﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِيْ الْأُمِّيّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

تاریخ اصلاح وتربیت

(جلد اول)

جس میں محسن عالم خیر القرون کے مربی اول اور دنیائے انسانیت کے مصلح اعظم نبی خاتم سید ولد آدم حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے خلفاء راشدین اور خانوادۂ نبوت کے چشم وچراغ حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کا تذکرہ ہے، جن کی اتباع میں امت کی اصلاح اور انسانوں کی ہدایت کا سامان ہے

سید محمود حسن حسنی ندوی

ناشر

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

طبع اول

رمضان المبارک ۱۴۳۶ھ مطابق جولائی ۲۰۱۵ء

کتاب	:	تاریخ اصلاح وتربیت (جلد اول)
مصنف	:	سید محمود حسنی ندوی
صفحات	:	۶۵۶
تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
باہتمام	:	محمد نفیس خاں ندوی

بہ تعاون

H.M. Husain Trust
E-Mail:hmhamuwash@yahoo.com

انتساب تعاون

الحاج عبدالحمید سیٹھؒ اور ان کی اہلیہ ام سلمان (سکندر آباد)

ناشر :

سیّد احمد شہیدؒ اکیڈمی

دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی (یوپی)

فہرست

انتساب ۱۳
شکرواعتراف ۱۵
مقدمہ اول ۲۴
مقدمہ دوم ۴۰
پیش لفظ ۵۷
عرض مصنف ۷۳

باب اول

بعثت ومقاصد بعثت، دعوت وتعلیم دین، اصلاح وتربیت اور تزکیہ واحسان ۹۶
دنیوی تمدن کا عروج اور انسانیت کی زبوں حالی ۹۹
جاہلیت کا مقابلہ اور توحید کی نداء ۱۰۲
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندیشہ اور قرآن مجید سے تعلق بڑھانے کا مشورہ... ۱۰۷
شریعت محمدی مکمل ترین، جامع ترین اور معقول ترین شریعت ہے ۱۱۱
تزکیہ واحسان ۱۱۳
تعلیم کے ساتھ تزکیہ کی ضرورت ۱۱۶
نفس کا تزکیہ دل کا تصفیہ ۱۲۰
استحضار نیت ۱۲۲
تزکیہ کے اعمال واشغال ۱۲۶
عقیدۂ توحید ۱۲۹
توحید کا اعلیٰ درجہ ۱۳۲
رسالت پر ایمان ۱۳۷
ایمان واحتساب ۱۳۹
محبت واخلاص ۱۴۴

صلاۃ (نماز) ۱۴۶
ذکر ۱۵۴
قرآن مجید ۱۶۲
اتباع سنت ۱۶۴
احکام شریعت پر عمل اور اتباع سنت ۱۶۵
مقاصد بعثت میں تزکیہ کا مقام ۱۶۷
نبوی وراثت ۱۷۳
بعثت کے اثرات ۱۷۷
صحبت نبوی کے اثرات ۱۸۱
صحابہ کا طریقہ اور بعد کے فتنے ۱۸۵
توبہ، انابت اور دعاء۔ قرآن مجید کا واضح اعلان ۱۹۰
پیغمبر انسانیت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت ۱۹۱
نماز کی تاثیر ۱۹۲
حج کی تاثیر ۱۹۳
مقامات عالیہ طے کرنے کا ذریعہ توبہ ہے ۱۹۴
توبہ اور استغفار کا تکوینی نظام پر اثر انداز ہونا ۱۹۵
سچی توبہ انسان کو بالکل پاک صاف کر دیتی ہے ۱۹۷
دعاء ایک بڑا عطیۂ خداوندی اور انعام ربانی ہے ۱۹۹
محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ۲۰۱
بیعت و صحبت۔ بیعت کی اصطلاح ۲۰۷
بیعت کے فوائد و اثرات ۲۰۹
بیعت ایک عہد و معاہدہ ہے ۲۱۴
نبی سے عہد و پیمان در حقیقت اللہ سے عہد و پیمان ہے ۲۱۷
اقسام بیعت۔ بیعت اسلام۔ بیعت جہاد ۲۱۸
بیعت اعمال اسلام۔ بیعت شریعت و طریقت ۲۱۹

بیعت کے اغراض و مقاصد اور اس کے اثرات۔ بیعت معیشت........................ ۲۲۳
بیعت تبرک... ۲۲۴
بیعت شریعت... ۲۲۵
بیعت طریقت... ۲۲۷
بیعت حقیقت... ۲۲۹
بیعت لینے کے لیے اجازت کی ضرورت.. ۲۳۱
مرشد کے لیے علم دین کی اہمیت.. ۲۳۳

باب دوم

سیدالاولین والآخرین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم........................ ۲۳۷
انسان کی تخلیق... ۲۳۷
مورث اعلیٰ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت........................ ۲۳۸
نسب شریف... ۲۴۰
ظہور قدسی... ۲۴۱
حوادث اور آزمائشیں... ۲۴۴
انسانی ہمدردی... ۲۴۶
تجارت و معیشت... ۲۴۸
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا نکاح۔
اسلام کی خاتون اول حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے........................ ۲۴۹
بیعت و رسالت... ۲۵۳
نبوت و بعثت... ۲۵۵
بعثت کا حال... ۲۵۶
مکہ مکرمہ میں دعوتی و تبلیغی کوششیں، موافقت و مخالفت........................ ۲۶۰
اسراء و معراج... ۲۶۴
صحابہ کی ہجرت... ۲۶۶
گھناؤنی سازش... ۲۶۸

ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۲۶۹
ہجری سال ۲۷۰
مدینہ منورہ کا قیام ۲۷۲
غزوات ۲۷۵
صلح حدیبیہ ۲۷۹
دنیا کے حکمرانوں کو دعوت اسلام۔غزوہ خیبر۔فتح مکہ ۲۸۰
روم کے خلاف فوج کشی ۲۸۱
اشاعت اسلام ۲۸۲
ارکان اسلام کی فرضیت ۲۸۳
حج اکبر ۲۸۵
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ عظیم ۲۸۸

باب سوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات وہدایات۔توحید ۲۹۱
بندگی۔اطاعت وانقیاد اور اتباع سنت۔محبت ۲۹۲
اکرام مسلم۔تجارت وصنعت ۲۹۳
عزت نفس۔سخاوت ۲۹۴
ایثار وغم خواری۔خیر خواہی ودادرسی ۲۹۵
صلح ومصالحت۔خاندانی زندگی۔صلہ رحمی ۲۹۶
اہل وعیال ۲۹۷
کمزور ومعذور افراد ۲۹۸
پڑوسی۔مہمان نوازی ۲۹۹
شفقت علی الخلق ۳۰۰
نیک صحبت اور اچھا ماحول۔آداب زندگی ۳۰۱
خوش اخلاقی اور تواضع ۳۰۳
نرمی اور بردباری۔امانت داری اور وفاداری ۳۰۴

سچائی۔شرم وحیا ۳۰۵
صبر وشکر ۳۰۶
توکل۔تقویٰ ۳۰۷
استقامت۔میانہ روی۔قرآن مجید کی تلاوت ۳۰۸
اذکار ۳۰۹
دعاء ۳۱۱
توبہ،انابت اور استغفار ۳۱۲
درود شریف ۳۱۳

باب چهارم

ازواج مطہرات (امہات المومنین) وذریت طیبہ رضی اللہ عنہم اجمعین ۳۱۵
۱-ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۱۶
۲-ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۱۷
۳-ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۱۸
۴-ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۰
۵-ام المومنین حضرت زینب بن خزیمہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۱
۶-ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۲
۷-ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۴
۸-ام المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۵
۹-ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۶
۱۰-ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۷
۱۱-ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۲۹
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ۳۳۱
۱-حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے حالات ۳۳۲
۲-حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حالات ۳۳۲
۳-حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے حالات ۳۳۲

۴-حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۴۳
۵-حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۴۴
۶-حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۴۵
۷-حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حالات ۳۴۶

باب پنجم

امت محمدی کا امتیاز و اعجاز خلافت نبوت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم ۳۴۹
خلافت کیا ہے؟۔سلب خلافت کی وجوہات ۳۴۹
امت پر اعتماد اور کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہ کرنا ۳۴۲
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت-
اسلام کی صداقت اور نبوت محمدی کی حقانیت کی دلیل ہے ۳۴۵
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت ۳۴۸
استخلاف فی الارض کا وعدہ اور خلافت راشدہ کا تحقق ۳۴۹
خلافت کی ضرورت اور اس کے کام ۳۵۴
خلافت راشدہ یا خلافت نبوت ۳۵۵
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت، خلافت نبوت کا امتداد اور تکمیل ہے ۳۵۶
خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم بے نظیر وحدت امتزاج و وحدت منہاج ۳۶۱

باب ششم

سرگروہ اہل صدق و وفا حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ۳۶۹
خلافت نبوت یا خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۳۶۹
خلافت نبوی کے مطالبات اور خلیفہ کی ذمہ داریاں ۳۷۷
بیعت خلافت نبوت ۳۸۰
خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطبہ ۳۸۴
خانوادہ نبوت کے افراد کی نصرت وحمایت ۳۸۵
مدعیان نبوت کی سرکوبی اور مرتدین سے مقابلہ ۳۹۳
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ایمانی غیرت اور-

"أينقص الدين و أنا حي" کا نعرہ مستانہ.......... ۳۹۶
حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قرآنی فضیلت ۳۹۸
ایک خطرہ.......... ۴۰۱
فضائل ومناقب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ۴۰۲
وفات۔خلیفہ کی نامزدگی ۴۰۷
دواہم دعاؤں کا اہتمام ۴۰۸
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فدایانہ تعلق.......... ۴۰۹
نبوی مزاج واخلاق سے مشابہت اور دیگر امتیازات وخصوصیات.......... ۴۱۱

باب ہفتم

سرگروہ اہل حق ویقین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ۔مقام ومرتبہ.......... ۴۱۵
قبول اسلام کا واقعہ ۴۱۷
علم نبوت سے مناسبت.......... ۴۱۹
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں ۴۲۲
درویشی اور زہد وقناعت.......... ۴۲۴
اصلاحیات ۴۲۸
عدل وقضا کے سلسلہ میں ہدایات ۴۳۰
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طریقہ استخلاف اور بعض اشارات وہدایات.......... ۴۳۷
ہدایات اور وصیتیں ۴۳۹
خدمات کا اجمالی تذکرہ ۴۴۲
شہادت ۴۴۵
شان محدثیت وفاروقیت.......... ۴۴۹
اقوال وملفوظات ۴۵۱

باب ہشتم

سروگروہ اہل احسان واستقامت حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ ۴۵۵
خاندان وقبیلہ۔فطرت سلیم.......... ۴۵۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ۴۵۶
خصوصی دعا اور جنت میں رفاقت کی بشارت ۴۵۷
مقام و مرتبہ ۴۵۸
بشارت شہادت در بشارت خلافت ۴۵۹
ایفائے عہد ۴۶۰
ذوق عبادت اور زہد و قناعت ۴۶۱
خلافت ۴۶۲
خدمات اور کارنامے ۴۶۴
واقعہ شہادت ۴۶۵
بعض اعتراضات اور ان کا جواب ۴۷۱
قصاص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ ۴۸۰
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صفات و خصوصیات۔شرم و حیاء ۴۸۶
صلہ رحمی اور حسن سلوک۔کثرت تلاوت ۴۸۷
عشق و وفا کی اعلیٰ مثال اور بیعت الرضوان ۴۸۸
ملفوظات گرامی ۴۹۱

باب نہم

سرگروہ اہل ایمان و توکل حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ۔مقام و مرتبہ ۴۹۳
ترتیب خلافت میں حکمت خداوندی کی کارفرمائی ۴۹۷
خلافت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور بعض شبہات کا ازالہ ۵۰۰
امتیازات و خصوصیات ۵۰۴
حضرت علیؓ سے محبت و تعلق نفاق سے براءت اور کمال ایمان کی علامت ہے ۵۱۴
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرات صحابہ و خلفاء راشدین کے ساتھ طرز عمل
اور ان کی خدمات کا اعتراف ۵۲۱
صحابہ کرام کا سلوک و برتاؤ اور رفقاء کی شہادت و اعتراف ۵۲۶
حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعتدال و انصاف ۵۳۳

جہاد فی سبیل اللہ اور سلوک راہ نبوت ۵۴۰
زہد واستغنا ۵۴۵
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ۵۴۶

باب دہم

خاندان نبوت کے چشم و چراغ اور باغ نبوت کے دو پھول حضرت حسن و حسینؓ ... ۵۴۷
ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ ۵۵۳
نام ونسب۔خانہ نبوت میں ولادت ۵۵۳
سایہ نبوت میں تعلیم وتربیت ۵۵۶
خلفائے راشدین کا تعلق ۵۶۳
حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حسن سلوک اور عقیدت واحترام ۵۶۵
حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت ۵۶۷
عظیم اور لازوال کارنامہ ۵۷۲
مصالحت میں فریقین کا کردار اور خلیفۃ المسلمین حضرت حسنؓ کا فکر ومزاج ۵۷۳
مصالحت میں فریقین کا کردار ۵۷۴
عام الجماعۃ ۵۷۷
فریقین کے لیے بشارت ۵۷۸
ظاہری سیادت وحکومت کی قربانی اور باطنی سیادت کی بشارت ۵۷۹
حیاومروت ۵۸۰
اقوال وملفوظات ۵۸۱
وصیت ۵۸۲
سانحہ وفات اور روضہ اقدس میں تدفین نہ ہونے کے اسباب ۵۸۵
ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ (شہید کربلا) ۵۹۰
نام ونسب ۵۹۰
ولادت باسعادت ۵۹۱
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی تعلق ۵۹۲

مشابہت ۵۹۳
دربار نبوت میں پرورش ۵۹۴
سنت کا پاس ولحاظ ۵۹۶
محبوبیت ومقبولیت ۵۹۸
فصاحت وبلاغت ۶۰۰
بڑوں کا پاس ولحاظ ۶۰۱
عبادت میں مشقت ومجاہدہ ۶۰۲
تواضع۔ صحابہ کرام کے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقام ۶۰۳
جگر گوشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۶۰۴
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو
بحیثیت اپنی اولاد کے قربانی کے لیے پیش کرنا ۶۰۵
آیت تطہیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل ۶۰۸
حادثہ کربلا اور شہادت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ ۶۱۱
اہل عراق کی بے وفائی ۶۱۵
حادثہ جانکاہ ۶۱۷
یوم عاشوراء ۶۱۸
یزید کا کردار ۶۱۹
شہادت حسین رضی اللہ عنہ کے پیچھے عیسائی دماغ کے اثرات ۶۲۰
سیدنا حسینؓ کا اقدام خلافت راشدہ کی روح کی حفاظت کے لیے تھا ۶۲۴
خلفائے اربعہؓ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی ۶۲۹
حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اقدام میں امت کے لیے رہنمائی ۶۴۹
اہل سنت والجماعت کا مسلک ۶۵۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انتساب

الحمد للّٰہ کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد!

امیر المؤمنین امام المجاہدین سید العارفین حضرت سید احمد شہید قدس اللہ سرہ العزیز کی طرف کرتے ہوئے مصنف اپنے لیے وہ سعادت محسوس کر رہا ہے جس کا وہ اہل نہیں، محض یہ اللہ کا فضل اور اس کی توفیق ہے، یہ وہ ناقابل فراموش ہستی ہے جس نے سماج کی کمزوریوں کو سماج کے اندر گھس کر دور کیا، اصلاحی انقلاب برپا کیا، بہت سی وہ سنتیں جو مردہ ہوگئیں تھیں اور بعض وہ فرائض جو نظر انداز کر دیئے گئے تھے ان کا احیاء کیا جیسے فریضہ حج اور جہاد کی عظیم نبوی سنت، ملت کو عالی حوصلگی عطا کی، اور انسانیت کو مساوات اور مواسات سے زندہ کیا، تنیم کو عام کیا، دعوت دین کو گھر گھر پہنچایا، تربیت کے نبوی منہج کا راستہ صاف کیا، قرآن کی صدا بلند کی، حدیث نبوی سے تعلق بڑھایا اور تزکیہ کے اعمال واشغال سے فلسفیانہ اثرات مٹائے اور یہ پیغام دیا:

> ''طریقۂ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ہے کہ زندگی کا ہر کام صرف رضائے رب العالمین کے لیے کیا جائے، مثلاً محنت کا مقصد یہ ہو کہ انسان حلال روزی کما کر خود بھی کھائے اور اہل وعیال کو بھی کھلائے، استراحت شب کا مدعا یہ ہو کہ انسان جوف لیل میں اُٹھ کر نماز تہجد ادا کرے اور نماز فجر اول وقت پڑھے، کھانا اس لیے کھایا جائے کہ جسم میں بقدر ضرورت طاقت بحال رہے تاکہ

انسان خدا کے احکام مستعدی سے بجالائے، نماز پڑھے، روزے رکھے، حج کے لیے جائے، ضرورت پڑے تو جہاد کے لیے تیار ہو، غرض چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے میں مقصود احکام خداوندی کی بجا آوری اور مرضات باری تعالیٰ کی پابندی کے سوا کچھ نہ ہو، بالفاظ دیگر ہر فرد آیت مبارکہ ﴿إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ کا عملی نمونہ بن جائے۔"

ان کے اصلاحی کارنامے تجدیدی کہلائے اور جو دین کے تمام شعبوں پر محیط نظر آئے اور ان کی جماعت دعوت وارشاد واصلاح و جہاد کے نام کہ جس کا ایک ایک فرد پوری قوم پر بھاری تھا بالخصوص حضرت شاہ اسماعیل شہید اور حضرت مولانا عبدالحی بڈھانوی (جو ان کے دست راست، قوت بازو، خلیفہ اور ان کے تمام کاموں میں شریک وسہیم تھے) اور بقیۃ السلف الصالحین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس سرہ اور اپنے والدین ماجدین علیھما الرحمۃ والغفران کے نام جنہیں اس تصنیف کی تکمیل کا بڑا تقاضہ تھا اور امت محمدیہ علیٰ صاحبھا ألف ألف تحیۃ وسلام کی عہد بہ عہد تمام محسن ہستیوں کے نام کہ سب کا نام لیا جائے تو کتاب کی کئی جلدیں بھی ناکافی ہوں گی، اللہ رب العالمین کے رجسٹر میں جس کا جیسا درجہ ہے، اس کو معنون ہے۔

اللّٰھم ارحمھم واغفر لھم وتقبّل ھذا الکتاب وانفع بہ.

سید محمود حسن حسنی ندوی
۷/صفر المظفر ۱۴۳۶ھ
بروز دوشنبہ

کتب خانہ علامہ شبلی نعمانیؒ
ندوۃ العلماء لکھنؤ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تشکر واعتراف

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على إمام المتقين سيد الأولين والآخرين خير خلق الله أجمعين وعلى آله الطيبين الطاهرين وأصحابه الغر الميامين وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين والعاقبة للمتقين، أما بعد!

سب سے پہلے شکر اپنے مالک حقیقی اللہ رب العالمین کا ادا کرتا ہوں کہ جس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے رسول اور نبی بھیجے اور پھر سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی بنا کر تمام رسولوں اور نبیوں کا سردار بنایا اور تمام مخلوقات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے برتر اور افضل بنایا۔

يـا ربِّ صـلِّ و سـلِّـم دائـمـاً أبـداً

عـلـىٰ حَبيبكَ خيـرِ الـخـلـقِ كلّهمُ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات جوامت اور انسانیت پر ہیں وہ شمار واحاطہ سے باہر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اظہار وفا کا طریقہ غلامانہ وابستگی سے ہی ہے اور اس کا بہترین راستہ اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں بتادیا ہے، وہ ہے کہ تمام احوال وکوائف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر نظر اور اس کی اتباع اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کی کثرت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے ساتھ خیر خواہی اور تمام انسانیت کی خیر خواہی کہ جن سے امت بنتی ہے، اسی طرح آپ صلی

اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی بھی اقتداء اور اتباع کہ ان کی بھی اقتداء واتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء واتباع ہے، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو وصیت فرمائی تھی کہ:

"علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین."

(میرے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقہ کی اتباع تم پر لازم ہے)۔

چونکہ خلافت راشدہ اصلاً خلافت نبوت ہے، اور حضرات حسنین (سیدنا حضرت حسن سبط اکبر اور سیدنا حضرت حسین سبط اصغر) رضی اللہ عنہما کا اقدام اس سے جڑا ہوا ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اقدام سے اجتماعیت کی روح پیدا ہوئی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس کی خوش خبری دے کر ان کے بلندی مرتبہ (سیادت) کو بھی واضح فرما دیا تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام نے خلافت نبوت اور ملوکیت وشہنشاہیت کے فرق کو سب پر آشکارا کر دیا اور یہ بتا دیا کہ نبوی و اسلامی روح ومزاج کیا ہے، اس کی وجہ سے اور ان دونوں کو جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب ومشابہت اور نسبی وروحانی نسبت حاصل ہے، اس وجہ سے بھی ان کا تذکرہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین کے ساتھ ہی ناظرین باتمکین ملاحظہ کریں گے اور یہ ان دونوں کی قربانیوں اور اقدام کو ادنیٰ خراج عقیدت اور نذرانہ تشکر بھی ہے کہ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ."

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ دین کا جو بھی حصہ ہم تک پہنچا ہے اور دنیا کا جو خیر اس وقت ہمیں حاصل ہے اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم (بشمول صحابیات رضی اللہ عنہن) اہل بیت عظام رضی اللہ عنہم (بشمول ازواج مطہرات و بنات طیبات و طاہرات رضی اللہ عنہن) کی برکات پوری طرح شامل ہیں، ان کے بغیر دربار رسالت میں رسائی ناممکن ہے، ان کے لیے دعا اور ان کے ساتھ حسن ظن اور ان کی قربانیوں کا

اعتراف، یہ روحانی ترقی کا ایسا زینہ ہے جس کے بغیر انسان بلندیوں تک نہیں پہنچ سکتا ہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے:

﴿أُولَـٰئِكَ الَّـذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوَى، لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَّأَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

(یہی وہ اصحابِ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن کے دلوں کو ان کے تقویٰ کا امتحان لینے کے لیے منتخب کیا، تو ان کے لیے (اس امتحان میں کامیاب ہوجانے پر) خصوصی مغفرت اور بہت بڑے انعام کا پروانہ ہے)۔

انشاء اللہ جلد دوم میں اس قدسی جماعت کے بقیہ نمائندہ افراد کا حال بیان ہوگا اور ان کے تابعین اور تبع تابعین کی سیرت کے بھی نقوش ہوں گے "والـذيـن اتبعـوهـم بـإحسـان." (جنھوں نے ان (اصحاب کرام رضی اللہ عنہم) کی احسان مندی کے ساتھ اتباع کی)۔

اور وہ سب اولیاء و اصفیاء، مجاہدین فی سبیل اللہ، اصحاب ربانیت وتقویٰ، اہل قلوب، ارباب علم و فضل اور مصلحین ومجددین جنھوں نے اپنے اپنے عہد میں اپنے پاکیزہ نفوس اور دل کی گرمی سے لوگوں کے دلوں کو ایمان کی حرارت بخشی اور مایوس لوگوں کو امید کی کرن دی اور پست ہمت لوگوں کو بلند حوصلگی عطا کی اور بندوں کو اللہ سے جوڑا، دل ودماغ کو عشق الٰہی اور محبت رسول سے معمور کیا، اور ایمان ویقین کی ایسی باد بہاری چلائی جس سے فضا منور ہوئی اور ماحول معطر ہوا۔

پیش نظر کتاب اسی سلسلہ وار تاریخ کا حرف آغاز ہے جو تاریخ ایمان و عزیمت وتاریخ اصلاح وتربیت کے سب سے زریں اور نمونہ کے عہد کا حال پیش کرتی ہے، اس لیے ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

"خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم."

(تمام زمانوں میں سب سے بہتر (مبارک) میرے عہد (کے لوگ ہیں)، پھر وہ لوگ جو مجھ سے قریبی عہد کے ہیں، پھر وہ لوگ جو ان کے قریبی عہد کے ہیں)۔

جب سے اسلام آیا، کبھی بھی اصلاح وتربیت اور دعوت وعزیمت کے میدان میں خلا نہیں رہا، اور زمانی ومکانی طور پر لوگوں کی استعداد کے مطابق ہر زمانہ و مکان پر لوگ کھڑے ہوتے رہے، ہم ان سب لوگوں کو جن کے نام معلوم ہو سکے یا جن کے نام معلوم نہ ہوئے، سلام وخراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ:

﴿اهدِنَــا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعمتَ عَلَيهِمْ﴾

(ہمیں سیدھا راستہ لے چل، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا)۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس اللہ سرہ العزیز سے اجازت حاصل کر کے اور ان کی دعا لے کر اس سلسلۂ تاریخ کا آغاز کیا، وہ ہمارے خاندان کے سرپرست، ہماری مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سرپرست اور ہم سب کے مرشد ومربی تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ صحیح معنوں میں عالم اسلام بھی اپنے کو ان کی سرپرستی میں محسوس کر رہا تھا، اللہ تعالیٰ حضرت کے مراتب عالیہ کو خوب بلند سے بلند تر فرمائے اور ان کے انوار وبرکات سے مسلسل دنیا کو منور اور مبارک کرتا رہے۔

والدین ماجدین کی یاد کیسے اور کیوں نہ آئے، اب دونوں ہی اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے ہیں، انھوں نے پالا پوسا، پروان چڑھایا، پڑھنے لکھنے کے اسباب فراہم کیے اور مشائخ واساتذہ کی خدمت میں حاضری کے لائق بنایا، حقیقی طور پر جو خوشی انھیں ہوتی شاید کسی کو ہو! ﴿رب ارحمهما كما ربياني صغيرا﴾.

مرشد ومخدوم ومعظم اور ہم سب کے سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم (ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) مخدوم گرامی مولانا عبداللہ عباس ندوی علیہ الرحمہ (سابق معتمد ندوۃ العلماء)، مربی

جلیل حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی زید مجدہم (معتمد تعلیم ندوۃ العلماء) خال معظم مولانا سید محمد حمزہ حسنی ندوی (ناظر عام ندوۃ العلماء)، خال معظم مولانا سید سلمان حسینی ندوی (صدر جمعیت شباب اسلام) اور استاذ معظم مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری، اسی طرح استاذ گرامی مولانا شمس الحق ندوی کی شفقتیں و رہنمائیاں راقم کو تعلیمی مرحلہ اور تقریر وتحریر کے سلسلہ میں مختلف انداز میں برابر حاصل ہوتی رہیں، اور اس سلسلہ میں بھی ان حضرات نے بڑے مفید مشوروں سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان کی برکات کو قائم رکھے اور ان کا سایہ تادیر ہم پر باقی رکھے۔

مربی ومخدوم حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ و برد مضجعہ و رفع مراتبہ کا احسان اس تعلق سے بہت بڑھا ہوا ہے کہ انھوں نے تحریک کی، حوصلہ دیا اور برابر اس کی فکر رکھی کہ کام کس مرحلہ میں ہے اور جائزہ لیتے رہے، مفید اور نہایت قیمتی مشوروں سے نوازتے رہے، اپنے مقدمہ سے کتاب کو زینت بخشی، کاش وہ حیات ہوتے! اسی طرح ان کے جانشین و برادر عزیز خال محترم مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی دام ظلہ سے بھی جا بجا رہنمائی اور تعاون ملتا رہا۔

بڑی ناسپاسی ہوگی کہ ہم اس موقع پر حضرت شاہ نفیس الحسینی "سید انور حسین زیدی نفیس رقم" لاہوری قدس سرہ کو بھول جائیں کہ جن کو اس کام کا جب سے علم ہوا، شدید اشتیاق و انتظار رہا، وہ آخر میں سلسلۂ رائے پوری کے سرحلقہ اور امیر المومنین حضرت سید احمد شہید قدس سرہ کے طریقۂ محمدیہ کے سب سے بڑے حامل تھے، حضرت کی راقم پر بڑی عنایات رہیں اور اپنے کتب خانہ سے استفادہ کا موقع بھی عنایت فرمایا۔

اور جب معاملہ تشکر و اعتراف کا ہے تو ہم اپنے عہد کے ان ممتاز مصنفین و محققین کو نہیں بھلا سکتے جنھوں نے اپنے تحقیقی کاموں سے دنیا میں ایک نام اور مقام حاصل کر لیا تھا، یہ ان کی ذرہ نوازی تھی کہ انھوں نے ہم پر دست شفقت رکھا، اپنی توجہات سے نوازا، ملاقات کا شرف عطا کیا، مراسلت کا موقع بہ آسانی فراہم کیا اور

جدید تحقیقی اصولوں کا خیال رکھ کر کام کرنے کا حوصلہ دیا، لیکن ایک ایک کر کے یہ حضرات اپنے سایۂ عاطفت سے محروم کرتے گئے اور استفادہ کا زیادہ موقع نہ مل سکا مگر جو ملا وہ بھی کم نہیں۔

ان میں پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم سابق پرو وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم سابق صدر عربک ڈپارٹمنٹ دہلی یونیورسٹی وسابق ایڈیٹر مجلہ ثقافۃ الہند نئی دہلی قابل ذکر ہیں، اور جن کا سایہ عاطفت قائم ہے، ان میں پروفیسر مولانا یٰسین مظہر صدیقی ندوی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور پروفیسر مولانا محمد محسن عثمانی ندوی (دہلی یونیورسٹی دہلی، وسیفل یونیورسٹی حیدرآباد) کا ذکر ضروری ہے، جزاهم الله أحسن الجزاء.

یہ ہم سب کے لیے سعادت وخوش بختی کی بات ہے کہ قائد اہل سنت مولانا محمد عبد العلیم فاروقی لکھنوی، محقق العصر مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی اور فقیہ العصر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہم کا سایۂ عاطفت ہمارے سروں پر قائم ہے، علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ان سے استفادہ ناگزیر ہے، انھوں نے کبھی اپنی عنایتوں سے محروم نہیں کیا، أطال الله بقاء هم و نفع بهم الأمة.

اپنے کرم فرما مکرمی جناب محمد عثمان صاحب حیدرآبادی (ایچ.ایم.حسین ٹرسٹ) اور محترمی قاری حبیب احمد لکھنوی (حال مقیم دبئی متحدہ عرب امارات) کا شکریہ بھی ضروری ہے کہ ان سے بھی ہمیں ہمت اور حوصلہ ملا، فجزاه الله تعالیٰ خیر الجزاء.

کتاب کا پہلا مسودہ گم ہوجانے کے بعد نئے سرے سے کتاب ترتیب دینے کا مرحلہ آسان نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت ومصلحت یہی تھی، ایک نیا حوصلہ ملا اور نیا تصنیفی منصوبہ بنا کر از سر نو کام کا آغاز کیا، فتقبله الله تعالیٰ قبولا حسنا.

دعا کرنے والوں کی دعائیں خوب کام آئیں، ان کی فہرست طویل ہے، جس کا سلسلہ آج سے نہیں لگ بھگ بیس سال سے تو ان لوگوں کا ہے جن کو جب سے اس کا علم ہوا تو انھوں نے دعاؤں کا غیر معمولی اہتمام کیا، افراد خاندان میں والدین ماجدین کے علاوہ چچا، پھوپھی، خالہ، ماموں اور بہن بھائی اور دیگر اقارب اور بزرگ ہیں جو ان بڑوں کے بھی بزرگ ہیں، ان میں سے کچھ تو دنیا سے جا چکے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی آغوش رحمت میں لے اور جو ہیں ان کے سایہ عاطفت کو عافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

دادا محترم جناب سید محمد مسلم حسنیؒ اور پھوپھا صاحب مولانا سید احمد علی حسنی ندویؒ کی یاد بھی آرہی ہے، ان دونوں بزرگوں کے راقم پر بڑے احسانات رہے ہیں، ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں ان دونوں بزرگوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، یہ دونوں ہمارے مرکز دعوت وتحقیق دار عرفات کے ذمہ داروں میں بھی تھے، جس سے راقم کی علمی وابستگی قائم ہے۔

اساتذہ میں سبھی کی دعائیں اور توجہات وتوجیہات حاصل رہیں، کچھ نے حروف شناسی سکھائی اور لکھنے کی مشق کرائی، کچھ نے قرآن مجید پڑھایا اور کچھ نے حدیث وفقہ کی تعلیم دی، ادب سکھایا، دینی اخلاق سکھائے اور علم وتحقیق کا ذوق دیا اور جس نے حصول علم کی راہ میں جو رہنمائی کی اور جو تعاون دیا اس کا حقیقی صلہ اللہ رب العالمین ہی دے گا، حقیقی معلم اور حقیقی مربی وہی ذات عالی ہے، جس نے یہ اسباب پیدا فرمائے۔

مشائخ میں برکۃ العصر حضرت مولانا افتخار الحسن صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم کی دعا شروع ہی میں حاصل کی، شیخ وقت حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب نور اللہ مرقدہ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس صاحب جونپوری دامت برکاتہم کی توجہ ودعا برابر حاصل رہی اور حضرت مولانا عبدالرحیم متالا (سورتی ثم افریقی) رحمۃ

اللہ علیہ (چپاٹا، زامبیا) نے تو اپنے معمولات یومیہ میں فکر و دعا شامل کرلی تھی اور دریافت حال بھی فرماتے رہتے تھے، حضرت مولانا شاہ قاری محمد مبین صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم، حضرت مولانا شاہ محمد قمرالزماں صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم اور حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب علی گڑھی دامت برکاتہم، جانشین محی السنۃ حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقی علیہ الرحمہ کی دعاؤں اور توجہات کا بھی بڑا حصہ ہے، ان کے علاوہ اور بھی حضرات ہیں جیسے معروف مربی و مصلح حضرت مولانا ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم جن کی صحبت بابرکت حرمین شریفین میں کئی بار حاصل ہوئی اور دعا وتوجہ سے نوازا، اسی طرح حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب کاندھلوی دامت برکاتہم صاحبزادہ وجانشین حضرت شیخ الحدیث ریحانۃ الاسلام مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ اور حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی اعظمی مدظلہ اور وہ بزرگ اساتذہ جو مشائخ کے درجہ میں ہیں اور ہماری مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکابر میں ہیں جیسے حضرت مولانا سعیدالرحمٰن اعظمی ندوی، حضرت مولانا مفتی محمد ظہور ندوی، حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، اللہ عزوجل ان سب مخدوم اور بزرگوں کے سایہ عاطفت اور ان کی برکات کو قائم ودائم رکھے، متعنا اللّٰہ والمسلمین بطول حیاتهم.

اپنے رفقاء میں جن سے خصوصی تعاون ملا، ان میں چند کا نام پیش کیے دیتا ہوں، برادر معظم ورفیق محترم مولانا عبدالسبحان ندوی بھٹکلی (استاذ تفسیر وحدیث جامعہ اسلامیہ ضیاء العلوم رائے بریلی)، برادر محترم مولانا نعیم الرحمٰن صدیقی ندوی (رکن خاندان حضرت مولانا عبدالماجد دریابادیؒ و معاون علمی کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ندوۃ العلماء لکھنؤ) برادر گرامی مولانا محمد عرفان ندوی گنج مرادآبادی مرحوم، مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی، مولانا محمد فیضان نگرامی ندوی، مولانا محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی، مولانا سید سحبان ثاقب ندوی بھٹکلی حفظہم اللہ، دیگر احباب ورفقاء میں مولوی ظفیر الاسلام ندوی میرٹھی، مولوی عبدالہادی اعظمی ندوی اور مولوی عاصم اختر ٹونکی ندوی،،

مولوی عاصم عبیداللہ ندوی برمی وغیرہ، اور پروف کی تصحیح کے آخری مرحلہ میں عزیزان مولوی طارق اکرمی ندوی، مولوی عبدالمنعم رکن الدین نواب ندوی و مولوی سید محمد شعیب سلمہ کا تعاون بھی قابل ذکر ہے۔

اللہ ان سب کو اور دیگر سبھی کو جن کا کسی طرح کا بھی تعاون ملا، جزائے خیر عطا فرمائے اور اجر میں شریک فرمائے، خاص طور پر مولانا محمد اسحٰق ندوی (شعبہ دعوت وارشاد، ندوۃ العلماء لکھنؤ) کو جنھوں نے کمپوزنگ بڑے اہتمام اور فکرمندی اور جذبۂ تعاون وخیرخواہی سے کی اور عزیز محترم مولوی محمد نفیس خاں ندوی (رفیق مرکز الامام ابی الحسن الندوی، دارعرفات، رائے بریلی) نے اس پر مزید محنت کی اور عزیز گرامی مولوی سید محمد غفران حسینی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء وحفید حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندویؒ) نے بھی مراجعت میں حصہ لیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ ہمارا یہ تجربہ رہا کہ جس سے مشورہ یا تعاون چاہا، اس نے پوری فراخ دلی سے مدد کی، چاہے وہ ہمارے لیے اجنبی رہے ہوں یا قدیم روابط والے۔

آخر میں اللہ رب العالمین ذات حمیدہ صفات، قدوس و وہاب اور حی وقیوم سے یہی دعا ہے کہ:

''بارِالٰہا! ان سب کو تو اپنے شایان شان بدلہ عطا فرما۔''

آمین یا رب العالمین ویا أرحم الراحمین.

محمود حسن حسنی ندوی
دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۹؍ربیع الاول ۱۴۳۶ھ
یکم جنوری ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ اول

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم
(ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسول الله محمد ابن عبد الله الصادق الأمين، وعلى آله الطيبين الطاهرين وعلى أزواجه وأصحابه الغرّ الميامين وعلى من تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أما بعد!

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو انسانی تاریخ کے ترقی یافتہ زمانہ کے آخری دور کے لیے مخصوص فرمایا لیکن غیر تعلیم یافتہ، و غیر ترقی یافتہ صحرائے عرب والی قوم میں مبعوث فرمایا جو دو عظیم اور متمدن مملکتوں کے درمیان اپنے محدود حالات کے ساتھ بسے ہوئے تھے اور یہ قومیں تعلیم وتمدن کے بام عروج پر اور یونانی عقل وفلسفہ کے علم سے فیض یافتہ تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انسان کے ساختہ پرداختہ علم وتمدن سے علاحدہ رکھتے ہوئے فطری صلاحیتوں پھر وحی الٰہی کی تعلیمی وتربیتی ہدایات سے فیض یافتہ بنانا چاہا تھا۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایسے عوامل مقدر فرمائے جو اس مقصد کے لیے مفید تھے اور وحی کے ذریعہ تعلیم دی اور تربیت بھی فرمائی، اور انسانوں میں اس قوم کو جس کے افراد فطرت انسانی کے فطری اوصاف تک محدود تھے، آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی صحبت ورفاقت کے لیے منتخب کیا، اوران کی تعلیم وتربیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ کرائی، اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپ کا یہ وصف قرآن مجید میں بیان فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِيْ الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾ (۱)

(وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جوان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اوران کا تزکیہ کرتا ہے اوران کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے)۔

اور پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آسمانی تربیت کے بعد اپنے رفقاء اور اصحاب کی تربیت سپرد کی جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالی جماعت تیار ہوئی، قرآن مجید نے اس تربیت یافتہ جماعت کی واضح الفاظ میں یوں تعریف فرمائی اور ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ أَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدَى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللّٰهِ شَهِيْداً، مُّحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً، سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُوْدِ، ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِيْ الْإِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوْقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ،

---

(۱) سورۂ جمعہ/۲

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً﴾ (۱)

(وہی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو ہر دین پر غالب کردے اور اللہ ہی گواہی کے لیے کافی ہے۔ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ انکاریوں پر زورآور ہیں اور آپس میں مہربان ہیں آپ انھیں رکوع اور سجدہ کرتے دیکھیں گے، اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں ان کی علامتیں سجدوں کے اثر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں ان کی یہ مثال تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے جیسے کھیتی ہو جس نے اکھوا نکالا پھر اس کو مضبوط کیا پھر وہ موٹا ہوا پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا کھیتی کرنے والوں کو بھانے لگا تا کہ وہ ان سے انکار کرنے والوں کو جلا دے، ان میں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے ان سے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے)۔

یہ حقیقت ہے کہ انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اس سے اس کی طبیعت مانوس ہو جاتی ہے اور مل جاتی ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت ہو گئی تھی جسے عشق کہتے ہیں، اس لیے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی میں ڈھل گئے، آپ کی مرضی توحید و عبودیت، اخلاص و تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ کا ہو کر رہنے کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واتباع کو کہا گیا کہ اس سے اللہ کی سچی محبت حاصل ہوگی، اور اس کے نتیجہ میں اللہ کا محبوب بننا آسان ہوگا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت تھی جس کی تاریخ انسانی میں نظیر نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کانٹا چبھے یہ بھی ان کے کسی ایک فرد کو برداشت نہ تھا،

---

(۱) سورۂ فتح / ۲۸-۲۹

چاہے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑ جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں عشرۂ مبشرہ اور ان میں حضرات خلفائے راشدین میں یہ بات زیادہ جلوہ گر ہوئی اور اصحاب اربعہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں یہ شان زیادہ نمایاں تھی، انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مناسبت پہلے سے تھی اور یہ تعلق بعثت نبوی سے پہلے سے تھا، جیسے بعض لوگوں سے رفاقت اور ہم عمری کی صورت میں ہو جاتا ہے یا خاندانی رشتہ، وطنی تعلق کی بنا پر مسلسل ربط کی صورت میں دو شخص دوست ہو جاتے ہیں، لہٰذا جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت آئی تو انھوں نے فوراً قبول کر لی، نبوت کے بعد اس تعلق میں دینی عنصر شامل ہو گیا اور آپ رضی اللہ عنہ کا مزاج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے دینی ربط کی بنا پر بہت حد تک یکساں ہو گیا اور ان کی شخصیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ڈھل گئی۔

مزاج میں یکسانیت یا مشابہت اور رفاقت کے مزید بڑھ جانے کی بنا پر دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں رفاقت کی خصوصیات میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تر ہو گئے، اسی مزاجی قرب کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سانحۂ عظیم کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپ کی شخصیت سے تقویت حاصل ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے لیے آپ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ سے زیادہ قریب تر محسوس کی گئی اور سرکردگی کے معاملات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے زیادہ قرب محسوس کیا گیا اور اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اختیار کردہ طرز بہت حد تک جاری رہا اور اس میں دو سال کی مدت نے قوت اور پختگی مزید پیدا کر دی اور نظم و انتظام اور قابل عمل معاملات میں سابقہ طریقہ قائم و جاری و ساری ہو گیا اور اس کی بنیاد مضبوط ہو گئی، اور اسی کے ساتھ مملکت کا دائرہ عمل وسیع ہوتا چلا گیا۔

فتوحات میں وسعت کی بنا پر حالات اور نظم وضبط کے تقاضے بہت بڑھنے لگے، اس لیے عظیم تنظیمی خصوصیات کی حامل شخصیت کی سربراہی کی ضرورت پیدا ہوئی، اس کے لیے اللہ رب العزت کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سربراہی مقدر فرمائی گئی، جن کی اس خصوصیت کو خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا تھا اور اپنے بعد کے عہد کے لیے ان کو تجویز کیا، جو نئے نظام عمل کے لیے زیادہ موزوں محسوس کیے گئے اور انھوں نے ذمہ داری ملنے پر اپنی اس صلاحیت کا غیر معمولی ثبوت دیا، انھوں نے اسلامی مزاج کا پابند بنانے کا کام بخوبی انجام دیا۔

مزید یہ ضرورت بھی پوری کی کہ دینی مسائل میں جہاں شبہات کا فائدہ اٹھانے کی صورت حال کو کنٹرول کیا اور اس میں جس اجتہاد کی ضرورت تھی، اس پر عمل کیا، چنانچہ بعض ایسے معاملات میں جزم اور قطعیت سے کام لیا اور تعلیم وتربیت اور حکمت واخلاق کا ایک پورا نظام دیا اور یہ اللہ کی حکمت تھی کہ ان حالات کے لیے اللہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو توفیق عطا کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے حکیمانہ اور پرعزیمت طرز عمل سے مسلمانوں کی دس سال سربراہی کی اور اسلام کا مثالی نظام عمل مستحکم بنا دیا اور اسلامی عہد اول کا بنیادی عہد اس طرح مکمل ہوا۔

پھر اسلام کے عہد اول کی نسل سے اس کے بعد کی نسل کا عہد شروع ہو گیا، اس میں عہد اول کے تربیت یافتہ لوگوں کا دیگر علاقوں اور نئے لوگوں سے اختلاط بڑھ گیا اور وہ بہت سے لوگ جو عہد اول کے تربیت یافتہ تھے، جنھوں نے اللہ اور اس کے دین کے خاطر سخت تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کی تھیں اور دین کی ایک ایک بات پر چلنے کا پورا حوصلہ رکھتے تھے، وہ دنیا سے رخصت ہونے کے سبب کم ہو گئے اور ان لوگوں کی خاصی آمد ہو گئی جو اسلامی فتوحات کے زیر اثر علاقوں سے تعلق رکھتے تھے، جو عموماً مصر وفارس کے لوگ اور دوسرے مقامات کے لوگ تھے، جو اسلامی حمیت اور عمل

میں عزیمت کی اس سطح پر نہ تھے، جس پر عہد اول کے لوگ تھے، ان حالات میں اسلام کی دی ہوئی رخصت کو برتنے کی ضرورت تھی، جس کو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے محسوس کیا اور عمومی صورت حال کو دیکھتے ہوئے رخصت پر عمل کا حسب ضرورت اجرا کیا تاکہ دین پر چلنے کا راستہ لوگوں کو دشوار نہ ہونے لگے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے فیصلوں اور طریقۂ کار کو دیکھنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلام کی تعلیمات کے ضروری طرز عمل کو نافذ کرنے میں ذرا کوتاہی نہیں کی، لیکن عزیمت کے عمل کو ہر حال میں جاری رکھنے کا خیال رکھنے والوں کو اعتراض ہوا، اس اعتراض نے اختلاف کی شکل اختیار کی اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا جو اسلامی نظام کے ابتدائی دور میں پیش آنے سے بڑا مسئلہ بن گیا، اور ان ہی حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا مزاج عزیمت کے معاملہ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مزاج تھا، انھوں نے اسی طرز کو اختیار کرنے کی کوشش کی، اس میں ان کو خاصی دشواری پیش آئی، ان کے پیش نظر یہ تھا کہ لوگ رخصت پر عمل کرنے پر کہیں اس کے اتنے عادی نہ ہو جائیں کہ تنعم اور سہولت پسندی، دین کے لیے قربانی اور مجاہدہ سے گریز کرنے لگیں، اس کا اظہار ان کے خطبات میں ملتا ہے، البتہ انھوں نے بڑھتی ہوئی اخلاقی اور سماجی برائیوں کے ازالہ اور صحیح اسلامی معاشرہ کو قائم کرنے کے لیے شخصی طور پر افراد کو تیار کر کے لوگوں میں دین مضبوط کرنے اور اللہ سے تعلق بڑھانے کا طریقہ اختیار کیا اور اپنے طرز عمل سے زہد و استغنا، قناعت و توکل کا وہ نمونہ پیش کیا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی یاد دلاتا تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی تھے اور کم عمری ہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت اور سرپرستی میں آگئے تھے اور آپ

صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت میں رہنے کے ساتھ بعد میں مزید یہ بات حاصل ہوئی کہ ان کے گھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا بحیثیت زوجہ کے آگئیں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تربیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی عزیمت پر عمل کرنے کی تھی کہ ان کو ذرا بھی سہولت والی بننے والا نہیں بنایا تھا اور ان کو مشقت کی زندگی کا عادی بنایا تھا، اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رفاقت رہی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزاج اسی انداز کا بنا، خطرات کے موقعوں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آگے رکھتے تھے، اور دنیا کی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے میں پیچھے رکھتے تھے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزاج زہد وقناعت، استغنا اور سادگی اختیار کرنے کرانے کا بن گیا تھا اور یہ وصف ان پر ہمیشہ غالب رہا، لیکن ان کو خلافت کی ذمہ داری اس عہد میں ملی جو عزیمت کے برداشت کرنے میں کوتاہی والا عہد تھا، اس کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اسلام کے ان دونوں پہلوؤں کے عملی نمونوں کو خلفائے راشدین کے ذریعہ زیر عمل آنے اور ان کی اپنی اپنی جگہ اہمیت ثابت ہونے کا عملی اظہار پوری طرح سامنے آگیا اور اس طرح خلافت راشدہ کے اصول و طریقہائے کار عملی مثال بن گئے۔

چاروں خلفائے راشدین کے طریقہائے عمل میں ان دونوں پہلوؤں کے نمونے ملتے ہیں جو ان کے اوصاف میں نظر آتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مزاج کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے جو قرب ومناسبت تھی اس کا اظہار ان کی خلافت میں ہوا، جو نبوت کے بعد سب سے اونچا مقام ہے ان کو ان کی اسی صفت پر ''صدیق'' کا لقب ملا، جس میں ان کے عمل تصدیق کو بڑا دخل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی روزِ اول سے مکمل تصدیق کی اور جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اسی وقت اسی حیثیت سے مانا اور تسلیم کیا، ان کی اس صدیقیت اور

رفاقت کا اعتراف زبان رسالت سے یہ ادا ہوتا ہے کہ "لو کنت متخذاً خليلا لاتخذت أبابكر خليلا."

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سانحۂ عظیم کے بعد امت کو سنبھالنے کا کام کیا اور سب سے پہلے لوگوں کے ایمان وعقیدہ کی فکر کی، پھر دین کے اجزاء کی حفاظت کے لیے قدم اٹھایا، اور صاف لفظوں میں یہ کہا: "أينقص الدين و أنا حی؟" کہ میرے جیتے جی دین میں کمی زیادتی کی بات نہیں ہوسکتی۔

اسی طرح مقام رسالت ونبوت میں شرکت کی بات کہنے والوں کے خلاف برسرپیکار ہوئے اور اس طرح مدعیان نبوت کے فتنہ پر قابو پایا اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس پیانہ پر چاہتے تھے اسی وزن اور پیانہ پر اس کو انجام دینے کی کوشش کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو "فاروق" کا خطاب ملا، اور اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ بات فرمائی کہ "میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے۔"

اس سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ان اقدامات، فیصلوں کی تائید ہوتی ہے جو انھوں نے اپنی غیر معمولی فراست ایمانی سے کیے، ان کو فاروق اس لیے کہا گیا کہ دین کے نفاذ میں وہ کسی کی رعایت ومروت کے قائل نہ تھے اور حق وباطل کو اپنے عمل وکردار اور اقدام کے ذریعہ واضح کردینے والے تھے تاکہ حق وباطل میں کسی طرح شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے، اور باطل کو پنپنے کا ذرا بھی موقع نہ ملے، اس میں وہ اپنی ایمانی طاقت اور دینی فراست سے مدد لیتے تھے جو اعلیٰ درجہ پر اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی تھی اور اس میں ان کی امتیازی شان کو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا تھا، اور ان کی تعریف کی تھی، اس کے ساتھ ان کا یہ وصف برابر ممتاز رہا کہ جہاں کہیں ان کو یہ محسوس ہوتا کہ کہیں ان سے زیادتی ہوگئی ہے تو فوراً اس کی تلافی

کرتے اور صاحب معاملہ سے معافی طلب کرلیتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اجتہاد بھی کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ غلطی کا ارتکاب بھول چوک سے یا کسی جسمانی کمزوری اور کسی دباؤ کے نتیجہ میں تو نہیں ہوا ہے؟ اسی طرح وہ اصول اور اصول کے نفاذ دونوں کا خیال رکھتے تھے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی انفرادی خصوصیت جو انھیں سارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ممتاز کرتی ہے وہ ان کی حیا اور مروت والی صفت ہے، جس کا لحاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی فرماتے اور ایک موقع پر فرمایا کہ "ان کا لحاظ فرشتے بھی کرتے ہیں۔" یہ صفت اللہ نے ان کے اندر فطری طور پر رکھی تھی، جس بات کو لوگ پسند نہیں کرتے، فطری طور پر ان کی طبیعت ان کاموں اور ان باتوں سے دور رہتی تھی، یہ حیا و مروت ان کی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط تھی، چنانچہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو ان کے فیصلوں اور اقدامات میں ان کا یہ وصف جلوہ گر ہوا، دوسرے مزاج اور طبیعت والوں کو ان سے اختلاف ہوتا لیکن امت کے لیے مفاد کی بات اسی میں تھی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے سامنے آئی اور نظام حکومت میں کارپرداز اور ضرورت کے مطابق اہلیت رکھنے والوں سے کام لینے میں انھوں نے توسع سے کام لیا اور اسے ضرورت کے تقاضہ اور اسلام کی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری سمجھا اور انھوں نے اپنے اقدام اور طرز عمل کے ذریعہ وسیع نظام حکومت کو چلایا اور اسلام کی سربلندی کو قائم رکھا۔

جہاں تک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی انفرادی خصوصیت کا تعلق ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست تربیت و سربراہی نے ان میں خصوصی طور پر دینی رسوخ پیدا کردیا تھا، ان کی سوجھ بوجھ بھی بڑی فائق ہوگئی تھی اور ان کے پیش رو تینوں خلفاء نے ان کے اس وصف سے پورا فائدہ اٹھایا، اور ان کی قدر کی، اور یہ محاورہ ان کی نسبت سے مشہور ہوا کہ "قضية و لا أبا حسن لها" کہ مشکل مسئلہ درپیش ہے

مگر ابوالحسن موجود نہیں ہیں۔

انھیں اپنے عہد میں اندرونی خلفشار اور داخلی فتنوں کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے خلافت کے استحکام، امت کی وحدت کی بقاء کے لیے اور دین کی باتوں کو اپنے مقاصد کے لیے اس کے صحیح مفہوم سے ہٹ کر الگ مفہوم لینے کے خلاف اعلان جنگ کیا اور جس طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اہل ارتداد کے خلاف اعلان جنگ کر کے مجتہدانہ قدم اٹھایا تھا، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے داخلی شورشوں اور فتنوں کے خلاف اور امت کو گمراہی سے بچانے کے لیے امت کے افراد کے خلاف تلوار اٹھائی تا کہ دین اپنی جگہ سے ذرا بھی ہٹنے نہ پائے اور وہ کسی قسم کی تحریف کا کسی دور میں بھی شکار نہ ہو، اور اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں وارد ہوئے ہیں، ان کے مصداق قرار پائے کہ "من كنت مولاه فعلي مولاه" اور "أنت بمنزلة هارون مني." تو جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کو حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں فتنۂ سامری سے بچانے کی کوشش کی، اسی طرح امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو فتنۂ ابن سبا سے بچانے کے لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سینہ سپر ہو گئے۔

اس طرح مسلمانوں کے لیے ان کا یہ دین اسلام قیامت تک کے لیے مکمل کر دیا گیا، اور خلفائے اربعہ کے مذکورہ بالا صفات وطرز ہائے عمل کے ذریعہ واضح اور مثالی بنا دیا گیا، اب قیامت تک جس طرح کے بھی حالات ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور خلفائے راشدین کی زندگی میں ان کے لیے نمونہ مل جائے گا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بات پر بھی اس طرح عمل کی توفیق ملے گی جس میں آپ نے اپنی سنت وسیرت کو پیش نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ خلفائے راشدین کی سیرت کو بھی پیش نظر رکھنے کو فرمایا تھا، حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی

روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین." (تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت اختیار کرنا لازم ہے)۔

اس طرح کتاب وسنت کا دائرہ ہر دور میں برقرار رہے گا، خلفائے راشدین نے اسی دائرہ میں رہ کر تمام انسانی معاملات کا دائرہ پیش کیا۔

ان خلفائے اربعہ کے بعد نصف سال کی مدت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت کی ہوئی، جو خلافت راشدہ ہی کا جزو ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ کے خلف اکبر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبط اکبر تھے، ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انتخاب خلیفہ کے متعینہ طریقہ سے منتخب کیا گیا اور خلافت کے مثالی طرز عمل کے وصف کے ساتھ خلافت راشدہ کا اختتام ان کی خلافت پر ہوا اور پھر خلافت کا وہ عہد شروع ہوا جو بعد میں علی العموم اپنایا جاتا رہا جو توسع اور حسب ضرورت طریقہ کار اختیار کرنے کے طرز کا حامل رہا۔

حضرت حسنؓ کے خلافت کی ذمہ داری سے تنازل کرنے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دست بردار ہو جانے کے سلسلہ کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی جو ان کے اس طرز عمل کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی کہ:

> ''میرا یہ بیٹا سردار ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔''

ان کے اس طرز عمل کے نتیجہ میں خلافت کے سلسلہ میں جو اختلافی صورت پیدا ہو رہی تھی وہ ختم ہوئی اور نظام خلافت میں یکجہتی پیدا ہوئی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، انھوں نے اسلام اور ملت کے مفاد میں جو کام انجام دیئے اس سے اسلامی مملکت کو بڑی تقویت ملی اور دین کے نافذ ہونے میں بڑی سہولت حاصل ہوئی، لیکن جب ان کی وفات کے بعد یزید کو ان کے جانشین کے طور پر پیش کیا گیا تو اس کو

پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا کہ ان کی زندگی ایک دینی پیشوا کی زندگی محسوس نہیں کی جارہی تھی اور ان کا طریقہ انتخاب بھی اس طریقہ سے مختلف تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ اول و دیگر خلفائے راشدین کے انتخاب میں اختیار کیا گیا، چنانچہ کئی کبار صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس نامزدگی کو قبول نہیں کیا اور اپنی اس ناپسندیدگی کو ظاہر کیا، ان میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی تھے جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ماننے والے رہے تھے وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان محبوب شخصیت کے مالک تھے، انھوں نے بھی ناپسندیدگی ظاہر کی اور جب حکومت کی طرف سے دباؤ زیادہ پڑا تو مدینہ منورہ سے عراق منتقل ہوجانے کا فیصلہ کیا، جہاں کے لوگ آپ کو بلا رہے تھے، وہاں جانے پر جب دباؤ طاقت سے ڈالا گیا تو انھوں نے مقابلہ کیا اور کربلا کا واقعہ پیش آیا، جس میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ خاندان نبوت کے ایک درجن سے زائد افراد شہید ہوگئے۔

دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ دونوں کا طرز عمل خلافت نبوت کی روح کی حفاظت کے لیے تھا اور اس میں بھی وہ بہترین نمونہ اہل ایمان کے لیے ہے، جنھیں مختلف ادوار میں ان حالات سے گزرنا پڑسکتا ہے۔

سیاست، اخلاق، معاملات، عقائد و عبادات، تمام چیزوں میں اللہ نے نمونے بنائے، حضرات خلفائے راشدین کو ان تمام شعبۂ حیات میں نمونہ بنایا اور دین جو زندگی کے تمام امور پر محیط ہے، عبادت، اخلاق، معاملات، سیاست میں خلفائے راشدین نے وہ نمونے چھوڑے جن کو سامنے رکھ کر دنیا کی مختلف جگہوں اور مختلف ادوار کے لوگ ان میں سے کسی ایک کے بھی طریقہ کار کو زمان و مکان کے فرق سے نمونہ بنا کر رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں۔

حضرات خلفائے راشدین کے بعد جو نظام حکومت و سیاست اختیار کیا گیا، ہم ان کو اگر نمونہ کا نہ کہیں تو بھی تنقید اس لیے نہیں کر سکتے کہ ہم کو نہیں معلوم کہ اس وقت کے کیا حالات ان کو درپیش تھے، البتہ خلفائے راشدین اور بعض اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خانوادۂ نبوت کے افراد نے لوگوں کی شخصی زندگی کو اسلام کے سانچہ میں ڈھالنے کا کام اپنے اپنے انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن مجید اور حدیث نبوی کی روشنی میں انجام دیا اور تعلیم حکمت و اخلاق کے ساتھ عوام الناس کی زندگیوں میں دین کا رنگ چڑھانے کا کام کیا۔

ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور خلفائے راشدین کے اسوہ و طریقۂ زندگی سے پوری رہنمائی ملتی ہے اور جس کی زندگی جتنی سیرت نبوی اور سیرت خلفائے راشدین سے قریب رہی ہے، اس کے ذریعہ لوگوں میں دین کا رنگ چڑھانے کا کام زیادہ اچھے انداز سے انجام پایا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین اور تابعین کے بعد تبع تابعین اور پھر عہد بہ عہد الگ الگ مقامات پر شخصیتیں سامنے آتی رہیں اور تعلیم دین کے ساتھ تزکیۂ نفس اور تربیت و اخلاق کا کام انجام پاتا رہا۔

اللہ تعالیٰ نے "أدع إلی سبیل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة" کے ذریعہ لوگوں کے اندر دین اتارنے کی ترغیب دی ہے، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیف قلب، حسن اخلاق اور اس راہ میں مشقت، زحمت برداشت کرنے سے کام لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طریقہ کی پیروی علماء و مشائخ نے ہر دور میں کی۔

دعوت دین جو حکمت اور موعظتِ حسنہ یعنی حکمت اور اخلاق و محبت سے دی جائے گی، دین کو اس کیفیت کے ساتھ پیش کرنے کا کام اہل قلوب اور صوفیاء نے انجام دیا اور ان کے ذریعہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کرنا لوگوں کے لیے زیادہ آسان ہوا۔

اور جہاں تک "وجادلھم بالتی ھی أحسن" کا تعلق ہے تو یہ کام علماء نے علمی دلائل اور بحث وجدال کے ذریعہ احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے کیا، اس کی ضرورت خاص طور پر اس وقت زیادہ پڑتی ہے جب شکوک وشبہات اور باطل سے تأثر کے نتیجہ میں انسان کا دماغ زیادہ متأثر ہوتا ہے، اس طرح دل کی اصلاح اور نفوس کی تربیت کا کام اصحاب علم ودانش نے کیا اور کوئی بھی دور ایسی باکمال شخصیتوں سے خالی نہ رہا۔

ضرورت تھی کہ تاریخی طور پر اس موضوع کو اختیار کر کے کام کیا جاتا، خوشی کی بات ہے کہ عزیزی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ نے اپنے بڑوں کے مشورہ سے یہ کام شروع کیا اور اس تاریخ کا جس کو انھوں نے ''تاریخ اصلاح وتربیت'' کا نام دیا ہے، پہلا حصہ جو سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور سیرت خلفائے راشدین سے متعلق ہے جس میں انھوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اسوۂ حسنہ کو بھی لیا ہے اور ان کے بعد سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے طریقۂ کار کا بھی ذکر کیا ہے، دونوں تربیت یافتہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، اور اپنی اپنی حیثیت سے دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور توجہ سے گزرے، اور اس کی برکت سے ان دونوں نے دین کے لیے جو قدم اٹھائے وہ نصرتِ حق اور دین کے معیارِ اعلیٰ کی حفاظت کے مقصد سے تھا۔

خلافت راشدہ کا یہ عہد نظام اسلام کے نفاذ کے مختلف پہلوؤں کی مثال پیش کرتا ہے، کتاب وسنت سے جو رہنمائی عہد رسالت میں ملی تھی، اس کو بجنسہٖ نافذ کرنے کی مثال عہد صدیقی میں اور توسع حاصل ہونے اور حالات میں تنوع پیدا ہونے پر عزیمت کو قائم رکھتے ہوئے ذرائع میں مجتہدانہ توسع اختیار کرنے کا کام عہد فاروقی میں ہوا اور عزیمت کے ساتھ حسب ضرورت رخصت سے فائدہ اٹھانے کا عمل عہد عثمانی میں ہوا اور امت کے وسیع اور مختلف النوع طبقات کے اثر سے اختلاف پیدا ہونے کا مقابلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہوا، اس کے لیے قرآنی نص کی تائید

ان کو حاصل تھی، وہ یہ ہے:

﴿وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ (۱)

(اور اگر اہل ایمان میں دو فریق لڑ پڑیں تو ان دونوں میں میل ملاپ کرادو، پھر اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے لیے جھک جائے، پس اگر وہ جھک جاتا ہے تو پھر دونوں میں برابری سے صلح کرادو اور انصاف سے کام لو، بلا شبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

پھر وحدت کی خاطر اپنے منصب سے تنازل کی مثال حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ سامنے آئی، اور ان کا عمل اس کے بعد والی آیت کا مصداق ہوا، وہ یہ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (۲)

(تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں، تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، تا کہ تم پر رحمت ہو)۔

کتاب کا پہلا حصہ اسی مذکورہ عہد پر مشتمل ہے، کتاب کے دوسرے حصہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ان شخصیتوں کو پیش کیا گیا ہے جو عشرۂ مبشرہ میں ہیں، اور وہ خلافت نبوت کے خاص اعوان اور معتمد ارکان تھے اور ان کے علاوہ اور وہ اصحاب کرام رضی اللہ عنہم جن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیازی معاملہ رہا اور ان

---

(۱) سورۂ حجرات/۱۰۔ (۲) سورۂ حجرات/۱۱

کے سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اونچے کلمات بھی ارشاد فرمائے اور اہم موقعوں پر وہ ساتھ رہے، پھر ان کی صحبت یافتہ وہ ربانی شخصیتیں رہیں جن سے فرد اور سماج کی بڑی اصلاح ہوئی اور ان کے ذریعہ خالص دینی وایمانی تربیت سے امت کے برگزیدہ افراد تیار ہوئے، ان میں بعض وہ شخصیتیں بھی ہیں جو اپنے بلند علمی مقام کی حامل تھیں اور اس کے ساتھ وہ اصلاح وارشاد کے کام میں بھی مرجع بنیں۔

مولوی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ نے تاریخ اسلام کے مختلف ادوار کی شخصیتوں میں مرکزی شخصیتوں کو نمونہ کے طور پر لیا ہے، اور ان کی سیرت کو پیش کرنے کے ساتھ ان کے اصلاح وتربیت کے منہج کو بھی پیش کیا ہے، جن شخصیتوں کا تذکرہ رہ گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ تمام شخصیتوں کا احاطہ کسی ایک کتاب میں نہیں کیا جاسکتا، انھوں نے ایک تسلسل دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا درخت اپنے موسم میں برابر پھل دیتا رہا ہے۔

ان کا یہ کام دراصل ان کے ادارے دارعرفات (رائے بریلی) کا کام ہے، جس سے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وابستہ ہوئے اور ادارے کے ذمہ داروں نے انھیں یہ کام سپرد کیا، انھیں ادارے کے اول سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی توجہ اور دعائیں بھی حاصل رہیں اور اپنے اس کام میں انھوں نے ان کی فکر اور تصنیفات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

میں اس کام کے مبارک ومفید ہونے اور اللہ کے یہاں قبولیت کے لیے دعا گو ہوں کہ وہی توفیق دینے والا اور راہیں کھولنے والا ہے۔

محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سنیچر ۲۶ شعبان المعظم ۱۴۳۴ھ
منزل الحاج غلام محمد بھائی پٹنی صاحب
سہاگ پیلس، مدن پورہ، ممبئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ دوم

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی دامت برکاتہم
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد للّٰہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفی، أما بعد!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت نے انسانیت کو جو تحفے دیے، ان میں انسانوں کے عقائد وافکار، خیالات ورجحانات اور اعمال واخلاق کی اصلاح، خالق کائنات ومالکِ حقیقی کی صحیح معرفت اور اس سے تعلق پیدا کرانا، اللہ کے حقوق کے ساتھ اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی تعلیم وتاکید، تمام انسانوں کے ساتھ بلاتفریق مذہب وملت، رنگ ونسل، زبان وقومیت ہمدردانہ وخیرخواہانہ برتاؤ کرنے کا جذبہ پیدا کرانا اور اس کا مزاج بنانا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں صرف مسلمانوں کے حقوق کا ذکر نہیں ملتا جنہوں نے گھربار چھوڑ کر اور سب سے کٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت ورفاقت کو اختیار کیا اور ایمان قبول کیا، بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ خیرخواہانہ وہمدردانہ معاملہ رکھنے اور بحیثیت انسان ان کے جو حقوق بنتے ہیں ان کا ذکر اور ان کے ساتھ مخلوق کی دوسری قسموں حیوانات، نباتات، بروبحر اور وہ سب اشیاء جو انسانوں کے لیے پیدا کی گئیں، ان کے سلسلہ میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کی تاکید ہے، جیسے پانی کو بلاوجہ خرچ نہ کیا جائے، اس سلسلہ میں بھی اللہ کے یہاں بازپرس ہوگی، زمین پر اترا کر نہ چلا جائے حالانکہ زمین پست

ہے، لیکن اس کے ساتھ حقارت کا معاملہ اللہ کو پسند نہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾.(۱)

(اور لوگوں کے لیے گال نہ پھلاؤ اور نہ زمین میں اکڑ کر چلو، بلا شبہ کسی اکڑنے والے اترانے والے کو اللہ پسند نہیں کرتا)۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً إِنَّكَ لَن تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَن تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولاً﴾.(۲)

(اور زمین میں اکڑ کر مت چلو، نہ تم زمین ہی کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ ہی لمبے ہو کر پہاڑوں تک پہنچ سکتے ہو)۔

اسی طریقہ سے جن جانوروں کے ذبح کرنے کی اجازت دی گئی، انہیں ذبح کرتے وقت چھری تیز کرنے کی ہدایت ملتی ہے تاکہ جانور کو تکلیف نہ ہو، اور ذبح کے بعد اس کو بنانے کے سلسلہ میں بھی ہدایات ہیں، اور ہر وہ مخلوق جو تر و تازہ جگر رکھتی ہے، اس کے ساتھ اچھے برتاؤ میں اجر بتایا گیا ہے، اور ہرے درخت جو زندگی رکھتے ہیں، ان کا خیال رکھنے اور ان کو ان کی غذا پہنچانے کی بھی ہدایات و تعلیمات اسلام میں ملیں گی، اور جو درخت اپنی زندگی کھو دیتے ہیں ان کا استعمال دوسرا ہے اور وہ بھی انسانوں کے نفع کے لیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کے تعلق سے فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعاً﴾.(۳)

(وہی اللہ ہے جس نے تم سب (انسانوں) کے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں (اندر باہر) ہے)۔

سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ اللعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے، اس کی خود قرآن مجید میں صراحت ملتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

(۱) سورۂ لقمان/۱۸۔(۲) سورۂ اسراء/۳۷۔(۳) سورۂ بقرہ/۲۹۔

﴿وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين﴾.(۱)

(اور ہم نے آپ کو سارے جہاں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا)۔

صرف ۲۳ ر سال کی مدت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی پاکیزہ جماعت تیار کردی جس نے نہ صرف مزاج نبوت اور بعثت محمدی کے مقصد کو سمجھا؛ بلکہ اس کی ہدایات وتعلیمات کو نافذ کرنے اور نبوی اسوہ وطرز عمل کی طرف راغب کرنے اور شوق دلانے کا کام انفرادی واجتماعی طور پر اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے انجام دیا، خواہ یہ دائرہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، گھر اور محلہ کا ہو یا شہر وملک اور اس سے آگے بڑھ کر کا حدود خلافت کا، اس ذمہ داری کی ادائیگی میں ذرا بھی پہلو تہی نہیں کی، خود قرآن مجید نے ایسے خلفاء حق کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے اوصاف وخصوصیات بھی بیان کردیے ہیں، اللہ تعالی فرماتا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئاً﴾.(۲)

(تم میں جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے بھلے کام کیے، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالی ان کو ضرور زمین میں حاکم بنائے گا جیسا اس نے ان کے پہلوں کو حاکم بنایا اور ان کے لیے ان کے اس دین کو ضرور طاقت عطا فرمائے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے اور ضرور ان کے خوف کو اطمینان سے بدل دے گا بس وہ میری بندگی کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں)۔

---

(۱) سورۂ انبیاء/۱۰۷۔(۲) سورۂ نور/۵۵۔

اس دور کو خلافت راشدہ وخلافت نبوت کہا گیا اور اس کے حاملین کو خلفائے راشدین کہا گیا جن کے طریقہ کو اختیار کرنے کی تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ملتی ہے۔

حضرت عرباض بن ساریہ کی روایت ہے:

"وعظنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم موعظة بلیغة، وجلت منها القلوب، وذرفت منها العیون، قلنا: یارسول اللّٰہ! کأنها موعظة مودع، فأوصنا، قال: أوصیکم بتقوی اللّٰہ، والسمع والطاعة، وإن تأمّر علیکم عبد حبشي، وإنه من یعش منکم فسیری اختلافاً کثیراً، فعلیکم بسنتي، وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین، عضّوا علیها بالنواجذ، وإیاکم ومحدثات الأمور، فإن کل محدثه بدعة، وکل بدعة ضلالة."(۱)

حضرت عرباض بن ساریہؓ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو ایک موثر نصیحت کی، جس سے دل دہل گئے اور آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، ہم نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو رخصت ہونے والے کی نصیحت معلوم ہوتی ہے، ہم کو وصیت کیجیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے فرمایا: میں تم لوگوں کو اللہ سے ڈرنے کی اور (امیر) کی سمع وطاعت کی وصیت کرتا ہوں، خواہ یہ امیر کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات دیکھیں گے، لہٰذا تم لوگ میری سنت کو اور خلفائے راشدین مہدیین کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لو، اور نئی نئی پیدا کی ہوئی باتوں سے بچو، اس لیے کہ ہر نئی پیدا کی ہوئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

---

(۱) رواہ الترمذی۔

عہد خلافت راشدہ کی جامعیت جو نظر آتی ہے وہ ایک طرف دین کے احکام پر عمل میں اعتدال و وسطیت کی خصوصیت ہے اور دوسری طرف روحانی و باطنی امور میں اخلاص اور سب کے ساتھ خیر خواہی اور اپنے ذاتی مفادات پر ملی و انسانی مفادات کی ترجیح کا امتیاز ہے۔

چونکہ یہ امت امتِ وسط ہے اور ایک رہبر اور مثالی امت ہے، اور جس کے افراد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سخت سے سخت حالات میں رہ کر اور پھر اچھے اور خوش گوار ماحول میں رہ کر تربیت حاصل کی تھی، اور وہ اس کیفیت کے ساتھ ہر موقع سے رہتے تھے کہ:

جہاں کردیا نرم، نرما گئے وہ
جہاں کر دیا گرم، گرما گئے وہ

اور یہ امت امت ہدایت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ اس کی بھی بعثت ہوئی ہے، اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

﴿كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتؤمنون بالله﴾.(۱)

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی ہے تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو)۔

چنانچہ خلفائے راشدین نے اجتماعی اور انفرادی دونوں طور پر اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے پوری کوشش کی، اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئے، اور ہدایت عام ہوتی چلی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت حاصل کرنے والے افراد نے جنہیں

---

(۱) سورۂ آل عمران/۱۰۹۔

صحابہ کا خطاب ملا، اصلاح ودعوت، تعلیم وتبلیغ، ارشاد وہدایت کا کام برابر جاری رکھا، اور ان کے فیض صحبت اور نور باطن سے استفادہ کرنے والی جماعت تابعین کی تیار ہوئی، جنہوں نے دین کا صحیح مزاج ان سے سمجھ کر اور انسانیت کی ہدایت کا درد پا کر دنیا بھر میں اس کو عام کرنے کا جذبہ اور حوصلہ لیا اور وہ دنیا میں اس فکر کو لے کر پھیل گئے، اور اسلام کی آغوش میں دنیا بھر کی قوموں کے افراد جوق در جوق داخل ہونے لگے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا خدمتِ خلق کا واقعہ انسانی حقوق کی ادائیگی کا ایک غیر معمولی اہمیت کا حامل واقعہ ہے اور یہ خدمت خلق کو عبادت کا ہی ایک عمل قرار دیتا ہے جس کے لیے انہوں نے اعتکاف کی قربانی دی، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ نے اس واقعہ کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مسجد نبوی (علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام) میں معتکف تھے، آپؓ کے پاس ایک شخص آیا اور سلام کرکے چُپ چاپ بیٹھ گیا، حضرت ابن عباسؓ نے اس سے فرمایا کہ میں تمہیں غمزدہ اور پریشان حال دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے؟ اس نے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! میں بیشک پریشان ہوں کہ فلاں کا مجھ پر حق ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اس قبر والے کی عزت کی قسم میں اس حق کے ادا کرنے پر قادر نہیں، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اچھا کیا میں تیری اس سے سفارش کروں؟ اس نے عرض کیا جیسا آپ مناسب سمجھیں، حضرت ابن عباس یہ سُن کر جوتا پہن کر مسجد سے باہر تشریف لائے، اس شخص نے عرض کیا کہ آپ اپنا اعتکاف بھول گئے، فرمایا: بھولا نہیں ہوں؛ بلکہ میں نے اس قبر والے

(صلی اللہ علیہ وسلم) سے سُنا ہے اور ابھی زمانہ کچھ زیادہ نہیں گزرا
(یہ لفظ کہتے ہوئے ابن عباسؓ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے)
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ جو شخص اپنے بھائی کے
کسی کام میں چلے پھرے اور کوشش کرے اس کے لیے دس برس
کے اعتکاف سے افضل ہے اور جو شخص ایک دن کا اعتکاف بھی
اللہ کی رضا کے واسطے کرتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ اس سے اور جہنم
کے درمیان تین خندقیں آڑ فرمادیتے ہیں، جن کی مسافت
آسمان وزمین کی درمیانی مسافت سے بھی زیادہ چوڑی ہے۔
(اور جب ایک دن کے اعتکاف کی یہ فضیلت ہے تو دس برس
کے اعتکاف کی کیا کچھ مقدار ہوگی)۔"(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت، تعلیم، اور دعوت وتبلیغ کے کام کی اہمیت صحابہ رضی اللہ عنہم کے دل ودماغ میں ایسی راسخ کردی تھی کہ اس میں کسی سیاسی اور دنیوی مصلحت کو کبھی حائل نہیں ہونے دیا، حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ ہدایات دیں پھر فرمایا: "ألا فليبلغ الشاهد الغائب" (سنو! جو حاضر ہیں وہ غیر حاضر لوگوں کو پہنچادیں)۔

تعلیم دین وفہم دین کے تعلق سے دو الگ باتیں فرمائیں، ایک موقع پر فرمایا:

"خيركم من تعلم القرآن وعلمه."

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے پھر دوسروں سکھائے)۔

اور فرمایا: "من يرد الله به خيراً يفقهه في الدين."
(اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اسے دین
کی سمجھ عطا فرمادیتے ہیں)۔

---

(۱) بحوالہ رسالہ فضائل رمضان، اعتکاف کا باب۔

ہدایت کے تعلق سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس وقت عجیب بات فرمائی جب وہ ایک مقابلہ پر تھے، کہا:

"لأن يهدي الله بك امرأ خير لك من حمر النعم."

(اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کسی ایک انسان بھی کو ہدایت دیدیں تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے)۔

سپہ سالار افواج ایران وفارس رستم کے پاس حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ نے جب حضرت ربعی بن عامر کو اپنا قاصد بنا کر بھیجا تو انہوں نے ہدایت کا پیغام سب سے پہلے دیا اور کہا:

"الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلى عبادة الله وحده ومن ضيق الدنيا إلى سعتها ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام."

(اللہ نے ہمیں اس لیے برپا کیا ہے کہ ہم لوگوں کو بندوں کی عبادت سے نکال کر خدائے واحد کی عبادت کی طرف، دنیا کی تنگی سے نکال کر اس کی کشادگی کی طرف اور مذاہب کے ظلم وجور سے نکال کر اسلام کے عدل وانصاف کی طرف لائیں)۔

صحابہ کرامؓ کسی اقدام سے پہلے اس بات کو پیش نظر رکھتے تھے کہ ان کا یہ اقدام اور عمل اللہ کو خوش کرنے والا ہے یا ناراضگی کا باعث ہوگا تا کہ ان کا کوئی بھی قدم اپنے نفس اور مفاد کے لیے نہ ہو، حضرت علیؓ کا عمل غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جب ایک مقابلہ میں دشمن نے ان کے اوپر تھوک دیا تو وہ پیچھے ہٹ گئے کہ ایسی صورت میں اٹھایا جانے والا قدم نفس کے لیے ہوگا، اسی طرح جب حضرت عمر بن خطاب نے حضرت خالد بن الولید کو معزول کیا تو وہ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کی ماتحتی میں اسلام کے دفاع اور نصرت دین میں دینی جذبہ اور عزم راسخ کے ساتھ حصہ لیتے رہے،

اور بہکانے والوں کو جواب دیا کہ میرا مقصد نصرت دین اور خدا کی رضا کا حصول ہے نہ کہ حضرت عمرؓ کی خوشنودی، اور حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا کہ ان کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اختلاف سے روم کا بادشاہ قیصر فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، تو حضرت امیر معاویہ نے قیصر روم کو ایک خط بھیجوایا اور اس میں لکھا کہ:

"مجھے اس بات کا علم ہوا ہے تم سرحد پر لشکر کشی کرنا چاہتے ہو،
یادرکھو! اگر تم نے ایسا کیا، تو میں اپنے ساتھی (حضرت علیؓ) سے
صلح کرلوں گا اور ان کا جو لشکر تم سے لڑنے کے لیے روانہ ہوگا،
اس کے ہراول دستہ میں شامل ہوکر قسطنطنیہ کو جلا ہوا کوئلہ بنا کر
رکھ دوں گا۔" (۱)

جب یہ خط قیصر روم کے پاس پہنچا تو وہ اپنے ارادہ سے باز آ گیا اور لشکر کشی سے رک گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ کفر کے مقابلہ میں اب بھی ایک جسم و جان کی طرح ہیں اور ان کا اختلاف سیاسی لیڈروں کا اختلاف نہیں ہے۔

اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد منصب خلافت قبول کر لینے کے کچھ دن کے بعد خلافت سے صرف اس لیے دستبرداری اختیار کرلی کہ ایک متحدہ نظام قائم ہو جائے اور امت مجتمع ہو جائے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو بات قیصر روم کو کہلائی تھی کہ حضرت علی کے لشکر کے ایک سپاہی کے طور پر سامنے آئیں گے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت امیر معاویہؓ کی امارت کو تسلیم کر کے عملی طور پر خود اسے کر کے دکھایا۔

صحابہ کی یہ خصوصیت تھی کہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنے والے اور آپس میں ایک دوسرے سے بڑی محبت و تعلق رکھنے والے تھے، قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے اوصاف کو سورۂ فتح کی آخری

---

(۱) حضرت امیر معاویہ اور تاریخی حقائق، از: مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، دار الکتاب دیوبند، ۲۰۰۲ء۔

آیت میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِيْ وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِيْ الْإِنجِيْلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً﴾.(۱)

(محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت ہیں، آپس میں رحمدل ہیں، تو انہیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدہ کر رہے ہیں، اللہ تعالی کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں ہیں، ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے، ان کی یہی مثال توریت میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے، مثل اس کھیتی کے جس نے اپنا انکھوا نکالا، پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہوگیا، پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا جو کسانوں کو خوش کرنے لگا تا کہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑائے، ان ایمان والوں اور نیک اعمال والوں سے اللہ تعالی نے بخشش کا اور بہت بڑے اجر کا وعدہ کیا ہے)۔

اسلام کو جب غلبہ حاصل ہوا اور جہاں سے اہل اسلام نے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لیے حبشہ اور مدینہ منورہ ہجرت کی تھی وہاں فتح کا علم بلند کیا، اس موقع پر ہمیشہ دشمنی پر کمربستہ رہنے والوں کو یہ یقین تھا کہ اہل اسلام کے لیے انتقام

---

(۱) سورۂ فتح /۲۹۔

لینے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوگا، اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح بڑے سے بڑے دشمن اور مخالفین کو معاف کیا اس کی نظیر انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے، اس کا کھلا اثر یہ پڑا کہ ایمان ان لوگوں کے دل میں گھر کر گیا جنہوں نے سب کچھ سوچا تھا مگر یہ نہیں سوچا تھا۔ اور پھر تو وفود کے وفود اسلام قبول کرنے لگے اور پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کی دعوت اس تیزی سے پھیلتی چلی گئی جس کا تصور محال نظر آتا تھا، فتح مکہ کے موقع پر مسلمان دس ہزار کی تعداد میں سامنے تھے، اور صرف دو سال کے عرصہ میں جب حجۃ الوداع کے موقع پر میدان عرفات میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بڑے مجمع کو آخری خطاب کیا تو یہ تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی۔

اجتماعی موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی وبخشش کا موقع فتح مکہ میں ظاہر ہوا البتہ انفرادی موقع پر یہ صفت پہلے ہی ظاہر ہو چکی تھی، جیسے کہ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک درخت کے نیچے آرام فرمارہے تھے، نیند آگئی اور ایک دشمن پہنچ گیا اور آپ کی تلوار لے کر کہنے لگا: "من يمنعك مني" کون مجھ سے آپ کو بچا سکے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا تھا کہ: اللہ، بس تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی اور اس کے اوسان خطا ہو گئے، اس موقع پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کوئی انتقام کی بات نہ کی اور نہ کہی، البتہ کچھ نصیحت فرمائی۔

اسی طرح جب معاذ بن جبلؓ اور ابوموسی اشعریؓ کو آپ نے اسلام کی دعوت دینے کے لیے یمن روانہ کیا تو ان کو ہدایت کی کہ: "يسّرا ولا تعسّرا، بشّرا ولا تنفّرا۔" (دیکھو آسانی پیدا کرنا، تنگی اور سختی نہ کرنا، خوشخبری دینا، متنفر اور بیزار نہ کرنا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے خلفاء واصحاب نے اس طرز عمل سے پہلوتہی نہ کی، اس لئے ان کی طرف سے بھی برابر اس کے نمونے دیکھنے کو ملتے رہے، اور بعد کے حکمرانوں اور فاتحین نے بھی اس کے نمونے پیش کیے، خلیفہ ثانی

حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے عدل وانصاف کا غلغلہ بلند کیا، آپ کی زاہدانہ اور متقشفانہ زندگی کے باوجود دشمن آپ کے رعب وجلال سے کانپتے تھے، بیت المقدس میں داخلہ کا واقعہ عدل فاروقی کا اعلیٰ نمونہ ہے، آپ فاتح کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک خاکسار اور عاجز بندہ کی طرح داخل ہوئے، جب بیت المقدس کا رخ کیا، تو نہ ساز وسامان، نہ نقارہ ونوبت اور لاؤ لشکر، حتیٰ کہ معمولی ڈیرہ اور خیمہ تک نہ تھا، سواری میں ایک گھوڑا تھا اور چند مہاجر اور انصار ساتھ تھے، گھوڑا جو سواری میں تھا، اس کے سم گھس کر بیکار ہو گئے تھے اور رک رک کر قدم رکھتا تھا، حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر اتر پڑے اور پیادہ پا چلے، بیت المقدس قریب آیا تو حضرت ابوعبیدہؓ اور سرداران فوج استقبال کو آئے، حضرت عمرؓ کا لباس اور ساز وسامان جس معمولی حیثیت کا تھا اس کو دیکھ کر مسلمانوں کو شرم آتی تھی کہ عیسائی اپنے دل میں کیا کہیں گے؟ چنانچہ لوگوں نے ترکی گھوڑا اور قیمتی عمدہ پوشاک حاضر کی، حضرت عمر نے کہا اور آپ کا یہ تاریخی جملہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ:

”اللہ نے ہم کو جو عزت دی ہے وہ اسلام کی عزت ہے اور ہمارے لیے یہی بس ہے۔“

اسی طرح جب ایک عیسائی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کہ حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے اس کی پٹائی کی ہے تو آپ نے حضرت عمرو بن العاص کو طلب کیا اور تنبیہ کی اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”تم نے ان کو کب سے غلام بنالیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا ہے۔“

حضرت عمر بن عبد العزیز کا سمرقند سے فوج کو واپس بلالینا تاریخ اسلام کا وہ عبرت انگیز واقعہ ہے جسے کوئی بھی انصاف پسند مؤرخ نظر انداز نہیں کرسکتا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنی کتاب ”کاروان زندگی“

میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے دور میں ایک گورنر نے شکایت کی کہ مفتوحہ ممالک میں لوگ اتنی کثرت سے اسلام میں داخل ہورہے کہ مملکت کے خزانہ اور مالیہ پر اثر پڑ رہا ہے کیونکہ شرعا اور قانونا ان سے جزیہ نہیں لیا جاسکتا جو حکومت کی آمدنی و مالیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو لکھا:

"ویحك، إن محمداً صلى الله عليه وسلم بعث هادياً ولم يبعث جابياً."

(اللہ کے بندے! محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ "ہادی" بنا کر مبعث کیے گئے "تحصیلدار" بنا کر (تحصیل اور ٹیکس اور آمدنی بڑھانے کے لیے) مبعوث نہیں ہوئے تھے، میں اس پر راضی ہوں کہ سب لوگ مسلمان ہوجائیں اور خزانہ خالی ہوجائے اور لوگوں کی معیشت کے دوسرے اسباب اختیار کرنے پڑیں)۔(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس اہم واقعہ کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ مراکش کے اولوالعزم بانی امیر المؤمنین یوسف بن تاشقین (۴۰۰ھ-۵۰۰ھ) جن کے فضائل ومحامد اخلاق، پاکیزہ زاہدانہ زندگی، عزم راسخ اور ایمان صادق کے واقعات سے تاریخ وسیر کی کتابیں لبریز ہیں، ان کا بڑا کارنامہ "زلاقہ" کی وہ جنگ ہے جو ۱۲ر رجب ۴۷۹ھ کو ہوئی، یہ جنگ "اشبیلیہ" و"قرطبہ" کے نامور ادیب وشاعر ومجاہد سلطان المعتمد ابن عباد کی تحریک ودعوت پر ہوئی، جب طلیطلہ کی عیسائی حکومت نے اس مسلمان حکومت کا خاتمہ کردینا چاہا جو اسپین میں اسلام کی عظمت کا آخری نشان اور اسلامی عربی تہذیب کا آخری قلعہ تھا اور معتمد نے جس کی شجاعت اور جانبازی مخالف اور موافق سب کو تسلیم تھی، جب یہ اندازہ لگالیا کہ وہ اس طاقور حریف سے عہدہ برآ نہیں ہوسکے گا تو اس نے یوسف بن تاشقین سے مدد طلب کی، مصلحت

---

(۱) کاروان زندگی، حصہ اول۔

اندیش ارکان سلطنت اور مشیران دربار نے سلطان کو عواقب سے ڈرایا اور کہا کہ کوئی مدد کرنے والا بادشاہ مدد کرنے اور دشمن کو شکست دینے کے بعد واپس نہیں جایا کرتا ہے، یوسف کو بلانا سلطنت سے ہاتھ دھونا ہے، معتمد نے اس کا جو جواب دیا وہ اس کی غیرت دینی کی علامت اور تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، اس نے کہا کہ:

”ہمارے بچوں کو مراکشی عربوں کا اونٹ چرانا بہرحال عیسائیوں کے سور چرانے سے بہتر ہے، یعنی اگر اس فتح کے نتیجہ میں ہم اپنے ہم مذہب عربوں کے غلام بن جائیں تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ ہم عیسائیوں کے خیمہ بردار باج گزار رہوں۔“

چنانچہ یوسف بن تاشقین نے زلاقہ کے میدان میں عیسائیوں کو شکست دی اور علاقہ فتح کرلیا، یوسف بن تاشقین کا یہ کارنامہ تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا اور وہ ان کو دنیا کے عظیم مجاہدین اور فاتحین میں شامل کرنے کے لیے کافی ہے۔(۱)

ایک اور واقعہ فاتح بیت المقدس سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہے جو ایک درویش صفت سلطان و فاتح تھے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

”فتح بیت المقدس کے موقع پر سلطان صلاح الدین ایوبی نے جس عالی ظرفی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ عیسائی مؤرخ اسٹینلے لین پول (Stanley Lane-Poole) کی زبان سے سننے کے قابل ہے، لین پول لکھتا ہے:

”صلاح الدین نے کبھی اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا، جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جارہا تھا، اس کی سپاہ اور معزز افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام

(۱) دو ہفتے مراکش میں، از مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی، ص: ۹۲-۹۳۔

قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم وزیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہونچا ہو، پیش نہ آیا، شہر سے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت معتبر امیر باب داؤد پر متعین تھا، کہ ہر شہری کو جو زرفدیہ ادا کر چکا ہو باہر جانے دے۔"

لین پول آگے لکھتا ہے:

"اب صلاح الدین نے اپنے امیروں سے کہا کہ میرے بھائی نے اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرتا ہوں، اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کردیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زرفدیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کئے جاتے ہیں، کہ جہاں چاہیں وہ جائیں، اور یہ سب باب البعزر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیرو خیرات تھی جو صلاح الدین نے بیشمار مفلسوں اور غریبوں کے ساتھ کی۔"(۱)

اسی طرح غیر معمولی اہمیت کا حامل نصرت دینی کا واقعہ سلطان عادل سلطان مظفر حلیم شاہ گجراتی (م-۹۳۲ھ) کا ہے جب ان سے ان کی ایک معاصر حریف ریاست کے سلطان محمود شاہ خلجی نے ۹۲۴ھ میں مدد طلب کی، حالانکہ انہیں سلطان مظفر حلیم گجراتی سے رقابت رہی تھی اور ان کے اجداد کو ان کے اجداد سے عداوت تھی لیکن ان باتوں کو پس پشت ڈال کر سلطان مظفر حلیم گجراتی نے سلطان محمود کی اس وقت مدد کی، جب ریاست مالوہ پر مدنی رائے نے غلبہ پالیا تھا اور ریاست مالوہ کو سلطان کی

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ اول، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ۔

فوجوں نے محمود خلجی کے لیے واپس لے لیا، تو فتح وکامرانی کے بعد محمود شاہ خلجی نے سلطان مظفر حلیم گجراتی سے عرض کیا کہ آپ کی ہمت وحوصلہ سے یہ فتح وکامرانی حاصل ہوئی ہے، اس لیے آپ ہی اس مملکت کے زیادہ حقدار ہیں، اور جو آپ کا ہے وہ میرا ہے آپ قبول فرمائیں اور قیام فرمائیں، سلطان مظفر حلیم شاہ گجراتی نے یہ کہہ کر ان دونوں باتوں سے معذرت کی کہ ایک تو میرا اقدام اللہ کی خوشنودی کے لیے تھا، اور پھر آپ کی نصرت واعانت کے لیے آپ کی نصرت واعانت ہوگئی، اللہ آپ کو مبارک کرے اور آپ کی مدد فرمائے۔(۱)

اسی طرح دوسرا حیرت انگیز واقعہ امیر المؤمنین حضرت سید احمد بن عرفان شہیدؒ (۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ) کا ہے جب انہوں نے سلطان محمد خان سے پشاور کو فتح کیا، تو جب سلطان محمد خاں نے آپ سے یہ وعدہ کیا کہ ہم کو ہماری حکومت مل جائے گی تو دین وشریعت کو نافذ کریں گے، تو حضرت سید احمد شہید نے لوگوں کو باور کرایا کہ یہ وعدہ کرر ہے ہیں کہ ہم بغاوت نہیں کریں گے اور شریعت نافذ کریں گے تو ہم نیت میں کیوں شبہ کریں اور ہمیں تو ظاہر کا مکلف کیا گیا ہے اور پشاور کو سلطان محمد خاں کے حوالہ کردیا۔ اور اسی طرح والی چترال کو صراحتاً تحریر فرمایا کہ ہمیں مال ودولت سے سروکار نہیں اور نہ ہم حکومت کے طالب ہیں، جو بھی ہمارے بھائی مسلم علاقوں کو کفار کے قبضہ سے آزاد کرائیں، اور احکام الٰہی کو نافذ کریں اور دین وشریعت کو ترویج دیں اور اپنے نظام حکومت میں قوانین شریعت کا التزام کریں تو یہی ہماری جدوجہد کا مقصد وہدف ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب کے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ اور دین وشریعت کا نفاذ تھا چاہے وہ جس کے ذریعہ ہو اور ان کے پیش نظر اللہ کی خوشنودی کا حصول رہتا تھا، اور جن فاتحین اور مجاہدین کی مثالیں پیش کی گئیں ان کے پیش نظر بھی یہی چیز تھی اور یہ حضرات خلفاء راشدین اور سب سے بڑھ کر حضور اقدس خاتم النبیین صلی اللہ علیہ کے اسوہ وطریقہ کا

---

(۱) نزھۃ الخواطر، جلد چہارم، از: علامہ سید عبدالحی حسنیؒ۔

اتباع اوراس کا اثر تھا۔(۱)

مذکورہ بالا سطور میں اسلام کی روشن تاریخ کی چند جھلکیاں پیش کی گئی ہیں ورنہ اسلامی تاریخ ایسے مثالی نمونوں اور تابندہ نقوش سے لبریز ہے، ہر دور میں مسلم فاتحین اور حکمرانوں نے عدل وانصاف کی اعلی مثالیں قائم کی ہیں، اور یہی اسلامی تعلیمات کا اصل اور حقیقی معیار ہیں۔

انسان کی اصلاح وتربیت ہمیشہ انبیاء اور رسولوں کے پیش نظر رہی اور دعوت توحید وایمان کے ساتھ انہوں نے زمانہ کا جو بڑا مرض اور اخلاقی خرابی رہی ہے، اس کو بھی انہوں نے موضوع بنایا، خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی ایک عہد اور قوم کے ساتھ محدود نہیں تھی، ساری انسانیت کے لیے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے تھی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا دائرہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے اور عہد بہ عہد اس سلسلہ کو آگے بڑھانے کا کام علماء ربانیین، مصلحین امت اور فاتحین ومجاہدین اور دیگر خادمین دین وملت نے انجام دیا اور اصلاح وتربیت کا عمل بلا انقطاع جاری ہے، ضرورت تھی کہ اسلامی تاریخ کا یہ حصہ اسی تسلسل کے ساتھ سامنے آتا جو اسلام کی سیاسی تاریخ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا، عزیزی سید محمود حسن ندوی نے جو برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے نواسہ ہیں، اس موضوع کو اختیار کیا۔ الحمد للہ اسلام کی اصلاحی وتربیتی تاریخ کا یہ پہلا حصہ ہدیہ ناظرین کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں، کفی به شرفاً، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ ان کی کوشش کو قبولیت حاصل ہو اور اس کا نفع عام ہو (آمین)۔

محمد واضح رشید حسنی ندوی

ندوۃ العلماء لکھنو | ٦/ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ

(۱) ملاحظہ ہو: سیرت سید احمد شہید، از: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ومولانا غلام رسول مہر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

(داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ)

الحمد للّٰه رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين و خاتم النبيين محمد بن عبد اللّٰه الأمين و على آله و صحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان و دعا بدعوتهم إلى يوم الدين، أمابعد!

تصوف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جن حضرات کو اس کے صحیح حاملین اور اس راہ کے معتبر اور صحیح رہنماؤں کی صحبت وزیارت کی توفیق نہیں ہوسکی، ان کے سامنے تصوف کی اصطلاح ایک معمہ اور چیستاں بن کر رہ گئی اور اس کے پس پردہ ایک ایسا خرافاتی نظام نظر آنے لگا جو روح شریعت سے متصادم اور کتاب و سنت کا متوازی نظام تھا جو ظاہر ہے کوئی توحید کا متوالا اور سنت کا شیدائی، غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی رکھنے والا انسان برداشت نہیں کرسکتا اور نہ کرنا چاہیے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:

> ’’اس صورت حال سے ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ اس اصطلاح ’’تصوف‘‘ نے دین کی کتنی عظیم، کتنی روشن اور کتنی اہم حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے اور بہت سے لوگوں کی راہ میں اس حقیقت کے حصول میں مانع بن گیا ہے۔‘‘

اس کے آگے مزید وضاحت کرتے ہوئے اس چیز کا ذکر فرماتے ہیں جس

نے خاص طور سے اس دینی حقیقت کو اور زیادہ غبار آلود کر دیا ہے:

''بہر حال واقعات ہمیشہ انسان کی خواہش کے تابع نہیں ہوتے، اب ہم کو فراخ دلی کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے اور قیود و اصطلاحات اور خواہشات و تعصبات سے آزاد ہو کر سوچنا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ ہم ایک دینی حقیقت سے محض ایک نئی اصطلاح اور ایک مروّج نام کی وجہ سے گریز اختیار کرنے لگیں۔''

حضرت علیہ الرحمہ نے تصوف و سلوک کو ایک الہامی نظام قرار دیا ہے اور مثالیں دے کر اس کی خوب وضاحت فرمائی ہے، اذان کی خواب میں تلقین، لیلۃ القدر کا طاق راتوں میں دیکھنا، تراویح کا اجتماعی نظام، قرآن مجید کا مصاحف میں جمع کرنا، قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کی جمع و تدوین کا کام، مجتہدین کا استنباط علم نحو و قرأت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر و اشاعت وغیرہ ان مثالوں کو قدرے تفصیل کے ساتھ تحریر فرمانے کے بعد رقمطراز ہیں:

''تزکیۂ نفس و تہذیب اخلاق کا وسیع و محکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم و فن کی شکل اختیار کر لی نفس اور شیطان کے مکائد کی نشاندہی، نفسانی و اخلاقی برائیوں کا علاج، تعلق مع اللہ اور نسبت باطنی کے ذرائع و طرق کی تشریح و تربیت جس کی اصل حقیقت تزکیہ و احسان کے ماثور و شرعی الفاظ میں پہلے سے موجود تھے اور جس کا عرفی و اصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں ''تصوف'' پڑ گیا، اس اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے۔''

اس تربیت گاہ سے جو حضرات تیار ہو کر میدان میں آئے اور تاریخ میں قائدانہ کردار ادا کیا، ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

"اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کرے گا جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔"(۱)

ایک جگہ اس شعبہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"دین کے اس شعبہ اور اسلام کے اس رکن کا جس کو ہم تزکیہ یا احسان یا فقہ باطن کہتے ہیں، صاف اقرار کرتے اور اس بات کو بلا تأمل قبول کرتے کہ وہ شریعت کی روح، دین کا لب لباب اور زندگی کی بنیادی ضرورت ہے، اور یہ کہ جب تک اس شعبہ کی طرف کماحقہٗ توجہ نہ کی جائے اس وقت تک کمال دین حاصل نہیں ہوسکتا اور اجتماعی زندگی کی بھی اصلاح نہیں ہوسکتی، اور نہ صحیح معنی میں زندگی کا لطف آسکتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں اس کو بیان کیا گیا ہے اور جو اوصاف تعلیم کتاب وحکمت وغیرہ کے بیان کیے گئے ہیں، ان اوصاف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخصوص صفت "تزکیہ" ہے۔"

تزکیہ کا مطلب کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کس طرح عمل کیا اور کیا اثرات مرتب ہوئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

"تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھا دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کی تلاوت و

(۱) تزکیہ واحسان ص ۲۹-۳۰ میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

تعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں، اس کتاب وتعلیم کو ان کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کر دیتے ہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سب سے کامیاب ہادی ومرشد تھے، صحابہؓ کی حیرت انگیز روحانی، اخلاقی، ذہنی، علمی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشہ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔"

آگے تحریر فرماتے ہیں:

"تزکیہ کرنے والے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں۔

انبیاء کی بعثت کا مقصد پورا کرنے کے لیے اور ان کی برکات پہنچانے کے لیے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب و حکمت کی تعلیم، یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ تعلیم ہے وہ تربیت، اور تکمیل انسانیت کے لیے دونوں کی ضرورت ہے۔

تزکیہ کی کمی اعلیٰ تعلیم کے باوجود اسی طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے ؏

زباں گو صاف ہو جاتی ہے، دل طاہر نہیں ہوتا

روز بروز یہ حقیقت واضح ہوتی جاتی ہے کہ دین جس چیز کا نام ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ دینی تعلیم سے بھی نہیں پیدا ہوتی ؏

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح میں اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا۔"(۱)

اس مرتبۂ احسان کی اہمیت وعظمت کو بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"مرتبۂ احسان جو نقد جان بلکہ دولت کونین دے کر بھی مل جائے تو ارزاں ہے ؎

متاع وصل جاناں بس گراں است

گر ایں سودہ بجاں بودے چہ بودے

احسان سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے جس کے لیے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہیے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہیے۔"(۲)

احسان دین کا وہ شعبہ ہے جس کا تعلق قال سے کم حال سے زیادہ ہے، یہ شنیدن سے زیادہ چشیدن ہے، یہاں کام قلب بریاں اور چشم گریاں کا ہے نہ کہ عقل حیراں اور فکر پریشاں کا، یہ مشاہداتی اطمینان وسکون ہے نہ کہ اخباری معلومات اور نظری تخیلات، یہ سراپا عشق ہے جس سے اخلاص کے سوتے جاری ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اس کو یوں بیان کیا ہے ؎

سرّ دیں مارا خبر اور نظر　　او درون خانہ ما بیرون در

ما کلیسا دوست ما مسجد فروش　　او ز دست مصطفیٰ پیمانہ نوش

اس فن کے ماہرین نے اس مقام پر فائز ہونے کے لیے چند امور کی بہت

---

(۱) سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۲۶۸، طبع ثانی۔ (۲) تزکیہ واحسان ص ۱۷۔

تاکید کی ہے، جن میں سے تین بہت اہم اور بنیادی سمجھے گئے:

۱- صحبت، محبت کے ساتھ۔

۲- کثرت ذکر۔

۳- خودرائی سے مکمل پرہیز۔

صحبت، محبت کے ساتھ

یک ساعت صحبتے با اولیاء
بہتر از طاعت صد سالہ بے ریا

فارسی کا یہ مشہور شعر ہے، اہل دین ربانی علماء اور اولیاء کی صحبت سے مستفید ہونے کی ترغیب کے لیے بہت پیش کیا جاتا ہے کہ ایک ساعت بزرگوں کی خدمت میں بیٹھنا، سو سال کی مقبول عبادت سے بہتر ہے۔

یہ وہی صحبت ہے کہ ایک ساعت میں قلب ماہیت ہو جائے، اہل اللہ کی صحبت میں یہ تاثیر ہے، قلب کے اندر کرنٹ دوڑا اور روح پیدا ہو گئی، انسان کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے، علامہ اقبال علیہ الرحمہ کا شعر ہے ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جب غلامانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا یہ حال ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا کیا حال رہا ہوگا، اس کی تاثیر سے صحابہ کے واقعات کتابوں میں بھرے پڑے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آداب کے ساتھ، محبت کے ساتھ، عظمت کے ساتھ اور اس سے بڑھ کر ہم مذاقی اور ہم مزاجی کے ساتھ رہے، چھوٹوں اور بڑوں کے مزاج میں فرق ہوتا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پہلے ہی سے ہم مزاجی، ہم مذاقی حاصل تھی، انھوں نے فوراً تصدیق کی اور ایمان لائے اور پھر برابر ساتھ رہے اور ساتھ دیا، اور کبھی بھی انھیں ذرا بھی شک وشبہ نہ ہوا، اس لیے ان کو جو مقام حاصل ہو گیا وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکا، اس لیے تنہا صحبت بھی کافی نہیں ہے، حضرت ابوبکر

صدیق رضی اللہ عنہ کا اس میں نمونہ سب سے بہتر اور سب سے کامل نمونہ ہے۔

حدیث میں اچھی صحبت کی مثال عطر بیچنے والے سے دی گئی ہے کہ اگر اس کے پاس بیٹھو گے تو خوشبو سے فائدہ اٹھاؤ گے، عطر بیز ہو جاؤ گے اور اگر بھٹی دھونکنے والے کے پاس بیٹھو گے تو اس کا دھواں اور اس کی کالک ہی ملے گی، کالک سے اگر اپنے کو بچا بھی لیا تو دھواں تو ضرور لگے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ صحبت میں رہو تو مومن کی ہی رہو۔ حدیث کے الفاظ ہیں: "لا تصاحب إلا مؤمنا."

مومن کے ساتھ ایمان ہوتا ہے، اس کے انوار کا دوسروں پر عکس پڑتا ہے، یہ صحبت ہی کی برکت ہے کہ ہمارا پورا نظام اجتماعیت کے ساتھ مربوط کر دیا گیا ہے کیونکہ اجتماع میں ہر شخص کو دوسرے سے فائدہ پہنچتا ہے، اس اجتماعیت کی ایک شکل نماز باجماعت ہے، سب نماز پڑھنے والے ہیں اور بعض اللہ والے اور اونچے درجے اور مقام والے ہیں، ایک کا فائدہ دوسرے کو پہنچتا ہے، سب ساتھ نماز پڑھتے ہیں، جس سے صحبت کا فائدہ ہوتا ہے، خود نیک صحبت بڑا نیک عمل ہے، اس نیک عمل کی الگ برکات ہیں، اسی طرح حج میں ہے، ایک ساتھ رہنے کا فائدہ جو بڑا معاشرتی فائدہ ہے وہ مزید اس میں حاصل ہوتا ہے اور روزہ ہے جس کا بڑا فائدہ زمانی فائدہ ہے، ایک زمانہ میں ایک ہی وقت میں سارے لوگ ایک ہی نیک عمل کر رہے ہیں اور روزے سے ہیں، اس طرح ایک دوسرے کی خوبیوں کا فائدہ دوسرے کو پہنچتا ہے اور اپنے محاسبہ کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے، اور مزید یہ کہ نیک اعمال کا حوصلہ بھی ملتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ دل کا فائدہ ہے، اچھوں کی صحبت سے دل سے دنیا کی محبت نکلتی ہے اور حدیث میں دنیا کی محبت کو رأس کل خطیئہ کہا گیا ہے: "حب الدنیا رأس کل خطیئة."

دراصل صحبت کا کوئی بدل نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو مقام و مرتبہ ملا اور

جوعزت و بلندی حاصل ہوئی وہ صحبت کی وجہ سے ہے، اسی طرح تابعین کو اور پھر تبع تابعین کو جو مقام وعزت اور رتبہ ملا وہ بھی صحبت کی وجہ سے ہی ملا، اور جن لوگوں کو عظیم لوگوں کی صحبت ملتی ہے ان کی قسمت اسی طرح بلند ہو جاتی ہے، جس طرح بغیر صحبت (ازدواجی) کے نسب قائم نہیں ہوتا، ویسے ہی بغیر صحبت (ایمانی وروحانی) کے نسبت حاصل نہیں ہوتی، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اپنی طرف سے عطا فرمادیں، یہ شاذ و نادر بات ہے، اس پر سب کو قیاس نہیں کیا جاسکتا، اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے تو صحابہ بن گئے اور جو صحابہ کی صحبت میں رہے وہ تابعین بن گئے، جو تابعین کی صحبت میں رہے وہ تبع تابعین ہو گئے اور یہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم" تو اس سے صحبت کی کھلی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے جیسے حضرت آدم علیہ السلام سے سلسلہ نسب چل رہا ہے، یہ سلسلہ علم و دین بھی چل رہا ہے۔

کثرتِ ذکر

ذکر کی اہمیت و فضیلت سے قرآنی آیات اور نبوی تعلیمات معمور ہیں، تصوف میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے جس کے بغیر انسان سیدھا کھڑا نہیں ہوسکتا، متقدمین اور متاخرین سب اس پر متفق ہیں، ان حضرات نے ذکر الٰہی کے مختلف طرق اختیار کیے ہیں تاکہ بہ آسانی قلیل سے قلیل مدت میں اس کے نتائج و اثرات ذاکر پر مرتب ہوسکیں، ذکر کی کثرت ہی سے یقین و اطمینان حضوری اور دھیان، اخلاص و استحضار، جذب و کیف انوار و برکات حاصل ہوتے ہیں، بلکہ اس کو زندگی کی روح اور ماحصل قرار دیا گیا ہے۔

اللہ اللہ ہے تو یارو جان ہے
ورنہ یارو جان بھی بے جان ہے

ذکر کس کو کہتے ہیں؟ ذکر کا مقام کیا ہے؟ قرآن وحدیث سے واضح ہے، ذکر سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (۱) (اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے)، ایک تو ذکر کو بڑی چیز کہا گیا کہ بڑی چیز اللہ کا ذکر ہی ہے اور دوسرے اللہ کی رضا کو بڑی چیز کہا، ذکر کرنے کی چیز ہے، رضا حاصل ہونے کی چیز ہے، اللہ کی رضا سب سے بڑی دولت ہے: ﴿وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ﴾ (۲) (اور اللہ کی خوشنودی بہت بڑی چیز ہے)، بڑی چیز، بڑی دولت بڑے عمل سے ہی حاصل ہوگی۔

ذکر کے ایک معنی یاد کرنے کے ہیں، اس کی مختلف شکلیں ہیں: لسانی یعنی زبان سے اللہ کو یاد کرنا، قلبی یعنی دل سے اللہ کو یاد کرنا، تیسرا مرحلہ چرچا کرنے کا ہے کہ خود بھی ذکر کریں اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیں، اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ ہر مفید چیز کو آسان کر دیتا ہے، ذکر کو بھی آسان کر دیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''سب سے افضل ذکر ''لا الہ الا اللہ'' ہے۔'' (۳)

صرف زبان سے ذکر کافی نہیں بلکہ اس کی معرفت بھی ملنی چاہیے، ایک صحابی نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، راستے تو بہت ہیں، کوئی ایسی چیز بتایئے جس کو مضبوطی سے میں تھام لوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بس تمہاری زبان ذکر الٰہی سے تر رہے۔'' (۴)

زبان تر اسی وقت ہوگی جب اس کا تعلق دماغ سے ہوگا، ذکر، زبان، دل، دماغ، تینوں کے ساتھ ہو تب ذکر، ذکر ہوا، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ:

''اگر صرف زبان کا ذکر ہے تو کچھ فائدہ نہیں، جتنا دھیان قوی

---

(۱) سورۂ عنکبوت۔ (۲) سورۂ توبہ/۷۲۔ (۳) ترمذی۔ (۴) ایضاً۔

ہوگا (اتنا ہی) فائدہ ہوگا، سارا مسئلہ ذہن سے تعلق رکھتا ہے،
تبھی معرفت پیدا ہوگی۔"

قرآن مجید اور نماز، یہ دونوں سراپا ذکر ہیں، اللہ اکبر سے نماز شروع ہوتی ہے، اس کی اذان سے نماز کی طرف بلایا جاتا ہے اور یاد دلایا جاتا ہے کہ یہ سب چیزیں حقیر ہیں، اصل اللہ کی رضا ہے جو اس کے ذکر سے حاصل ہوتی ہے، نماز میں قرآن مجید کی تلاوت اور مختلف اذکار اور دعائیں ہیں اور اٹھتے بیٹھتے رکوع وسجدہ میں آتے جاتے اللہ ہی کا نام لیا جاتا ہے اور اس کی بڑائی بیان کی جاتی ہے اور پوری نماز میں کہیں اور دھیان نہیں لگاتا:

"أن تعبد الله كأنك تراه وإن لم تكن تراه فإنه يراك."

(اللہ کی ایسی عبادت کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اپنے کو اس حالت میں نہیں پا رہے کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو تو یہ یقین کرو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے)۔

اور قرآن مجید کا ایک نام ذکر بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (١)

(ہم نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے)۔

تو قرآن مجید کی تلاوت ہم اس انداز سے کریں کہ ذکر کا غلبہ ہو تو اس سے ہماری حفاظت ہوگی، ہر ہر حرف پر یہ استحضار رہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور یہ خیال رہے کہ اللہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے اور کیا چاہ رہا ہے، تلاوت میں بھی ذکر کا تبھی پورا فائدہ ہے، جب وہ زبان کے ساتھ دل سے بھی ہو اور دماغ سے بھی، تبھی عمل کی توفیق ہوگی اور تبھی اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔

---

(١) سورۂ حجر/٩۔

خودرائی سے مکمل پرہیز

جہاں تک خودرائی سے پرہیز کا تعلق ہے ایک عارف نے کوچہ عشق میں قدم رکھنے کی شرط بیان کی ہے اور اس کو ضروری قرار دیا ہے

جب تک فنائے رائے کی ہمت نہ پایئے
کیوں آپ اہل عشق کی محفل میں آیئے

واقعہ یہ ہے کہ یہ اس راہ کا دستور ہے سب ہی اس پر چل کر کامیاب ہوئے ہیں، تین باتیں اور بھی بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں، اور جس میں یہ چیز جتنی بڑھی ہوتی ہے اس کو ویسا ہی ممتاز کرتی ہے، قرآن مجید میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے:
۱-ایک توحید، ۲-دوسری سنت سے محبت اور اس کی اتباع، ۳-اور تیسری چیز کا تعلق کیفیت سے ہے، غلبۂ اسلام کی فکرمندی اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور انسانیت کے تعلق سے دلسوزی، راقم نے جن بڑے مشائخ کو دیکھا، برکۃ العصر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی، محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق حقی، حضرت مولانا قاری سید صدیق احمد باندوی، ان سب کو اس میں ممتاز پایا۔

اسلام کی فکرمندی، مسلمانوں کے حالات سے دردمندی اور انسانیت کی خیرخواہی کہ کس طرح وہ راہ ہدایت پر پڑ جائے، او راسلام کا جگہ جگہ بول بالا ہوجائے، یہ ان کے پورے نظام زندگی کی روح رواں بن گئی تھی، اس کے لیے نہ زندگی کا کوئی شعبہ مخصوص تھا نہ عمر کا کوئی وقت، یہ درد جسم اور قوائے فکریہ میں اس طرح جذب ہوگیا تھا:

شاخ گل میں جس طرح بادِ سحر گاہی کا نم

یہ وہ گروہ امت ہے جس کا ذکر وشغل، اس کا انقطاع الی اللہ، اس کی یکسوئی و

بے نیازی اس کو مسلمانوں سے جدا نہیں کرتی اور بے فکر نہیں بناتی بلکہ اور زیادہ اسلام اور مسلمانوں اور انسانیت کے درد میں مضطرب اور بے قرار بنا دیتی ہے اور اس سنت سے قریب تر کر دیتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال قرآن مجید نے بتایا ہے:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ﴾.

اور مسلمانوں کے تعلق سے وہ زبان حال سے گویا ہوتا ہے

مراد ردیست اندر دل چوی گویم زباں سوزد
اگر دم در کشم ترسم کہ مغز استخواں سوزد

یہی درد کبھی زبان پر آ کر آہ وفغاں میں تبدیل ہو جاتا ہے کبھی مسلمانوں کی کوتاہیوں اور ناسمجھیوں پر درد وقلق کے اظہار میں تبدیل و تحلیل ہو جاتا ہے لیکن وہ دم کے ساتھ تھا اور اس کو کسی وقت قرار نہیں۔

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

عزیزی سید محمود حسن حسنی ندوی سلمہ اپنی کتاب ''تاریخ اصلاح وتربیت'' میں جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگی تزکیہ واحسان اور اصلاح وتربیت کے میدان میں عہد بہ عہد کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کو ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ پیش کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور اس کی پہلی جلد منظر عام پر آنے کے مرحلہ میں ہے۔

عزیزی مولوی محمود حسن حسنی ندوی کے لیے یہ نہایت سعادت کی بات ہے کہ انھوں نے جلد اول کو سید الاولین والآخرین خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک اور اس میں تزکیہ کے پہلو کو نمایاں کرنے کے ساتھ خاص کی ہے، صحبت نبوی کی حیرت انگیز تاثیر یہ تھی کہ جو بھی طلب صادق لے کر آتا وہ نہ صرف یہ کہ مشرف بہ اسلام ہو جاتا بلکہ اس کو بہت جلد ایمان کی حلاوت اور اگلے ہی مرحلہ میں اس کو تزکیہ واحسان کی بھی دولت حاصل ہو جاتی تھی، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ امتیاز ہے جس کو قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِيْ الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ﴾(۱)

(وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کرسناتا ہے اوران کا تزکیہ کرتا ہے اوران کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ جماعت کا نام صحابہ پڑا، اوران کو مغفرت و رضوان کی بشارت اللہ نے اپنے کلام پاک میں عطا فرمائی، انھوں نے احکام اسلام پر عمل اور دین کے فروغ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے عمل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل و جان سے اور مال و متاع کی قربانی سے ساتھ دیا، ان سب کے تذکرے کے لیے کئی دفتر مطلوب ہیں، اس پہلی جلد میں عزیز موصوف نے سیرت نبوی کو پیش کرنے کے ساتھ کچھ ممتاز صحابہ کی سیرت کے بھی جلوے دکھائے ہیں اور یہ "ما أنا عليه و أصحابی" کا بھی تقاضہ ہے۔

نبوی دسترخوان کے خوشہ چینوں کو دنیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لقب سے جانتی ہے، یہ وہ اللہ والی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چاہنے والی، پیغام خدا ورسول کو بے کم و کاست پہنچانے والی جماعت ہے، جن کی تمام خوبیوں، خصوصیات اور امتیازات کو پیش کرنا ناممکن ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی امتیازی خصوصیات کی فہرست بہت طویل ہے، ان کی جاں نثاری وفداکاری، محبت وشوق، علم وآگہی، اخلاق کریمانہ، تعلیم وتربیت، دعوت وارشاد، انسانی ہمدردی اورشفقت ومحبت، غرض یہ کہ ان کے کمالات اور ممتاز اوصاف کی فہرست بہت طویل ہے، ان میں کچھ کی طرف

---

(۱) سورۂ جمعہ/۲۔

اشارہ کرتا چلتا ہوں۔

اخلاص وللّٰہیت اور خواہش نفس پر قابو پانے میں اس پاکیزہ وممتاز جماعت کو امتیاز حاصل ہے کہ کوئی کام بھی ذاتی غرض اور منفعت کے پیش نظر کسی نیت بد کے نتیجہ میں نہیں کرتے تھے، وہ ہر کام اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت سے کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خود مخلصوں کے سردار تھے ان کے دل ودماغ کو اخلاص کے سانچہ میں ڈھال دیا تھا اور وقتاً فوقتاً ان کے سامنے اس کی اہمیت اور عنداللہ مقبولیت واضح فرماتے رہتے تھے، بنیادی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا تھا کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، تنہا ظاہری اعمال چاہے وہ کتنے ہی بھلے اور اچھے معلوم ہوتے ہوں کیسے ہی خوش نما ہوں اگر وہ روح سے خالی، نیت بد سے داغ دار کیے جاچکے ہیں تو عنداللہ ذرا بھی قابل قبول نہ ہوں گے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس میں خاص امتیاز حاصل تھا، اسی طرح خواہشات ایجابی ہوں یا سلبی، باہری دنیا دیکھ کر پیدا ہوئی ہوں یا اندرونی جذبات کا عکس ہوں، دونوں ہی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بے مثال ثابت قدمی اور استقامت اور راہ سنت وشریعت پر استواری ان کا شعار رہا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ یہودی کو انھوں نے مغلوب کرلیا تھا مگر یہودی کے تھوک دینے سے اندرونی انتقامی جذبہ پیدا ہوگیا اور نفس کا شدید تقاضہ ہوا کہ اس کو فوراً تہ تیغ کردیا جائے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس پر قابو پاکر اسے چھوڑ دیا، وہ حیرت زدہ رہ گیا پوچھنے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ کے لیے تجھے قتل کررہا تھا، جب تم نے تھوکا تو مجھے غصہ آگیا جو میرے نفس کے لیے تھا، اس لیے میں نے چھوڑ دیا، یہ سن کر یہودی کی دنیا بدل گئی اور کلمہ شہادت پڑھ کر ایمان لے آیا، اس طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نفس پر قابو پاکر ایک جان کو جہنم سے بچالیا اور خود کو اپنی ذات کے انتقام لینے کے جذبہ سے محفوظ رکھا،

عین معرکہ کے وقت جب کہ دونوں ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوں یہ ناممکن سی بات ہے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسے ہی تھے کہ کتنی ہی ایسی ناممکن باتوں کو ممکن بنادیا۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک ممتاز صفت ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا معلوم کر کے اس کے مطابق عمل کرنے کا جذبہ تھا، بعض لوگوں کو اپنے بڑے اور مقتدا شخصیت کے سامنے کسی مقام پر سجدہ کرتے دیکھا تو دل میں خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حق دار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم لوگ سجدہ (تعظیمی) کریں، جذبات میں آکر سجدہ کر لیتے پھر پوچھتے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کرتا دیکھ کر منع فرماتے، بلکہ دل میں شدید داعیہ پیدا ہونے پر عمل سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف منع فرمادیا اور کہہ دیا کہ کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ کسی دوسرے کو سجدہ کرے، اگر دنیا میں کسی کو سجدہ کی اجازت ہوتی تو عورت کو حکم ہوتا کہ شوہر کو سجدہ کرے۔

اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی اور نمایاں صفت اور امتیازی خصوصیت توبہ وانابت الی اللہ ہے، بحیثیت انسان کے اگر کوئی غلطی ہوگئی تو وہ ایسے بے قرار اور بے چین ہوئے کہ کیا طریقہ اختیار کریں کہ جس سے اللہ کی پکڑ سے بچ جائیں اور آخرت کا معاملہ خراب نہ ہو اور ایسی ندامت ہوئی اور اس کے لیے ایسی قربانی دی کہ رحمت الٰہی کو جوش آیا اور ان پر رحمت کی ایسی بارش ہوئی کہ اگر پورا شہر مدینہ اس کے ذریعہ اپنی بخشش کروانا چاہتا تو ہوجاتی کہ ؏

یہ وہ بندہ ہے جس پر ناز کرتا ہے کرم میرا

اور کسی نے کفارے کے لیے ایسے مجاہدات کیے کہ امت کے لیے قیامت تک کے لیے نمونہ چھوڑ گئے۔

اس کے ساتھ ایک بڑی اور امتیازی خصوصیت ان کی ذہنی پختگی، عقلی بلوغ اور ذہنی ودماغی تربیت کا کمال ہے، اگر ایک طرف وہ سرافگندگی، سپردگی، اطاعت و

فرماں برداری اور تسلیم و رضا کے امام تھے تو دوسری طرف ذہنی و عقلی صلاحیتوں سے پورا پورا استفادہ کرتے تھے اور ان کا صحیح استعمال جانتے تھے، کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی غیر معمولی تربیت اور نگرانی میں ان کے ذہن و دماغ کو اس طرح تیار کر دیا تھا کہ اندھے بہروں کی طرح زندگی نہ گزاریں جا بے جا، حق ناحق تقلید و پیروی کی راہ نہ اپنائیں، ذہن کو کھلا رکھیں، عقل و دانش کا استعمال کرتے رہیں، شاہراہ شریعت اور جادۂ سنت پر بصیرت کے ساتھ گامزن ہوں تاکہ کوئی شیطانی وسوسہ یا غلط سازش ان کی راہ کھوٹی نہ کر پائے، جس کا اصول آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر بیان کر دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے کسی بھی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں، کوئی انسان بھی اس لائق نہیں کہ اس کے ساتھ خدا کا سا معاملہ کیا جائے اور اس کی بات کو خدائی حکم کا درجہ دیا جائے، بڑوں کی اطاعت چاہے امیر ہو یا شیخ، پیر ہو یا فقیر، حاکم ہو یا عالم اس حد تک کی جائے جس کی اجازت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

صحابہ کرام کی ذہنی پختگی، عقلی بلوغ اور بیدار مغزی اور اس کے ساتھ کامل اطاعت، مکمل انقیاد، بے مثال تابع داری اور فرماں برداری سے ان کی تاریخ بھری پڑی ہے، وہ امی قوم کے تھے لیکن علم و عقل اور عمل تینوں کے جامع بن گئے تھے اور یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا معجزانہ اثر تھا اور پوری جماعت صحابہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزے کے طور پر ظاہر ہوئی۔

عبد اللہ حسنی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ حسنیؒ، تکیہ کلاں، رائے بریلی

۶ر شوال المکرم ۱۴۳۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مصنف

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین سیدنا محمد و علی آلہ وصحبہ أجمعین وبعد!

اللہ تبارک وتعالیٰ کا امت محمدیہ پر یہ بہت بڑا احسان وانعام ہے کہ اس نے اس امت کو خاتم النبیین سید المرسلین اور اپنے محبوب ومقبول بندوں میں سب سے محبوب ومقبول بندہ اور اپنے مقربین میں سب سے مقرب شخص سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت بنایا اور اسے قرآن حکیم جیسی کتاب عطا کی جسے اس کے لیے دستور بنا کر حفاظت کا وعدہ کیا اور حفاظت کے وہ اسباب اور وسائل بھی مہیا کیے جن کی ضرورت پڑتی ہے، لفظی واعرابی حفاظت کا بھی سامان کیا، معنوی حفاظت بھی مقدر فرمائی، اس سب کے لیے ہر دور میں اور ہر مقام پر ایسے ایسے افراد پیدا کرتا رہا جو ان کوششوں کے سامنے منجنیق کی طرح آئے وہ کوششیں لفظی ومعنوی تحریف کی کھلم کھلا یا در پردہ ہوتی رہیں، اس سلسلہ میں داخلی اور خارجی فتنوں سے کوئی دور خالی نظر نہیں آتا، مگر اسی طرح ایسے علمائے عاملین، اولیائے ربانیین، مصلحین ومجددین اور مزکین نفوس اور معلمین اخلاق زمین پر ستاروں کے مانند جگمگاتے رہے، جن کی زندگی قرآنی زندگی تھی، جن پر عکس خیر القرون کے نمائندہ افراد کا تھا، جن کا حال اور قال نبوی طریقہ سے قریب تھا، جن کا ذہن ودماغ مراد الٰہی کو سمجھنے میں تیز تھا جن کے جوارح طریقہ نبوی کو اختیار کرنے میں مستعد اور مطابق حال تھے۔

اگر اللہ چاہتا تو قرآن مجید کو تنہا ہدایت خلق کے لیے کافی کر دیتا مگر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرما کر اور آپ کی بعثت کو افراد انسانی میں منتخب اور چیدہ و چنیدہ اشخاص کو ساتھ کر کے اس بعثت کو بعثت مقرونہ کر دیا اور ہدایت رسانی کے لیے کتاب الٰہی کے ساتھ مردان باخدا لازم ملزوم کر دیئے، یہ مردان باخدا اپنے آقائے نامدار سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و تعلیم کی روشنی میں اپنی زندگی کو منور کرتے رہے اور سنت و محبت نبوی کی روشنی اپنے اندر محفوظ کر کے سالکین طریقت اور طالبین معرفت کو دل کے تاروں سے پہنچاتے رہے جس سے ان کی ارواح کو تازگی اور فرحت اور ان کے اجساد کو قوت و برکت ملتی رہی، اور اس طرح باتوفیق اور مؤید من اللہ افراد کی ایک جماعت برابر موجود رہی، اور ایک کے جانے کے بعد دوسرا اس کی جگہ لیتا رہا، اس فرق کے ساتھ کہ نگاہیں ایک کو دیکھتے دیکھتے اسی کی عادی اور اسی سے مانوس ہو جایا کرتی ہیں، دوسرا اسے اتنا نہیں جچتا جتنا اسے اپنا محبوب اول بھاتا ہے مگر ہر ایک اپنے کچھ انفرادی خصائص اور امتیازات رکھتا ہے جس کا عکس اس کے صحبت یافتہ حضرات اور وابستگان پر اگر وہ صدق و خلوص سے ساتھ ہیں ضرور پڑتا ہے اور کبھی یہ وصف اس اتحاد و یگانگت کو پہنچ جاتا ہے کہ دو الگ شخصیتیں ایک نظر آنے لگتی ہیں، اس تعلق و نسبت کو نسبت اتحادی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور اس کا ظہور بار بار اور برابر ہوتا رہا ہے، اسلامی تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی پہلی مثال تھے، حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ اس کی بہترین مثال ہیں، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی چال ڈھال اور گفتار پر اس کے اثرات زیادہ نمایاں تھے، ان کے شاگردوں میں حضرت علقمہ ان ہی جیسے ہو گئے تھے، پھر اسی طرح ان کے شاگرد حضرت ابراہیم نخعی کا حال ہو گیا تھا، آج تک یہ سلسلہ جاری و ساری ہے اور انشاء اللہ رہے گا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا جو وعدہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ

وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ کہہ کر فرمایا ہے اسی وعدہ میں رجال دین اور مردان باخدا کی حفاظت وصیانت کا بھی وعدہ مضمر نظر آتا ہے اور تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات محقق بھی ہو جاتی ہے۔

مقاصد بعثت میں تلاوت آیات کتاب الٰہی، تزکیہ نفس اور تعلیم شریعت و اخلاق وہ مقاصد ہیں جن کا قرآن مجید میں جا بجا ذکر ملتا ہے اور چار آیات ایسی ہیں جن میں ان کی تعیین بھی کر دی گئی ہے، اس بات سے قطع نظر کہ تعلیم تزکیہ پر مقدم ہوگی یا تزکیہ لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ علم دین وشریعت ایک نور ہے اور نور کو سمیٹنے کے لیے قلب کی صفائی ناگزیر ہے، تزکیہ انسان کی کامیابی اس کی فلاح و بہبود کے لیے اور اس کی روح کی بالیدگی کے لیے ویسے ہی ضروری ہے جیسے جسم کو پانی کی ضرورت ہے، اخلاق حسنہ سے آراستگی اور علم پر عمل اس کے بغیر ممکن نہیں، نظام صلاح وفلاح کا یہ ایک اہم عنصر ہے اور اتنا اہم عنصر ہے کہ ایک آیت میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے ﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا﴾.

اللہ تعالیٰ نے اسی سلسلہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تربیت فرمائی، انھوں نے اپنی اپنی استعداد کے لحاظ سے اس سے بھرپور حصہ لیا، ان میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرات خلفاء راشدین حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم کو نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کام کی انجام دہی کے لیے اور ان لوگوں کی تکمیل تربیت وتعلیم کے لیے جو آخر زمانہ میں اس جماعت حقہ سے آملے تھے اور ان کی تربیت وارشاد کے لیے جو بعد میں اس جماعت حقہ سے منسلک ہوئے، خصوصیت سے منتخب فرمایا، اللہ تعالیٰ کام لینے کے لیے اپنے خاص بندوں کا اصطفاء فرماتا ہے، وہ قلب کے صلاح اور دماغ کی صلاحیت کو دیکھتا ہے، چنانچہ علم وعقل وعمل تینوں کے مجموعہ کے ساتھ امتیازی شان پیدا ہوتی ہے۔

دین کو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی ورسالت کے ذریعہ

مکمل فرمادیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقوال، اعمال وافعال اور احوال کے ذریعہ اس کا علم دیا اور اس کا رنگ بھی اپنے ہم نشینوں پر چڑھایا اور تعلیم قرآن و حکمت، دعوت وتبلیغ، جہاد وغزوات اور جس مقصد کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی اس کے ذریعہ منصب رسالت کا حق ادا کیا اور وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر ایک ایسے عظیم اجتماع کی موجودگی میں جو لاکھ سوا لاکھ کی تعداد کو پہنچ رہا تھا امت مسلمہ کے لیے یہ واضح فرمادیا کہ:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً﴾.(۱)

(آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کردی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین کے پسند کرلیا)۔

اور اسی حجۃ الوداع کے موقع پر وفات سے صرف تین ماہ قبل جب یہ آیت نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعلان فرمایا اور امت کو ضروری باتوں کی وصیت فرمائی، اور اللہ کو بھی گواہ بنایا اور فرمایا: "اللھم اشھد، اللھم اشھد، اللھم اشھد" تین بار فرمایا، اور لوگوں کو یہ تعلیم بھی دی کہ بات محدود نہ رہنے پائے، دوسروں تک منتقل بھی کی جائے، فرمایا: "ألا فلیبلغ الشاھد الغائب، فرب مبلغ أوعی من سامع"، اس میں یہ بھی اشارہ تھا کہ اس امت کے حصہ میں بڑی عظیم صلاحیتوں کے حامل لوگ آئیں گے اور بڑی بڑی قومیں اس کی آغوش میں پناہ لیں گی۔

اور امت مسلمہ کو دین کی حقیقت سمجھانے کے لیے یہ عجیب اور انوکھا طریقہ اختیار کیا جس کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ بیان کیا ہے جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حبیب خدا رسول مصطفیٰ صلی اللہ

(۱) سورۂ مائدہ/۳۔

علیہ وسلم سے دین کے بنیادی عناصر اور کلیدی اجزاء کے بارے میں دریافت کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے، جب یہ سب ہو چکا تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ یہ جبرئیل تھے تم کو تمہارا دین سکھلانے آئے تھے، یہ واقعہ اس طرح روایت کیا گیا ہے:

"عن عمر بن الخطاب رضی الله عنه قال: "بينما نحن عند رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم إذ طلع علينا رجل شديد بياض الثياب، شديد سواد الشعر لا يرى عليه أثر السفر ولا يعرفه منا أحد حتى جلس إلى النبی صلى الله عليه وسلم فأسند ركبتيه إلى ركبتيه ووضع كفيه على فخذيه وقال يا محمد! أخبرنی عن الإسلام. فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الإسلام أن تشهد أن لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله، وتقيم الصلاة وتؤتی الزكوٰة وتصوم رمضان وتحج البيت إن استطعت إليه سبيلا. قال: صدقت. قال فعجبنا له، يسأله ويصدقه. قال فأخبرنی عن الإيمان قال: أن تؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر وتؤمن بالقدر خيره وشره. قال: صدقت. قال فأخبرنی عن الإحسان. قال: أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك." (١)

(حضرت عمر رضی اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھے کہ نہایت سفید کپڑوں

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، اول حدیث۔

میں ملبوس اور گہرے سیاہ بالوں والا ایک شخص ہمارے سامنے نمودار ہوا، نہ اس پر سفر کے آثار نمایاں تھے اور نہ ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا تھا، وہ آ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیاں رانوں پر رکھ دیں اور کہا کہ اے محمد! مجھے اسلام کے متعلق بتلاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا کہ: اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، ماہ رمضان کے روزے رکھو اور اگر تم میں استطاعت ہو تو فریضہ حج ادا کرو۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ آپ نے سچ فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں بڑا تعجب ہوا کہ سوال بھی کر رہا ہے اور پھر تصدیق بھی۔ اس نے پھر عرض کیا کہ مجھے ایمان کے متعلق بتلاؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، فرشتوں پر، آسمانی کتابوں پر، رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھو (یقین رکھو) اور اچھی بری ہر طرح کی تقدیر پر تمہارا ایمان ہو۔ اس نے یہ سن کر پھر کہا کہ آپ نے سچ فرمایا۔ اس کے بعد عرض کیا کہ مجھے احسان کے متعلق بتلائیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو تو اگر تم نہیں بھی دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں ہے:

"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يوما بارزاً للناس

فأتاه رجل فقال يا رسول الله ما الإيمان؟ قال: أن تؤمن بالله وملائكته وكتابه ولقائه ورسله وتؤمن بالبعث الآخر. قال: يا رسول الله ما الإسلام؟ قال: الإسلام أن تعبد الله ولاتشرك به شيئا وتقيم الصلاة المكتوبة وتؤدى الزكوٰة المفروضة وتصوم رمضان. قال يا رسول الله: ما الإحسان؟ قال: أن تعبد الله كأنك تراه فإنك إن لا تراه فإنه يراك."(۱)

(آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز لوگوں کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایمان کسے کہتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، فرشتوں پر، کتاب الٰہی (قرآن) پر، اللہ کے روبرو حاضر ہونے پر اور رسولوں پر یقین رکھو اور یوم آخرت پر تمہارا ایمان ہو۔ اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے؟ (اسلام کسے کہتے ہیں؟) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، فرض نمازوں کی پابندی کرو، زکوٰۃ کی ادائیگی کرو اور ماہ رمضان کے روزے رکھو۔ اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! احسان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو تو اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث/۱۳۔

اس کے بعد پھر اور چند سوالات کیے جس میں قیامت کے تعلق سے اور اس کی علامات سے متعلق سوالات تھے، جب وہ چلے گئے جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوالات کر رہے تھے تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا:

"هذا جبرئيل جاء ليعلم الناس دينهم."

(کہ یہ جبرئیل تھے لوگوں کو ان کا دین سکھانے آئے تھے۔)

اس گفتگو میں جو لوگوں کو دین کی تعلیم کے لیے ہوئی تھی دین کے ان اہم عناصر کا ذکر کیا گیا جن سے جامعیت اور کمال حاصل کیا جا سکتا ہے، مزید فتن کی طرف اشارہ اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ایام فتن میں بھی صحیح ایمانی و اسلامی زندگی گزارنے کے لیے ایک مومن کو دین ہی میں رہنمائی ملے گی اور اس کا سب سے کامل نمونہ خلفائے راشدین و مومنین صادقین تھے ان سے اسوہ ملے گا۔

دین کے ان عناصر کو سامنے رکھ کر خلفائے راشدین کی ترتیب میں قدرت الٰہی کی حکمت کی کارفرمائی نظر آتی ہے، سب سے اہم عنصر ایمان کی تنفیذ اور ایمان کے خلاف اٹھنے والی موجوں کے لیے باندھ باندھنے کا کام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا جو ارتداد کے خلاف سد سکندری بن کر سامنے آگئے، اور ان کا یہ جملہ کہ "أينقص الدين وأنا حي" نیابت انبیاء کا کام کرنے والوں کا شعار بن گیا اور ارتداد کے مقابلہ کے لیے وہ نمونہ پیش کیا جس سے مصلحین امت اور ائمہ ربانیین ہر دور میں روشنی حاصل کرتے رہے اور اس کا مقابلہ کرتے رہے ہیں، ارتداد کی یہ لہریں نبوت محمدیؐ کے خلاف اٹھی تھیں اور ختم نبوت کے مسئلہ کے لیے چیلنج بن کر آرہی تھیں لیکن عزم صدیقی کے آگے یہ ٹھہر نہ سکیں، حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی مختصر مدت خلافت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کے لیے عرصہ دراز درکار ہوتا ہے۔

ایمانیات کے استحکام کی تکمیل اور اسلام کے ایک پورے نظام زندگی اور تہذیب و معاشرت کے نفاذ کا کام حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آیا،

انھوں نے اس سلسلہ میں جس باریک بینی اور حقوق انسانی کے پاس ولحاظ کے ساتھ احکام شریعت کی تنفیذ کا کام انجام دیا اس کی اقوام وملل کی تاریخ میں کہیں نظیر نہیں ملتی، ایک ایسے وقت میں جب دنیا کی دو عظیم سلطنتیں روم وفارس مغلوب ومفتوح ہوکر آپ کے زیر قدم آچکی تھیں اور اسلام کا جھنڈا گڑ چکا تھا عرب جو اعرابی تمدن ومعاشرت رکھتے تھے ان کا ایرانی اور رومی تمدن وتہذیب سے اچانک بھرپور طریقہ سے سامنا کر کے مبہوت ہو جانا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، اس موقع پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس جرأت اور ہمت کا مظاہرہ کیا اور زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی تعلیمات اور اس کی حقانیت وافادیت کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنا کر اور زیادہ مؤثر وطاقتور کیا اور یہ ثابت کردیا کہ انسانیت کی نجات اور اس کی فلاح وبہبود اس نظام میں آئے بغیر ممکن نہیں، عدل ومساوات اور کرگستری کا وہ مزاج بنایا کہ غریب وامیر کا فرق باقی نہ رہا اور اس میں سب سے زیادہ مثالی زندگی خود ان ہی کی رہی۔

اس کے بعد خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا، انھوں نے نہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چھوڑے ہوئے کاموں کی تکمیل کی، بلکہ اسلامی حدود وسلطنت کو وسیع تر بنانے اور نظام اسلامی کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی محکم تدابیر اختیار کیں، چنانچہ اسلام کا پیغام ہدایت دنیا کے وسیع تر خطوں میں پہنچ گیا، فتنوں اور سورشوں کے بیچ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس حکمت عملی، حسن تدبیر، مروت واخلاق اور رواداری کے ساتھ احکام شریعت کی تنفیذ کا کام کیا وہ خود ایک مثال اور نمونہ ہے، مخالفین اسلام ومعاندین نبوت محمدی کی ریشہ دوانیوں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جن داخلی فتنوں کا سامنا کرنا پڑا اور جس کے نتیجہ میں ان کی مظلومانہ شہادت کا سانحۂ عظیم بھی پیش آگیا، اصلاح باطن کا یہ ایک نہایت اہم پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ انھوں نے خوں ریزی پر اپنے خون کو ترجیح دی، جہاد بالنفس کی یہ ایسی اعلیٰ مثال ہے جس کی حکمرانوں کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں، حضرت عثمان رضی اللہ

عنہ نے تنفیذ اوامر اسلام کی تکمیل کا جس طرح کام کیا اسی طرح دین کے تیسرے عنصر احسان کا عدیم النظیر نمونہ بھی پیش کرتے گئے جس کے اصولوں کو متعین کرنے اور جس کے اجزا کو عملی شکل میں لانے کی سعادت آپ کے بعد کے خلیفہ کا مقدر تھا۔

خلیفہ رابع حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو دور ملا وہ فتنوں، سازشوں، ریشہ دوانیوں کا تھا، ذاتی مفادات واغراض کو ملی و اجتماعی مفادات پر ترجیح اسی طرح اپنی خواہش اور تقاضوں کو دینی تقاضوں اور ضرورتوں پر فوقیت دینے اور انانیت، ہوس، نفاق کا بازار گرم تھا، یہ سب اس لیے بھی تھا کہ مفتوحہ علاقوں اور سلطنتوں کے باشندے اسلام کے زیر سایہ تو آگئے تھے مگر ایمان ان کے دلوں میں اترا نہیں تھا، احسان کی کیفیت سے وہ ناآشنا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس نازک موقع پر جس طرح ملت کی کشتی کی ناخدائی کی، دانشمندانہ قیادت کی، قتل وخون کا بدلہ لینے میں انصاف کے دامن کو ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا، دنیا کو بار بار اپنے پاس سے بھگایا، اس کے فریب سے دوسروں کو چوکنا کرتے رہے، دنیا کی حقارت اس کی کم مائیگی اس کے زوال وفنا کی حقیقت لوگوں کے دلوں میں ان حالات میں اتاری جب دلوں میں دنیا گھر کر رہی تھی، احسان کی دولت سے آشنا کیا اس وقت جب ایمان دلوں سے نکل رہا تھا، نفاق اندر گھس رہا تھا ایمان کی لذت کا ذائقہ دیا، اسلام کی ان تعلیمات اور احکام کو جاری کیا جو ان حالات کے لیے ہی تھے، ایسے حالات کے لیے جب لوگوں کے قلوب مردہ اور زنگ آلودہ ہورہے ہوں اور حق وباطل کا معرکہ پھر سامنے ہو، ایسا معرکہ جس میں باطل اہل حق کو ساتھ لے کر چل رہا ہو اور حق اپنے ساتھ اہل باطل کو جدا نہ کر پا رہا ہو ان حالات میں ملت کی کشتی بھنور سے نکال کر ساحل تک پہنچانے کا کام جس طرح آپ نے کیا وہ آپ ہی کا حق تھا، فتنوں اور آزمائشوں میں کس طرح اسلامی نظام حیات اور ایمانی نقطہ نظر سے زندگی گزاری جائے اس کے لیے آپ نے احسانی راہ سے انسانیت کے لیے ایک بہترین نمونہ چھوڑا، اسلام صرف عبادات وعقائد کا نام نہیں ہے یہ ایک مستقل

تہذیب اور مکمل نظام حیات ہے اگر معاملہ انفرادی ہے تو انفرادی طور پر اور اگر معاملہ اجتماعی ہے تو اجتماعی طور پر اوامر الٰہی کا خیال کرتے ہوئے کہ اگر ہم اپنے رب کو نہیں دیکھ پا رہے ہیں مگر وہ تو ہمارے سارے کرتوت پر نظر رکھے ہوئے ہے زندگی گزارنا سکھایا، چونکہ پہلے ان جیسے حالات نہیں تھے اس لیے وہ بہت سی باتیں جو ان حالات میں سمجھ میں آسکتی تھیں پہلے نہیں سمجھی جاسکتی تھیں، عربی و عجمی ثقافت کے اختلاط کی وجہ سے بہت سی وہ چیزیں پیش آنے لگی تھیں جن کا تصور و خیال بھی آنا محال تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے مجتہدانہ طرز عمل اور فکر و بصیرت سے اپنے رب سے تعلق مضبوط کرنے، دنیا کے فریب میں نہ آنے، اخلاص و اخلاق کے ساتھ زندگی گزارنے اور اپنے سبھی معاملات کو شریعت کے مطابق نمٹانے پر زور دیا اور فتنوں پر بڑی حد تک قابو پا لیا، مگر خود شہید ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زندگی میں زہد، انابت، اخبات، حلم، عدل، شجاعت، معاملہ فہمی، یقین و توکل، تسلیم و رضا کے پہلو بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

آپ کے بعد آپ ہی کے جانشینوں محبوبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرات حسن و حسین رضی اللہ عنہما نے دو ایسی مثالیں پیش کیں جن میں امت کی کشتی کے ناخداؤں اور مصلحین و مربین نفوس و معلمین اخلاق کے لیے وہ سامان سبق ہے جس سے کبھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کس طرح اپنی سلطنت و سطوت محض خون خرابے سے بچاؤ کے لیے قربان کر دی اور ملت کی شیرازہ بندی کے لیے اپنے حق سے دستبردار ہو گئے، جس کی وجہ سے ملت کے مختلف گروہ ایک گروہ بن گئے، اور دوسرا نمونہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پیش کیا جس میں ایفاء عہد اور امانت کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے اور مجاہدانہ زندگی اختیار کرنے اور جہاد اسلامی کو جاری رکھنے کا واضح اشارہ ملتا ہے، اس وقت خلافت اسلامی جو کہ ایک بڑی امانت تھی اور ملت کی قیادت جو کہ اصلاً دین اسلام کی کشتی کی ناخدائی تھی نا اہل ہاتھوں میں جانے سے روکنا ایک ایسا عمل تھا جس کی ملت کے رہنماؤں کو زمانہ اور

حالات کے تغیر کے ساتھ ضرورت پڑ سکتی تھی، اس کے لیے حضرت حسین بن علی نواسہ رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اقدام کیا، اور میدان کربلا میں اپنے بعض افراد خاندان کے ساتھ جام شہادت نوش کیا، حالانکہ بعض مخلصین انھیں مقابلہ آرائی سے باز رہنے کا مشورہ دے رہے تھے مگر آپ میدان میں پہنچنے کا وعدہ فرما چکے تھے اور اپنے بعض ساتھیوں کو پہلے بھیج چکے تھے اس لیے اپنے عزم پر جمے رہے اور خلافت اسلامی کی امانت کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگا دی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم سے سیرۃً وصورۃً مشابہ کیا تھا، اور صفات نبوت کو آپ دونوں نے موروثی طور پر حاصل کیا تھا، یہ انبیاء کی خصوصیت ہے کہ وہ درہم ودینار کو وراثت میں نہیں چھوڑتے مال ومتاع میں ان کی وراثت نہیں چلتی مگر علم ومعرفت تقویٰ وانابت، اخبات وسماحت میں ان کے ورثہ سے بھر پور حصہ حاصل کیا جا سکتا ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دونوں نواسوں سے جو تعلق خاطر تھا اس کی پاسداری حضرات شیخین سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمر فاروق نے بھی کی اور اتنی کی کہ اپنی اولاد پر انھیں ترجیح دیتے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وصفات کا بڑا ذخیرہ بھی ان دونوں حضرات سے مروی ہے جو شمائل ترمذی میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

تطہیر وتزکیہ کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خصوصی معاملہ آپ دونوں حضرات کے ساتھ رہا کہ ایک چادر میں خواتین جنت کی سیادت کی بشارت پانے والی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن وحضرت حسین رضی اللہ عنہما کو ڈھانپ لیا اور قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ جو اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں نازل ہوئی تھی جس کی اولین مخاطب ازواج مطہرات تھیں خصوصیت سے ان حضرات کے لیے تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾(۱)

(بیشک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے اے اہل بیت نجاست کو دور فرمادے اور تم کو پاک وصاف فرمادے)۔

اور اس کی ان حضرات کے لیے دعا بھی فرمائی۔

جماعت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فارسی نژاد عجمی النسل ہوتے ہوئے اپنے کنبہ میں شامل فرمایا "سلمان منّا أهل البيت" ان کا اہل بیت ہونا مجازاً ہے اور دین اسلام کے مزاج ومساوات کی عکاسی کرتا ہے کہ اس نے رنگ و نسل اور زبان کے سب فرق مٹادیئے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا فائدہ حضرت سلمانؓ کو جو پہنچنا چاہیے تھا پہنچا، اللہ تعالیٰ نے ان خصوصیات وامتیازات کا حصہ وافر انھیں بھی عطا کیا جس میں اہل بیت کی اپنی شناخت ہے، آج تطہیر نفس اور تزکیہ باطن کے جو سلسلے نفع رسانی کا کام انجام دے رہے ہیں ان کی اہم کڑیاں یہی حضرات ہیں، تابعین میں ان حضرات کے اور امت کے درمیان پہلا واسطہ حضرت حسن بصری اور حضرت علی زین العابدین ہیں، حضرت حسن بصری کو ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی گود میں پرورش پانے اور ان کی رضاعت کا شرف حاصل کرنے کی وہ سعادت حاصل ہے جو ان کے اقران ومعاصرین کو حاصل نہیں، شاید یہی چیز ہے جس نے علم ومعرفت کے دریا ان کی زبان سے بہائے، ان کے خطبات ومواعظ اللہ سے تعلق جوڑنے، دنیا سے منہ موڑنے، آخرت کی تیاری کرنے، صفات ایمانی پیدا کرنے، دلوں میں سوز ورقت پیدا کرنے، دنیا کے زوال وفنا کی حقیقت دل میں بٹھانے صبر وشکر، علم وحلم، زہد وقناعت، تسلیم ورضا اور اتباع سنت و

---

(۱) سورۂ احزاب/۳۳۔

پاس شریعت کی طرف توجہ دلانے میں مہمیز کا کام کیا، ظاہر میں ان کی فصاحت و بلاغت اور سیل روانی میں اور باطن میں ان کی معرفت وتقویٰ میں ان کا کوئی ہم پلہ نظر نہیں آتا، جسے ان کی صحبت نصیب ہوگئی اس کو ولایت حاصل ہوگئی۔

دوسری شخصیت حضرت علی بن الحسین نبیرۂ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے جنھوں نے سیاست کے میدان کی خرابیوں کو دیکھ کر کہ وہ سیاست علی منہاج الخلافۃ الراشدۃ نہیں رہی تھی، اور اس میں دجل وفریب، قتل وغارت گری، حرص وہوس کا چلن تھی، کسرویت اور قیصریت سے مماثلت تھی، جلوت پر عزلت وخلوت کو ترجیح دی، ان کے یومیہ معمولات میں ہزار رکعت کا پڑھنا، لوگوں سے چھپ چھپا کر غرباء و مساکین کا پتہ لگانا اور ان کو ان کا رزق پہنچانا تھا، مہمان نوازی، صلہ رحمی، خادموں کے ساتھ درگزر، علم سے اشتغال اور حلم وتقویٰ پر ثابت قدمی یہ ان کے وہ اوصاف تھے جس سے ان کی محبوبیت ومقبولیت اتنی بڑھی کہ امراء وخلفاء کو ان پر رشک آتا، مشہور شاعر فرزدق کا ایک قصیدہ آپ کی شان میں ہے جس سے آپ کے مقام ومرتبہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حضرت علی بن الحسین امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کی عمر حضرت حسن بصری سے کم ہوئی، حضرت حسن بصری ولادۃً حضرت علی بن الحسین سے مقدم اور وفاۃً مؤخر ہیں، اس لیے حضرت حسن بصری کے تلامذہ، مسترشدین اور صحبت یافتہ ائمہ وعلماء کی تعداد بھی زیادہ ہے، اور پھر آپ کے خطب ومواعظ کی سحر انگیزی کی وجہ سے علمی و دینی فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے، ان میں حضرت عبدالواحد بن زید(۱) اور حضرت حبیب عجمی کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، ان کے بعد جو شخصیتیں دل کو موضوع بنا کر زیادہ نمایاں ہوئیں ان میں حضرت سفیان ثوری، حضرت فضیل بن

---

(۱) حضرت عبدالواحد بن زید کے اصول وطریقہ پر سلسلہ چشتیہ وجود میں آیا جس کی خیر القرون کی کڑیوں میں حضرت فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم بن ادہم کے نام نامی نمایاں اور تابناک ہیں، جن کے تذکروں سے مؤرخین نے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔

عیاض، حضرت ابراہیم ادہم، حضرت داؤد طائی، حضرت عبداللہ بن المبارک رحمہم اللہ کے نام خواص وعوام کی زبان پر آج بھی چڑھے ہوئے ہیں۔

یہ تقدس مآب شخصیتیں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کے مدرسہ تعلیم وتربیت سے جڑی تھیں جو صرف ایک علمی مدرسہ ہی نہیں بڑی تربیت گاہ بھی تھی، انھوں نے خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو دیکھا تھا اور بعض دوسرے صحابہ کو بھی اور بعض اکابر تابعین اور خانوادہ نبوت کے افراد سے تربیت وتعلیم حاصل کی تھی جیسے حضرت امام باقر، حضرت زید الشہید اور حضرت جعفر صادق وغیرہم، اور جن کا ایک سلسلہ تعلیم وتربیت تھا: أبو حنيفة عن حماد عن إبراهيم النخعي عن علقمة عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه.

علم ومعرفت میں مثال دی جانے والی شخصیت حضرت معروف کرخی ان ہی امام اعظم حضرت ابوحنیفہ نعمان بن ثابت رحمہ اللہ کے روحانی جانشین فقیہ داؤد طائی کے بیک واسطہ(۱) شاگرد وفیض یافتہ اور امام علی الرضا کے صحبت یافتہ اور ان کے ہاتھ پر اسلام کی طرف ہدایت پانے والے بزرگ ہیں، امام علی الرضا اپنے جدامجد حضرت علی بن الحسین کے سلسلۂ نسبی وروحانی کی سنہری کڑی ہیں جن کا عباسی خلیفہ مامون رشید نہایت درجہ معتقد تھا، حضرت معروف کرخی کے صرف ایک واسطہ سے مسترشد سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کی شخصیت ایسی مرجع خلائق ہوئی کہ جن پر آکر تقریبا سبھی سلاسل تصوف مجتمع ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ سلسلہ چشتیہ جس کے مشائخ دوسرے طریق سے حضرت حسن بصری سے ملتے ہیں، اس سلسلہ کے جلیل القدر شیخ حضرت ممشاد دینوری کا رشتہ استرشاد بھی حضرت جنید بغدادی سے قائم رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ سلسلہ سہروردیہ میں حضرت ممشاد دینوری کو ان ہی جنید بغدادی کا مسترشد و

---

(۱) یہ واسطہ حضرت ابن السماکؒ کا ہے، امام ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں حضرت معروف کرخیؒ کا حضرت ابن السماکؒ سے استفادہ کا ذکر کیا ہے، جن کا حضرت داؤد طائی سے استفادہ محقق ہے، امام ذہبی معروف کرخی کے بلاواسطہ ستفادہ کے قائل نہیں ہیں۔

خلیفہ قرار دیا جاتا ہے۔

اسلام کا فلسفہ اخلاق ان حضرات کے کام ومقام سے ایک جامع نظام صلاح وتربیت کے طور پر سامنے آیا اور اس سلسلہ میں لوگوں کے طبائع اور فطرتوں کا لحاظ کرتے ہوئے مشائخ وقت نے مجتہدانہ طریقے بھی اختیار کیے، اور تطہیر نفس اور تزکیہ قلب کے لیے مؤثر اصول بھی طے کیے اور شریعت کے حکمت واخلاق کے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا، پھر اللہ تعالیٰ نے علم اخلاق کی تدوین اور احسان اور اس کے اصولوں کی ترتیب کے لیے الگ الگ لوگ کھڑے کیے جنھیں اس کی خاص حس اور بصیرت و فراست عطا حاصل تھی، اللہ تعالیٰ کی زمین میں یہ سنت معلوم ہوتی ہے کہ وہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے اس پر اس کی وہ باتیں القاء فرماتا ہے جس کا دوسرے کے لیے تصور بھی محال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ جس سے جو خدمت لینا چاہتا ہے اس کے لیے اس میں مدد معاون وسائل و امور آسانی سے مہیا فرما دیتا ہے جہاں دوسرے کی رسائی ناممکن سی ہوتی ہے، اور جو جس راستہ میں اپنی تگ ودو لگاتا ہے وہاں اس کے لیے اس راستہ کے خفیہ امور جلی اور واضح ہو جاتے ہیں ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کا اعجاز بار بار ظاہر ہوتا ہے، تاریخ تصوف واحسان کے طالب علم کے لیے اسلام کے فلسفہ اخلاق واصلاح باطن کے نظام اور اصولوں کی تدوین وترتیب کے لیے اللہ تعالیٰ کا اپنے جن بندوں کے ساتھ خصوصی معاملہ رہا ہے ان میں چار برگزیدہ شخصیتوں کے ساتھ خاص اصطفائی واجتبائی معاملہ ٹھیک اسی طرح ظاہر ہوتا ہے جس طرح علم احکام شریعت کی تدوین وترتیب کے لیے اللہ تعالیٰ کا اپنے خاص بندوں کے ساتھ خصوصی معاملہ رہا ہے وذلك فضل الله يؤتيه من يشاء.

دین وشریعت کے مسائل کے استنباط میں ائمہ کے درمیان اختلاف، امت کے لیے رحمت بن کر سامنے آیا، جس کا بڑا فائدہ زمانہ کے تغیرات اور علاقوں وملکوں کے مزاج کے فرق میں نظر آیا، اسی طرح اخلاق اسلامی جسے تصوف و احسان اور

رہبانیت کا نام دیا جاتا ہے کے ائمہ اور اس کے سلاسل کے بانیان اور مشائخ کے انتخاب میں قدرت الٰہی کی حکمت کی کھلی کارفرمائی ظاہر ہوئی ہے، سلاسل تصوف خیر القرون کے عہد مبارک سے وجود میں آگئے تھے اور اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ احسانی فیض بھی دنیا کے چپہ چپہ میں پھیل گیا تھا، مگر ساتھ میں وہ باتیں بھی داخل ہونے لگیں جن کا تعلق علاقائی خصوصیات سے تھا، اور جن پر آبائی وموروثی عادات و اثرات کا عکس تھا، اور بعض اعمال واذکار کی زیادتی کی وجہ سے جن کا تحمل نہ ہوسکا، ایسی باتوں کا ظہور تھا جس سے دین کے دوسرے شعبے متاثر ہورہے تھے اور پھر دوسری طرف تمدن اور مادیت کے اثر سے رجوع الی اللہ اور اخبات وعبادت کا پہلو یا تو ختم ہورہا تھا یا نظرانداز کیا جارہا تھا۔

پانچویں صدی کی عظیم وعبقری شخصیت امام غزالی نے احیاء علوم الدین کے ذریعہ صحیح اسلامی ڈگر پر لانے کے لیے بڑا تجدیدی کارنامہ انجام دیا اور اسی زمانہ میں حضرت امام نووی نے اپنی کتابوں اور حدیث کی شرح وتدریس کے ذریعہ راہ اعتدال پر امت مسلمہ کو گامزن کیا پھر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے اسلام کے فلسفہ اخلاق کو مربوط ومنظم کرکے پیش کیا، اس سلسلہ میں ان کی کتاب فتوح الغیب اور ان کے مواعظ کا مجموعہ غنیۃ الطالبین شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، ان سے اللہ تعالیٰ نے اصلاح باطن اور تزکیہ نفس وتصفیہ قلب کا جو عظیم الشان کام لیا اور پھر ان کے سلسلہ ارشاد وبیعت میں وہ برکت اور قبولیت رکھی جس میں ان کا ہم پلہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ بعد کے مصلحین اور ائمہ سلوک واحسان بھی ان ہی کی لڑی میں پروے دکھائی دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کی انھیں امامت وقیادت عطا کی اور ان پر ایسے علوم ومعارف ملہم کیے جس کی روشنی کا سلسلہ لامتناہی تھا، انھوں نے تقرب الی اللہ اور ولایت وللّٰہیت کے لیے جو اصول طے کیے اس میں ایک خاص طریقہ کے ساتھ ذکر اور نماز اور صفات اختیار کرنے پر زور تھا، دوسری شخصیت حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ہے جن کے

طے کردہ اصولوں پر عمل کر کے کتنے سالکین طریقت، رہبران طریقت اور بڑے اولیاء اللہ بن گئے جن کے انفاس قدسیہ سے لاکھوں لوگ ہدایت یافتہ بنے، انھوں نے اپنے محل وقوع کا لحاظ کرتے ہوئے نفس کشی، چلہ کشی اور سوز عشق اور روزوں کی کثرت کو بنیادی اہمیت دی اور ذکر جہری پر خاص زور دیا۔

آپ کی آمد ایک ایسے دیار میں ہوئی تھی جہاں بت پرستی، اوہام پرستی، شرک وکفر کا دور دورہ تھا، معبودان باطل کی ندا لگائی جارہی تھی، غیر اللہ کی پرستش اس حد تک تھی کہ جس میں ذرا نفع یا ذرا نقصان پہنچانے کی حس محسوس کی جاتی اسے خالق خیر یا خالق شر سمجھ کر معبود مان لیا جاتا، ایسی وثنیت سے آلودہ فضا کو صاف کرنے کے لیے ذکر جہری ایک بڑا علاج تھا جس کے اثرات ظاہر ہوئے، دوسری طرف شیخ شہاب الدین سہروردی نے نظام تخلیق کائنات کی حکمتوں اور فوائد کو دیکھتے ہوئے سالک کے لیے نظم وترتیب اور نماز روزہ کے ساتھ اذکار وادعیہ ماثورہ اور تلاوت کلام پاک کے اہتمام پر زور دیا، حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند کے یہاں مراقبہ الٰہی، محاسبہ نفس، دعا ومناجات اور اتباع سنت پر زیادہ زور دیا گیا۔

ان کے اصولوں کو سب سے طاقتور طریقہ سے امام سرہندی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ نے پیش کیا اور اس میں بھی انھوں نے مجددانہ ومجتہدانہ طریقہ اختیار کرتے ہوئے ہر اس چیز کو جو رسم بن کر داخل ہو رہی تھی الگ کیا اور وہ توحید اور عقیدہ کے سلسلہ میں شمشیر برہنہ بن کر سامنے آئے، ان کے خلفاء ومتبعین کے ذریعہ ان کا فیض ملک شام، ترکی وغیرہ بھی پہنچا، چنانچہ ان کا یہ سلسلہ ایوان سلطنت میں بھی داخل ہوا، اور سلطان محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے ان ہی مشائخ کے زیر سرپرستی تربیت حاصل کی اور سلوک طے کیا، حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ حضرت سید آدم بنوری کے سلسلہ میں حضرت سید شاہ علم اللہ حسنی رائے بریلوی اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے والد رحمہم اللہ ایسے بزرگ ہوئے جنھوں نے اس نسبت کو

کامل طریقہ پر جذب کیا، حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی علیہ الرحمہ کے سلسلہ میں حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ خلیفہ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں اوران کے خلفاء نے اسی نسبت کے فیضان کو دنیا میں عام کردیا جن میں خاص طور سے شیخ خالد کردی قابل ذکر ہیں جن سے شام اورترکی میں بڑے وسیع پیمانہ پر اصلاح ہوئی اوراس کی برکات آج بھی ظاہر ہیں اور پھیل رہی ہیں، شام میں علامہ ابن عابدین اورترکی میں شیخ بدیع الزماں سعید النورسی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی عہد میں ایک انقلاب انگیز دینی وروحانی شخصیت امیر المومنین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی سامنے آئی جنھوں نے استحضار نیت، نماز، قرآن اوراتباع سنت کو طریقت کا لب لباب بتایا اوراسی منہج اصلاح وتربیت کا کام انجام دیا، پھر انھوں نے عملی طور پر ان تینوں سنتوں کو اختیار کرتے ہوئے معاشرہ اور جماعت کو اسی کے مطابق ڈھالا اور بارہ صدیوں کے بعد مکی ومدنی معاشرہ کو قائم کرنے کی کوشش کی، دعوت وتبلیغ کے لیے ملاقاتیں کیں، وفود بھیجے اور وفود کا استقبال کیا، ہجرت کا عمل کیا اور پھر جہاد اسلامی کی داغ بیل ڈالی، اوراس طرح مکی ومدنی خصوصیات کو جمع کیا، اور ظاہری وباطنی تمام سنتوں کو ان کے تمام پہلوؤں کے ساتھ زندہ کرنے کی کوشش کی، یہاں تک شہادت سے سرفراز ہوگئے اوراس مشن کو آگے بڑھانے میں آپ کے خلفاء اوران کے اتباع نے جان کی بازی لگادی، آپ کی اصلاح وتجدید کا سایہ آج بھی ملت اسلامیہ کے سر پر قائم دائم ہے، آپ کے خلفاء جاوا، مراکش سے تبت وچین تک پھیلے البتہ آپ کے خلفاء میں حضرت شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی، مولانا کرامت علی جونپوری، میاں نور محمد جھنجھانوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، علمائے صادقپور کا فیض زیادہ جاری ہوا، اور مشائخ عصر میں حاجی عبدالرحیم ولایتی، شاہ ابوسعید مجددی، شاہ صبغۃ اللہ راشدی نے آپ کی صحبت اٹھائی اور استفادہ باطنی کیا، اور حضرت شاہ عبدالرحیم ولایتی سے آپ کا سلسلہ بھی جاری ہوا، دوسری طرف حضرت

مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا کی اور ان کی خانقاہ ایک طرف طالبین علم شریعت، دوسری طرف طالبین سلوک و احسان کا مرکز بنی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی مکہ مکرمہ ہجرت فرما چکے تھے، اس کے باوجود ان کی طرف خواص ملت کا ایسا رجوع تھا جو کم کسی کی طرف دیکھنے میں آیا ہے۔

اس کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی شخصیتیں اپنے امتیازات کے ساتھ سامنے آئیں جنھوں نے تصوف وسلوک پر کتاب وسنت کی بالادستی قائم رکھی، اور حقوق العباد پر اس کی جزئیات کے ساتھ متوجہ کیا، اسی طرح اسی آخری دور کی شخصیات میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری، حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہم اللہ کے فیوض و برکات سے عرب وعجم مستفید ہوئے اور حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے درد وسوز سے عالمگیر تبلیغی تحریک وجود میں آئی جو چلتی پھرتی خانقاہ اور چلتا پھرتا مدرسہ ہے اور اس سے دنیا کے گوشہ گوشہ میں دین پھیل رہا ہے، ان تمام شخصیات سے عطر کشید کر کے جو شخصیت تیار ہوئی وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرہ آفاق شخصیت ہے جن کی عظمت کی گواہی مسجد حرام اور مسجد نبوی علی صاحبہ الف الف تحیۃ وسلام کے مناروں سے دی گئی، انھوں نے گزری ہوئی شخصیات سے کتابوں اور ان کے حالات کے مطالعہ سے استفادہ کیا اور ان شخصیات سے جن کو انھوں نے پایا خود خدمت میں حاضری دے کر مراسلت ومکاتبت کا رشتہ قائم کر کے استفادہ کیا اور ان کے مشن میں اپنا کردار پیش کر کے وہ اعتماد ومحبت حاصل کی جو مولانائے روم کو حضرت شمس تبریز کے یہاں ملی، حضرت سید احمد شہید کو حضرت شاہ عبدالعزیز کے یہاں ملی ہوگی رحمهم الله تعالیٰ رحمة واسعة۔

جہاں تک دنیا کے دوسرے ملکوں اور خطوں میں اصلاح قلب وتزکیۂ نفس کی کوشش کا حال ہے، مغربی افریقی ملکوں میں سلسلۂ شاذلیہ کو بڑا فروغ ملا، جس کی

نسبت امام ابوالحسن الشاذلی (الحسنی) کی طرف ہے، لیبیا میں سنوسی سلسلہ کے مشائخ اور مراکش و اندلس میں ادریسی حسنی سلسلہ کے مشائخ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، عراق وشام میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے نسبت رکھنے والے مشائخ نے بندگان خدا کے دلوں کو خالق و مالک حقیقی رب العالمین سے جوڑنے کے جو مساعی پیش کیں، اس کے اثرات صرف وہیں تک محدود نہیں رہے، بلکہ دنیا کے چپہ چپہ میں پھیل گئے، البتہ اس راہ سے جو بدعات آئیں، ان کے اصلاح کے لیے اللہ رب العزت نے پھر ایسی مصلح ومجدد شخصیتیں زمانی ومکانی فرق کے ساتھ کھڑی کیں جن سے پھر دین صحیح شکل میں لوگوں کے سامنے آگیا، اندلس کی شخصیتوں میں شیخ اکبر محی الدین ابن العربی اور صاحب تفسیر امام قرطبی اور بعض دوسری شخصیتیں اپنے اپنے عہد میں نمایاں رہیں، اور ان کی کتابوں اور تحقیقات سے آج بھی استفادہ کیا جارہا ہے، امام حافظ ابن تیمیہ علیہ الرحمہ پھر ان کے جانشین علامہ ابن القیم الجوزیہ بھی صحیح سلسلوں سے روحانی طور پر وابستہ رہے، جس طرح علمی طور پر صحیح سلسلوں سے وابستگی کا انھوں نے اہتمام کیا تھا، مسلکاً وہ حنبلی تھے اور مشرباً وہ قادری تھے اور یہ ایسا موضوع ہے جس پر لوگ اپنی اپنی تحقیقات پیش کر چکے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں ائمہ دین واعلام امت کی سیرت کا مطالعہ کریں تو ہمیں امام ابن قدامہ مقدسی، شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ، علامہ ابن القیم، امام شمس الدین ذہبی، علامہ ابن کثیر دمشقی، مفسر قرطبی، محدث ابن صلاح جیسی نابغہ عصر شخصیتیں سلوک و تصوف کے مردمیدان اور اس کے سلسلہ طلائے ناب کی زریں کڑیاں نظر آئیں گی۔

جہاں تک امام ابن تیمیہ کا تعلق ہے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ سلسلۂ قادریہ سے مجاز بیعت وارشاد تھے ان کے اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے درمیان تین واسطے ہیں، حتی کہ مشہور حنبلی امام موفق الدین ابن قدامہ صاحب المغنی بھی ان تینوں واسطوں میں درمیانی واسطہ ہیں۔

شیخ ابن عبد الہادی متوفی ۹۰۹ھ کا بیان ہے کہ ابن قیم اور ابن تیمیہ دونوں بزرگوں نے خرقۂ سلوک پہنا اور شیخ عبد القادر جیلانی تک علامہ ابن قیم کا سلسلہ سلوک وتصوف اس طرح ہے، ابن القیم م: ۷۵۱ھ از ابن تیمیہ م: ۷۲۸ھ از ابن ابی عمر ابن قدامہ م: ۶۸۲ھ از موفق الدین ابن قدامہ م: ۶۲۰ھ از ابوعمر بن قدامہ م: ۶۰۷ھ از شیخ عبد القادر جیلانی م: ۵۶۱ھ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

مشہور محدث ومؤرخ امام ذہبی علیہ الرحمہ نے خود اپنے روحانی استفادہ میں مشائخ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجھے خرقۂ تصوف ہمارے شیخ محدث زاہد، ضیاء الدین عیسیٰ بن یحییٰ انصاری نے قاہرہ میں پہنایا اور فرمایا کہ مجھے یہ خرقہ شیخ شہاب الدین سہروردی نے مکہ میں اپنے چچا شیخ ابوالنجیب کی طرف سے پہنایا تھا۔(۱)

اور مشہور محدث علامہ ابن صلاح نے بھی دو واسطوں سے امام ابوالقاسم قشیری سے اجازت وخلافت کا ذکر کیا ہے کہ مجھے بھی خرقہ پہنایا گیا۔

اور علامہ ابن کثیر علیہ الرحمہ سے متعلق ان کے شاگرد صفدی نے ان کے طریقہ شاذلیہ میں استفادہ اور اس سلسلہ میں منسلک ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور "الوافی فی الوفیات" میں وضاحت کی ہے کہ علامہ ابن کثیر نے سلسلۂ شاذلیہ میں سلوک طے کیا تھا۔

آخری دور کی شخصیتوں میں داغستان، الجزائر اور لیبیا میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اٹھنے والی تحریکات کے قائدین بھی صلاح قلب کی فکر کے ساتھ میدان میں سامنے آئے تھے جیسے امام شامل، عبد القادر الجزائری، شیخ محمد الشریف السوسی اور گزشتہ صدی کی عبقری شخصیت امام حسن البنا نے بھی اس کا بڑا اہتمام رکھا اور ان کی وابستگی سلسلہ شاذلیہ سے رہی، یہ ایک ایسی مسلسل تاریخ ہے جس میں انقطاع نظر نہیں آتا۔

راقم کے لیے بڑی سعادت وعزت کی بات ہے کہ اسے اپنے بزرگوں اور

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۲/ ۳۷۷۔

محسنوں کی طرف سے اسلام کے ان ارباب اصلاح وعزیمت کے تعلق سے تحریر پیش کرنے کا اشارہ ملا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق بھی عطا کی، اسی سے دعا ہے کہ وہ اسے شرف قبولیت بھی عطا کرے، اور اس کے نفع کو عام کرے۔

البتہ یہ احساس بار بار ابھرتا ہے کہ اصلاح نفوس کی تاریخ کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس کو صرف ایک نمونہ کی حیثیت حاصل ہے، کتاب جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگی، اس کا پہلا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے تابناک نمونوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ تربیت پانے والے درخشاں ستاروں کے حالات زندگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ اور نورچشمان سید الاولین والآخرین حضرت حسن و حضرت حسین رضی اللہ عنہم کی سیرت وحالات زندگی اور دینی مزاج وروح کی حفاظت کے لیے کیے گئے ان کے اقدامات کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم.“

سید محمود حسن حسنی ندوی

سہاگ پیلس (۱) — بوقت عصر بروز جمعہ

مدن پورہ ممبئی — صفر المظفر ۱۴۲۶ھ/ ۲۵ مارچ ۲۰۰۵ء

---

(۱) مقدمۂ کتاب کی حیثیت آغاز کتاب کی ہے، حسن اتفاق تھا کہ مصنف نے اس مبارک کام کا آغاز اس مقام سے کیا جہاں اس کے شیخ ومربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس سرہ نے اپنی متعدد کتابوں کا آغاز کیا تھا یا ان کا اکثر حصہ تحریر فرمایا تھا اور پھر ان کی تکمیل اس مقام پر انجام پائی تھی۔

راقم کے لیے یہ بات بڑی سعادت وشرف کی تھی کہ اسے حضرت کے جانشین مخدوم ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہم کی خدمت میں اس مقام پر قیام کا موقع ملا اور اس کی برکت اس طور پر کھلی ظاہر ہوئی، والفضل من اللہ وله الشكر الجميل والثناء الحسن. (محمود)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب اول

بعثت ومقاصد بعثت، دعوت وتعلیم دین، اصلاح وتربیت اور تزکیہ واحسان

حکیم الاسلام اور عالم اسلام کی شہرۂ آفاق علمی وفکری دینی رہنما شخصیت اور نادرۂ روزگار ہستی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۳۲ھ-۱۴۲۰ھ) بارہویں صدی ہجری کی عہد آفریں شخصیت احیاء دین واشاعت کتاب وسنت اور اسرار ومقاصد شریعت کی نابغہ روزگار ہستی حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کے حوالہ سے واضح کرتے ہیں کہ:

> ''سب سے کامل بعثت اس نبی کی ہوتی ہے جس کی بعثت ''مقرون'' ہوتی ہے یعنی اس کی بعثت کے ساتھ ایک پوری قوم تبلیغ و دعوت پر مامور اور اس کے فیض صحبت سے تیار ہوکر دوسرے انسانوں کی تعلیم وتربیت کا ذریعہ بنتی ہے، نبی کی بعثت بالاصالت ہوتی ہے (اور اس کو نبوت کہتے ہیں) امت کی ماموریت اور تفویض خدمت کی نوعیت بالواسطہ وبالنیابہ ہوتی

ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی ہی جامع بعثت تھی
جس کے ساتھ ایک پوری امت کو آپ کے منصب نبوت کی
خدمت واشاعت کے لیے ''جارحہ'' اور ''آلہ کار'' بنایا گیا، اور
اس کے لیے بعثت اور بعثت کے ہم معنی الفاظ استعمال کیے گئے
ہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ (۱)

جتنی امتیں پیدا ہوئیں تم ان میں سب سے بہتر ہو، لوگوں کو نیک
کام کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو)۔

اور حدیث میں بعثت ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم
نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ." (۲)

(تم تیسیر (آسانی پیدا کرنے کے لیے) پیدا کیے گئے ہو، تعسیر
(مشکلات پیدا کرنے کے لیے) مبعوث نہیں کیے گئے ہو)۔

اس کا مخاطب امت محمدیہ کا وہ گروہ ہے جس کی خود تربیت اور رہنمائی
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اس مقدس گروہ کے لیے جس کو صحابہ کا
ٹائٹل ملا، تنہا یہ فضیلت ہی کافی تھی کہ اس کے ایک ایک فرد نے دین وقرآن کی دولت
بلاواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی اور دین وقرآن کی حفاظت اور اس کو
تحریف سے بچانے اور کتر بیونت سے محفوظ رکھنے کا سب سے پہلا ذریعہ بنے، اور
دین کے تمام شعبوں اور گوشوں کا یہی سرچشمہ ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

---

(۱) آل عمران/۱۱۰۔ (۲) تاریخ دعوت وعزیمت ۲۳۴/۵

''امام ابن تیمیہ یہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ اس وقت مسلمانوں کے پاس علم ودین کا جو کچھ سرمایہ ہے، خیر و برکت کا جو کچھ ذخیرہ ہے، شعائر اسلام کی بلندی، اسلام کی اشاعت، عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیق خیر ہے اور سچ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ صلاح و خیر نظر آرہی ہے۔ وہ سب صحابہ کرام کی جاں فشانیوں، اخلاص، علو ہمت، ایثار، اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت و نورانیت ہے، امام ابن تیمیہؒ بڑے جوش سے لکھتے ہیں:

"وأما الخلفاء والصحابة فكل خير فيه المسلمون إلى يوم القيامة من الإيمان والإسلام والقرآن والعلم والمعارف والعبادات ودخول الجنة والنجاة من النار وانتصارهم على الكفار وعلو كلمة الله فإنما هو ببركة ما فعله الصحابة الذين بلّغوا الدين وجاهدوا في سبيل الله وكل مؤمن آمن بالله فللصحابة رضى الله عنهم عليه فضل إلى يوم القيامة وكل خير فيه الشيعة وغيرهم فهو ببركة الصحابة، وخير الصحابة تبع لخير الخلفاء الراشدين فهم كانوا أقوم بكل خير في الدين والدنيا من سائر الصحابة."(۱)

(اس وقت سے لے کر قیامت تک مسلمانوں کے پاس جو کچھ خیر ہے مثلاً ایمان و اسلام، قرآن، علوم و معارف، عبادات، دخول جنت، جہنم سے نجات، کفار پر غلبہ، اللہ کے نام کی بلندی، وہ سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی برکت ہے، جنھوں نے دین

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۲/ ۲۹۹ بحوالہ منہاج السنۃ ۳/ ۲۴۵

کی تبلیغ کی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا، جو مومن بھی اللہ پر ایمان لایا اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا، اور شیعہ وغیرہ کو بھی جو کچھ خیر حاصل ہے وہ صحابہ کرام کی برکت سے، اور صحابہ کرام کی خیر خلفاء راشدین کی خیر کی تابع ہے، اس لیے کہ وہ دین و دنیا کی ہر خیر کے ذمہ دار و سرچشمہ تھے)۔

دنیوی تمدن کا عروج اور انسانیت کی زبوں حالی

وہ زمانہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی انسانیت کی صبح صادق کے طلوع ہونے کا زمانہ تھا، ایرانی و رومی اقتدار و حکومت اور ان کے رعب و دبدبہ کا زمانہ تھا، ان کے نزدیک وہ ترقی کے اعلیٰ معیار پر اور تہذیب وتمدن کی اعلیٰ کسوٹی پر قائم تھے، حالانکہ وہ حقیقتاً جاہلیت اور حیوانیت کی تمام تر حدود کو پار کر کے شیطنت کو مات دے رہے تھے، جس طرح آج کی قومیں اپنی تہذیب و ثقافت اور تمدن کو دنیوی ترقی کا اعلیٰ معیار اور انسانیت کا نجات دہندہ اور ان کو اپنے فکر و خیال میں قید بامشقت سے رہائی اور آزادی کا ذریعہ قرار دے رہی ہیں، حالانکہ اس مغربی تہذیب وتمدن نے انسانوں کو حیوان سے بدتر اور شیطان سے زیادہ بدکردار بنادیا ہے، جس طرح آج کی سائنسی ترقی نظر آرہی ہے اور اس کے نتیجہ میں اخلاقی قدروں کی پامالی سامنے ہے ٹھیک اسی طرح اس وقت کی برسر اقتدار قومیں اپنی ترقی اور اپنے تمدن وتہذیب کو ہی قابل تقلید اور تمام قوموں کے لیے نجات کا ذریعہ سمجھتی ہیں، آج وہی جاہلیت پھر عود کر آئی ہے اور جس طرح اس جاہلیت کا خاتمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اعلان توحید اور اسوۂ حسنہ کے ذریعہ اور اپنے اصحاب کرام کے کردار کے ذریعہ کیا تھا آج نئی جاہلیت کے خاتمہ کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کے کردار کو اپنائیں، قبل از بعثت جاہلیت کی تصویر میں موجودہ جاہلیت کا عکس نظر آئے گا،

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے قلم سے اس کا نقشہ کھینچا ہے، اس سے پہلے وہ اپنے تمہیدی الفاظ میں لکھتے ہیں:

''عہد جاہلیت اگرچہ عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھا، وہ ایک عالمگیر اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی و سیاسی بحران تھا جو ساری دنیا پر محیط تھا، لیکن ایرانی اور رومی اس کے قائد اور اصل ذمہ دار تھے کہ انھیں کا تمدن اس وقت دنیا میں معیاری سمجھا جاتا تھا اور اسی کی تقلید ہر جگہ کی جاتی تھی اور انھیں کے ممالک مرکزی شہر اور معاشرہ سب سے زیادہ اس کی زد میں تھا، اس صورت حال کا جو نقشہ شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے کھینچا ہے اور اس کے جو اسباب بیان کیے ہیں اس سے بہتر نقشہ سیرت و تاریخ کی کسی کتاب میں جو دور ماضی میں لکھی گئی ہو اور فلسفۂ تاریخ اور علوم عمرانیہ کے کسی فاضل کے قلم سے دیکھنے میں نہیں آیا، یہاں پر آکر شاہ صاحب علیہ الرحمہ کا قلم اپنے پورے جوہر دکھاتا ہے اور ان کی قوت تحریر اور حسن انشا اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے، یہ مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے کہ اس سے شاہ صاحب کی تاریخ پر گہری نظر، حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت اور صورت حال کے صحیح تجزیہ کی خداداد قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے، شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے، آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامان راحت میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کرلی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست

میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے، دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے صناع، اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے، جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا، اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی، اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو۔(۱)

یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزء بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ بس گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے، اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا، یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا، ہر شہری پر پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو

---

(۱) شاہان دہلی اور مغل بادشاہوں کی طرف اشارہ ہے۔

زندگی سے عاجز کر دیا تھا، اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔

بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشتکاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں، اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں، اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے، جس سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا، اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے، اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔

اس پر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادتِ اُخروی کا بھی خیال کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔"(۱)

جاہلیت کا مقابلہ اور توحید کی نداء

انسان کا جب جب اللہ پر یقین و اعتماد کمزور ہوتا ہے تو اپنی طاقت کا غرور لامحالہ بڑھتا جاتا ہے اور اسی کے سبب انسان اللہ کے عطا کیے ہوئے سارے ذرائع و وسائل کو اپنا ہنر اور اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ سمجھتا جاتا ہے، اسی لیے ساری خرابیوں کا علاج حضرات انبیاء کرام شرک و مظاہر شرک اور اسی کے اثر سے کفر و الحاد اور ظلم و استبداد اور حیوانی اعمال و عادات بے راہ روی بے حیائی اور آزاد خیالی اور دنیوی ساز و سامان

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۲۳۶-۲۳۷ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ ۱/۱۰۴-۱۰۷

سے حد سے زیادہ لطف اندوزی اور اس میں اسراف وتبذیر اور دنیوی طور وطریق میں نام ونمائش اور دوسروں پر غلبہ وتفوق کا اظہار اور شان وشوکت کا معاملہ سامنے آتا ہے، اس لیے انبیاء کرام معاشرہ کو گھن کی طرح کھا جانے والی بیماریوں کو دیکھتے ہیں تو وہ اس کا علاج صرف اسی میں پاتے ہیں کہ ان کی توجہ اللہ اور یوم آخرت کی طرف مبذول کرائیں اور یہ باور کرائیں کہ قادر مطلق، علیم وخبیر، سمیع وبصیر اور رازق حقیقی، مالک کل اور ہر شئی کی پرورش کرنے والی ذات صرف ایک اللہ رب العالمین کی ہے، درحقیقت بڑا وہی ہے اور ہر شئی مخفی ہو یا ظاہر اسی کے بنائے ہوئے نظام کے تحت گھڑی کی سوئی کی طرح چل رہی ہے اور اس کی مشیت کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے جو بھی ضرورت ہو اسی کے سامنے رکھو، اسی سے لو لگائے رہو، اور اپنے طور وطریق کو اسی کی منشاء کے مطابق کرو، اور شیطان کے راستہ پر نہ پڑو، حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر نبی آخر الزماں سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سب اسی کی تاکید وتلقین کرتے آئے اور سبھی کا شعار اور پہلی دعوت یہی رہی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ نے اس تاریخی وایمانی حقیقت کو بہت واضح انداز میں یوں لکھا ہے:

> ”اس دین کا سب سے پہلا امتیاز اور نمایاں شعار عقیدہ پر زور اور اصرار، اور سب سے پہلے اس کا مسئلہ حل کر لینے کی تاکید ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام ایک معین عقیدہ کی (جو ان کو وحی کے ذریعہ ملا تھا) دعوت دیتے، اور اس کا مطالبہ کرتے رہے، اور اس کے مقابلہ میں کسی مفاہمت یا دست برداری پر تیار نہ ہوئے، ان کے نزدیک بہتر سے بہتر اخلاقی زندگی، اور اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی کردار کا حامل، نیکی وصلاح، سلامت روی اور معقولیت کا زندہ

پیکر اور مثالی مجسمہ، خواہ اس سے کسی بہتر حکومت کا قیام، کسی صالح معاشرہ کا وجود، اور کسی مفید انقلاب کا ظہور ہوا ہو، اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا جب تک وہ اس عقیدہ کا ماننے والا نہ ہو، جس کو وہ لے کر آئے اور جس کی دعوت ان کی زندگی کا نصب العین ہے اور جب تک اس کی یہ ساری کوششیں اور کاوشیں صرف اس عقیدہ کی بنیاد پر نہ ہوں، یہی وہ حد فاصل، واضح اور روشن خط ہے جو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت، اور قومی رہنماؤں، سیاسی لیڈروں، انقلابیوں اور ہر اس شخص کے درمیان کھینچ دیا گیا ہے جس کا سرچشمۂ فکر و نظر انبیاء کرام کی تعلیمات اور ان کی سیرتوں کے بجائے کوئی اور ہو۔"(۱)

"حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ جو علوم و معارف انسانوں تک پہنچے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ اور ضروری و اہم علم خدا تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کا علم اور اس مخصوص تعلق کا تعین ہے جو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان حائل ہونا چاہیے، یہ علم سب سے برتر و افضل علم ہے، اس لیے کہ اس پر انسانوں کی سعادت و فلاح دنیوی اور نجات اخروی پر موقوف ہے، اور یہی عقائد و اعمال اور اخلاق و تمدن کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ انسان اپنی حقیقت سے واقف ہوتا، کائنات کی پہیلی بوجھتا اور زندگی کا راز معلوم کرتا ہے، اسی سے اس عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرتا اور اس کی بنیاد پر اپنے ہم جنسوں سے اپنے

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت ۵/۱۳۳ بحوالہ دستور حیات ص/۲۱-۲۲، اس کتاب میں آیات قرآنی اور انبیاء علیہم السلام کے اسوہ کی مدد سے اس کے شواہد و دلائل پیش کیے گئے ہیں، اور حدیث و سیرت کے واقعات سے اس کو مدلل کیا گیا ہے۔

تعلقات استوار کرتا ہے اور اپنے مسلک زندگی کے بارے میں فیصلہ اور پورے اعتماد و بصیرت اور وضاحت کے ساتھ اپنے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔"(۱)

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ جو خصوصی رابطہ اور تائید و نصرت، رضا و محبت، اور غلبہ و عزت کا جو مؤکد وعدہ ہے، وہ محض عقائد صحیحہ، ایمانی صفات و خصوصیات اور خاص طور پر خالص اور بے آمیز عقیدۂ توحید کی بناء پر ہے، ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ (۲)

(اور (دیکھو) بے دل نہ ہونا اور نہ کسی طرح کا غم کرنا، گر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب ہو گے)۔

نیز کھلے لفظوں میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا، يَعْبُدُوْنَنِي لَا يُشْرِكُوْنَ بِي شَيْئًا وَّمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ (۳)

(جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے، ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۱۳۳ بحوالہ دستور حیات ص/۶۰

(۲) سورۂ آل عمران/۱۳۹۔ (۳) سورۂ النور/۵۵۔

امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے (اور) میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں)۔

انبیاء کے نائبین برحق، اور علمائے ربانی جو دین اللہ کی فطرت اور اس کے مزاج سے واقف ہوتے ہیں وہ اس کو کسی جگہ پر قائم کرنے کے لیے پہلے زمین کو پورے طور پر صاف وہموار کرتے ہیں، وہ شرک اور جاہلیت کی جڑیں اور رگیں (خواہ وہ وثنیت قدیمہ کی یادگار رہوں یا قومی و مقامی اثرات کا نتیجہ) چن چن کر نکالتے اور ان کا ایک ایک بیج بن بن کر پھینکتے ہیں اور مٹی کو بالکل الٹ پلٹ دیتے ہیں، چاہے ان کو اس کام میں کتنی ہی دیر لگے، اور کیسی ہی زحمت اٹھانی پڑے، وہ نتیجہ کے حصول میں کبھی عجلت اور بے صبری سے کام نہیں لیتے۔(۱)

"شرک (مختلف شکلوں میں) نوع انسانی کی سب سے خطرناک اور پرانی بیماری ہے، وہ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکانے کے ماسوا، بندوں کے روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑا ہے، وہ انسان کی قوتوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے، ان کی صلاحیتوں کا خون کرتا ہے، قادر مطلق پر اس کے یقین، اس کی خود اعتمادی اور خود شناسی کا خاتمہ کر دیتا ہے، اور سمیع وبصیر اور صاحب قدرت و علم، صاحب جود و عطا اور مغفرت و محبت والے خدا کی محفوظ و مستحکم پناہ سے نکال کر اور اس کے لامحدود صفات، اور نہ ختم ہونے والے خزانوں کے فوائد سے محروم کر کے

---

(۱) تاریخ دعوت و عزیمت ۵/۱۳۳-۱۳۴۔

کمزور و عاجز، فقیر وحقیر مخلوقات کے زیر سایہ پناہ لینے پر مجبور
کر دیتا ہے، جن کی جھولی میں کچھ نہیں۔"(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی اس کا عادی بنایا، چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن بھیجا تو پہلے نمبر پر اسی بات کی تاکید کی "فليكن أول ما تدعوهم إلى أن يوحدوا الله" الخ. یعنی پہلی دعوت، دعوت توحید ہو۔(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اندیشہ اور قرآن مجید سے تعلق بڑھانے کا مشورہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھلی امتوں کا جو حال دیکھا، اور انسانوں کی ابتر حالت دیکھی اور جاہلیت کی بدترین صورتحال کا سامنا کیا اور پھر اس کا مقابلہ کیا اور پھر استخلاف فی الارض حاصل ہو جانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے آپ کے اسوۂ حسنہ کو رواج دے کر جاہلیت کی بیخ کنی کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے سلسلہ میں جس بات کا زیادہ خطرہ تھا وہ اسی عقیدہ توحید کے سلسلہ کی لغزش کھا جانے اور خرافات و واہیات، بدعات اور مشرکانہ رسوم و عادات کا شکار ہو جانے کا تھا۔(۳)

تفہیمات میں حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی نقل کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۱۳۵/۵ بحوالہ منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین ص/۲۷۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب التوحید۔ (۳) تفہیمات میں شاہ صاحب لکھتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ تم مسلمان بھی آخر کار اپنے سے پہلے کی امتوں کے طریقہ اختیار کر لوگے اور جہاں جہاں انھوں نے قدم رکھا ہے، وہاں تم بھی قدم رکھوگے، حتی کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں گھسے ہیں تو تم بھی ان کے پیچھے جاؤگے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور کون؟ اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے (تاریخ دعوت وعزیمت ۱۳۸/۵)

وسلم کی امت کے آنے والے افراد کے لیے فکر وتڑپ اور امت کی بے راہ روی کا ذکر کر کے اس کا علاج بھی بتایا ہے کہ قرآن مجید سے تعلق بڑھایا جائے اور درحقیقت یہ ایسا علاج ہے کہ جس کی طرف خود اللہ تعالیٰ نے پوری صراحت فرمادی ہے:

﴿ الٓر. كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ الخ. (۱)

(الر، یہ کتاب ہے جسے ہم نے آپ کی طرف اتارا ہے تا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکال کر لائیں)۔

خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تركت فيكم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة نبيه." (۲)

(کہ ہم تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ کر جارہے ہیں جب تک تم ان کو مضبوطی سے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہوگے:
۱۔ کتاب اللہ ۲۔ سنت رسول اللہ)۔

تو اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا امت سے مطالبہ کیا اور تقاضا فرمایا۔

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

"شاہ صاحبؒ نے اس مرض بلکہ وبائے عام کے علاج کے لیے قرآن مجید کے مطالعہ وتدبر اور اس کے فہم کو سب سے مؤثر علاج سمجھا...... اور یہ بات محض ذہانت، قوت مطالعہ اور قیاس پر مبنی نہیں تھی بلکہ یہ ایسی بدیہی حقیقت تھی جس پر قرآن مجید خود شاہد اور نہ صرف عہد بعثت کی تاریخ بلکہ اسلام کی پوری تاریخ دعوت اور سرگزشت اصلاح وتجدید گواہ ہے، خاص طور پر حقیقت توحید

---

(۱) سورۂ ابراہیم/۱-۲۔ (۲) مؤطا امام مالک باب النهي عن القول في القدر، حدیث نمبر/۱۵۹۴۔

اور حقیقت شرک کو ظاہر کرنے کے لیے اس سے زیادہ واضح اس سے زیادہ طاقتور اور دل نشین ذریعہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا، ترجمان قرآن شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے مقدمہ ''موضح القرآن'' میں جتنے سادہ اور دل نشین انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے اس سے زیادہ مشکل ہے، فرماتے ہیں:

''بتانے والے بہتیرا بتائیں جیسا خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں آپ کو بتایا ہے ویسا کوئی نہیں بتا سکتا اور جیسا اثر اور راہ پانا خدا کے کلام میں ہے کسی کے کلام میں نہیں۔'' (۱)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں قرآن مجید کی تعلیمات و ہدایات اور قصص و احکام میں جو رنگ اور عکس تھا وہ کوئی مخفی چیز نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں وہ رنگ اس درجہ چڑھ گیا تھا کہ جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو ایسے بلیغ جملہ میں جواب دیا کہ عقلیں دنگ رہ جائیں اور یہ جملہ اسی کو ادا کرنے کا حق حاصل ہے جسے شب و روز گھر اور باہر کی زندگی اطمینان و پرسکون لمحات اور ہنگامی حالات سبھی میں رفاقت رہی ہو، وہ جملہ یہ تھا ''كان خلقه القرآن'' (۲) اور خود قرآن نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق عالیہ کی ایک ہی جملہ میں وضاحت کردی ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (۳) اور قرآن مجید میں ہی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی ایک آیت میں یوں تعریف کی:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعاً سُجَّداً يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۱۴۰-۱۴۱ بحوالہ مقدمہ موضح القرآن۔

(۲) الأدب المفرد بأحكام الألباني باب من دعا الله أن يحسن خلقه. (۳) سورۂ قلم/۴۔

وَرِضْوَاناً سِيمَاهُمْ فِيْ وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِيْ التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِيْ الإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْراً عَظِيماً﴾(۱)

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور جولوگ ان کے ساتھ ہیں وہ انکاریوں پر زورآور ہیں اور آپس میں مہربان ہیں آپ انھیں رکوع اور سجدہ کرتے دیکھیں گے، اللہ کا فضل اور خوشنودی چاہتے ہیں ان کی علامتیں سجدوں کے اثر سے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں ان کی یہ مثال تورات میں ہے اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے جیسے کھیتی ہو جس نے اکھوا نکالا پھر اس کو مضبوط کیا پھر وہ موٹا ہوا پھر اپنے تنے پر کھڑا ہوگیا کھیتی کرنے والوں کو بھانے لگا تا کہ وہ ان سے انکار کرنے والوں کو جلا دے، ان میں سے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے ان سے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کر رکھا ہے)۔

اسی طرح قرآن مجید کی تلاوت اور اس کا مطالعہ اس کا فہم و تدبر اور جس ذات عظیم پر اللہ رب العزت نے قرآن پاک اتارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی سیرت و کردار اور ان کی ایمانی و عملی زندگی کا مطالعہ اور اسی کی روشنی میں برابر اپنی زندگی کا جائزہ لینے رہنے ہی سے انسان کا اپنا عقیدہ وعمل اللہ کی مرضی کے مطابق اور سالم و محفوظ رہ سکتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے امت پر احسانات میں سے بڑا احسان یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ کی

---

(۱) سورۂ فتح/۲۹۔

درستگی کے ساتھ امت کا قرآن مجید سے تعلق بڑھایا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور آپ کی سیرت پاک کے گوشے قرآن مجید کے حقائق معانی اور مفاہیم کو کھولنے والے اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو قرآن مجید کی بہترین عملی تفسیر ہے۔

شریعت محمدی مکمل ترین جامع ترین اور معقول ترین شریعت ہے

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''آپ کی شریعت مکمل ترین شریعت ہے، کوئی ایسی معقول اور بھلی بات نہیں جو عقلی طور پر معقول و مستحسن ہو اور آپ نے حکم نہ دیا ہو، اور کوئی ایسی نامناسب اور قبیح بات نہیں جس کو عقل نامناسب اور قبیح سمجھتی ہو اور آپ نے اس سے نہ روکا ہو، آپ نے کسی ایسی بات کا حکم نہیں دیا جس کے متعلق آج یہ کہنے کا موقع ہو کہ کاش آپ اس کا حکم نہ دیتے، اور نہ کسی ایسی چیز کی ممانعت کی کہ آج یہ کہا جاسکے کہ کاش آپ اس کی ممانعت نہ کرتے، آپ نے تمام پاکیزہ صاف ستھری چیزوں کو حلال کیا، اور ان میں سے کسی چیز کو حرام نہیں کیا جیسا کہ بعض شریعتوں میں حرام کیا گیا تھا، اور تمام ناپاک اور گندی چیزوں کو حرام کیا، ان میں سے کسی چیز کو حلال نہیں کیا جیسے کہ بعض شریعتوں میں حلال ہوئیں، دنیا کی تمام قوموں کے پاس جتنی خوبیاں اور محاسن ہیں، اس شریعت میں وہ سب جمع ہیں، تورات وانجیل و زبور میں اور اس کے فرشتوں اور یوم آخرت کے متعلق جو اطلاعات ہیں، وہ مکمل ترین طریقہ پر قرآن میں اور آپ کی شریعت میں آ گئی ہیں، اور کچھ ایسی چیزوں کی بھی اطلاع دی گئی ہے جن کا ان

کتابوں میں تذکرہ نہیں، ان کتابوں میں عدل کی ضرورت، صحیح فیصلہ، فضائل کی دعوت اور حسنات کی جو کچھ ترغیب آئی ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے اور اس پر اضافہ کیا، اگر کوئی عقلمند ان عبادات کے بارے میں غور کرے گا جو اسلام میں مشروع ہیں اور دوسری قوموں کی عبادتوں پر بھی غور کرے گا تو اسلامی عبادات کی برتری اور فوقیت ظاہر ہوگی، یہی حال تمام حدود واحکام اور شریعت کے مسائل وقوانین کا ہے۔"(۱)

"اس سلسلہ میں انھوں نے عبادات کا مقصود اور اس کے بارے میں مختلف گروہوں کے مذاہب اور نقطہ نظر کا ذکر کرنے کے بعد اسلامی عبادات کے مقاصد واسرار اور فوائد وآثار پر بڑی حکیمانہ بحث کی ہے۔"(۲)

"پھر ثابت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صدق وعدل کا نمونۂ کامل تھے اور آپ کے خلفائے راشدین اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنی زندگی اور حکومت وخلافت اور معاملہ وسیاست میں اس صدق وعدل کا اظہار کیا اور ایسے زہد وورع کی زندگی گزاری جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔"(۳)

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۲۸۰ بحوالہ الجواب الصحیح ۴/۸۱-۸۲
(۲) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۲۸۰ بحوالہ الجواب الصحیح ۴/۱۰۴-۱۱۰
(۳) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۲۸۱ بحوالہ الجواب الصحیح ۴/۱۱۹

تزکیہ واحسان

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "تفہیمات الٰہیہ" میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چیز کی طرف دعوت دی، ان میں سب سے مہتم بالشان تین امور ہیں:

۱- تصحیح عقائد، جس کا ذمہ علمائے امت کے اہل اصول نے اٹھایا۔
۲- اعمال کو صحیح طور پر ادا کرنا، اس فن کو فقہائے امت نے اپنے ذمہ لیا۔
۳- احسان، جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"یہ تیسرا جزو شریعت کے مقاصد کا سب سے وقیع فن ہے اور بہت گہرا ہے، جملہ شرائع کے مقابلہ میں جو بمنزلۂ روح ہے بدن کے مقابلہ میں، اس فن کا تکفل صوفیاء نے کیا ہے، انھوں نے خود ہدایت پائی اور دوسروں کو ہدایت فرمائی اور انتہائی سعادت کے ساتھ کامیاب ہوئے۔"(۱)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے تزکیہ کی بڑی جامع تعریف فرمائی ہے وہ یہ کہ:

"انسانی نفوس کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ اور رذائل سے پاک وصاف کیا جائے۔"(۲)

---

(۱) ملاحظہ ہو "تفہیمات الٰہیہ، از حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ (۲) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک/۱۵

اور وہی اس کی کی مزید تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

''زبان نبوت اسلام وایمان کے ساتھ ایک خاص درجہ اور مرتبہ کا ذکر کرتی ہے، اور اس کو احسان سے تعبیر کرتی ہے، جس سے مراد یقین واستحضار کی وہ کیفیت ہے، جس کے لئے ہر صاحب ایمان کو کوشاں ہونا چاہئے اور جس کا شوق ہر مرد مومن کے دل میں موجزن ہونا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ''احسان'' کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا'' تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو، اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔''(۱)

دوسری طرف مولانا رحمۃ اللہ علیہ شریعت اسلامی اور سنت نبوی کو دو حصوں پر منقسم کرتے ہوئے ظاہری افعال وحرکات اور امور محسوسہ سے متعلق احکام شریعت وتعلیمات سنت کو فقہ ظاہر اور اور باطنی کیفیات وامور غیر محسوسہ کو فقہ باطن کا نام دیتے ہیں اور اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

''جب ہم شریعت اسلامی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واحوال پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دو حصوں پر منقسم تھے، ایک کا تعلق افعال وحرکات اور امور محسوسہ سے تھا، مثلاً قیام وقعود، رکوع وسجود، تلاوت وتسبیح، اذکار وادعیہ، احکام ومناسک، فن حدیث نے اس کی روایت اور تدوین کی خدمت انجام دی، علم فقہ نے اس سے مسائل وجزئیات استخراج کرنے کا بیڑا اٹھایا، اور محدثین اور فقہائے امت نے (اللہ تعالیٰ ان کو اس کار عظیم کا بہترین صلہ عطا فرمائے) دین کو اس طرح محفوظ

---

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک/۱۵

کردیا کہ امت کے لئے اس پر عمل پیرا ہونا آسان ہوگیا۔

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق ان باطنی کیفیات سے ہے، جو ان افعال وحرکات کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قیام وقعود، رکوع وسجود، ذکر ودعا، وعظ ونصیحت، گھر کے ماحول، میدان جہاد، غرض ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہیں، ان کیفیات کی تعبیر ہم اخلاص واحتساب، صبر وتوکل، زہد واستغناء، ایثار وسخاوت، ادب وحیا، خشوع وخضوع، انابت وتضرع، دعا کے وقت دل شکستگی، دنیا پر آخرت کو ترجیح، رضائے الٰہی، اور دیدار کا شوق اور اس طرح کی اور دوسری باطنی کیفیات اور ایمانی اخلاق سے کر سکتے ہیں، جن کی حیثیت جسم میں روح کی اور ظاہر میں باطن کی ہے، پھر ان عنوانات کے تحت اور بہت سی جزئیات اور آداب واحکام ہیں، جنہوں نے اس کو ایک مستقل علم اور علیحدہ فقہ کا درجہ دے دیا ہے، چناں چہ اگر اس علم کو جو اول الذکر کی شرح وتفسیر سے متعلق ہے، فقہ ظاہر کہا جا سکتا ہے، تو وہ علم جو ان کیفیات کی تشریح کرتا ہے اور ان کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا ہے "فقہ باطن" قرار دیا جا سکتا ہے۔

زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ ہم اس علم کو جس کا کام تزکیہ نفوس اور تہذیب اخلاق ہے اور جو نفس انسانی کو فضائل شرعیہ سے آراستہ اور نفسانی واخلاقی رذائل سے پاک وصاف کرتا ہے، اور کمال ایمان ودرجۂ احسان، اخلاق نبوی کی پیروی، روحانی وباطنی کیفیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع وتقلید کی دعوت

دیتا ہے، ''تزکیہ'' یا ''احسان'' ہی کے نام سے یاد کرتے یا کم ازکم فقہ باطن ہی کہتے۔''(۱)

تعلیم کے ساتھ تزکیہ کی ضرورت

دین وشریعت کے ایک طرف ظاہری احکام ہیں، جن کو پیش کرنے کا کام علماء ومحدثین نے کیا جن سے مسائل کے استنباط اور اس کی درجہ بندی فقہاء نے کی، اور حرام وحلال، جائز وناجائز، فرض، واجب، سنت، مستحب، مباح، مکروہ اور پھر اس کی بھی قسمیں کیں کہ مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی وغیرہ ان سب کو فقہاء ظاہر شریعت نے اپنا موضوع بحث بنایا، اور فقہی کتابوں کی تدوین میں انہی پر سارا زور صرف کیا، اور تعلیم وتدریس میں انہی کے دلائل اور اختلاف پیش کئے، لیکن ان کی مقصدیت اور روح کو یکسر نظر انداز کیا، جس سے اعمال اپنی صورتوں کے ساتھ تو سامنے آئے لیکن روح سے خالی رہے، گویا قالب بغیر قلب کے وجود میں آیا، جب کہ صحابہ اور تابعین قالب شریعت کے ساتھ اس کے قلب وروح سے بھی بحث کرتے تھے، اس لئے کامیابی اسی سے جوڑ دی گئی ہے اور فلاح اسی کے ساتھ وابستہ کردی گئی ہے، جیسے کہ ارشاد ربانی ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ﴾(۲)

اسی طرح جیسے کہ حدیث میں وارد ہوا ہے:

"من صام رمضان إيماناً واحتساباً غفرله ما تقدّم من ذنبه"(۳)

اور اسی طرح ارشاد ہے:

(۱) تزکیہ واحسان یا تصوف وسلوک/۱۵-۱۶

(۲) سورة المومنون/ ۱۱

(۳) صحيح البخاري: ۳۸، باب صوم رمضان احتسابا من الإيمان.

"من قام ليلة القدر إيماناً واحتساباً غفرله ما تقدّم من ذنبه"(۱)

اوراسی قلب وروح کوسیدنا امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اورسیدنا امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی توجہ کا خاص مرکز بنادیا، اوردونوں نے الگ الگ حدیث اس تعلق سے ذکرکر کے دین وشریعت میں اس کی بنیادی اہمیت سے آگاہ کیا، امام بخاری نے "إنما الأعمال بالنيات" والی حدیث سے آغاز کر کے اورامام مسلم نے حدیث جبرئیل سے جس میں ایمان، اسلام اوراحسان کی بابت بتایا گیاہے، اوراحسان کا وہ درجہ سمجھایا گیا ہے کہ اعمال کی انجام دہی کے وقت حضوری کی وہ کیفیت رہے جو درحقیقت تزکیہ واحسان کا منتہیٰ ہے، اس طرف توجہ دلاکر شریعت کے ساتھ اس کی حقیقت کومدنظر رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے، لیکن بعد کے علماء نے جب احکام ومسائل دین وشریعت کو موضوع بنایا تووہ اس کے ظاہر میں ایسے مستغرق ہوئے کہ باطنی مسائل کی طرف توجہ نہ کرسکے، جس سے علماء کے اندر بڑا خلا پیدا ہوا اوراندرونی طور پر وہ اس کمی کو محسوس کر کے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے فکر مند ہوئے، اوراسی کمی کو محسوس کر کے علمائے طریقت نے تصنیفات پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی، جیسے امام حارث محاسبیؒ کی رسالة المسترشدين اور بعض دوسری کتابیں اسی طرح سراجؒ نے "اللُّمع" قشیریؒ نے "الرسالة" ہجویریؒ نے "كشف المحجوب"، شیخ ابوطالب مکی نے "قوت القلوب" امام غزالیؒ نے "احياء علوم الدين" اور "کیمیائے سعادت" شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے "غنية الطالبين" شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے "عوارف المعارف" لکھی اور پھر اس سلسلہ میں کتب وتصنیفات ورسائل کا اضافہ ہوتا چلا گیا، امام نوویؒ صحیح احادیث کا ایک مجموعہ "رياض الصالحين" ترتیب دیا جو سب سے زیادہ مقبول ہوا، چنانچہ پھر یہ سعادت ہندوستان کے حصہ میں آئی اور بڑے ہی اعتدال وتوازن کے ساتھ اور جو بے راہ روی اس راہ سے آگئی تھی اس کو دور کرنے کے ساتھ مجدد الف ثانی

---

(۱) صحيح البخاري: ۲۰۱٤، باب فضل ليلة القدر

امام سرہندیؒ، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ، حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اس عہد کے بعد اس سے متصل عہد کی شخصیات میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ، مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ اور آخر میں مولانا منظور نعمانیؒ اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے جو ذخیرہ پیش کیا وہ موجودہ نسل کے لئے بہترین دینی ورثہ ہے۔

دین وشریعت میں ظاہر وباطن کی یہ تقسیم جو پہلے خلا کی صورت میں تھی بعد میں خلیج بن کر سامنے آئی، یہ جس کوتاہی کا نتیجہ تھی اس کی طرف مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑی دلسوزی سے اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے اپنی کتاب طبقات الصوفية الكبرىٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ فقہ کے ائمہ ومجتہدین جیسے کتاب وسنت کے کلیات سے جزئیات پیدا کر کے ان پر فرض وواجب، سنت ومستحب یا حرام ومکروہ اور خلاف اولیٰ ہونے کا حکم لگاتے ہیں، آخر تصوف کے ائمہ عارفین کتاب وسنت کے اس حصہ میں جس سے ان کے متعلقہ مسائل کا تعلق ہے اگر جزئیات پیدا کریں اور ان پر حکم لگائیں تو اس پر تعجب کیوں کیا جائے؟
>
> آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ:
>
> "ليس إيجاب مجتهد باجتهاده شيئا لم يصرح الشريعة بوجوبه أولىٰ من إيجاب ولى الله تعالىٰ حكماً فى طريق لم تصرح الشريعة بوجوبه؟"(۱)

---

(۱) طبقات الصوفية الكبرىٰ ۱/ ٤

(یعنی شریعت میں جن وجوب کی تصریح نہیں ملتی لیکن امام مجتہد اپنی اجتہادی کوششوں سے ان کے وجوب کا حکم اگر بتلا سکتا ہے، تو اپنے طریقۂ خاص (یعنی تصوف) کے متعلق اللہ کا ولی کسی ایک مسئلہ پر وجوبی حکم اگر لگاتا ہے جس کی تصریح شریعت میں نہیں پائی جاتی تو دونوں میں ایک کو ترجیح دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟)۔

واقعہ یہ ہے کہ اتنے صاف اور واضح مسئلہ کو سمجھنے سے بعض لوگ نہ معلوم کیوں گریز کرتے ہیں۔''

دوسری طرف وہ اپنے استاد علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا تأثر نقل کر کے اپنا درد پیش کرتے ہیں، وہ رقم طراز ہیں:

''ہمارے استاد امام علامہ کشمیری نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ نماز میں خشوع وخضوع کا مسئلہ ظاہر ہے کہ قرآنی مطالبہ ہے لیکن فقہ کی کتابوں میں سالہا سال سے تلاش کر رہا ہوں کہ فقہاء نے اس مسئلہ کو کہیں اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے یا نہیں؟ فرماتے تھے کہ مدت کے بعد ایک غیر مطبوعہ کتاب میں صرف ایک فقرہ ملا کہ نماز کے مستحبات میں یہ بھی ہے۔

واقعہ وہی ہے کہ فقہاء نے اسلام کے قالب پر اپنی بحث کا موضوع بنایا اس لئے صرف انہی عناصر کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہیں، جن سے اس اسلامی قالب کی تعمیر میں مدد ملتی ہو، باقی اسلام کا قلب اور اس کی روح اس کے عناصر واجزاء یہ بالکلیہ جداگانہ چیزیں ہیں، کتاب وسنت کا جو حصہ اس پر مشتمل ہے، فقہاء نے اپنی فقہی کتابوں میں دین کے اس حصہ پر بحث

کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا ہے، مثلاً روزے کے مسائل میں آپ کو ہر فقہی کتاب میں یہ مسئلہ ملے گا کہ غیبت کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، یعنی روزے کا قالب متاثر نہیں ہوتا لیکن کون نہیں جانتا کہ روزے کا قلب اور اس کی روح غیبت سے نکل جاتی ہے، صحیح حدیثوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصریح کی ہے۔(۱)

نفس کا تزکیہ دل کا تصفیہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾
آیت بالا میں کرامت و بزرگی کا اصل معیار تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے، تقویٰ عقائد میں، اعمال میں، افکار میں، رجحانات میں اور تمام تعلقات حیات میں ہوتا ہے، اور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، اس کا اصل تعلق قلب سے ہے، اور قلب میں جو نور اللہ کی طرف سے اترتا ہے، اسی سے قلب کی صفائی اور تزکیہ ہوتا ہے، مومن و کافر ظاہر میں اعمال یکساں کرتے ہیں، لیکن دل کی صفائی اور ارادہ کی پاکیزگی سے ایک کا عمل عرش معلّٰی پر پہنچتا ہے اور دوسرے کا تحت الثریٰ میں جاتا ہے، ایک کا مقام اعلیٰ علیین اور دوسرے کا اسفل سافلین ہوتا ہے، یہی دل کا تقوی ہے، جس کی طرف اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار اشارہ فرمایا تھا کہ "التقوی ھھنا، التقوی ھھنا، التقوی ھھنا" یہی دل کا تقوی اعمال کی پاکیزگی کا سبب بنتا ہے، اسی سے اللہ کا ڈر اور پاس ولحاظ اور اس کے احکام اور اوامر ونواہی کا دھیان رہتا ہے، اسی سے اعمال میں احتیاط پیدا ہوتی ہے، اور اللہ سے نسبت رکھنے والی چیزوں کا احترام آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:﴿وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾(۲)

---

(۱) مقالات احسانی از مولانا مناظر احسن گیلانی/۱۷۴-۱۷۵ مطبوعہ مکتبہ اسعد کراچی۔
(۲) سورۂ حج/۳۲

اسی سے وہ درجۂ ولایت حاصل ہوتا ہے جس کے حصول کے بعد "نفس مطمئنة" حاصل ہوجاتا ہے اور "راضية مرضية" کا مقام بھی، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾ (۱) اس میں نفس اور شیطان کی غلامی و بندگی سے حفاظت کی جہاں بشارت ہے وہیں اپنا خصوصی بندہ قرار دیئے جانے کی فضیلت بھی ہے، یہی لوگ ہیں جنھوں نے مقصدِ حیات کو جانا کہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (۲) اور یہی وہ ہستیاں ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ﴾. (۳)

یہی تقوی ہے جس کی تعریف امام ابن تیمیہؒ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"والتقوى أن يعمل الرجل بطاعة الله على نور من الله يرجو رحمة الله، وأن يترك معصية الله على نور من الله يخاف عذاب الله، ولا يتقرب إلى الله إلا بأداء فرائضه ثم بأداء نوافله." (۴)

(اور تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ کا فرماں بردار ہے، اللہ کی توفیق سے اور اللہ کی رحمت کا امیدواری ہے اور توفیق الٰہی سے نافرمانی سے بچے، اللہ کے عذاب سے ڈرتا رہے، اور اللہ کا ولی فرائض کی ادائیگی کے بغیر پھر نوافل کے اہتمام کے بغیر اللہ کا قرب حاصل نہیں کرسکتا)۔

اور "نورٌ علیٰ نور" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

(۱) سورۂ فجر/۲۷-۳۰ (۲) سورۂ ذاریات/۵۶ (۳) سورۂ یونس/۶۲-۶۳

(۴) فتاوی ابن تیمیہ علم السلوک ۱۰/۴۳۳۔

"هو المومن ينطق بالحكمة وإن لم يسمع فيها بأثر، فإذا سمع بالأثر كان نوراً على نور، نور الإيمان الذى فى قلبه يطابق نور القرآن، كما أن الميزان العقلى يطابق الكتاب المنزل، فإن الله أنزل الكتاب والميزان ليقوم الناس بالقسط."(۱)

(مومن کی زبان حکمت سے منور ہوتی ہے، اگر چہ اس میں اس کو کوئی اثر نہ ملا ہو جب وہ اثر سن لیتا ہے تو یہ نورٌعلی نور ہوتا ہے، ایمان کا نور جو اس کے دل میں ہوتا ہے، نورِ قرآن کے مطابق ہوتا ہے، جیسے میزان عقلی کتاب منزل کے مطابق ہوتی ہے، اللہ نے یہی کتاب ومیزان اتارا ہے تاکہ لوگ انصاف سے کام لیں)۔

استحضارِ نیت

ارادہ اور نیت کا تعلق بھی اسی قلب سے ہے، اور جو آغاز عمل سے پہلے ہوتا ہے، اور نیک ارادہ پر وہ عنداللہ ماجور ہو جاتا ہے، اور برے ارادہ پر عمل نہ کرنے پر وہ ماجور ہوتا ہے، اور سچا بندہ وہ ہے جو وہ چاہے جو اس کا رب چاہتا ہے، اور اس کی رضا کا طالب ومرید رہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس پر شیخ المشائخ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے اقوال ومعارف کا ذکر کرنے کے بعد بڑے زور کا کلام فرماتے ہیں، اور رقم طراز ہیں:

"والله تعالىٰ قد وصف الأنبياء والصديقين بهذه الإرادة، فقال تعالىٰ: ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ وقال تعالىٰ: ﴿وَمَا لِأَحَدٍ

---

(۱) فتاوی ابن تیمیہ علم السلوک ۱۰/۴۷۵

عِـنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَى إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَى﴾ وقال تـعـالـى: ﴿إِنَّـمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُـكُـوْراً﴾ وقــال تـعــالــى: ﴿وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰـهَ وَرَسُـوْلَـهُ وَالدَّارَ الآخِرَةَ فَإِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْـراً عَـظِيْـماً﴾ وقال تعالى: ﴿وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ وَسَعَى لَهَـا سَـعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُوْلٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُوْراً﴾ وقـال تعالى: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصاً لَّهُ الدِّيْنَ، أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْـخَـالِـصُ﴾ وقـال تـعـالـى: ﴿قُـلِ اللّٰهَ أَعْبُدُ مُخْلِصاً لَّهُ دِيْـنِـيْ﴾ وقـال تـعـالـى ﴿وَاعْبُـدُوْا الـلّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـئـاً﴾ وقـال تـعـالـى: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾.

ولا عبادة إلا بإرادة الله ولما أمر به، وقال تعالى: ﴿بَلٰى مَنْ أَسْلَـمَ وَجْهَـهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ أى أخلص قصده لله، وقـال تـعالى: ﴿وَمَآ أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَـهُ الـدِّيْـنَ﴾ وإخلاص الدين له هو إرادته وحده، وقال تعالى: ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهُ﴾ وقال تعالى: ﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَشَدُّ حُبّاً لِلّٰهِ﴾ وكل محب فهو مريد، وقال الخليل عليه السـلام: ﴿لَآ أُحِـبُّ الآفِـلِيْـنَ﴾ ثـم قال: ﴿إِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾.

ومثـل هـذا كثيـر في القرآن، يأمر الله بإرادته، وإرادة ما يـأمـر بـه وينهى عن إرادة غيره، وإرادة ما نهى عنه، وقد قـال الـنبى صلى الله عليه وسلم: "إنما الأعمال بالنيات

وإنما لكل امرئ ما نوى فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله ومن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر إليه" فهما إرادتان: إرادة يحبها ويرضاها، وإرادة لا يحبها الله ولا يرضاها بل إما نهى عنها وإما لم يأمر بها ولا ينهى عنها."(۱)

(امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کا نتیجہ بحث یہ ہے کہ اصل ارادہ ونیت ہے جو خالص اللہ کے لیے ہوگا، اللہ اسی کا حکم دیتا ہے اور کسی اور کے ارادہ ونیت سے روکتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد ہے "إنما الأعمال بالنيات" کہ تمام کاموں کا دارومدار ارادوں ونیتوں پر ہے جو جس کے لیے ارادہ ونیت کرے گا وہ عمل اسی لیے مانا جائے گا)۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی قدس سرہ استحضار نیت کے اثرات پر کلام کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ حدیث پاک بڑی جامع ہے، بعض علماء نے اس حدیث کو آدھا علم کہا ہے، بلکہ میرے نزدیک تو تصوف سارا کا سارا یہی ہے، جیسا کہ آگے آرہا ہے، حدیث پاک میں دو جملے ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے، اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی نیت کرے، دوسرا جملہ پہلے کی تاکید بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ اکثروں نے کہا ہے، اور مستقل دوسرا مضمون بھی ہوسکتا ہے، اور یہ زیادہ اچھا ہے، اور وہ یہ کہ آدمی کسی نیک کام میں جتنی نیتیں کرلے، اللہ تعالیٰ سبھی کا ثواب عطا فرماتے ہیں،

---

(۱) فتاوی ابن تیمیہ علم السلوک ۱۰/۴۹۵-۴۹۶

مولانا نواب قطب الدین صاحب نے مظاہر حق میں اس کی بہت سی مثالیں لکھی ہیں، مثلاً مسجد کے جانے میں بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ نیت اعتکاف کی کرے اور اس کے ساتھ اس کی بھی نیت کرے کہ رب کریم کے گھر حاضری ہے، اور کریم اپنے یہاں آنے والوں کا اکرام کرتا ہی ہے، اسی طرح سے نماز کے انتظار میں جتنی دیر بیٹھے گا اس کا مستقل ثواب ہوگا، کہ حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص نماز کے انتظار میں رہتا ہے وہ نماز ہی میں رہتا ہے، اور یہ کہ اس مقام پر آنکھ کان اور دیگر اعضاء کی معاصی سے حفاظت کا مقام ہے کہ بازار وغیرہ میں یہ سب اعضاء کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا رہتے ہیں، ان سے حفاظت کی نیت کرے، اس کا مستقل ثواب ہوگا، اور یہ بھی نیت کرلے کہ یہاں یکسوئی اور کمال توجہ الی اللہ نصیب ہوگی، جس کا مستقل ثواب ہے، اور یہ بھی نیت کرے کہ وضو کرکے نماز کے لیے جانے کا ثواب حج اور عمرہ کا ہوتا ہے، اور یہ بھی نیت کرے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور علم حاصل کرنا اور علم سکھانا مجمع کی وجہ سے مسجد ہی میں میسر ہوتا ہے، اور یہ بھی نیت کرے کہ مسلمانوں سے ملاقات ہوگی، کہ ایک مستقل عبادت ہے، اور انھیں سلام کرنے کا موقع ملے گا، اور آخرت کے امور میں اللہ کی پاک بارگاہ میں مراقبہ اور فکر کا موقع ملے گا، اور اسی طرح سے بہت سے امور پیدا ہوسکتے ہیں، اور جتنے امور کی آدمی نیت کرلے گا ان کا مستقل ثواب ملے گا، مالک کے یہاں عطا میں کوئی کسر نہیں ہے۔"(۱)

---

(۱) آپ بیتی/۲، یاد ایام/۱ از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی

محبت وتعلق کا محل ومکان بھی یہی قلب ہے، اوراس کا اصول یہ ہے کہ جس کے قلب میں اللہ کی محبت ہوتی ہے، غیر اللہ کی محبت نہیں ہوسکتی، اور غیر اللہ کی محبت ہوگی تو اللہ کی محبت سے وہ دل خالی ہوگا، گرچہ اس کو اللہ کی محبت کا دعوی ہو، دوسری صورت میں محبت میں شریک کرنا ہوگا جو اللہ کو پسند نہیں، یہ دبا ہوا شرک کہلاتا ہے لیکن اس کے اثرات بڑے مہلک ہوتے ہیں۔

تزکیہ کے اعمال واشغال

جہاں تک تزکیۂ نفس واصلاح باطن کے لئے مخصوص ومؤثر اعمال واشغال اوراذکار وادعیہ وغیرہ کا تعلق ہے تو یہ ایک ایسا موضوع ہے جو خود ایک پوری تصنیف کا موضوع ہے، اوراس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، اوراس سلسلہ میں اسوۂ نبوی سے جوامت کو رہنمائی ملتی ہے یقیناً اس سے بڑھ کر کوئی اور انفع واصلح چیز نظر نہیں آتی ہے، جس کو قرآن مجید میں ایک جگہ:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللهَ وَالْيَوْمَ الآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيراً﴾ (۱)

(تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ) میں بہترین نمونہ موجود ہے اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو اوراس نے اللہ کو بہت یاد کیا ہو)۔

ایک جگہ:

﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (۲)

(آپ فرمادیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری راہ چلو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا)۔

---

(۱) الأحزاب/ ۲۱ (۲) آل عمران/ ۳۱

ایک جگہ:

﴿یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْآ اِنْ تَتَّقُوْا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا﴾(۱)

(اے ایمان والو! اگر تم اللہ کا لحاظ رکھو گے تو وہ تمہیں ایک امتیاز عطا فرمائے گا)۔

ایک جگہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾(۲)

(بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر جمے رہے ان پر فرشتے (یہ کہتے) اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی بشارت قبول کرو جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا)۔

اور ایک جگہ اولیاء اور محبوبین بارگاہ ایزدی کے حال ومقام کے متعلق ارشاد فرما کر:

﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ، الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَکَانُوْا یَتَّقُوْنَ﴾ (۳)

(یادرکھو اللہ کے دوستوں پر ہرگز نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے، جو ایمان لائے اور وہ پرہیزگار رہے)۔

بات واضح فرمادی ہے، اور یہ بھی ارشاد ہے اپنے نبی حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرما کر:

﴿اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ (۴)

---

(۱) الأنفال/ ۲۹ (۲) حمٓ، السجدۃ/ ۳۰

(۳) یونس/ ۶۲-۶۳ (٤) العنکبوت/ ٤٥

(اور آپ کو جس کتاب کی وحی کی گئی ہے آپ اس کی تلاوت کرتے رہیں اور نماز کو قائم رکھیں بلاشبہ نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے)۔

اور اس انفرادی اور ذاتی صفات وکمالات کی طرف متوجہ کرنے کے ساتھ الگ الگ دوسری ہدایات بھی دیں، مثلاً:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾ (۱)

(اے چادر لپیٹنے والے، اٹھ جایئے پھر خبردار کیجیے، اور اپنے رب ہی کی بڑائی بیان کیجیے، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے، اور ہر گندگی سے دور رہیے، اور اس لیے احسان نہ کیجیے کہ زیادہ ملے)۔

اور ایک پوری سورت نازل فرمائی:

﴿وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (۲)

(زمانے کی قسم، یقیناً انسان گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور انھوں نے ایک دوسرے کو حق کی تلقین کی اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی)۔

ان تمام ہدایات وارشادات کی روشنی میں یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ عقیدۂ صحیح اور فکر سلیم اور سنت نبوی سے تعلق کے بغیر اس راہ میں جسے راہ ولایت سے تعبیر کریں یا اس کی اعلیٰ تعبیر راہ نبوت سے کریں، عروج وتقرب الٰہی اور ولایت ومحبوبیت اور ترقی ایمانی وروحانی ممکن نہیں، اس لئے کہ پہلا دروازہ عقیدہ کا ہے، جو اس دروازہ میں داخل نہیں ہوگا اس کے لیے اندر کا کوئی دروازہ نہیں کھل سکے گا۔

---

(۱) المدثر/ ۱-۶ (۲) والعصر/ ۱-۳

عقیدہ توحید

کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' کا زبان ودل سے اقرار کیا جائے، یہ عقیدہ کا پہلا درجہ ہے، اس کا اثر عملی زندگی میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت واستعانت میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں ٹھہراتا، حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

> ''مشرکین عرب جو قرآن مجید کے پیغام توحید کے اولین مخاطب تھے، ان کا بڑا اور اول درجہ کا شرک یہی شرک فی العبادت اور شرک فی الاستعانت تھا، اور اس لیے ''لا الٰہ الا اللہ'' کے ذریعہ ان کو جس توحید کا پیغام دیا گیا اس کا اولین مطالبہ ان سے یہی تھا کہ وہ عبادت اور استعانت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور خود ہم سے بھی ہر نماز کی رکعت میں اسی کا اقرار ان لفظوں میں کرایا جاتا ہے: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ (اے اللہ! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تیری ہی عبادت کریں گے، اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگیں گے)۔(۱)

پھر اس کا درجہ ہے کہ اس کے مطلب اور معنی کو دل کی گہرائیوں سے قبول کرنا پڑتا ہے، اس میں پہلے غیر اللہ کی نفی، شرک وکفر وغیرہ سے براءت وبیزاری کا اظہار، اور پھر اللہ کا اور اس کی سبھی صفات وکمالات اور اسماء کے ساتھ اثبات ہے، اس کو جلیل القدر عالم دین مولانا عبدالحی حسنیؒ نے اچھا سمجھایا اور لکھا ہے کہ:

> ''ارشاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ جو لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دیتے ہوئے وفات پائے گا وہ جنت میں داخل ہوگا، مرید کے لئے ضروری ہے کہ ان مقامات میں وہ برابر ترقی کرتا رہے، اور

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی/۱۴-۱۵

ان مقامات کے لئے طاعت واخلاص اصل ہے، اور اس کی بنیادی اور مقدم شرط ایمان ہے، پھر اس کے نتیجہ میں کچھ احوال وصفات اور نتائج وثمرات ظاہر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ مرید درجہ بہ درجہ توحید اور معرفت کے بلند مقام پر پہنچ جاتا ہے، اگر کسی مقام وحالت میں صحیح اور مطلوب ثمرات حاصل نہ ہوں تو سمجھ لینا چاہئے کہ پہلے والے مقام میں کوئی تقصیر رہ گئی ہے، اور ٹھیک اسی طرح واردات قلبی اور کیفیات نفسی میں بھی سمجھنا چاہئے، اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے قول وفعل کا برابر محاسبہ کرتا رہے، اور جائزہ لیتا رہے۔"(۱)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تزکیہ واصلاح باطن کی راہ میں قدم رکھنے والوں کے لئے اپنی ہدایات میں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

"سب سے ضروری بات یہ ہے کہ عقیدہ درست اور پختہ کیا جائے اور اس بات کا اقرار اور اس پر ایمان ہو کہ اللہ کے سوا کسی کے ہاتھ میں جلانے، مارنے، صحت وشفاء دینے، اولاد دینے، روزی دینے، اور قسمت اچھی بُری کرنے کا اختیار نہیں ہے، اور اس کے سوا کوئی بندگی کا مستحق نہیں، نہ اس کے سوا کسی کے سامنے سجدہ کیا جاسکتا ہے، نہ بندگی کی کوئی شکل اختیار کی جاسکتی ہے، نہ حاجت روائی اور مشکل کشائی کا سوال کیا جاسکتا ہے۔"(۲)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے توحید کے درجات کو واضح انداز میں اس

---

(۱) الثقافة الاسلامية في الهند، ط: دمشق از مولانا عبدالحی حسنی ترجمہ مولانا ابوالعرفان خاں ندوی۔

(۲) ملاحظہ ہو رسالہ "سلاسل اربعہ" از مصنف۔

طرح بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''توحید کے ثانوی مطالبے جن کے بغیر توحید کامل نہیں ہوتی، مثلاً یہ کہ وہ فیصلہ کرلے کہ مجھے صرف اللہ کے حکم پر چلنا ہے، اسی کی اطاعت وفرماں برداری کرنا ہے، اسی کے حکم کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کے طریقے یا قومی رسم ورواج یا حکومت وقت کے قانون یا دنیا والوں کی رائے یا خود اپنی مصلحت اور جی کی خواہش کو یا دوسرے لوگوں کی پسند اور خوشی کو نہیں دیکھنا ہے، بلکہ اس کے حکم کے مقابلہ میں ان سب چیزوں کو پس پشت ڈال کر بس اسی کے حکم اور اسی کی مرضی پر چلنا ہے، بہرحال تکمیل توحید کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اپنی پوری زندگی میں یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ ہی کے حکم پر چلنے کا فیصلہ کرے، اور ہر حال میں اس کی اطاعت اور غلامی کو اپنا اصول زندگی بنائے اور ایمان والوں سے یہی مطالبہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کو صرف اللہ کی ہدایت کے تابع کردیں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں بس اسی کے حکم پر چلیں، یقیناً بہت سوں کے لیے توحید کا یہ مطالبہ مشکل اور سخت ہے، لیکن کوئی شبہ نہیں ''لا الہ الا اللہ'' ان سے یہ بھی چاہتا ہے اور اس کے بغیر ان کا ایمان واسلام کامل نہیں۔

اسی طرح توحید کا ایک تکمیلی مطالبہ ایمان والوں سے یہ بھی ہے کہ اسی کی قادر وقیوم ذات پر وہ توکل وبھروسہ رکھیں، اور اسی کو اپنا حافظ وناصر اور ملجا وماویٰ سمجھیں، اسی سے خیر اور بھلائی کی امیدیں رکھیں، صرف اسی کے غضب اور قہر سے ڈریں، اور اسی کی نصرت واعانت کے اعتماد پر دنیا کی کسی بڑی سے بڑی طاقت

کی بھی پرواہ نہ کریں: ﴿وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَداً إِلَّا اللّٰهَ﴾. (۱)

الغرض یہ سب ''لا الہ الا اللہ'' کے اہم مطالبات میں سے ہے اور جس شخص میں جتنی کمی اس بارے میں رہے گی سمجھنا چاہیے کہ اس کی توحید اتنی ہی ناقص اور ادھوری رہے گی اور وہ اسی حساب سے شرک میں گرفتار رہے گا اور جس میں یہ باتیں جس قدر کامل درجہ میں ہوں گی اس کی توحید بھی اتنے ہی کامل درجہ کی ہوگی۔'' (۲)

توحید کا اعلیٰ درجہ

توحید کے درجات میں اعلیٰ درجہ فنائیت کا ہے، یہی مقام فنا و بقا انسان کو اس مقام پر فائز کر دیتا ہے، جس کا حال وقال قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿إِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾. (۳)

(کہہ دیجیے میری نماز، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنہار ہے)۔

اور جس کا اخروی انعام اس طرح قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ﴾. (۴)

(اے وہ جان جو چین پا چکی ہے، اپنے رب کی طرف اس طرح لوٹ جا کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی، بس میرے خاص بندوں میں چلی جا، اور میری جنت میں داخل ہو جا)۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ توحید کے اس اعلیٰ درجہ کی تعریف

---

(۱) سورۂ احزاب/۳۱ (۲) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۱۶-۱۹ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)
(۳) سورۂ انعام/۱۶۳ (۴) سورۂ فجر/۲۷-۳۰

اس طرح کرتے ہیں، وہ رقم طراز ہیں:

''توحید کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ہم صرف اللہ ہی سے لو لگائیں، اور اسی کو اپنا حقیقی محبوب اور مقصود و مطلوب بنائیں، پھر اس کے عشق و محبت میں ہم ایسے فنا ہوں کہ جو کچھ کریں، صرف اسی کے لیے کریں اور اس کی رضا کے سوا ہر چیز کی خواہش ہمارے قلب سے نکل جائے، پھر ہمارا ہر عمل صرف نماز یا روزہ ہی نہیں بلکہ ہمارا کھانا و پینا، سونا اور جاگنا، رونا اور ہنسنا، کسی سے خوش ہونا اور زیادہ جامع لفظوں میں ہمارا مرنا اور جینا سب اللہ کے لیے اور صرف اسی کی رضا کے واسطے ہو، گویا کہ ﴿مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ ہمارا خواب ہو، اور ہمارے دل کی یہ پکار ہو۔''(۱)

اور اس کے آثار ونتائج کے بارے میں حضرت مولانا نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''جب اللہ کے کسی بندہ کو توحید کا یہ اعلیٰ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو پھر اس کا ہر کام صرف اللہ کے لیے ہونے لگتا ہے، حتی کہ بظاہر اگر وہ اپنے ذاتی اور خانگی کام بھی کرتا ہے تو وہ بھی اپنی ضرورت کے احساس اور نفسانی تقاضے سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی نیت سے اور اس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور یہ بات یعنی ہر چھوٹا بڑا کام رضائے الٰہی کے لیے ہی کرنا اس بندۂ خدا کے لیے بالکل ایسی طبعی بات ہو جاتی ہے جس طرح عوام الناس ہر کام اپنی ضرورت سے اور اپنے نفس کی خواہش سے کرتے ہیں، یہ درجہ توحید اور اخلاص کا اعلیٰ درجہ ہے، اور یہی

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۲۱ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

مقام فنا ہے، اور اسی مقام پر پہنچ کے "لا إلـه إلا الله" کی تکمیل ہوتی ہے، حدیث میں ہے:

"مـن أحـب لله وأبـغـض لله وأعـطى لله و منع لله فقد استكمل الإيمان." (۱)

(جس نے اللہ کے لیے محبت کی (جس سے محبت کی) اور اللہ ہی کے لیے بغض رکھا (جس سے بغض رکھا) اور اللہ ہی کے لیے دیا (جس کو کچھ دیا) اور اللہ ہی کے لیے دینے سے ہاتھ روکا (جس کو دینے سے ہاتھ روکا) (غرض جس کا یہ حال ہو گیا کہ وہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے کرنے لگا) تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی)۔

اللہ کے جن بندوں کو اس نسبت کا کچھ حصہ مل گیا، ان کو کونین کی سب سے بڑی دولت مل گئی، یہی وہ "مردان خدا" ہوتے ہیں جن کو راہ خدا میں راحت و مصیبت بالکل یکساں معلوم ہوتی ہے اور زندگی ان کو موت سے زیادہ محبوب و مرغوب نہیں ہوتی، ان کے دل کے ساز سے ہر وقت یہ آواز نکلتی ہے ؎

زندہ کنی عطائے تو در بکشی قضائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

بلکہ وہ اللہ سے آرزوئیں کرتے ہیں کہ انھیں بار بار زندگی دی جائے تا کہ وہ بار بار راہ خدا میں قربان ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اسی جذبہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

"لـوددت أن أقتـل فـى سبيـل الله ثـم أحيى ثم أقتل ثم أحيى ثم أقتل." (۲)

---

(۱) رواه أبو داؤد عن أبي أمامة. (۲) صحيح البخاري، باب تمنى الشهادة.

(میرا جی چاہتا ہے کہ راہ خدا میں مجھے شہید کیا جائے اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں، پھر میں زندہ کیا جاؤں اور پھر شہید کیا جاؤں)۔(۱)

فنا و بقا کے اس درجہ پر جب اہل ایمان و اہل توحید پہنچ جاتے ہیں تو ان کا عزم فولادی اور ان کی طاقت انقلابی اور ان کا نفس نفس زکیہ اور ان کا قلب قلب صافی اور ان کا دماغ روشن، ان کا ضمیر حساس اور ان کی نگاہ تقدیر بدل دینے والی بن جاتی ہے، اور وہ حق کے خاطر کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، اور ان کی عالی حوصلگی دین کے کسی معاملہ میں پیچھے ہٹنے نہیں دیتی، اور درحقیقت وہ کسی خطرہ کو خاطر ہی میں نہیں لاتے، یہی سوز عشق وہ دل دردمند اور فکر ارجمند پیدا کردیتا ہے جس کی روشنی میں قافلے چلتے ہیں اور منزل مقصود کو پہنچتے ہیں، اپنی ہستی کو مٹانے کے نتیجہ میں اللہ کا مزید ان پر انعام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال و افعال اور اقدامات کو اپنی طرف منسوب کرلیتا ہے، اور انھیں تائید غیبی حاصل ہوتی ہے، اور ہر ہر لحہ توفیق ایزدی ان کے شامل حال ہوتی ہے، اسی کو حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ ایک جملہ میں فرماتے ہیں کہ ''ان کی الٹی بھی سیدھی ہوجاتی ہے'' اور واقعہ یہی ہے کہ جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کا ہوجاتا ہے ''من کان للہ کان اللہ له'' اور ''من تواضع للہ رفعه اللہ'' اور ان خاصانِ خدا کا یہ حال ہوتا ہے کہ ''لو أقسم علی اللہ لأبره'' ایسے لوگوں کے تعلق سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں، وہ بھی توحید کے سراسر منافی ہیں، حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب رحمہ اللہ نے ان غلط فہمیوں کا بڑے بلیغ انداز میں ازالہ فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ایک صحیح حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بعض بندے قرب الٰہی کے مقامات طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ جاتے

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۲۱-۲۴ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

ہیں کہ ان کی آنکھیں اور ان کے ہاتھ ان کے نہیں رہتے، بلکہ وہ چونکہ صرف اللہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں، اس لیے ان کی یہ ساری قوتیں گویا اللہ کی ہو جاتی ہیں، یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ یہ لوگ خدا ہو جاتے ہیں یا خدا ان کا جز ہو جاتا ہے۔"(۱)

بہر حال توحید کا یہ اعلیٰ درجہ جس سے ایمان کامل و تام ہو جاتا ہے، یہ درجہ عام نہیں خاص ہے اور اسی کے حصول کے لیے ذکر "لا الہ الا اللہ" کی وہ کثرت کروائی جاتی ہے کہ ملکہ یادداشت حاصل ہو جائے اور بندہ سے غفلت دور ہو جائے، اور اس کی مراد مقصود و مطلوب اور محبوب اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ رہے، کلمہ کا ورد اور دھیان اس کے استحضار کے ساتھ توحید و ایمان کے مراتب عالیہ پر فائز کر دیتا ہے اور یہ ایسی قابل رشک بات ہے کہ بقول حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ:

"اس میں شبہ نہیں کہ اگر جانیں اور عمریں کھپا کے اور دنیا کی ساری لذتیں اور راحتیں ہمیشہ کے لیے قربان کر کے بھی توحید کا یہ اعلیٰ درجہ حاصل ہو سکے تو بڑی ارزاں ہے، اور حاصل نہ کرنے والے بڑے بے نصیب ہیں، مگر اس راہ کے عارفوں کا بیان ہے کہ اگر طلب صادق ہو اور کوشش صحیح طریقہ پر ہو تو یہ بہت زیادہ مشکل الحصول بھی نہیں ہے کہ ہم اس کی آرزو اور اس کے لیے کوشش بھی نہ کر سکیں، بلکہ ارباب ہمت کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے، اور سچے طالبوں کو خود اللہ کی رحمت اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے، بہر حال اگر سچی انابت ہو اور جہد قربانی کماحقہ اور صحیح طریقہ پر ہو تو پھر محروم رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔"(۲)

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/ ۲۶ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)
(۲) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/ ۲۷ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

رسالت پر ایمان

کلمہ کا دوسرا جز ''محمد رسول اللہ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عقیدہ کے اس اہم مسئلہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ہدایت دیتے ہیں کہ:

''سید المرسلین و خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی، ذریعہ ہدایت، وسیلہ شفاعت اور سب سے زیادہ محبت اور اتباع و پیروی کا مستحق سمجھا جائے اور زیادہ سے زیادہ آپ کی سنتوں پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے اور دینی و دنیوی زندگیوں میں آپ کے ہدایات، آپ کے معمولات اور دستور پر عمل کرنے کی کوشش کی جائے، آپ کی سیرت پاک کے مطالعہ کا اہتمام کیا جائے اور آپ کی احادیث کے مجموعوں اور سیرت کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا جائے۔''(۱)

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے:

''کسی ہستی کو رسول اللہ ماننے کے لوازم میں یہ بھی ہے کہ دنیا و مافیہا میں سب سے زیادہ اس سے محبت کی جائے، یعنی اللہ کے بعد وہی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہو، اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچی محبت ہو جائے تو کم از کم اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مسرت اور آپ کے دکھ درد میں آپ شریک ہو جائیں گے، یعنی جن چیزوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسرت اور خوشی ہوا کرتی تھی، ان سے آپ کو خوشی ہونے لگے گی، اور جن چیزوں سے آپ کو رنج اور صدمہ ہوا کرتا

---

(۱) ملاحظہ ہو رسالہ ''سلاسل اربعہ'' از مصنف

تھا ان سے آپ کو بھی رنج اور صدمہ پہنچنے لگے گا، اور یہ بڑی دولت ہوگی، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے جذبات اور اوصاف واخلاق کا پرتو بھی آپ پر پڑنے لگے گا، کیونکہ یہ محبت کا لازمی ثمرہ ہے، اور اس طرح آپ اپنی ذاتی خصوصیات اور عادات کو چھوڑتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وشمائل کی برکات کو اپنے میں جذب کرتے جائیں گے، اور یہی امتی کا کمال ہے۔"(۱)

رسالت کے تعلق سے ایمان ونفاق کا فرق بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"کلمہ طیبہ میں ہم جو "محمدٌ رسولُ اللّٰہ" زبان سے کہتے ہیں، اور آپ کی رسالت کی جو شہادت دیتے ہیں تو اس کی ذمہ داریوں کو ہم کہاں تک پورا کر رہے ہیں، زبان سے اللہ کے کسی نبی ورسول کی نبوت ورسالت کی شہادت دینا اور زندگی بھر اس کے خلاف راستوں پر اطمینان سے چلتے رہنا ایمان نہیں نفاق ہے۔"(۲)

اسی ایمان بالرسالت سے سنت وبدعت کے فرق کو بھی واضح کردیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"کسی نبی ورسول کی نبوت ورسالت پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم نے اس کی ہر تعلیم وہدایت کو حق، اور اس کے خلاف ہر نظریئے اور ہر رواج اور ہر دستور کو غلط وباطل مان لیا، اور مرضیات الٰہی کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے ان کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور رہنما تسلیم کرلیا۔

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۵۰-۵۲ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

(۲) ایضا ص/۴۹-۵۰

بہر حال نبی ورسول کی تعلیم وہدایت کے سامنے آجانے کے بعد مومن کو غور وتامل اور ترجیح وانتخاب کا اختیار نہیں رہتا، بلکہ اس کا کام صرف مان لینا اور اس کی تعمیل میں لگ جانا ہے اور یہ ماننا بھی صرف قانونی اور جبری قسم کا نہیں بلکہ دل وجان سے مان لینا، یہی شرط ایمان ہے۔"(۱)

ایمان واحتساب

ایمان واحتساب اعمال کی روح ہے، اس میں ایک طرف تو اللہ کے وعدوں پر یقین اور اللہ جل جلالہ کے انبیاء ورسولوں اور خاتم النبیین حضرت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت اور بتائی ہوئی باتوں پر ایمان ویقین ہے کہ جو بات جس طرح فرمادی ہے وہ اسی طرح ہو کر رہنی ہے، اور اللہ نے نیک کاموں پر جو بشارتیں دی ہیں، اور برے کاموں پر جو وعیدیں اور عذاب کی باتیں کہی ہیں ان میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں، ایک نہ ایک دن سبھی کو مرنا ہے، اور پھر میدان حشر میں جمع ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، اس لئے کہ فرمادیا گیا ہے:

﴿إِنَّ إِلَيْنَا إِيَابَهُمْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ﴾ (۲)

(یقیناً ہماری ہی طرف سب کو لوٹ کر آنا ہے، پھر ان سب کا حساب ہمارے ہی ذمہ ہے)۔

اور اسی طرح واضح کردیا گیا ہے:

﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ (۳)

(بس جس نے ذرہ برابر بھی بھلائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا،

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۴۶-۴۷

(۲) سورۃ الغاشیہ/۲۵-۲۶ (۳) سورۃ الزلزال /۷-۸

اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا)۔

جنت حق ہے، جہنم حق ہے، اچھوں کا ٹھکانہ جنت ہے، بُروں کا ٹھکانہ جہنم (دوزخ) ہے، فرشتے حق ہیں، جن کو اللہ نے الگ الگ کام ذمہ کرر کھے ہیں، وہ اس سے ہٹ کر کام نہیں کرتے، ان میں چار کو خصوصیت حاصل ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام، حضرت اسرافیل علیہ السلام، حضرت میکائیل علیہ السلام، حضرت عزرائیل علیہ السلام، کچھ فرشتے عرش کے ساتھ خاص ہیں، کچھ مخلوق خدا کی دیکھ ریکھ اور ان کی حفاظت کے لئے مامور ہیں، کچھ صلحاء کے لئے سکینت کا باعث بننے کے لئے، اور پھر ہر ایک کے ساتھ دنیا میں کراماً کاتبین کے طور پر اور مرنے کے بعد سوال و جواب کے لئے جب وہ قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے یا کوئی اور شکل اس کے فنا کی اختیار کی جاتی ہے منکر نکیر کے طور پر آتے ہیں چنانچہ یہ ایمان رکھنا ہوتا ہے:

"آمَنتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ."

اور:

"آمَنْتُ بِاللّٰهِ کَمَا هُوَ بِأَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ أَحْکَامِهٖ إِقْرَارًا ، بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقاً بِالْقَلْبِ."

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ایمان واحتساب کی بڑی بلیغ تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اللہ کو اللہ سمجھتے ہوئے اس کے حکم کو اس کا حکم سمجھتے ہوئے اس کے وعدوں پر پورے یقین و وثوق کے ساتھ اور اس کی رضا اور اس کے موعود اجر وانعام کے شوق و طمع میں کام کیا جائے حدیث میں آیا ہے:

"من صام رمضان إيماناً واحتساباً غُفِر له ما تقدّم

من ذنبه." (۱)

(جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وانعام کے شوق میں رکھے گا تو اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے)۔

"من قام ليلة القدر إيماناً واحتساباً غُفِر له ما تقدم من ذنبه." (۲)

(جو شب قدر میں ایمان واحتساب کے ساتھ شب بیداری کرے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے)۔

یہی عمل کی روح ہے جس سے عمل دفعتہً فرش سے عرش تک پہنچ جاتا ہے، اور اس کے بغیر بڑے سے بڑا عمل پرواز کی طاقت نہیں رکھتا، ایک حدیث سے اس کی مزید توضیح وتوثیق ہوتی ہے:

"عن عبدالله بن عمرو بن العاص قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أربعون خصلةً أعلاهن منيحة العنز، ما من عامل يعمل بخصلة منها رجاء ثوابها وتصديق موعودها إلا أدخله الله بها الجنة." (۳)

(حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چالیس باتیں ہیں جن میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ بکری کسی کو دے تاکہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھائے پھر واپس کردے جو شخص ان میں سے کسی بات پر بھی اس کے ثواب کی امید میں اور اس پر جو اللہ کا وعدہ ہے اس کے

---

(۱) صحيح البخاري، رقم الحديث: ۳۸، باب صوم رمضان احتسابا من الإيمان.

(۲) صحيح البخاري، رقم الحديث: ۲۰۱۴، باب فضل ليلة القدر.

(۳) أيضا، رقم: ۲۶۳۱، باب فضل المنيحة، كتاب الهبة.

یقین اور تصدیق کے ساتھ عمل کرے گا اللہ اس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کرے گا)۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ اپنے مربی وداعی الی اللہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (۱۹۴۴ء) کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں:

''۱- باطن مذہب ایمان واحتساب ہے، بہت سے اعمال میں مصرح ذکر کیا جاتا ہے، "إيماناً و احتساباً" لہٰذا ہر عمل کے بارے میں جو خطابات وارد ہوئے ہیں، ان میں دھیان کرنا اور اس کے ذریعہ حق تعالیٰ کی عظمت، اس کی بڑائی اور اس کے قرب اور یقین کو بڑھانا اور ان اعمال پر جو دینی ودنیوی مصالح اور انعامات وعطیات کا وعدہ فرمایا گیا ہے ان کو بطور عطا کے نہ کہ بطور معاوضہ کے یقین کرنا یہ باطن ہے۔

۲- اعمال اپنی ذات سے کوئی قیمت نہیں رکھتے، ان کے اندر جو قیمت آتی ہے، وہ اللہ کے حکم کے امتثال کے ذریعہ اس ذات عالی کی وابستگی سے آتی ہے، تو جس قدر روجوہ وابستگی پر قابو ہوگا، وہ اسی قدر قوی ہوگا، اور جتنا بھی عمل زیادہ طمانینت اور دل سے اور قوت سے ہوگا ان اعمال کی اصل قدر وقیمت اسی قدر ہوگی۔

۳- جناب عالی نے جذبہ اور ولولہ نہ ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے، مجھے اس پر بڑا ہی رشک ہے، مؤمن کے لئے اللہ کے امتثال امر کی اصلیت یہ ہے کہ حکم کے یقین اور اس کی عظمت سے اتنا دبا ہوا ہو کہ وہ ولولہ کو دبادے، ولولہ طبیعت سے پیدا ہوتا ہے، ولولہ اگر ہو تو یہ حب طبعی ہوئی اور جب تعمیل حکم کی عظمت سے اور فرضیت کے احساس سے ہو تو یہ حب عقلی اور حب ایمانی ہے۔

۴- بسا اوقات تھوڑے سے لئے ہوئے کو دیکھ کر ان پر خوش ہوجانا باقیوں کی کوتاہیوں کو محسوس ہونے سے حجاب ہوجاتا ہے، اور اپنے اس مغالطے سے بچنے کی بہت زیادہ فکر رکھیں، کرنے والوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کا صرف اتنا ہی اثر لیں کہ فطرۃً اپنی غلطی سے اثرات مرتب ہونے کو جو ہم اپنی کامیابی سمجھتے ہیں وہ نہ ہونی چاہئے، اصلی کامیابی کوشش میں لگ جانا ہے، نہ کہ ثمرات کا مرتب ہونا، چناں چہ دینی امور کا اصل ثمرہ اجر وثواب ہے، وہ محض کام میں مشغول ہونے سے تعلق رکھتا ہے، دنیاوی اثرات سے اس کو کیا علاقہ، بہر حال اگر ثمرات مرتب ہورہے ہیں تو ان سے صرف اتنا ہی اثر لیں کہ ہم غلطی سے جن اثرات کو دنیا میں ڈھونڈتے ہیں، وہ بھی ہورہے ہیں، اثرات مرتب نہ ہونے پر بھی کوشش میں کمی کرنا بڑی غلطی ہے، بس اتنا محسوس کر (کہ) اپنی توجہ کو صرف کوتاہی اور نقصان کے محسوس کرنے میں متوجہ رکھیں۔

۵- عبادات واذکار کے بارے میں جو نصوص وارد ہوئے ہیں ان نصوص کو دیکھتے رہنا اور ان کے پڑھنے پر جو وعدہ فرمائے گئے ہیں ان کا یقین کرنا اور اس کی کوشش کرتے ہوئے ان سب اوراد کو نبھانا چاہئے، بڑی چیز ان وعدوں پر یقین کی کوشش ہے، یہ یقین چوں کہ قلب سے تعلق رکھتا ہے، لہٰذا یہ ان عبادات کے قلب کا درجہ رکھتا ہے اور روحانیت کی امید اسی سے وابستہ ہوتی ہے۔

۶- ہر وقت کے لئے ان کے اپنے وقتوں کی عظمت اور حرمت میں آئی ہوئی تعریفیں اور فضیلتیں معلوم کر کے ان کا اعتقاد کرتے

ہوئے کرنا یہی ان کا طریقہ ہے، ہر ایک کی فضیلتیں حدیثوں میں الگ الگ وارد ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ برکات ہیں اور انوار ہیں، ہم جیسے عامی لوگوں کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ ہر وقت کی نماز ادا کرنے کے وقت یہ مانگ لیں کہ ہر وقت کے جو برکات اور انوار ہیں ان کا اللہ تعالیٰ ہمیں حصہ نصیب کرے۔

۷- جی لگنے اور مزہ آنے کا دھیان نہ کریں، بلکہ اللہ اور رسول کا حکم سمجھتے ہوئے کرتے رہیں اور ان کی اقتداء کو عظیم سمجھیں، فرمان کی تعمیل اور امر کی اقتدا بہت بڑی چیز ہے۔(۱)

محبت واخلاص

سلوک واحسان میں محبت واخلاص کی حیثیت کلید کی ہے، جس سے قفل کھلتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ تعالیٰ کے لیے محبت انسان کو بڑے مقامات قرب و ولایت کی طرف لے جاتی ہے اور یہ حدیث قدسی اس کے لیے بہت صریح اور واضح ہے کہ:

"أين المتحابون بجلالي اليوم أظلهم في ظلّي يوم لاظلّ إلا ظلي."(۲)

(کہاں ہیں میری خاطر آپس میں محبت کرنے والے؟ اپنے جلال کی قسم آج کے دن میں انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دوں گا، آج میرے سایہ کے لیے سوا کوئی اور سایہ نہیں ہے)۔

تعاون، ہمدردی، ایثار، مواسات، مساوات، عدل وانصاف، کرم گستری، شفقت ومہربانی اور تمام نیکیاں اسی وقت کارآمد ہیں جب وہ اللہ کے لیے اللہ کی محبت

---

(۱) مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت/ ۱۹۷-۲۰۰، ادارہ اشاعت دینیات نئی دہلی

(۲) صحیح مسلم، رقم: ۶۵۴۸، باب فضل الحب في الله تعالیٰ، باب البر والصلة والآداب۔

کے ساتھ ہوں اور یہ چیز توحید کی روح ہے، شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانی دمشقیؒ نے اللہ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت کے فرق اور نتائج کو بڑے بلیغ انداز میں بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"والفرق ثابت بين الحب لله والحب مع الله، فأهل التوحيد والإخلاص يحبون غير الله لله والمشركون يحبون غير الله مع الله كحب المشركين لآلهتهم وحبّ النصارى للمسيح وحب أهل الأهواء لرؤوسهم."(۱)

(اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے ساتھ دوسرے کی محبت میں فرق واضح ہے، اہل توحید و اخلاص غیر اللہ سے محبت اللہ کے لیے رکھتے ہیں اور مشرک اللہ کی محبت میں غیر اللہ کو شریک بناتے ہیں جیسے مشرکین کی معبودان باطل کی محبت، نصاریٰ کی عیسیٰ علیہ السلام کی محبت، نفس پرستوں کی اپنے آقاؤں کی محبت)۔

امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ کا یہ قول بھی نقل کیا جاتا ہے کہ:

''اعمال قلبیہ، یعنی توکل، اخلاص، صبر و شکر، رجا و خوف، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت رضا بالقضا اور اس جیسے اعمال باطنہ سب مامور بہ ہیں اور تمام مخلوق پر واجب ہیں۔''

اور فرمایا ہے کہ:

''واجباتِ ایمان میں سب سے اعظم و اکبر و اجل اللہ کی محبت اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے اور اللہ کی محبت کی اصل اعمالِ دین اور رجاء و خوف وغیرہ اللہ کی محبت کو مستلزم ہیں۔''(۲)

---

(۱) مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہ، علم السلوک ۱۰/۴۶۵ (۲) ملاحظہ ہو: روح دین از محمد سہیل مدینہ منورہ

صلوٰۃ (نماز)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عبادت وبندگی کا جو ایک مرتب نظام روزانہ کے لئے عطا فرمایا ہے، وہ قیام، رکوع، سجود اور قعود کا ہے، اور اس نظام میں ہاتھ بلند کر کے اللہ کی بڑائی بیان کرتے ہوئے داخل ہوا جاتا ہے، اور داخل ہوتے ہی جسماً، ذہناً، قلباً روحاً، تمام ہی اعتبارات سے دنیا سے بے تعلق ہو جانا پڑتا ہے، اور پھر اللہ کی تسبیح، حمد وثناء، اور اس کے کلام پاک کی تلاوت، دعا ومناجات اور اس کے نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک اور استغفار وطلب رحمت کے ساتھ اس نظام میں رہنا پڑتا ہے، اور مخلوق خدا کو سلام ورحمت اور برکتوں کی دعا دے کر یہ عبادت گزار اس نظام عبادت سے باہر آتا ہے، یہ وہ نظام عبادت ہے جو ہر نبی ورسول کو دیا گیا، اور اللہ کے سبھی مخلص بندوں کو اس سے عشق کی حد تک تعلق رہا، اس میں اللہ نے تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، روح کی بالیدگی، اور تقرب وولایت کا سامان رکھا، اور اسی سے برکتیں جوڑ دیں، اپنے نبی حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا:

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ، إِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْداً، وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوْداً﴾ (۱)

(سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک نماز قائم رکھئے اور فجر کے قرآن (کا اہتمام رکھئے) یقیناً فجر کا قرآن حضوری (کے وقت) کا ہوتا ہے، اور رات کے کچھ حصہ میں بیدار رہا کیجیے یہ آپ کے لیے اضافہ ہے، امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقام محمود پر فائز فرمائے گا)۔

روحانی عروج ہو یا جسمانی سلامتی، یا محبوبیت ومقبولیت کی بات یا برکتوں کا ظہور ہو یہ سب کچھ اسی نظام عبادت سے جوڑ دیا گیا، ارشاد ہے:

---

(۱) سورۂ بنی اسرائیل/۷۸-۷۹

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقاً نَّحْنُ نَرْزُقُكَ﴾ (۱)

(اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجیے اور خود اس میں لگے رہیے ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے رزق تو ہم آپ کو دیں گے)۔

اسی سے ہدایت وفلاح اور سعادت دنیوی واخروی وابستہ کردی گئی، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ﴾ (۲)

(یقیناً وہ ایمان والے اپنی مراد کو پہنچ گئے، جو اپنی نمازوں میں خشوع رکھنے والے ہیں، اور جو لغویات میں نہیں پڑتے)۔

اور ارشاد ہے:

﴿ أَلٓمّٓ، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ، الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ .... أُولٰئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (۳)

(الٓمّٓ، یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شبہ ہی نہیں، راہ بتاتی ہے ڈر رکھنے والوں کو، جو بن دیکھے ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور جو ایمان رکھتے ہیں اس پر جو آپ پر اتارا گیا اور اس پر (بھی) جو آپ سے پہلے اتارا جاچکا اور آخرت کو وہ یقین جانتے ہیں، وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے صحیح راستہ پر ہیں اور وہی لوگ

---

(۱) سورۂ طٰہٰ/۱۳۲ (۲) سورۂ المومنون/۱-۲ (۳) سورۂ بقرہ/۱-۴

اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں)۔

نماز ہی ایسی چیز ہے جس سے مشکلات دور ہوتی ہیں، اور مسائل حل ہوتے ہیں، اور جن لوگوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے، انہیں نماز کا بڑا اہتمام رہا کرتا تھا، خود اللہ نے فرمایا ہے:

﴿يَـآ أَيُّهَـا الَّـذِيْـنَ آمَنُوْا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ (۱)

(اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

نماز سے بندہ اپنے کو اپنے رب کے دربار میں محسوس کرتا ہے اور اسی کیفیت سے سرشار ہوتا ہے کہ اس کو اس کا رب دیکھ رہا ہے، اور توجہ فرما رہا ہے، اور وہ خود گویا دیکھ رہا ہے، اور یہ تو محسوس کر ہی رہا ہوتا ہے کہ عنایات ربانی اس پر ہیں، توبہ واستغفار کرتا ہے، اس یقین کے ساتھ کہ رب العالمین غفور بھی ہے اور رحیم بھی، خوب بخشنے والا اور بڑے بڑے گناہ کو معاف کردینے والا، اور بڑا مہربان اور بار بار رحم کرنے والا، اس طرح وہ خود بڑے چھوٹے گناہ کا اعتراف کرکے بخشش چاہتا ہے، اور گناہ نہ کرنے کا عزم کرتا ہے، اور توبہ کرنے کے بعد آدمی اس طرح ہوجاتا ہے جیسے گناہ کیا ہی نہیں، اس سے وہ گناہوں کے اثرات سے پاک صاف ہوجاتا ہے، حدیث میں آتا ہے:

"التائب من الذنب كمن لاذنب له." (۲)

(گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی طرح ہوجاتا ہے جس نے کوئی گناہ ہی نہ کیا ہو)۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے صحیح لکھا ہے:

''بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی

---

(۱) ایضاً/۱۵۳ (۲) سنن ابن ماجہ، رقم: ۴۲۹۱، باب ذکر التوبہ

ہے، یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے، جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى، وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ (۱)

(کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا، پس نماز پڑھی)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح و پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے، اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

﴿إِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ، وَمَنْ تَزَكّٰى فَإِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾ (۲)

(تو انہیں کو تو ہوشیار کر سکتا ہے کہ جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے، اپنے ہی لئے حاصل کرتا ہے، اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے)۔

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعاً، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعاً، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعاً، إِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾ (۳)

(بے شک انسان بے صبرا بنا ہے، جب اس پر مصیبت آئے تو

---

(۱) سورۂ اعلیٰ/۱۴-۱۵ (۲) سورۂ فاطر/۱۸ (۳) سورۂ معارج/۱۹-۲۳

گھبرا یا، اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں)۔

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لئے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے، نماز کے انہی اثرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ: ''اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف وشفاف نہر بہتی ہو، جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے؟'' صحابہ نے عرض کیا: نہیں یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)! ارشاد ہوا کہ ''نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے، جس طرح پانی میل کو۔''(۱)

ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آکر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی، اس پر آیت نازل ہوئی:

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ، ذٰلِكَ ذِكْرَىٰ لِلذَّاكِرِينَ﴾ (۲)

(اور دن کے دونوں پہر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کو)۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا، کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے، ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے، جو اپنے صحیح آداب وشرائط کے ساتھ بجالائی گئی ہو،

---

(۱) یہ حدیث مختلف مجموعہائے حدیث میں ہے، امام ترمذی نے اپنی جامع السنن میں ابواب الامثال میں ذکر کی ہے۔
(۲) سورۂ ہود/۱۱۴

یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے، جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔"(۱)

آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں نماز کے بارے میں جو تصریحات وتاکیدات ملتی ہیں، اعمال وعبادات میں کسی اور کے بارے میں اتنی شدت سے نہیں ہیں، عقیدۂ توحید اور ایمان بالرسالت وختم نبوت اور ایمان بالآخرۃ کے بعد نماز کو ہی اس درجہ اہمیت سے ذکر کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس سلسلہ میں سخت سے سخت وارد ہوئے ہیں، یہ کسی صورت میں معاف نہیں، البتہ پاکی (بدن کی اور جگہ کی بھی) اور ہوش وحواس کو ضروری قرار دیا گیا، ارشاد ہے:

﴿......إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ......﴾(۲)

(اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے چہروں کو اور ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کرلیا کرو اور پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو اچھی طرح پاک ہولو، اور اگر تم مریض ہو یا سفر پر ہو یا تم استنجاء کر کے آئے ہو یا تم نے عورتوں سے مباشرت کی ہو پھر تمہیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمم کرو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلو، اللہ تمہیں بالکل تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا البتہ وہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے اور اپنی نعمت تم پر مکمل کردے، شاید کہ تم شکر کرنے لگ جاؤ)۔

آگے وضو کی پوری ترتیب وترکیب اور طہارت کے دوسرے طریقے غسل و تیمم وغیرہ ذکر کیے گئے ہیں کہ کس حالت میں کونسا طریقۂ طہارت کافی ہوجائے گا،

---

(۱) ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد پنجم (۲) سورۂ مائدہ/۶

اور حصول عبادت کے طریقہ میں بھی اللہ نے یہ تاثیر رکھی کہ ظاہری وجسمانی طہارت کے ساتھ باطنی وروحانی طہارت بھی ہوتی جاتی ہے، اب اگر کوئی نماز سے بے پرواہ ہوکر تزکیۂ نفس اور ولایت بارگاہ ایزدی کا متمنی ہے تو یہ اس کے دماغ کی خرابی ہی کہی جائے گی، حضرت مجدد الف ثانی امام سرہندیؒ (۱۰۳۴ھ) نے اپنے ایک مسترشد میر محمد نعمان کو ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:

''اس گروہ (صوفیاء) میں ایک جماعت ہے جو نماز کی حقیقت سے آگاہ اور اس کے کمالات مخصوصہ سے واقف نہیں ہوسکی، وہ اپنے امراض کا علاج دوسری چیزوں سے ڈھونڈتی اور اپنے مقاصد کا حصول دوسرے امور سے مربوط سمجھتی ہے، بلکہ ان میں سے ایک گروہ نماز کو دور از کار سمجھتے ہوئے اور اس کو غیر وغیریت پر مبنی سمجھتے ہوئے روزے کو نماز سے افضل سمجھتا ہے کہ اس میں صفت صمدیت کا ظہور ہے، اور ایک جم غفیر اپنے اضطراب کی تسکین سماع ونغمہ، وجد وتواجد سے تلاش کرتی ہے، اور رقص ورقاصی کو بھی کمال سمجھ لیا ہے، کیا انہوں نے نہیں سنا کہ "ماجعل اللہ فی الحرام شفاء" (اللہ تعالیٰ نے حرام چیز میں شفا نہیں رکھی) اگر ان پر ان کمالات کا جو نماز سے حاصل ہوتے ہیں، ایک شمہ بھی منکشف ہوجاتا تو وہ سماع ونغمہ کا دم نہ بھرتے اور وجد وتواجد کو یاد نہ کرتے ؎

''چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند''(۱)

امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمہ اللہ نماز کو انسان کے لیے مجموعہ کمالات بنانے اور اس میں تمام مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) مکتوب بنام میر محمد نعمان از دفتر اول نمبر ۲۶۱ بحوالہ تاریخ دعوت وعزیمت ۴/۲۵۵

''اس میں شک نہیں کہ نماز ایسی چیز ہے کہ خود خدائے ذوالجلال نے اپنی کتاب میں خاصیتیں اس کی بیان فرمائی ہیں کہ وہ انسان کو تمام کمالات انسانی کا مجموعہ بنادیتی ہے، اور شریعت الٰہیہ کی نافرمانی سے بچاتی ہے، کیا یہ معمولی بات ہے۔

یقیناً اگر مسلمانوں کی توجہ نماز کی طرف ہوجائے اور وہ اپنی نماز کے درست کرنے کی فکر میں لگ جائیں تو تمام وہ مقاصد بہ آسانی حاصل ہوجائیں جن کی ضرورت آج مصلحان قوم محسوس کررہے ہیں، اور جن کے حاصل کرنے کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملارہے ہیں، اور نہیں حاصل ہوتے، نماز کے درست ہوجانے سے مسلمانوں کو اپنے دین کی معرفت حاصل ہوگی۔

اسلام کے عقائد ضروریہ سب کو معلوم ہوجائیں گے، ان کے ایمانیات سب ایک مرکز پر آجائیں گے، ان کے آپس کے بہت سے جھگڑے جو بالکل لغو اور فضول ہیں یک قلم رفع ہوجائیں گے، بہت سے باہمی اختلافات جو اگر اپنی حد میں رہتے تو مذموم نہ تھے اور اب چونکہ وہ تنازع فی الدین کا رنگ اختیار کرچکے ہیں، ان کی وجہ سے آج مسلمانوں کی وہ حالت ہورہی ہے جو خدا نے یہود ونصاریٰ کی بیان فرمائی ہے۔

ان تمام اختلافات کا فیصلہ کرکے ان میں اخوت واتحاد کا شیرازہ قائم کرنے والی، ان میں ایثار اور ہمدردی کی صفت بیدار کرنے والی، ان کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی میں لانے والی نماز ہے۔''(۱)

---

(۱) مقدمہ کتاب الصلوٰۃ مصنفہ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی۔

ذکر

نماز کو بھی اللہ کا ذکر کہا گیا ہے، اور نماز میں اول تا آخر اللہ کا ذکر ہی ذکر ہے، اسی کی حمد وثناء ہے اور اسی سے دعا ومناجات، اسی کی تکبیر وتعظیم ہے اور اسی کے کلام کا ورد، اور مراقبہ بھی اور ہر نوعیت کا ذکر، ذکر لسانی بھی، ذکر قلبی بھی، ذکر روحی بھی، اور روئیں روئیں کا ذکر، پورا جسم سبھی قویٰ اور جوارح ذکر میں ہی ہوتے ہیں، لیکن نماز میں آدمی ہر وقت نہیں رہتا، اس کو زندگی کے اور بھی کام ہوتے ہیں، گھریلو مسائل، معاشرتی معاملات، دعوتی حالات، خدمت خلق وغیرہ لیکن اللہ کی یاد (ذکر) سے بندہ کو کسی وقت بھی غافل نہیں ہونا ہے، ذکر اللہ کے نام کا بھی کرنا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ (۱)

(اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرو)۔

اور ورد کلمہ کا بھی رکھنا ہے، حدیث میں افضل الذکر کلمہَ لا الٰہ الا اللہ کو کہا گیا ہے، اور اسی کے ذریعہ ایمان کی تجدید کرتے رہنے کو کہا گیا ہے، قرآنی ہدایات، نبوی ارشادات اس میں کھلی رہنمائی کرتے ہیں، یہ ذکر ہی ہے جو قلب کو چمکاتا ہے، حدیث میں اسے "صقالۃ القلوب" کہا گیا ہے، اس سے اللہ پر یقین جمتا ہے اور دوسروں سے دل ہٹ کر ایک طرف یکسو ہو جاتا ہے، اور دل میں ایک اللہ کی محبت سما جاتی ہے اور ان کی محبت جن سے اللہ کو محبت ہوتی ہے، تو کیوں نہ حبیب خدا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب واتباع کی محبت نہ سمائے گی، اللہ تعالیٰ آپ پر درود بھیجتا ہے، اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں اور اس کا اہل ایمان بندوں سے

---

(۱) سورۂ مزمل/۸۔ اس کے علاوہ ایک جگہ ﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَىٰ﴾، ایک جگہ ﴿وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا﴾، اسی طرح ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ﴾، وغیرہ کے الفاظ یہ رہنمائی کرتے ہیں کہ اللہ کے نام کی تسبیح، اللہ کی حمد اور اللہ کی بڑائی بیان کی جائے اور اس کے مخصوص صیغوں "سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر" وغیرہ کا ورد رکھا جائے، اسی طرح ﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ﴾ کا جملہ تقاضا کر رہا ہے کہ مطلق اللہ کے نام کو بھی زبان پر جاری رکھا جائے اور حدیث شریف میں آتا ہے: "لا یزال لسانك رطباً من ذکر اللہ" أو کما قال علیه الصلوٰة والسلام.

مطالبہ ہے کہ وہ بھی درود وسلام بھیجیں، ذکر کی ایک قسم یہ بھی ہے اور یہ از قبیل دعا ہے، اور تمام دعاؤں میں سب سے افضل دعا ہے، اور ایسی دعا ہے کہ صرف یہی دعا کی جائے تو تمام دعاؤں کو کافی ہوا کرتی ہے۔(۱)

تو ذکر و دعاء و تسبیح کا ایک خاص شکل وصورت کا طریقہ تو نماز ہے اور دوسرا طریقہ جو عام ہے اس کے لئے زمان ومکان اور ایک خاص ہیئت بنانے کی شرط نہیں ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں، ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید وشرط کے بغیر ادا کر سکے، اس کا نام تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی ہے جس کے لئے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے، چنانچہ خدا نے فرمایا:
>
> ﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَاماً وَّقُعُوداً وَّعَلىٰ جُنُوبِكُمْ﴾ (۲)
>
> (پس تم اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرو)۔
>
> اور سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے صحابہ کرام کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:
>
> ﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَاماً وَّقُعُوداً وَّعَلىٰ جُنُوبِهِمْ﴾ (۳)
>
> (جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں)۔
>
> دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے،

فرمایا:

---

(۱) ذکر میں اذکار، اشغال، مراقبات کی مختلف شکلیں اور صورتیں آجاتی ہیں، لوگوں کے طبائع اور زمانہ کے تقاضوں اور حالات کے رخ کے اعتبار سے روحانی امراض کے ازالہ کے لئے مشائخ وقت شریعت وسنت کی روشنی میں مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں، تاکہ انسان کسی لمحہ بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے پائے۔

(۲) سورۂ نساء/۱۵ (۳) سورۂ آل عمران/۱۹۱

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِاللّٰهِ﴾(۱)
(ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید وفروخت کے
مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے)۔"(۲)

قرآنی ہدایات اور نبوی تعلیمات نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ذکر وفکر کا ایسا گرویدہ بنا دیا تھا کہ وہ ہر وقت اللہ کی یاد اور اللہ کی مرضی کے حصول کے کاموں میں لگے ہوتے تھے اور اسی میں لگے رہنے نے ان کے اندر وہ سوز عشق پیدا کر دیا تھا جو بڑی ریاضات اور مجاہدات کے بعد بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے اس معجزانہ اثر اور صحابہ کے حال کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح وتحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین وتسلی کے احساس سے خالی تھی، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے دفعۃً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اس کے ہر کام کا مقصد بن گئی، اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی، اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزے کے سوا اور کوئی مزا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا، اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی

() سورۂ نور/ ۳۷
(۲) سیرۃ النبی جلد پنجم از سید سلیمان ندوی

طالب نہ تھیں اور اس کی روح یادالٰہی کی تڑپ اور ذکر الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔"

دل را کہ مردہ بود حیاتے زنور سید
تابوئے ازنسیم میش در مشام رفت (۱)

قلب و دماغ میں توحید راسخ نہ ہونے کے جو سنگین نتائج و اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ بے علمی سے بدعملی اور پھر شرک و کفر تک پہنچا دیتے ہیں، خدا فراموشی، مادیت پرستی، قومیت و وطنیت اسی شجرۂ خبیثہ کے پھل ہیں جو اپنے اندر زہر لیے ہوئے ہوتا ہے، اور اس محبت کو جو غیر اللہ کی ہوتی ہے اور قوم و وطن کی حد سے بڑھی ہوئی محبت، انسان کو غلط رخ پر ڈال دیتی ہے، "لآالہ الا اللہ" کے ذکر اور قلب پر اس کی ضرب ان غلط رجحانات و خیالات اور دنیوی محبت کا خاتمہ کرتی ہے، حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے اس کی تاثیر اور تقاضے کو واضح طور پر اس طرح بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس موقع پر یہ بتادینا بھی مناسب ہوگا کہ مادہ پرست اور خدافراموش یورپ میں ہیرو پرستی، قوم پرستی، اور وطن پرستی کی قسم کی جو گمراہیاں پیدا ہوئی ہیں، اور جس طرح ان کا ظہور ہورہا ہے، یہ سب بھی شرک ہی کی ذریات ہیں، اور اسلام "لا الہ الا اللہ" ہی کی ضرب سے ان نئے معبودوں کو بھی مٹانا چاہتا ہے، مثلاً: اپنے قومی ہیروؤں کی مطلق اور غیر مشروط پیروی کرنا اور ان کے مجسمے نصب کرانا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے سامنے بھی تعظیم و عقیدت کے مظاہرے کرنا، سلامی دینا، سر جھکانا، اور ان پر ہار پھول چڑھانا، اور دعوتی، اجتماعی معاملات

---

(۱) سیرۃ النبی جلد پنجم ص/۱۰۵ ایڈیشن لاہور

میں قانون الٰہی سے بے پرواہ ہوکر اپنے خدا ناشناس لیڈروں کی پیروی کرنا، تو ہیرو پرستی، لیڈر پرستی کی یہ سب صورتیں بھی ''لا الہ الا اللہ'' کے پیغام توحید کے قطعاً منافی ہیں، اور اسلام میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''(۱)

توحید کامل کے مقام تک پہنچنے کے لیے ابتدائی نصاب کے طور پر حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ نے بڑے تجربہ کی بات یہ تحریر فرمائی ہے کہ:

''اس منزل مقصود کی طرف جانے کے لیے صحیح تر راستہ تو وہی ہوگا جو اس منزل کا کوئی شناسا اور اس کا کوئی راہبر آپ کے لیے تجویز کرے، لیکن ہم جیسے مبتدیوں کے لیے ایک عمومی تدبیر جس میں انشاء اللہ کوئی خطرہ اور کوئی کھٹکا نہیں ہے اور جو اس راہ کے عارفوں ہی کی بتلائی ہوئی اور لکھی ہوئی ہے، یہ بھی ہے کہ اس حقیقت کا دھیان کر کے کہ ''اللہ کے سوا میرا کوئی مقصود و مطلوب نہیں'' اسی کلمہ ''لا الہ الا اللہ'' کے ذکر کی کثرت کی جائے، یعنی تسلسل اور تکرار کے ساتھ دل اور زبان ہم آواز ہو کے اَلاپا کریں، ''لا الہ الا اللہ'' (اللہ کے سوا کوئی مقصود و مطلوب نہیں) اس معنی سے دھیان کے ساتھ اس ذکر کی کثرت ہی سے انشاء اللہ یہ کیفیت پیدا ہونے لگے گی، اور خدا نے چاہا تو ترقی ہوتی جائے گی۔''(۲)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ نے اپنے ایک مرید کے سوال کے جواب میں جس میں ذکر نفی و اثبات ''لا الہ الا اللہ'' اور اثبات محض ''اللہ اللہ''

---

(۱) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۱۹ (الفرقان بک ڈپو لکھنؤ)

(۲) کلمہ طیبہ کی حقیقت از مولانا محمد منظور نعمانی ص/۲۸

کی تاثیر کے بارے میں دریافت کیا تھا، فرمایا کہ "لا الہ الا اللہ" کی کثرت سے ایمان و یقین مضبوط ہوتا ہے اور "اللہ اللہ" کی کثرت سے اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھتی ہے۔"

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے فضائل ذکر میں "لا الہ الا اللہ" کی کثرت کا بڑا فائدہ یہ تحریر فرمایا ہے کہ "اس کی کثرت رکھنے والے کا انجام خراب نہیں ہوتا اور آخری ایام میں وہ رسوائی سے بچ جاتا ہے۔"

اور تجدید ایمان کا فائدہ ظاہر و باہر ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: جدّدوا إيمانكم، قيل يا رسول الله وكيف نجدد إيماننا؟ قال: أكثروا من قول لا إله إلا الله." (۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے ایمان کی تجدید یعنی ان کو تازہ کرتے رہا کرو، صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم کس طرح اپنے ایمان کی تجدید کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا الہ الا اللہ" کثرت سے پڑھا کرو)۔

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جو صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں مذکور ہے، ایمان کے ستّر سے زائد شعبوں میں سب سے افضل شعبہ "لا الہ الا اللہ" کے کہنے کو کہا گیا ہے۔

اور ابن ماجہ ونسائی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں تمام اذکار میں افضل و اعلیٰ "لا الہ الا اللہ" کو کہا گیا ہے۔

اور نسائی، حاکم اور بیہقی وغیرہ نے حضرت ابوسعید خدری سے مروی ایک حدیث قدسی ذکر کی ہے جس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

---

(۱) مسند احمد و معجم طبرانی

"لو أن السماوات السبع والأرضين السبع وضعت فى كفة و وضعت لآإله إلا الله فى كفة، لرجحت بهن"۔
و اللفظ لمصنف ابن ابي شيبة(۱)
(اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ایک پلڑے میں رکھی جائیں اور"لا الہ الا اللہ" دوسرے پلڑے میں، تو"لا الہ الا اللہ" والا پلڑا ہی بھاری رہے گا)۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ نے اس کلمہ کے الگ جز کے مفرد ذکر کی بھی اہمیت باور کراتے ہوئے اللہ کے مفرد ذکر کو اس کے حکم "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ" سے جوڑا ہے اور لکھا ہے کہ ظاہری الفاظ سے محض اسم کے ذکر کو بھی عام ہے، اور یہ توجیہ بھی حضرت تھانویؒ کے حوالہ سے تحریر فرمائی ہے کہ حرف ندا محذوف اور حذف ندا شائع اور مشہور ہے، یہ ندا شوق اور نام کے ساتھ تلذذ کی وجہ سے ہوئی ہے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ہی حوالہ سے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ"الا اللہ" اور اسم جلالہ کے تکرار معتاد سے مقصود بالذات ذکر نہیں بلکہ ایک خاص مطلوب کا استحضار مقصود ہے، اور وہ خاص مطلوب فنائے علمی غیر اللہ اور توجہ الی اللہ میں تدریجاً ترقی کرنا ہے، اور یہ بھی حکمت بیان کی ہے کہ چونکہ ابتدا میں کثرت مشہود ہوتی ہے، اس لیے لا الہ الا اللہ سے اس مشہود کی نفی کر کے اس کو راسخ کیا، پھر جب اس نفی میں ایک درجہ گویا کامیابی ہوگئی تو محض ثبوت ذات کو ذہن میں راسخ کرنے کے لیے الا اللہ کا تکرار کیا، پھر ثبوت ذات کو ذہن میں راسخ کرنے کے لیے اسم جلالہ کا تکرار کیا، جس کی مزاولت سے قلب میں غیر مطلوب سے بے التفاتی اور حضرت مطلوب کی طرف خاص التفات میں بلکہ راسخ ہو کر پھر ذکر کامل کا حق ادا کر کے خوب مقصود حاصل کرتا رہے گا۔(۲)

امراض کے ازالہ اور صفات سے متصف ہونے میں اذکار میں وہ تسبیحات

---

(۱) مسند احمد: ٦۵۸۳، والادب المفرد: ۵۴۸ (عن عبداللہ بن عمرو)
(۲) شریعت وطریقت کا تلازم: ۱۷۲-۱۷۳

بھی ہیں جنھیں تسبیحات فاطمی کہا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چہیتی بیٹی سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو یہ تلقین فرمائی، جب ان کو تعب ومشقت کی وجہ سے معاون درکار تھا، اس کے التزام نے یہ سہولت پیدا کردی اور پر مشقت کام ان کے لیے آسان ہوگئے، سبحان اللہ، الحمد للہ، اور اللہ اکبر کا یہ ذکر ہے، سبحان کی کثرت جسمانی وروحانی عیوب کو زائل کرتی ہے، الحمد اللہ کی کثرت سے اوصاف حمیدہ پیدا ہوتے ہیں، اور اللہ اکبر کی کثرت سے تواضع پیدا ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں رفعت وعظمت ملتی ہے، ذاکر اپنی نگاہ میں تو بڑا حقیر وخاکسار ہوتا ہے لیکن دوسروں کی نگاہ میں عالی مرتبہ والا اور قابل تقلید ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی بھی ہیں، ان کا بھی الگ الگ ذکر ہے، جیسے یارحمٰن یا رحیم، اور یا سلام وغیرہ، دعا واستغفار بھی ذکر میں شامل ہے، اور درود شریف بھی جس میں دعا بھی ہے اور سب سے بڑھ کر دعا اور اللہ کی کبریائی کا اظہار بھی ہے، اور درودِ ابراہیمی کا خیال رہے تو اس میں اللہ کی حمد بھی ہے۔

اشغال میں اعضاء جسمانی ہاتھ پیر وغیرہ اور قلب ونگاہ کی حفاظت اور ان کا صحیح جگہ استعمال بھی ہے، جس کا سب سے زیادہ ظہور نماز میں ہوتا ہے، ان سب کے ساتھ سانس کی حفاظت بھی اہم شغل ہے، جس میں سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اسی طرح قلب کا معاملہ ہے اس میں زبان حرکت نہیں کرتی، لیکن سانس اور قلب اپنا عمل جاری رکھتے ہیں، اور یہی دونوں نفس کے لیے ایسے ساتھی ہیں جو آخر میں ساتھ چھوڑتے ہیں، سارے اعضا کام کرنا چھوڑ دیں، لیکن یہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، اس کی مشق کا سب سے زیادہ فائدہ انتقال کے وقت ہوتا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی غرض یہ بیان کی ہے کہ:

> ”پاس انفاس سے اصلی غرض یہ ہے کہ انسان کا کوئی سانس اللہ کے ذکر سے خالی نہ رہے، نہ اندر جانے والا سانس نہ باہر نکلنے

والا سانس۔"(۱)

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"بغیر پاس انفاس کی مدد کے انسان کا قلب کدورتوں اور تاریکیوں سے ہرگز صاف نہیں ہوسکتا۔"(۲)

مراقبات میں مراقبۂ دعائیہ اور تصورات میں تصور آخرت سب سے بڑھ کر ہے، معاصی چھوٹتے جاتے ہیں اور طاعات میں حلاوت ولذت حاصل ہوتی ہے، اور اس کی توفیق ملتی جاتی ہے اور بقول حضرت مولانا اسعد اللہ علیہ الرحمہ سابق ناظم مظاہر علوم سہارنپور:

"یہ اذکار گناہوں کو چھڑانے میں بڑے معاون ومؤثر ہوتے ہیں۔"

قرآن مجید

اللہ تعالیٰ کے قرب وولایت کے لئے مدارج طے کرنے میں قرآن مجید سے تعلق کو بڑا دخل ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ میں بڑا اہتمام فرماتے تھے، اور صحابہ وتابعین بھی اور سبھی اولیاء واصفیاء نے اس کو حرز جان بنایا، اور اس میں ذرا بھی کوتاہی روا نہ رکھی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے دین کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا: "الدین النصیحة" کہ دین خیر خواہی کا نام ہے، صحابہ نے پوچھا: "لمن؟" کن کے ساتھ؟ فرمایا: "للّٰه ولكتابه ولرسوله ولأئمة المسلمين وعامتهم"(۳) تو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی شکل میں کتاب عطا فرمائی، اس کی تلاوت، اس کی عظمت، اس سے محبت، اس میں غور وفکر اور تدبر اور اس کے مطابق زندگی کو ڈھالنا اور اس کے پیغام کو عام کرنا یہ سب کچھ نصیحت میں داخل ہے، قرآن مجید کے ساتھ تعلق کے بارے میں امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ فرماتے

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم/۱۷۵-۱۷۶ (۲) ایضاً/۱۷۵، بحوالہ ضیاء القلوب

(۳) صحیح مسلم، باب بيان أن الدين النصيحة، حديث:۹۵

ہیں:

"قرآن مجید کی عظمت کا تصور کرے، اور دل سے سوچے کہ یہ اللہ کی صفات ازلیہ میں ہے، محض اپنی عنایت سے زبان عربی کے لباس میں اس وصف ازلی اور کمال ذاتی کو نازل فرمایا اور اس کو اپنے بندوں کے درمیان واسطہ بنایا جس طرح کہ ایک بادشاہ عظیم القدر اپنی دستار کو ہاتھ میں لئے اس کے ایک کنارے کو اپنے ہاتھ سے تھامے اور دوسرے کنارے کو ایک مفلس وعاجز وفقیر بے چارے کو جو کہ ہرگز التفات شاہانہ کے لائق نہ تھا پکڑائے اور حکم دے کہ جب کبھی تجھ کو ضرورت پیش آئے اس دستار کو حرکت دے کر مجھ کو اپنی ضرورت کی اطلاع دے، میں فوراً توجہ کروں گا، پس اگر اس فقیر کی حالت پر اچھی طرح سے غور کیا جائے، تھوڑی دیر کے لئے قانون ادب سے آدمی ہٹ جائے تو صاف صاف کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ بظاہر فقیر کے ہاتھ میں دستار کا صرف ایک کنارہ ہے لیکن فی الحقیقت اس کے ہاتھ میں خود بادشاہ اور اس کی بادشاہت ہے، غرض اس کلام پاک کی عظمت اس کے ذہن میں ایسی راسخ ہوجانی چاہئے کہ جب وہ مصحف پر نظر کرے اور اس کلام پاک کے تعلق کا مصحف کے ساتھ لحاظ کرے، اس کی نگاہیں مصحف کے دیکھنے سے خیرہ اور اس کا سینہ اس کلام کی عظمت سے پاش پاش ہوجائے اور پھر جب وہ دیکھے کہ وہ کلام پاک اس مصحف کے واسطہ سے میرے قابو میں ہے جس وقت توجہ کروں بے تکلف اس کو زبان پر جاری کرلوں اور جس وقت ارادہ کروں بلاجان ومال صرف کئے

ہوئے اپنے ہاتھ کو اس تک پہنچا دوں اور اس کو سینہ پر رکھ لوں تو ضرور اس کو اس بات کا خیال کر کے اپنی حالت پر تعجب و حیرت ہوگی، جس طرح ایک یاقوت درخشاں ایک مفلس کم مایہ کے ہاتھ لگ جائے جب وہ اس کو دیکھتا ہے تو نگاہ اس کی چمک سے خیرہ ہو جاتی ہے، جب اپنے افلاس و کم مائیگی پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت میں غرق ہو جاتا ہے۔(۱)

قرآن مجید کی تلاوت پوری عظمت، محبت و عقیدت اور احترام و تقدس کے ساتھ کی جائے اس لیے کہ اللہ رب العزت کا کلام ہے، اور بندہ کی زبان سے اس کی ادائیگی کا اللہ نے اس طرح حکم فرمادیا ہے، تو یہ تلاوت قلب کے زنگ کو دور کرتی ہے اور ایک ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، گناہ معاف ہوتے ہیں، اس طرح یہ چیز قلب کی صفائی اور نفس کے تزکیہ اور باطن کی اصلاح کا بڑا ذریعہ بنتی ہے۔

اتباع سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چھوٹی بڑی تمام سنتوں کا، ان کا تعلق عبادات سے ہو یا عادات سے، التزام کیا جانا چاہئے، ان میں بھی کچھ وہ ہیں جو فرائض و حقوق سے متعلق ہیں اور کچھ وہ ہیں جو نوافل اور مستحبات سے تعلق رکھتی ہیں، زندگی میں لانے کے لئے درجہ بہ درجہ ان کی اہمیت ہے، اور بعض عارفین نے یہ کہا ہے کہ اس سلسلہ میں علماء و فقہاء کی اصطلاحیں اور تقسیم اپنی جگہ، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جس چیز کی نسبت ہو اس کو عملاً ضروری ہی سمجھنا چاہئے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس سلسلہ میں اور اونچی بات تحریر فرمائی ہے کہ:

''اتباع سنت کا ایک دقیق، نہایت لطیف اور بلند درجہ یہ ہے کہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: سیرت احمد شہیدؒ (طبع اول ۱۹۳۹ء بحوالہ ''صراط مستقیم'' ملفوظات حضرت سید احمد شہید مرتبہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ۔

عام انسانی حالات وحوادث سے حدود شریعت کے اندر طبعی طور پر متاثر ہو جائے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات پر جو بشری طور پر رنج وحزن کا باعث ہیں، طبعی طور پر حزن بھی ہوتا تھا، اور سرور کے مواقع پر سرور اور شکر کی کیفیت بھی پیدا ہوتی تھی، بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سلوک وتصوف اور کمال وترقی یہ ہے کہ انسانی احساسات اور بشری تأثرات وکیفیات سے انسان بالکل آزاد ہو جائے، نہ اس پر حزن کبھی طاری ہو نہ کوئی چیز سرور پیدا کر سکے۔" (١)

احکام شریعت پر عمل اور اتباع سنت

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کبار مشائخ سالکین کے حوالہ سے احکام شریعت پر عمل اور اتباع سنت ضروری قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"فأما المستقيمون من السالكين كجمهور مشائخ السلف مثل الفضيل بن عياض وإبراهيم بن أدهم وأبى سليمان الدارانى ومعروف الكرخى، والسرى السقطى والجنيد بن محمد، وغيرهم من المتقدمين، ومثل الشيخ عبد القادر والشيخ حماد والشيخ أبى البيان وغيرهم من المتأخرين، فهم لا يسوغون للسالك ولو طار فى الهواء أو مشى على الماء أن يخرج عن الأمر والنهى الشرعيين بل عليه أن يفعل المأمور ويدع المحظور إلى أن يموت، وهذا هو الحق الذى دل عليه

(١) حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت/٢٤٢-٢٤٣
(٢) فتاوی ابن تیمیہ ١٠/٥١٦-٥١٧

الكتاب والسنة وإجماع السلف." (۲)

(جہاں تک اہل استقامت سالکین کا تعلق ہے، جیسے سلف صالح میں بڑے مشائخ فضیل بن عیاض، ابراہیم بن ادہم، ابوسلیمان دارانی، معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی وغیرہ اور بعد کے مشائخ میں جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ حماد، شیخ ابوالبیان وغیرہ، وہ سب کے سب سالک وصوفی کے لیے شریعت کی اقتدا کو ضروری قرار دیتے ہیں، چاہے وہ ہوا میں اڑنے لگے اور پانی پر چلنے لگے، زندگی بھر مامورات پر چلنا اور منہیات سے بچنا ضروری ہے، یہی حق وصواب ہے، کتاب وسنت یہی کہتی ہے، اور اسی پر اجماع سلف ہے)۔

امام ابن تیمیہ علیہ الرحمہ اتباع سنت کی اہمیت وضرورت کو اور واضح انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"فمحمد صلى الله عليه وسلم أرسل إلى كل أحد من الإنس والجن كتابيهم وغير كتابيهم في كل ما يتعلق بدينه من الأمور الباطنة والظاهرة في عقائده وحقائقه وطرائقه وشرائعه، فلا عقيدة إلا عقيدته ولا حقيقة إلا حقيقته ولا طريقة إلا طريقته ولا شريعة إلا شريعته، ولا يصل أحد من الخلق إلى الله وإلى رضوانه وجنته، وكرامته، وولايته إلا بمتابعته باطناً وظاهراً في الأقوال والأعمال الباطنة والظاهرة في أقوال القلب وعقائده وأحوال القلب وحقائقه وأقوال اللسان وأعمال

(۱) فتاویٰ ابن تیمیہ ۱۰/۴۳۰-۴۳۱

الجوارح وليس لله وليّ إلا من اتبعه باطناً وظاهراً."(۱)

(محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انس وجن کے ہر فرد کی طرف مبعوث کیے گئے، کتابی ہوں یا غیر کتابی، عقیدہ وحقیقت اور طریقت وشریعت کے تمام ظاہری وباطنی دینی امور میں آپ کی بعثت ہوئی ہے، آپ کا عقیدہ ہی عقیدہ ہے، آپ کی حقیقت ہی درحقیقت حقیقت ہے، آپ کا طریقہ ہی طریقت ہے، آپ کی شریعت ہی شریعت ہے، مخلوق کی خالق کی طرف رسائی اور اس کی خوشنودی اس کی جنت اور ولایت کے حصول کا راستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے بغیر ممکن نہیں، یہ اتباع ظاہر و باطن تمام قول وفعل میں قلب کے کلام وعقیدہ قلب کے احوال و حقیقت اور زبان کے کلام اور جوارح کے اعمال ان سب میں ضروری ہے، اور اللہ کی ولایت ظاہری وباطنی اتباع سنت کے بغیر حاصل ہی نہیں کی جاسکتی)۔

مقاصد بعثت میں تزکیہ کا مقام

سیدنا حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے رب العالمین سے دعا کی اور ایسے پیغمبر کی بعثت کی دعا کی جو تلاوت آیات، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ کے فرائض کی انجام دہی کرے، اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا کو اس طرح نقل کیا ہے:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱)

(اے ہمارے رب ان میں ایک ایسا رسول بھیج دے جو ان کو تیری

---

(۱) سورۂ بقرہ/۱۲۹

آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا
تزکیہ کرے بیشک تو ہی ہے جوزبردست ہے بھرپور حکمت والا ہے)۔

اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور آخری نبی کے طور پر پوری انسانیت کی تعلیم وہدایت اور تزکیہ وارشاد کے لئے سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی، اس طرح نسلی، قبائلی، علاقائی، لسانی حدود سے نکال کر یہاں تک کہ زمانی حدود سے بھی بالاتر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو بعثت مقرونہ فرمایا، اور صرف یہی نہیں بلکہ آپ کی صحبت اور زبان میں یہ تأثیر رکھ دی کہ جو تھوڑی دیر کے لئے ایمان اور جذبہ صحیح کے ساتھ بیٹھ جائے وہ علم سے بہرہ ور اور تزکیہ کے نور سے منور ہوجاتا، اس طرح بیٹھنے والے اور خدمت اقدس میں چند ساعت گزارنے والے کا پہلے ہی لمحہ میں تزکیہ ہوجاتا تھا اور تزکیہ کے نور سے تعلیم کتاب وحکمت سے بھی استفادہ آسان ہوجاتا تھا، اور بہت جلد حضرات صحابہ اس میں بھی کمال پیدا کرلیتے تھے، گو تزکیہ کا مقام نہایت اعلیٰ ہے، اور امراض نفسانیہ وقلبیہ کا علاج کہیں آخر میں جاکر ہوا کرتا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر دور کے امراض اپنے اپنے وقت کے اعتبار سے مختلف ہوا کرتے ہیں، لیکن صحبت نبوی کی برکت سے قلب میں ایسا نور اتر جاتا تھا جس سے تزکیہ کا فائدہ فوری طور پر حاصل ہوجاتا تھا اور صحیح یہ ہے کہ انوار کے نزول کا صحیح مقام قلب ہی ہے(۱) اور حدیث شریف ہے:

"ألا وإن فی الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله

---

(۱) اسی لیے مشائخ سلوک کا سارا زور قلب پر ہوتا ہے، اسی پر ضرب ماری جاتی ہے، اور اسی کو جاری کیا جاتا ہے، اور اسی کے لیے جو اذکار ومراقبات ہیں وہ مرید وسالک کی طبیعت کے اعتبار سے تجویز کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: مکتوبات امام ربانی، القول الجمیل فی بیان سواء السبیل از حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی، صراط مستقیم از حضرت سید احمد شہید، خیر السالک از مولانا محمد ظاہر حسنی، ضیاء القلوب از حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، تسہیل قصد السبیل از حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، شریعت وطریقت کا تلازم از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور مکتوبات شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور مجالس حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمہم اللہ۔

(۲) صحیح بخاری حدیث نمبر/۵۲، باب فضل من استبرأ لدینہ.

وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب." (٢)

(یادرکھو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک ہوتا ہے تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے، اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے، یادرکھو کہ وہ دل ہے)۔

حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے گو اپنی دعا میں تزکیہ کو مؤخر رکھا کہ وہ اعلیٰ وارفع مقام ہے، اور انبیاء کی بعثت کا اہم مقصد ہے، اور اس سے بندوں کے دل اللہ سے جڑتے ہیں، اور اسی سے فلاح اور نجات ملتی ہے، اور بہت سے ایسے امراض ہیں جن کا علاج آخر میں ہو جاتا ہے کہ وہ امراض پیدا ہی آخر میں ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ یہ خصوصیت تعلیم سے پہلے عطا فرمادی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تزکیہ پہلے ہی مرحلہ میں ہونے لگ گیا تھا۔

زادالمعاد میں علامہ ابن القیم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''فضالہ بن عمیرؓ کہتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ میں طواف کررہے تھے، میں برے ارادے سے آیا، جب قریب ہوا تو آپؐ نے فرمایا: فضالہ! میں نے کہا: یارسول اللہ! فضالہ ہی ہے، فرمایا: کیا ارادہ کررہے تھے؟ میں نے کہا: کچھ نہیں، اللہ کا ذکر کررہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور کہا: فضالہ! اللہ سے مغفرت چاہو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک میرے سینے پر رکھ دیا، میرا دل ٹھہر گیا، خدا کی قسم! ابھی آپ نے ہاتھ نہیں ہٹایا تھا کہ اللہ کی مخلوقات میں آپ سے زیادہ کوئی چیز میری نظر میں محبوب نہیں رہی، میں واپس گیا، تو وہ عورت ملی جس سے میں باتیں کیا کرتا تھا، اُس نے کہا: آؤ فضالہ! باتیں کریں۔

---

(۱) سیرت سید احمد شہید جلد دوم/٥٤٦

میں نے کہا: اسلام کے بعد یہ نہیں ہوسکتا۔"(۱)

اور اس صورتحال کی تصویر خود قرآن پاک نے کھینچ دی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کھلی فضیلت اور آپ کی نبوت و بعثت کی صداقت کی روشن دلیل الگ الگ تین موقعوں پر مقاصد بعثت بیان کرتے ہوئے بیان کی، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ، فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ (۱)

(جیسے کہ ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ہماری آیتیں تمہیں پڑھ کر سناتا ہے اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم جانتے نہ تھے، تو تم مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا اور میرے لیے شکر گزار بن کر رہو اور میری ناشکری مت کرو)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ (۲)

(بلاشبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان کے درمیان ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے جبکہ وہ اس سے

---

(۱) سورۂ بقرہ/۱۵۱-۱۵۲

(۲) سورۂ آل عمران/۱۶۴

پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

سورۂ جمعہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّيْنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ، وَآخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾(۱)

(وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے جبکہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے، اور دوسرے بھی ان میں شامل ہیں جو ابھی تک ان سے نہیں ملے اور وہ (اللہ) غالب ہے حکمت رکھتا ہے، یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے وہ عطا فرماتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے)۔

یہ وہ فضل عظیم ہے جس سے اللہ نے اپنے بندۂ خاص خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازا تھا، جس کی دعا ان کے جد امجد خلیل الرحمٰن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی تھی، اس طرح جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام پر پیار آیا، وہیں اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نوازنا چاہا، اور نمایاں امتیازی شان کے ساتھ نوازا، کہ آپ کا خیر آپ کی امت کو متعدی فرما کر امت کے برگزیدہ افراد میں بعض کو الگ الگ صفات کا حامل بنا کر تعلیم وتبلیغ، دعوت واصلاح باطن کے کام کی صلاحیت بخشی۔

(۱) سورۂ جمعہ ۲ تا ۴

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے :۱-تلاوت آیات الٰہی (یعنی قرآن حکیم)۔۲-تعلیم کتاب۔۳-تعلیم حکمت۔۴-تزکیۂ نفس کواسی ترتیب سے ذکر کیا ہے جس ترتیب سے ایک انسان کو فطری طور پر گزرنا پڑتا ہے اور یہ وہی ترتیب ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں رکھی، اوران کو بعثت کے اولین مقاصد میں گنایا ہے اور بتایا ہے کہ یہ دعوت اسلامی کے ارکان اربعہ اور مظاہر کبریٰ ہیں جن میں اس نبوت کا اصلاحی وتربیتی معجزہ ظہور پذیر ہے، باقی جو کچھ قانون وتشریع اور احکام وفروع اور حِکَم وجہاد وغیرہ کے امور ہیں وہ سب انہی مقاصد کا ذیل اور انہی کے لوازمات اور متممات اور مکملات ہیں، مزید ان مقاصد بعثت میں وہ تہذیب وتزکیۂ نفس کو اسی نبوی دعوت کے دائرہ میں بڑا اہم مقام دلاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”ومهمة تهذيب الأخلاق وتزكية النفوس تشغل مكاناً كبيراً في دائرة هٰذه الدعوة النبوية ومقاصد البعثة المحمدية وفي القرآن ما يدل على أن الأخلاق الفاضلة والآداب الإسلامية هي من أهم مظاهر الحكمة فإن القرآن قد أطلق لفظ الحكمة علىٰ هٰذه الأخلاق والآداب في عدة مواضع.“ (۱)

(تزکیہ نفس اور اصلاح اخلاق کا عمل نبوی دعوت کے دائرے اور بعثت محمدی کے مقاصد میں بڑی جگہ کو لیتا ہے اور قرآن مجید میں اخلاق فاضلہ اور اسلامی آداب کو حکمت کے مظاہر میں دکھایا گیا ہے اور قرآن مجید میں حکمت کا لفظ ان ہی اخلاق وآداب کے لیے متعدد مواقع پر استعمال کیا گیا ہے)۔

آگے لکھتے ہیں:

---

(۱) مقدمہ تہذیب الاخلاق از مولانا ابوالحسن علی ندوی

"فتعليم الأخلاق الفاضلة، وتهذيب النفوس وتزكية الأرواح – ولا يتم ذلك إلا بتصحيح العقائد والتطهر من دنس الشرك والجاهلية والتحلي بالعلم الصحيح – يحتل مكاناً كبيراً في مهمة النبوة المقدسة، ويشكل مقصداً كبيراً من مقاصد البعثة الرئيسية وقد دخل ذلك في تعليم الحكمة وفي التزكية." (۱)

(اخلاق فاضلہ کی تعلیم اور ارواح کے تزکیہ اور نفوس کی اصلاح و صفائی کا عمل بغیر عقائد کی اصلاح اور شرک ومظاہر شرک کی گندگی سے نکالے بغیر ممکن نہیں اور علم صحیح (یعنی علم نبوت) سے آراستہ کرنا نبوت مقدسہ کا بڑا کام اور بعثت کا بنیادی مقصد ہے، ان کے ساتھ تعلیم حکمت واخلاق اور تزکیہ نفوس وارواح کا عمل پورا ہوگا)۔

نبوی وراثت

انبیاء کی وراثت درہم ودینار، اشرفیوں اور آج کی زبان میں کہا جائے، روپے پیسے، پونڈ، ڈالر اور ریالات میں نہیں چلی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحۂ عظیم پیش آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے زیادہ مزاج شناس اور آپ کے طور طریق کے سب سے زیادہ واقف کار اور سب سے قدیم رفیق اور جاں نثار خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کے جمیع افراد خاندان اور دنیوی قانون کے تحت وارث ہونے والے اشخاص کے سامنے خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا دیا:

---

(۱) مقدمہ تہذیب الاخلاق از مولانا ابوالحسن علی ندوی

(۲) صحیح بخاری، رقم/۳۰۹۳، باب فرض الخمس.

"لا نورث، ما ترکنا صدقة."(۲)

(کہ ہماری میراث (مال ومتاع) نہیں چلے گی، ہمارا چھوڑا ہوا مال صدقہ ہوگا)۔

چنانچہ آپ کی وراثت دعوت دین اور آپ کی تعلیمات وہدایات اور قرآنی احکام وآیات کے فہم وعمل اور اس کی تعلیم وتبلیغ اور نفوس وارواح کے تزکیہ اور انسانی قلوب کے تصفیہ میں جاری ہوئی، اور اس میں جو جتنا بڑھتا گیا اور رسوخ پیدا کرتا گیا، اسے اپنے پروردگار کا تقرب بھی نصیب ہوا اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی وراثت ونیابت بھی ملی، اس کا دروازہ بند نہیں ہوا ہے، کھلا ہے اور کھلا رہے گا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ مقاصد بعثت کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے اس کے اہم ترین مقصد تزکیہ میں نیابت نبوت سے متعلق بہت واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

"آپ کے بعد آپ کی امت میں آپ کے ان اوصاف میں بہت سے لوگ علاحدہ علاحدہ اور بعض مجموعی طور پر آپ کے جانشین ونائب ہوئے اور قیامت تک ہوتے رہیں گے، بعض کے حصے میں تلاوت کتاب آئی، بعض کو تعلیم کتاب، بعض کو تعلیم حکمت سپرد ہوئی اور بعض کا منصب تزکیہ ہے اور بعض جامع اوصاف ہیں۔

صرف تلاوت کتاب کرنے والے حفاظ وقراء ہیں، تعلیم کتاب کی خدمت انجام دینے والے علماء ظاہر ہیں، اور حکمت کی تعلیم دینے والے علماء باطن اور محققین صوفیہ ہیں اور تزکیہ کرنے والے آپ کی امت کے وہ اہل دل اور صاحب حال بزرگ ہیں جو آپ کے انفاس وانوار کے وارث وحامل ہیں، انبیاء کی بعثت

کا مقصد پورا کرنے کے لئے اور ان کی برکات پہنچانے کے لئے تزکیہ بھی اتنا ہی ضروری کام ہے جتنی کتاب وحکمت کی تعلیم، یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ تعلیم ہے، اور وہ تربیت اور تکمیل انسانیت کے لئے دونوں کی ضرورت ہے۔

اعلیٰ تعلیم کے باوجود تزکیہ کی کمی اس طرح محسوس ہوتی ہے جس طرح کھانے میں نمک کی کمی اور دونوں کے نتائج میں وہی فرق ہے جو اکبر مرحوم نے بیان کیا ہے ع

زبان گو صاف ہوجاتی ہے، دل طاہر نہیں ہوتا

اہل دل نے ہمیشہ یہ ضرورت پوری کی اور امت کی اصلاح اور دین کی خدمت میں علماء کا اچھی طرح ہاتھ بٹایا، دونوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کا فرض انجام دیا، علماء ظاہر سے اگر لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی، اس کی خوشی وناخوشی کا حال اور شریعت کے احکام کا علم ہوا، توان بزرگوں سے حقائق شرعیہ اور حِکَم الٰہیہ کا علم اور احکام پر عمل کرنے کا شوق وولولہ، مسابقت کا جذبہ، قلب میں تازگی و رقت، روح میں بالیدگی، طاعات میں سہولت واخلاص، تہذیب نفس اور طہارت اخلاق حاصل ہوئی، جن کو نصوص قرآن وحدیث میں لفظ ''احسان'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعد میں اسی تزکیہ واحسان کو لوگوں نے تصوف، طریقت، علم باطن، سلوک مختلف ناموں سے یاد کرنا شروع کیا، اُسی وقت سے یہ بحثیں پیدا ہوئیں کہ یہ چیز بدعت ہے یا سنت، فرض ہے یا واجب، مستحب یا مباح؟ اور شریعت وطریقت میں موافقت

ہے یا مغایرت؟ پھر اس میں مختلف مذاہب اور گروہ ہو گئے، اور یہ ایک بہت بڑا اختلافی مسئلہ بن گیا، رفتہ رفتہ ظاہر و باطن کی تقسیم ہوئی، اور بہت سے لوگوں نے اس پر مصالحت کر لی، کہ شریعت و طریقت کی راہ الگ الگ ہے، رہنما الگ الگ ہیں اور رہ نورد الگ الگ، حالاں کہ یہ تقسیم سراسر بدعت ہے، لیکن اگر خیال رکھا جائے کہ تزکیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ وصف خاص ہے جس کو زبان وحی نے آپ کے اوصاف کے تذکرے میں کبھی نظر انداز نہیں کیا، تو یہ مباحث جنہوں نے بہت کچھ تلخی پیدا کر لی ہے اور دو محترم گروہوں میں جن میں سے ہر ایک کو دوسرے کی امداد کی ضرورت ہے، بہت ہی غیریت اور دوری پیدا کر دی ہے، از خود ختم ہو جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح کتاب وسنت کی تعلیم بعد میں ایک فن اور ''صناعت'' بن گئی اور اس کے لئے بہت سے علوم ومقدمات، کتابوں اور اساتذہ کا ایک پورا ضروری سلسلہ پیدا ہو گیا، اور دین کے خادموں نے اپنے اپنے وقت میں اس میں پوری کوشش کی اور اہل حق نے اس کو بدعات میں شمار نہیں کیا، بلکہ خدمت دین اور قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھا، اسی طرح تزکیہ بھی رفتہ رفتہ ایک فن اور صناعت ہو گیا، جس کے لئے تعلیم اور اساتذۂ فن کی ضرورت ہوئی، نیز ہر زمانہ کی صحت ومرض اور اہل زمانہ کے مزاج کے موافق ان اطباء امت نے قلوب و ارواح کا علاج کیا، اور وقتاً فوقتاً اس طب نبوی کی تجدید کرتے

---

(۱) سیرت سید شہید احمد جلد دوم ۵۴۶-۵۴۸

رہے۔"(۱)

بعثت کے اثرات

اگر انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ محض اپنی کوششوں اور محض اپنے غور وفکر، بحث و استدلال، مجاہدات، ریاضات و مراقبات سے اللہ کی معرفت اور نفس کی صفائی جسے تزکیہ کہتے ہیں حاصل کرلے گا، تو یہ ایک بڑا دھوکہ ہے، نبوت محمدی سے پہلے اس سلسلہ میں حکمائے یونان نے دھوکہ کھایا، اور نفس کے فریب کا شکار ہوکر کہیں کے نہ رہے، اسی طرح نبوت محمدی پر کچھ وقت گزرنے کے بعد حکمائے خراسان وایران نے ان حقائق ومعارف تک پہونچنے کا راستہ اپنی محنتوں اور کوششوں کو سمجھا تو وہ بھی جگہ جگہ زچ کھائے اور نامراد ہوئے، غور وفکر اور علمی بحث واستدلال کو فلاسفہ نے اختیار کیا اور اندرونی روشنی، نفس کشی، صفائی اور مشاہدہ اور وہ علم جو باطنی حواس اور روحانی طاقتوں سے حاصل ہوتا ہے، اسے حکمائے اشراق نے اختیار کیا، بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ:

> "درحقیقت فلسفہ اور اشراق میں ایک ہی روح اور ایک ہی ذہنیت کام کرتی ہے، دونوں حقیقت کو اپنی کوششوں سے پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم کرنا چاہتے ہیں، منزل دونوں کی ایک ہے، طریقۂ سفر مختلف ہے، ایک ہوا میں اڑکر (خیالی پرواز سے) وہاں پہنچنا چاہتا ہے اور ایک کسی مخفی زمین دوز راستہ سے (روحانی طریقہ سے)۔"(۱)

لیکن حضرت مجدد الف ثانی امام احمد بن عبدالاحد سرہندیؒ (۹۷۱ھ-۱۰۳۴ھ) نے بڑے صاف اور واضح طریقہ سے اس فکر وفلسفہ پر ضرب لگائی اور کہا:

> "ہم کہتے ہیں کہ تصفیہ وتزکیہ ان نیک اعمال سے وابستہ ہیں جو

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۴/۱۹۹

مولیٰ جل شانہ کو پسندیدہ اور اس کے یہاں مقبول ہوں اور یہ بات بعثت پر موقوف ہے پس بعثت کے بغیر صفائی اور تزکیہ کی حقیقت واشگاف نہیں ہوتی۔"(۱)

اسی طرح شیخ شہاب الدین سہروردی (۶۳۲ھ) بانی سلسلۂ سہروردیہ نے پوری صراحت سے یہ بات عوارف المعارف میں نتیجتاً ثابت کی کہ:

"تصوف نام ہے قولاً، فعلاً، حالاً ہر حیثیت سے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اسی پر مداومت رکھنے سے اہل تصوف کے نفوس مقدس ہو جاتے ہیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور ہر شی میں اتباع رسول ہونے لگتا ہے۔"(۲)

مشہور ہندوستانی عارف ومحقق صوفی شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ نے وجد انگیز طریقہ پر پوری قوت سے یہ بات کہی کہ:

"انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے، انبیاء کا جسم خاکی اپنی صفائی وپاکیزگی اور قرب خداوندی میں اولیاء کرام کے دل اوران کے سر اور راز ونیاز کے برابر ہے۔"(۳)

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مجدد الف ثانیؒ کی تعلیمات سے نتیجہ نکالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"انبیاء کرام اعتقادی، روحانی، ذہنی اور خلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی صفت اور صفت جود کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں، ان کو ایسا تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے جس میں کوئی توجہ اور مصروفیت حاجب نہیں ہوتی اور یہ اس شرح صدر کا نتیجہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ ان

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۴/۲۴۴ بحوالہ مکتوب بنام خواجہ عبداللہ وخواجہ عبیداللہ

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم، باب دہم، ص/ ۲۹۸-۳۰۲

(۳) تاریخ دعوت وعزیمت جلد چہارم، ص/۲۳۲

کو خاص کرتا ہے، ان کی عالی ظرفی، قوت تحمل، وسعت صدر اوران کے پیغام اور کام کا (جو ان کے سپرد کیا جاتا ہے) تقاضا ''صحو دائم'' ہر وقت کی بیداری حاضر دماغی اور ہوش ہے جو اہل ولایت وسکر کو حاصل نہیں، ان کی جہاں ابتدا ہوتی ہے وہ اولیاء کی انتہا ہے، نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے جس کو قرب بالنوافل کبھی نہیں پہونچ سکتا، کمالاتِ ولایت کمالاتِ نبوت کے مقابلہ وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے۔''(۱)

اور ایک مکتوب میں حضرت مجدد صاحب لکھتے ہیں:

''اولیاء کو جو الہام ہوتا ہے وہ بھی انوار نبوت سے ماخوذ ہے اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے اتباع وپیروی کے فیوض وبرکات میں سے ہے۔''(۲)

اسی طرح ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

''انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت دنیا والوں کے لئے رحمت ہے، اگر ان حضرات کے وجود کا ذریعہ نہ ہوتا تو ہم گمراہوں کو اللہ تعالیٰ (جو واجب الوجود ہے) کی ذات وصفات کی پہچان (معرفت) کی طرف کون رہنمائی کرتا اور اس کی پسندیدگی وناپسندیدگی کے کاموں میں کون امتیاز پیدا کرتا؟''(۳)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ بھی حقائق ومعارف تک رسائی کا واحد ذریعہ منصب رسالت کو بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت اور علم کا لب لباب یہ ہے کہ یہ حقائق پیغمبروں کے واسطہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے، جن کو اللہ منصب رسالت سے

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۲۳۲/۴ (۲) ایضاً ۲۲۹/۴ (۳) ایضاً ۲۲۴/۴

سرفراز فرماتا ہے ان کو اپنی ذات وصفات اور "مَلَکُوْتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ" زمین وآسمان کی بادشاہی کا سب سے بڑا علم بخشتا ہے، اور اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی اور احکام کا براہ راست علم عطا کرتا ہے اور ان کو اپنے اور انسانوں کے درمیان واسطہ بناتا ہے، ان کی رسالت ونبوت دنیا کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے، ذات وصفات الٰہی کا جو عظیم الشان علم، بلا زحمت اور بلا قیمت عطا کرتے ہیں، اس کے ایک ذرہ کو بھی ہزاروں برس کی فلسفیانہ غور وفکر اور بحث واستدلال اور سالہا سال کے مجاہدہ ومراقبہ وتزکیۂ نفس سے نہیں حاصل کیا جاسکتا:

﴿ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ﴾(۱)

اسی طرح رسالت کی ابدیت وعالمگیرت اور ختم نبوت پر یقین اور پھر صاحب رسالت اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کو ہی ساری کامیابیوں کا راز قرار دیتے ہیں اور رقم طراز ہیں:

"یہی اتباع خلافت راشدہ کی روح ہے اور یہی وہ پہلو ہے جو حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافتوں میں پورے طور پر مشترک ہے، ایک نے فتوحات کی حالت میں اور اسلام کے اقبال وترقی کے دوران اتباع کا حق ادا کیا اور خلافت نبوت کا شاندار نمونہ پیش کیا، دوسرے نے انتہائی فتنوں اور آزمائشوں اور اپنی خلافت کے پُرآشوب دور میں نبوت کی جانشینی کا حق ادا کرکے دکھلایا، اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے معیار سے بال

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۴/۱۹۹

برابر اور اپنے اصول میں ذرہ برابر ترمیم اور ادنیٰ لچک پیدا کرنا بھی گوارہ نہیں کیا، بیت المال کی آمد وخرچ کے معاملے میں عمال وحکام کے عزل ونصب میں وہ اسی پُل صراط پر قائم رہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔"(۱)

مولانا ندویؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک غیر فانی معجزہ یہ ہے کہ آپ کے فیض کا چشمہ کبھی خشک ہونے نہیں پایا، آپ کا نمونہ آنکھوں سے بھی اوجھل نہیں ہوتا، آپ کی امت کی ضرورتیں زیادہ دیر تک اٹکی نہیں رہتیں اور وہ اس طرح پر کہ آپ کی مشعل نور سے براہ راست مسلسل طریقہ پر سینکڑوں مشعلیں روشن ہوتی رہی ہیں، اور قیامت تک ہوتی رہیں گی۔

آپ کی کامل پیروی سے ہر زمانہ میں اور تقریباً ہر جگہ کم وبیش ایسے انسان پیدا ہوتے رہے جن سے آپ کی یاد تازہ ہوتی تھی، اور انبیاء کی شان نظر آتی تھی، جن سے ظاہر ہوتا کہ اللہ کا کام بند نہیں ہوا، اللہ کا دین زندہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہر زمانہ میں ممکن ہے اور انہیں کی وجہ سے خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی عملاً ضرورت نہیں۔"(۲)

صحبت نبوی کے اثرات

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ تعلق مع اللہ کے حصول وتقویت اور غفلت ومادیت اور مشرکانہ اعمال وافکار ورجحانات سے حفاظت اور امراض نفسانی ودنیا طلبی

---

(۱) سیرت سید احمد شہید جلد دوم ۲۹۶ مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ

(۲) سیرت سید احمد شہید جلد دوم/ ۲۹ مطبوعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ پہلا ایڈیشن

کے علاج کا نبوی طریقہ جو عجم کے اختلاط اور فلسفیانہ موشگافیوں اور اشراقی نظریہ سے تصوف قرار پا گیا، حقیقت میں قرآنی اصطلاح کے مطابق ''تزکیہ'' اور حدیث صحیح کی تعبیر کے مطابق ''احسان'' ہی کا وہ دینی شعبہ تھا جس کو قرآن مجید میں نبوی اوصاف کا ایک اہم وصف اور مقاصد بعثت کا وہ عظیم مقصد قرار دیا گیا ہے جسے کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کا سب سے بڑا نتیجہ اور اولین ثمرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت قدسی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں:

"وكانت هذه "الحكمة" و"التزكية" من أعظم ثمرات الصحبة النبوية ومجالسته صلى الله عليه وسلم وعشرته، فنشأ في أحضانه، جيل تحلى بأفضل الأخلاق وأكرم الصفات وتجرد عن رزائل الأخلاق، ومهلكات العادات وذمائم الصفات، وغوائل النفوس، وبقايا الجاهلية ومغالطات الشيطان، وقد شهد القرآن باستقامة قلوبهم وصلاح نفوسهم ووصولهم إلى ذروة تهذيب الأخلاق وتزكية النفوس"(١)

اللہ تعالیٰ نے گواہی دی:

﴿وَاعْلَمُوْآ أَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ، وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ، أُوْلٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُوْنَ، فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَّاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ (٢)

---

(۱) مقدمہ تہذیب الاخلاق مؤلفہ مولانا سید عبدالحی حسنیؒ مطبوعہ مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ

(۲) سورۃ الحجرات/۷-۸

(اور جان رکھو کہ اللہ کے رسول تم میں موجود ہیں، اگر وہ اکثر چیزوں میں تمہاری بات مانیں گے تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے، البتہ اللہ ہی نے تمہارے لیے ایمان میں رغبت پیدا فرمادی اور کفر و نافرمانی اور معصیت سے تمہیں بیزار کیا، یہی لوگ ہیں جو سیدھے راستہ پر ہیں، سب اللہ کے فضل اور اس کی نعمت کا نتیجہ ہے، اور اللہ خوب جاننے والا، حکمت والا ہے)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اور پھر ان کے تربیت یافتہ حضرات کے متعلق گواہی دی گویا انہیں استفادہ اور افادہ دونوں کا سب سے زیادہ لائق اور سب پر ان دونوں حیثیتوں سے فائق بتایا، چنانچہ ارشاد ہے:

"خیر الناس قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم."

(سب سے بہترین لوگ میرے زمانہ کے ہیں، پھر جو ان کے بعد آئیں گے پھر جو ان کے بعد آئیں گے)۔

اور ایک روایت میں "خیر أمتي قرنی" فرمایا۔

یہ دونوں روایت امام بخاری نے روایت کی ہیں، پہلے کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسری کے حضرت عمران بن حصین ہیں۔

اور صحابی جلیل حضرت عبداللہ بن مسعود نے اپنے ان رفقاء کی بڑی بلیغ تعریف فرمائی اور کہا:

"خیر هذه الأمة أبرها قلوباً، وأعمقها علماً، وأقلها تکلفاً."(۱)

(اس امت کی سب سے بہترین جماعت صحابہ ہیں، بڑے ہی نیک دل اور علم میں خوب پختہ اور تکلف میں سب سے کم)۔

---

(۱) شرح السنة للبغوی، باب ردّ البدع والأهواء.

جماعت صحابہ ان اوصاف وخصوصیات کی حامل جن اسباب ومحرکات سے ہوئی ان میں ایک بڑا اور بنیادی سبب ''تزکیہ'' ہے کہ ان حضرات کا تزکیہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمایا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقم طراز ہیں کہ:

''تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صرف پڑھ کر سنا دینے اور سمجھانے پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ اس تلاوت وتعلیم کا رنگ ان پر چڑھا دیتے ہیں، اس کتاب وتعلیم کو اُن کے کانوں اور دماغوں سے گزار کر ان کے قلوب وارواح کو رنگین کرتے ہوئے ان کے اعضاء وجوارح سے جاری کردیتے ہیں، یہی صفت آپ کو دنیا کے تمام واعظین ومعلمین سے ممتاز کرتی ہے، کہ آپ واعظ ومعلم کے علاوہ ''مزکی'' بھی تھے، اور اسی لئے آپ دنیا کے سب سے کامیاب مرشد وہادی تھے، صحابہ کی حیرت انگیز روحانی اخلاقی، ذہنی، عملی تبدیلی اور اسلام کی ابتدائی کامیابی کا راز یہی تھا اور آج اسی کی کمی اسلامی زندگی کے ہر گوشے میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

دوست دشمن سب تسلیم کرتے ہیں کہ آپ کی صحبت میں پارس کی تاثیر تھی، جس کو میسر آئی وہ کندن نہیں، بلکہ خود پارس بن گیا، بہائم انسان بن گئے، اور انسان فرشتے، اُن کی اعتقادی، اخلاقی، روحانی تربیت اتنی اعلیٰ اور مکمل ہوئی جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتی، جو آپ کے پاس بیٹھا، آپ کے رنگ میں رنگ گیا، شریعت کے سانچہ میں ڈھل گیا، اتباع شریعت بلا ارادہ ہونے لگا، طاعات آسان اور طبعًا مرغوب ہوگئیں، معاصی مکروہ اور طبعًا مبغوض ہوگئے، یہاں تک کہ امت کا صحابہ کے متعلق

عقیدہ ہے کہ وہ سب کے سب عادل ہیں اور ادنیٰ صحابی بھی بعد کے بڑے سے بڑے ولی اللہ سے افضل ہے۔" (۱)

اور مسدس میں مولانا حالی مرحوم نے نہایت سچی اور بولتی ہوئی تصویر کھینچی ہے، اس کا شعر ملاحظہ ہو:

رہ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ ان کی
فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی
شریعت کے قبضے میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم نرما گئے وہ
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ
کفایت جہاں چاہئے، واں کفایت
سخاوت جہاں چاہئے، واں سخاوت
جچی اور تلی دشمنی اور محبت
نہ بے وجہ الفت، نہ بے وجہ نفرت
جھکا حق سے جو جھک گئے اس سے وہ بھی
رکا حق سے جو رک گئے اس سے وہ بھی

صحابہ کا طریقہ اور بعد کے فتنے

صحابہ کرام نے تبلیغ دین، تعلیم شریعت اور تزکیہ نفس کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ نبوی طریقہ کے مطابق تھا، اور دین کی روح اور شریعت کے مزاج کا حامل تھا، اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو مختلف جگہوں پر بھیج کر یہ خدمت لی تھی، جیسے حضرت مصعب بن عمیرؓ (شہید غزوۂ احد) کو مدینہ طیبہ بھیجا اور پھر ان کے نتیجہ

---

(۱) سیرت سید احمد شہید جلد دوم، ص/ ۵۴۵-۵۴۶

میں وہاں سے جماعتیں آئیں اور مکہ مکرمہ پہونچ کر ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، اسی طرح حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا، اور یہ نصیحت بھی فرمائی کہ:

"إنك تقدم على قوم من أهل الكتاب فليكن أول ما تدعوهم إلى أن يوحدوا الله فإذا عرفوا ذلك فأخبرهم أن اللّٰه فرض عليهم خمس صلوات في يومهم و ليلتهم." (۱)

(تم اہل کتاب کے پاس جا رہے ہو تو تم سب سے پہلے انھیں توحید کی طرف بلانا، پھر جب وہ اس کو سمجھ لیں تو ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی ہر ناحیہ سے تربیت فرمائی تھی، اس لئے صحیح شکل وصورت میں دین ان کے پاس تھا، جس پر کوئی خارجی اثر نہ پڑا تھا اور نہ ان حضرات کے ہوتے پڑسکتا تھا، اس لئے دعوت الی اللہ کا کام ہی ان پر طاری رہتا تھا، اور بندوں کے قلوب کا خالق سے جوڑنا ہی ان کا محبوب مشغلہ تھا، اس جماعت کا ہر فرد معلم بھی تھا، مربی اور مزکی بھی، قرآن مجید کی آیات کو سنانے والا اور دوسروں کے قلوب میں اس کے حقائق ومعانی اتارنے والا بھی تھا، اور اس کے ذریعہ امراض نفسانی وروحانی کا علاج کرنے والا بھی، لیکن بعد کے زمانوں میں زمانۂ نبوت سے بُعد اور عجم کے اختلاط کی وجہ سے صورت حال میں تبدیلی واقع ہونے لگی اور ابلیس کو اس راستہ سے بھی تلبیس کا موقع ملنے لگا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے صحیح لکھا ہے:

''دین کو اس کے قالب وقلب، جسم وروح اور ضابطہ ورابطہ کے

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب التوحيد، باب ما جاء في دعاء النبي صلى الله عليه و سلم أمته إلى توحيد الله تبارك و تعالىٰ.

ساتھ قائم رکھنے کا کام خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفائے راشدین اور نائبین برحق کے ذمہ تھا، اور وہ شریعت محمدی کے ساتھ اس ''طب نبوی'' کی بھی حفاظت وتجدید کرتے رہتے رہے، اور فقہ ظاہر کے ساتھ فقہ باطن کی بھی اشاعت وتبلیغ میں سرگرم رہے، ان کا یہ کام تفصیل کے بجائے اجمال، اور فروع سے زیادہ اصول پر مبنی تھا، لیکن قلمرو خلافت اور فتوحات اسلامی کی توسیع وسیع پیمانہ پر اشاعت اسلام، دولت اور وسائل عیش وعشرت کی فراوانی زمانۂ نبوت سے بُعد اور بمصداق ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ جب شیطان کے مکائد مادیت کے فتنے اور امراض نفسانی وروحانی نئی نئی شکلوں میں اور نئے فلسفوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوئے تو تزکیہ واحسان کا فن بھی ''تصوف'' کی حادث اصطلاح کے ساتھ اسی طرح ایک مدوّن فن بن گیا، جس طرح عجمی قوموں کے اختلاط نے قواعد زبان (صرف ونحو) اور فن معانی وبیان کو (جن کے اصول و مبادی عربی اللسان قوموں کی فطرت میں داخل تھے) نحو و بلاغت کے وسیع ودقیق فن کی شکل میں منتقل کردیا اور اس کے ماہرین خصوصی پیدا ہونے شروع ہوگئے، جنہوں نے مستقل مدارس وجامعات قائم کئے اور ان کے لئے مستقل نصاب وضع کئے اور ان کی طرف ان علوم کے طالبین اور ان مقاصد کے شائقین کا رجوع عام شروع ہوا۔''(۱)

صحابہ کا طریقہ بڑے اعتدال وتوازن کا تھا، اور جب بھی رسول اللہ کو اس سے ہٹ کر کوئی بات محسوس ہوئی تو تنبیہ فرمائی اور حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ادا کرنے

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۴/ ۲۳۶

کی تلقین کی اور اسی میں اللہ کی خوشنودی بتائی، کبھی زیادہ شب بیداری سے منع فرمایا، کبھی جہاد میں جانے سے روک دیا، کبھی والدین کی خدمت کو مقدم کرایا، اس لئے صحابہ کو شریعت وسنت سے ہٹ کر کوئی چیز بھی گوارہ نہ تھی، اور وہ ہر لمحہ کتاب وسنت کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہے، لیکن بعد میں زہد وعبادت میں غلو کے نتیجہ میں رہبانیت کے جراثیم اور بدعات کے اثرات داخل ہونے لگے، وہ چیز یہاں تک بڑھ گئی کہ حقائق ومعانی بھی اپنے مراد ومطلب سے لئے جانے لگے، جس کے مقابلہ کے لیے پھر علمائے دین کو کمر کسنی پڑی اور ربانیت کی دعوت دی گئی، اس خطرناک صورت حال کا تجزیہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ نے اس طرح پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ابتدائی صدیوں میں اس طریقۂ علاج (تزکیہ یا تصوف) کا مدار کار کتاب وسنت، اسوۂ رسولؐ کی پیروی اور شمائل واخلاق نبوی کے تتبع پر تھا، لیکن زمانہ کے اثرات، عجمی اور نومسلم قوموں کے اختلاط، عجمی زُہاد ونساک کی صحبت وعقیدت کے نتیجہ میں تصوف میں بدعات، زہد وعبادات میں غلو، تجرّد، رہبانیت کے جراثیم، اشخاص ومعتقد فیہ لوگوں کی حد سے بڑھی ہوئی تعظیم و تقدیس کی رسم اور بہت سے خودساختہ اعمال ورسوم داخل ہونے شروع ہوگئے، یہاں تک کہ یہ غیر اسلامی اور سرتاپیر اجنبی و بیرونی اعتقاد بھی بعض روحانی حلقوں اور سلسلوں میں دبے پاؤں چلا آیا کہ ''اخلاص وانہماک'' اور پوری دقیقہ رسی کے ساتھ ایک عرصہ تک عبادت میں مشغول رہنے اور فرائض وسنن کی پابندی کرنے اور عرفان کامل حاصل ہونے کے بعد ایک منزل ایسی آتی ہے، جب سالک ان فرائض شرعی اور عبادات راتبہ کا

مکلف نہیں رہتا، اور وہ ان کی پابندی سے مستثنیٰ ہو جاتا ہے، اسی کا نام "سقوطِ تکلیف" ہے اور اس اعتقاد کے لوگ قرآن مجید کی مشہور آیت "وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ" (اور آپ اپنے رب کی عبادت کرتے رہئے، یہاں تک کہ آپ کو موت (۱) آجائے) سے استدلال کرتے ہیں، یہ ایک عظیم فتنہ تھا، جو پورے نظام شریعت کو معطّل اور سالک بے قید اور عبادات کی پابندیوں سے آزاد کر دیتا تھا۔" (۲)

(۱) وہ لوگ یقین سے مراد موت کے بجائے یقین لیتے ہیں کہ یہ حال پیدا ہو جانے کے بعد عبادت وریاضت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، اور شیطان نے خوابوں کے ذریعہ بھی اور بیداری میں روشنی اور کیفیات کے ذریعہ بھی اس دھوکہ میں ڈالا، اسی لیے سالک برابر رہنمائی اور سرپرستی کا محتاج ہے۔ (م)

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت ۴/ ۲۴۰-۲۴۱

توبہ، انابت اور دعا

قرآن مجید کا واضح اعلان

قرآن مجید کا واضح اور صاف اعلان ہے:

﴿أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ، وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ﴾ (۱)

(کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا اور انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھ لی جائے گی پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا)۔

اس واضح اور دوٹوک اعلان نے انسان کو عزم وحوصلہ بخشا، اس کے اندر قوت وجرأت پیدا کی، ذوق وشوق سے اپنی نیا کو پار لگانے کا جذبہ عطا کیا، اس کے اندر خود اعتمادی بحال کی، یہ یقین حاصل ہوا کہ اسے اپنے کئے دھرے کا بدلہ خود ملنا ہے، یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ اپنے کام پر انعام خود چاہتا ہے، بھلے وہ دوسرے کو اس میں شریک کرلے، اس کے لئے اس سے بڑی خوشخبری کیا ہوسکتی تھی کہ اس کی کوشش

---

(۱) سورہ النجم/۳۸-۴۰

رائیگاں نہیں جائے گی، اس سے اس کو روکنے کے لئے یہ بات کافی تھی کہ اپنے کرتوت کو اسے خود بھگتنا ہوگا، نہ کوئی اس کے لئے کفارہ بنے گا جیسے کہ محرف شدہ عیسائیت نے اعلان کیا کہ انسان پیدائشی وفطری گناہگار اور حضرت مسیحؑ اس کے گناہوں کا کفارہ ہیں، اور اسی طرح جیسا کہ ہندوستان کے قدیم مذاہب کا آواگون (تناسخ) کا عقیدہ وفلسفہ تھا جس کی رو سے انسان کو اپنی سزا بھگتنا ہی بھگتنا تھا، ان کے فکر وعقیدے کے مطابق اس کا اگلا جنم درندے، چرندے، یہاں تک کہ کتا بلی سور وغیرہ اور بھوت پریت یا بدہیئت انسان یا مصیبت زدہ شخص کی شکل میں ہوتا ہے اور اچھے اعمال کی صورت میں اس کا اگلا جنم اچھی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اسلام کے اس واضح اعلان نے کہ انسان کو اپنی کوششوں کا بدلہ خود ملنا ہے اور اسے اپنے کئے دھرے کا انجام خود دیکھنا ہے، جیسے کہ ایک دوسری جگہ واضح الفاظ میں یہ بتا دیا گیا ہے۔

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَّرَهُ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَّرَهُ﴾.

(جو کوئی ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا، اور جس نے ذرہ بھر بھی بدی کی ہوگی اسے بھی دیکھ لے گا)۔

پیغمبر انسانیت سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وضاحت

پیغمبر انسانیت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی واضح کیا کہ گناہ، خطا، لغزش، تقصیر، کوتاہی انسان کا خاصہ ہے، شیطان کے بہکانے سے اس کے نفس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے، لیکن جو اس بگاڑ کو بگاڑ، غلطی کو غلطی سمجھ کر اپنے پیدا کرنے والے، پوری دنیا کا نظام چلانے والے اپنے مالک حقیقی، ایک معبود برحق کا خیال کر کے کہ اس کے یہاں جواب دہ ہونا ہے، گڑگڑائے، روئے، نادم وشرمندہ ہو اور یہ تہیہ کرے کہ یہ غلطی وہ اب نہیں دہرائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی غلطی کو معاف کر دیتا ہے، چاہے وہ جتنی بڑی غلطی ہو، البتہ غلطی کا تعلق دوسرے انسان سے بھی ہوتا ہے، جیسے کسی

کی ناحق جان لینے میں وہ شریک رہا، اور کسی کی زمین جائیداد ہڑپ کی یا کوئی الزام لگا کر کسی کو ذلیل کرنے کا کام کیا، یا اس میں شریک رہا، یا ماں باپ کی حق تلفی کی یا پڑوسی کو تکلیف دی، خواہ پڑوسی کا تعلق کسی مذہب، کسی نسل، کسی برادری سے ہو اسے ایسے کسی معاملہ میں ان سے جن سے اس کا معاملہ جڑا ہوا تھا، معاملہ صاف کرنا پڑے گا، تب اس کی ندامت اللہ کے یہاں قبول کی جائے گی، اسی ندامت کا نام توبہ ہے، جو اللہ کو اتنی پسند ہے کہ وہ اس کے بعد بندہ کو ایسا پاک وصاف کر دیتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ اور لغزش کی ہی نہیں۔ ایک حدیث میں صاف الفاظ میں ہے:

"التائب من الذنب كمن لا ذنب له" (۱)

(گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہے)۔

اور ایک حدیث میں ہے:

"كل بنى آدم خطآء، وخير الخطائين التوابون" (۲)

(تمام انسان خطا کار ہوتے ہیں، مگر سب سے بہتر خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں)۔

نماز کی تاثیر

چوں کہ انسان سے خطا اور غلطی ہو ہی جاتی ہے، شیطان اس کو گڑھے میں گرانے کے لئے ہر وقت مستعد اور چوکنا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دن میں پانچ اوقات میں نماز کا نظام بنا کر توبہ اور ندامت کا ایک پورا یومیہ لائحہ عمل دے دیا کہ نماز میں آدمی اپنی عاجزی، بے بسی، درماندگی، ندامت، انابت ورجوع، استعانت اور طلب ہدایت ومغفرت اور بندگی کا ثبوت فراہم کرتا ہے جو اس نظام کے بغیر کرنا چاہے تو وہ نہ کر سکے گا۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کے عمل کو اتنا آسان کر کے عام بھی کر دیا، اسی طرح

---

(۱) سنن ابن ماجه باب ذكر التوبة، حدیث نمبر/۴۳۹۱

(۲) مستدرك حاكم، كتاب التوبة والإنابة، حدیث نمبر/۷۶۱۷

نماز کی صحیح طور پر ادائیگی گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور انسان پاک وصاف ہو کر رات بسر کرتا ہے۔

ایک حدیث میں نماز کے اس وصف کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"عن أبی هريرة رضی الله عنه قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: أرأيتم لو أن نهرا بباب أحدكم يغتسل منه كل يوم خمس مرات، هل يبقى من درنه شيئ؟ قالوا: لا يبقى من درنه شيئ، قال: فذلك مثل الصلوات الخمس، يمحو الله بهن الخطايا."(۱)

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا سمجھتے ہو کہ اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر ایک نہر ہو، جس سے وہ روزانہ پانچ بار غسل کرتا ہو، کیا اس کے بدن پر کوئی میل باقی رہے گا؟ حاضرین مجلس نے عرض کیا نہیں، فرمایا یہی مثال پانچوں نمازوں کی ہے، ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹا دیتا ہے)۔

حج کی تاثیر

ایک دوسری سراپا دعا وتوبہ عبادت حج کی رکھی، حج ایک ایسی عبادت ہے جس میں آدمی کو اپنے رب کو معبود برحق اللہ عزوجل کا خیال کر کے رونے وگڑگڑانے، دعا وابتہال، بخشش ومعافی کی طلب کا خوب موقع ملتا ہے، ایک مقام پر ایک ارادہ سے دنیا کے مختلف گوشوں اور علاقوں سے جوق در جوق لوگ اپنا مال خرچ کر کے ایک کیفیت کے ساتھ جمع ہوتے ہیں کچھ جگہ کے انوارات اور کچھ ماحول کا اثر دعا، انابت اور عبادت کی اس کیفیت سے آراستہ کر دیتا ہے جو اس کو ایک در پر حاضر ہو جانے کے

---

(۱) صحیح مسلم، باب المشی إلى الصلاة، حدیث نمبر/۱۵۵۴۔

بعد دوسرے در پر جانے اور دوسروں کے آگے سر جھکانے اور ٹھوکر کھانے سے بے نیاز کردیتی ہے، اسی لئے حج سے واپس آنے کے بعد آدمی اپنی پارسائی کے اس بلند مقام پر فائز ہوجاتا ہے جس مقام پر وہ اپنی ماں کے پیٹ سے زمین پر آنے کے وقت تھا، مگر یہ کہ وہ ایسا بدقسمت ہو کہ حج کے دنوں میں بیت اللہ شریف میں پہنچ کر اور منیٰ و عرفات میں حاضری دے کر بھی وہ گناہوں سے نہ بچ سکا ہو، حج کے مناسک کے صحیح طور پر ادا کرنے والے شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"من حج هذا البيت فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته أمه."(۱)

(جس نے اس گھر کا حج کیا اور فسق و فجور سے بچا رہا تو وہ گناہوں سے ایسا پاک صاف ہوکر لوٹے گا جیسے اس کی ماں نے اسے آج ہی جنا ہو)۔

مقامات عالیہ طے کرنے کا ذریعہ توبہ ہے

صرف یہی نہیں کہ توبہ اور انابت سے گناہ معاف کردیا جاتا ہے، بلکہ توبہ اور انابت کو بندگی اور اعلیٰ درجہ کی عبادت قرار دیا گیا جس سے توبہ کرنے والا درجات عالیہ اور منازل رفیعہ پر فائز ہوتا ہے، اور قرآن مجید میں اس کے ایک شاندار مستقبل کی بھی پیشین گوئی کردی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يَهْدِىٓ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (کہ جو اس کی طرف رجوع و انابت کرتا ہے تو اس کو وہ راہ راست پر ڈال دیتا ہے) ماضی کا بھی صیغہ استعمال کیا گیا ہے: ﴿يَهْدِىٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾ سورۂ توبہ کی ایک آیت میں توبہ کرنے والوں کا ذکر بڑی برگزیدہ جماعت کے ساتھ کیا گیا ہے اور صرف ذکر ہی نہیں کیا گیا بلکہ برگزیدہ افراد کی مختلف جماعتوں وطبقات کا ذکر کرتے ہوئے اس نورانی فہرست کی ابتداء توبہ کرنے والی جماعت سے کی گئی ہے، وہ آیت

---

(۱) صحيح البخاری، باب قول الله تعالى "فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج" حدیث نمبر/۱۷۲۳

کریمہ یہ ہے:

﴿التَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾(۱)

(وہ توبہ کرنے والے بندگی کرنے والے حمد کرنے والے روزہ رکھنے والے رکوع کرنے والے سجدے کرنے والے بھلائی کی بات کہنے والے اور برائی سے روکنے والے حدودِ الٰہی کی حفاظت کرنے والے اور ایمان والوں کو بشارت سنا دیجیے)۔

توبہ اور استغفار کا تکوینی نظام پر اثر انداز ہونا

توبہ کی قبولیت اور توبہ کرنے والوں کی عنداللہ مقبولیت اور تکوینی نظام پر مرتب ہونے والے توبہ کے حیرت انگیز اثرات کی ایک اعلیٰ مثال حضرت یونس علیہ السلام کی قوم کی بھی ہے کہ جب حضرت یونسؑ نے دعوت وتبلیغ، اصلاحِ معاشرہ اور ازالۂ منکرات کے کام میں یہ محسوس کیا کہ انہوں نے حجت تمام کردی ہے اور یہ قوم ماننے والی نہیں، ایسی صورت میں عذاب کے سوا کوئی راستہ نہیں رہ جاتا ہے، اس لئے یہ جگہ چھوڑ دینا ہی مناسب ہے، جیسا کہ انبیاء اور ان کی قوموں کے ساتھ ہوتا آیا ہے، قوم کے نبی کی بات نہ ماننے کے نتیجہ میں جب جب عذاب کی خبر دی گئی تو پہلے نبی کو وہاں سے ہٹنے کو کہا گیا، چنانچہ حضرت یونسؑ نے اسی خطرہ کے پیش نظر جگہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا، اور وہ روانہ بھی ہوگئے، مگر عذاب ٹل گیا، اس لئے کہ اس کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کی قوم نے ایسی توبہ کی اور وہ ندامت وانابت پیش کی کہ اللہ تعالیٰ کو رحم آیا، اور قوم کو ہدایت مل گئی، ساتھ میں حضرت یونس علیہ السلام کو بھی تنبیہ ہوئی کہ انہیں اتنی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو بھی اس کا احساس ہوا مگر

---

(۱) سورہ توبہ/۱۱۲۔ (۲) سورہ یونس/۹۸

اب وہ نکل چکے تھے، قرآن مجید نے قوم یونسؑ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

﴿لَمَّا آمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ إِلَىٰ حِينٍ﴾ (۲)

(کہ جب وہ لوگ ایمان لے آئے ہم نے ان پر سے رسوائی کے عذاب کو دنیاوی زندگی میں دور کردیا اور ان کو ایک وقت خاص تک خوش عیشی دے دی)۔

چونکہ وہ نبی تھے اس لئے ان کی اس جلد بازی پر بھی گرفت ہوئی اوران کو دریا میں مچھلی کے پیٹ میں ایک عرصہ گزارنا پڑا، وہاں ان کی انابت اللہ کو اتنی پسند آئی کہ ان کو بطن حوت (مچھلی کے پیٹ) میں زندگی کی ساری سہولتیں عطا کردیں، اور جب وہ ایک مدت اس میں صبر واستغنا اور انابت واخبات کے ساتھ گزار چکے تو اس مچھلی نے اپنے مالک حقیقی اللہ رب العالمین کے حکم سے انہیں ساحل دریا پر چھوڑ دیا، اور وہ عافیت وسلامتی کے ساتھ بطن حوت سے نکل کر اپنی قوم کے پاس پہنچے، اور اس موقع کی ان کی انابت کے الفاظ کو اللہ نے وہ قبولیت بخشی کہ تا قیامت اس میں وہ تاثیر پیدا کردی کہ دنیا کے کرب وہول اور آخرت کے کرب وہول دونوں سے نجات کے لئے انابت کے یہ الفاظ بڑے کارگر ہوگئے، وہ الفاظ تھے:

﴿لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ﴾

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ توبہ کے واقعات اور انابت کی کیفیات کا ظہور امم واقوام کی تاریخ میں انفرادی واجتماعی طور پر ہوتا رہا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو اللہ کی رحمت کو متوجہ کرتی رہی، جس کی وجہ سے دنیا کا نظام قائم ودائم ہے، توبہ کا عمل اللہ کو اس قدر پسند ہے کہ بڑے بڑے اعمال وافعال پر جو بدلہ وانعام ملتا ہے وہ ایک توبہ اور ایک کیفیت انابت پر ہی حاصل ہوجایا کرتا ہے، شرک وکفر ایسے سنگین جرائم اور گناہ ہیں کہ اللہ نے ان کے متعلق صاف فرمادیا ہے کہ اسے اللہ معاف

نہیں کرے گا، چاہے کسی گناہ کو بھی معاف کر دے، جبکہ وہ یہ بھی فرما چکا ہے:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيَ أَنِّيَ أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ﴾.

ارشاد باری ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَآءُ﴾. (۱)

پھر بھی اگر مشرک و کافر شرک و کفر سے توبہ کرتا ہے اور اللہ کی وحدانیت و کبریائی کا اقرار کرتا ہے اور توحید کو اختیار کرتا ہے، اور سچے دل سے لا إلـه إلا الله کہتا ہے اور اس کا اقرار کرتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اس کے لئے اس کی رب کی عطا کردہ تعلیمات ہیں اور وہی اللہ زندگی بخشنے والا ہے اور موت دینے والا ہے، اور مرنے پر دوبارہ اسی کے پاس لوٹنا ہے، اور کارخانۂ کائنات اسی کا بنایا ہوا ہے، اور اسی کے حکم و مرضی ومنشا کے مطابق سارا نظام کائنات چل رہا ہے، اس نے صاف صاف فرمادیا ہے: ﴿أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ﴾ (یادرکھو پیدا کرنا بھی اسی کا کام ہے اور نظام چلانا بھی اسی کا کام ہے)، وہی حی وقیوم ہے: ﴿اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ کوئی اس کی مرضی کے بغیر سفارش بھی نہیں کرسکتا اور کوئی پر بھی نہیں مارسکتا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ﴾ کچھ اس سے مخفی ومستور نہیں: ﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْئٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ہر چیز اس کے احاطۂ قدرت میں ہے: ﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضَ﴾ اور اس پر کچھ بھی گراں بار نہیں: ﴿وَلَا يَؤُدُهُ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ﴾. (۲)

سچی توبہ انسان کو بالکل پاک صاف کر دیتی ہے

اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اور وہی مالک یوم الدین (روز جزا کا مالک)

---

(۱) سورۂ نساء/۴۸۔ (۲) سورۂ بقرہ۔

بھی ہے، کوئی اس کا اس میں شریک وسہیم اور مشیر نہیں، وہ خالق ہے اور سب مخلوق، سب کچھ اسی ایک اللہ رب العالمین کے اختیار اور بس میں ہے کسی اور کو اختیار اور بس حاصل نہیں، یہ اقرار واعتراف ایک لحہ انسان کو ان بلندیوں پر پہونچا دیتا ہے کہ ملائکہ بھی رشک کرنے لگتے ہیں، یہی انسان جس کو کفر اور شرک کی گندگی نے آلودہ کر رکھا تھا، گندگی بھی اس گندگی کی طرح نہ تھی جو جسم پر لگ جاتی ہے اور پانی سے یا مٹی وغیرہ سے اس کو صاف کرلیا جاتا ہے، یہ گندگی دل اور دماغ کی گندگی تھی، جس نے پورے جسم کو آلودہ کر رکھا تھا، یہ اوپر سے پھیلنے کے بجائے اندر سے اعضاء جسمانی میں سرایت کئے ہوئے تھی، اس کی صفائی توحید وایمان سے ہی ممکن تھی، اللہ نے یہ تاثیر توبہ اور انابت میں رکھی کہ اس کے نتیجہ میں توحید وایمان ملا، وہ ایسا صاف ستھرا ہوجاتا ہے کہ اس کے پچھلے سب کرتوت معاصی اور فسوق بھی دھل جاتے ہیں، اور اس کے اس انقلابی اقرار سے اس کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ کہ بیشک مشرکین پلید ہیں، اگر کہا گیا ہے اور حرم شریف کے حدود میں ان کو جانے سے روکا گیا ہے تو یہ کسی نسل، قوم، ملک یا لسانی تعصب کی وجہ سے نہیں، صرف شرک کی اس گندگی کی وجہ سے جس کا چشمہ دل ہوتا ہے، اور وہ اس سے جسم کے ہر حصہ کو پہونچتی رہتی ہے، اگر وہ اس سے توبہ کرکے اور اللہ کی طرف انابت کرکے اس گندگی کو دور کرلیتا ہے تو عزت واحترام کے ساتھ وہاں داخلہ ملتا ہے، اور وہ اپنے مالک سے قریب اور اس کا محبوب ہوجاتا ہے، توبہ کا یہ درجہ اور مقام ہے جو اللہ نے انسانیت کو عطا کیا، اور معلم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کھول کر بیان کیا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

"محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طے فرمادیا کہ گناہ اور لغزش وخطا انسانی زندگی کا ایک عارضی وعبوری وقفہ ہوتا ہے، جن میں

انسان اپنی نادانی وسادگی، کوتاہ نظری اور بعض اوقات نفس و شیطان کے بہکانے سے مبتلا ہوجاتا ہے، اور خیر وصلاح، گناہوں کا اعتراف واقرار اوران پر ندامت اس کی اصل فطرت اور جوہر انسانیت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور خشوع وخضوع اور گناہوں کے عدم ارتکاب کا عزم محکم انسان کی شرافت ونجابت کی دلیل اور حضرت آدم علیہ السلام کی میراث ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مسلمان گناہگاروں کے سامنے (جو معصیت کے دلدل میں گلے گلے تک دھنسے اور ڈوبے ہوئے ہیں) توبہ کا وسیع دروازہ کھول دیا، اور لوگوں کو اس کی طرف کھلے عام بلایا، اور توبہ کی فضیلت اتنی تفصیل سے بتائی کہ اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپؐ نے دین کے اس رکن عظیم کو پھر سے زندہ واستوار کیا، اور اسی لئے آپ کے دوسرے اسمائے گرامی کے ساتھ آپ کا ایک اسم شریف ''نبی توبہ'' بھی ہے، آپ نے توبہ کو ایک اضطراری وسیلہ ہی نہیں بتایا جس کے ذریعہ انسان تلافی مافات کرلیتا ہے، بلکہ آپ نے توبہ کا مقام اتنا اونچا کیا کہ وہ افضل ترین عبادت اور تھوڑے سے وقت میں قرب وولایت کے انتہائی درجات تک پہنچنے کا آسان راستہ بنادیا جس پر بڑے بڑے عابدوں، زاہدوں اوران پاکیزہ نفوس کو بھی جو گناہوں سے محفوظ رہے ہیں، رشک آتا ہے۔''

دعا ایک بڑا عطیہ خداوندی اور انعام ربانی ہے

توبہ وانابت کے ساتھ ایک دوسری چیز دعا ہے، یہ بھی انسانیت کے لئے ایک بڑا عطیۂ خداوندی اور انعام ربانی ہے، اس میں انسان کو مساوات کا عظیم سبق ملتا

ہے، انسان کو اپنے خالق ومالک، اللہ واحد، احکم الحاکمین سے قرب کا احساس پیدا ہوتا ہے، اسے اپنے رب سے مناجات وہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اس کے لئے نہ کوئی وقت کی قید ہے، اور نہ کسی خاص جگہ کا تعین، اس سے ہٹ کر کہ وقت وجگہ اپنا اثر اس طور پر دکھایا بھی کرتے ہیں کہ اللہ کو صاف ستھری جگہ پسند ہے، تو جو جگہ جتنی صاف ستھری ہے، اللہ نے اس کو دوسری جگہوں پر فوقیت دے دی، جیسے بیت اللہ شریف (کعبہ مشرفہ) اور اس کے قریب کی جگہیں وغیرہ اور بعض اوقات جس کو اللہ نے دوسرے اوقات پر فضیلت دی، جیسے شب قدر، جمعہ کی خاص ساعت، رات کا آخری حصہ وغیرہ لیکن اس میں بھی جو اثر وکیفیت اور یقین وتوکل اور تعلق مع اللہ دکھاتا ہے وہ اثر سب پر بھاری پڑتا ہے، اللہ کو یہ پسند ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ مانگا جائے اور یہ سمجھ کر مانگا جائے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے جو اس کے دل ودماغ میں ہے اور سب سننے والا ہے جو جس کی زبان پر ہے، وہ قریب ہے، مانگنے والے کو دیتا ہے، دیتے وقت وہ مانگنے والے کی مصلحت اور فائدہ کو دیکھتا ہے، کبھی وہ وہی کچھ دے دیتا ہے جو اس نے مانگا، اور کبھی وہ اس کے عوض کوئی تکلیف وپریشانی کو دور کردیتا ہے جو اس کے علم میں نہیں، اور کچھ چیزیں وہاں دے گا جب مرنے کے بعد دوبارہ اسے اللہ زندہ کرے گا، اور اس وقت اسے یہ تمنا ہوگی کہ اس کی ساری مانگیں آج ہی کے دن پوری کی جاتیں، اسی طرح اللہ کو یہ پسند ہے کہ ہر چیز اسی سے مانگی جائے، اور ہر ضرورت اسی کے سامنے رکھی جائے، اور اس کو یہ پسند ہے کہ اس سے بلا استحقاق مانگا جائے، بڑی سے بڑی چیز مانگی جائے، اس کو یہ پسند ہے کہ آدمی جو خیر اپنے لئے مانگ رہا ہے اس میں دوسرے کو بھی شریک کرے، اور اس پر تو وہ بہت خوش ہوتا ہے کہ وہ خیر دوسرے کے لئے پہلے مانگ لے، تو مانگنے والے کی یہ مانگ اس کے لئے جلدی پوری ہوتی ہے، اپنے لئے اور اپنے ساتھ دوسروں کے لئے ہدایت کی دعا اس کی پسندیدہ دعا ہے، اور ایسی دعا جس کی نہ صرف تعلیم دی گئی ہے، بلکہ اس سورہ میں اس کو اتار کر جس

سورہ کو ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے اس دعا کا پابند کردیا، وہ دعا یہ ہے:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، صِرَاطَ الَّذِيْنَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾.

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں

قرآن مجید میں اور بھی جامع دعائیں سکھلادی گئیں ہیں، اوران کی تاثیر اس لیے بھی بڑھی ہوئی ہے کہ ان کے الفاظ اللہ تبارک وتعالیٰ کے بیان کردہ ہیں، ان میں وہ دعائیں بھی منقول ہیں جو اللہ نے اپنے مقبول بندوں کی زبان سے نکلوائیں اور کہلوائیں اور پھر ان کو انسانیت کے نفع کے لیے قرآن مجید کا حصہ بنا کر عام کردیا، ان دعاؤں کے انوار کچھ اور ہی ہیں، جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے، محسن انسانیت سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں کا ایک ذخیرہ امت کے لئے چھوڑا ہے جس میں اس کی دینی اور دنیوی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ انسانیت کی فلاح و بہبود اور حاکم ورعیت کے مفادات کا لحاظ، عمر کے مختلف مراحل کا خیال، زندگی کے نشیب و فراز کا دھیان اور انفرادی واجتماعی انسانی فکر نمایاں ہوتی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں کے اندر بھی انسانی حقوق کا کس باریک بینی سے نہ صرف خیال رکھا ہے، بلکہ امت کو ان حقوق کی طرف دعاؤں کے ذریعہ بھی توجہ دلائی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس سرہ نے اپنی کتاب ''دعائیں'' میں جس میں انھوں نے قرآنی دعاؤں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی دعاؤں کا حسین انتخاب پیش کیا ہے، مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعا سے شغف اس طرح بیان کیا ہے:

''ان دعاؤں کے پڑھنے، ان کے اسلوب اور الفاظ پر غور کرنے

اور دعا مانگنے والے کے حالات اور معمولات، اس کا شوق دعا اور سرگوشی، اس کا انہماک ولذت معلوم کرنے کے بعد ہر منصف یہ نتیجہ نکالے گا:

۱- ان دعاؤں کا مانگنے والا بہت بڑا روحانی شخص تھا، جس کا خدا سے خاص تعلق تھا، اس کو اس کی یاد میں مزہ آتا تھا، اور اس کی یاد سے بے قرار رہتا تھا، اس کو خدا سے بات کرنے کا خاص ڈھنگ تھا، وہ اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا تھا، اس کو اس پر بہت بھروسہ تھا، اور اس کی رحمت کا یقین تھا۔

۲- وہ مخلص ضرور تھا، اس لیے اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی طلب اور جسم اور دنیا کی دولت سے زیادہ روح اور دل، اللہ کی مغفرت اور رحمت اور اس کے ثواب کی فکر ہے، وہ رات کی تاریکیوں اور خاموشیوں میں دعا کرتا ہے، اور روتا ہے، پیشانی خاک پر رکھتا ہے، اس کو لوگوں کے دیکھنے اور سننے کی کوئی فکر نہیں بلکہ اس سے بچنا چاہتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آنکھ رات کو کھل جاتی ہے، دیکھتی ہیں کہ بستر خالی ہے، خیال ہوتا ہے کہ شاید کسی بیوی کے حجرہ میں تشریف لے گئے ہیں، ٹٹولتی ہیں تو ہاتھ پیر پر پڑتا ہے، اور پیشانی خاک پر ملتی ہے، آپ گریہ وزاری اور دعا میں مصروف ہیں۔

پیاری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پانی بھرتے بھرتے اور گھر کا کام کرتے کرتے ہاتھ پر نشان پڑ گئے ہیں، باپ دنیا کا بادشاہ ہے لیکن کیسا کہ جب لونڈی غلاموں کی آمد سن کر عرض کرتی ہیں کہ ایک خدمت گار مجھے بھی مل جائے اور ہاتھ اور بدن کے

نشانات دکھاتی ہیں تو فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ایک خدمت گار سے بھی اچھی چیز بتاؤں؟ سوتے وقت یہ پڑھ لیا کرو۔

بدر کے میدان میں فوجیں صف آرا ہیں، لیکن قائد کس عالم میں ہے، ہاتھ خدا کے سامنے پھیلے ہوئے ہیں، چادر شانوں سے گر گئی ہے اور کہہ رہا ہے کہ اللہ اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ چند مارے گئے تو دنیا میں تیری یکتائی کی منادی کرنے والا کوئی نہ رہے گا۔

طائف سے اس حالت میں واپس ہو رہا ہے کہ ٹخنے ظالموں کے پتھروں سے زخمی ہیں، اور دل ان کے سلوک سے شکستہ ہے، بڑی امیدیں لے کر گیا تھا، اور بڑی حسرت سے واپس آرہا ہے، لیکن زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں:

''الٰہی اپنی کمزوری، بے چارگی اور ذلت کی تجھ سے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے، درماندگی سے پریشان اور کمزوروں کا مالک تو ہی ہے، مجھے کس پر چھوڑتا ہے، کسی بیگانہ، ترش رو پر یا کسی دشمن کے سپرد کیے دیتا ہے، اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے بھی کچھ پروا نہیں، لیکن تیری سلامتی میرے لیے زیادہ کشادہ ہے، میں تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں، جس سے تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں، اور دنیا اور دین کے کام بن جاتے ہیں، اس بات سے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا تیری نارضامندی، مجھے تیری رضامندی اور خوشنودی درکار ہے، اور تجھی پر بھروسہ اور سہارا ہے۔''

۳- وہ انسانی زندگی اور انسانی ضروریات سے بہت واقف تھا، دیکھ کن کن چیزوں کی اس نے دعا مانگی ہے، اور کن کن چیزوں

سے پناہ مانگی ہے، وہ کہتا ہے کہ میری سب سے زیادہ فراخ روزی میرے بڑھاپے میں کر، میں برے پڑوسی سے پناہ مانگتا ہوں مستقل قیام کی جگہ میں۔

۴- وہ عیوب ونقائص، اخلاقی امراض اور دل میں چھپی ہوئی بیماریوں کو خوب جانتا تھا اور انسانی نفسیات سے بہت واقف تھا، وہ بزدلی، بخل، تکبر، سینہ کے فساد، دل کے کھوٹ، زبان اور ہاتھ کے شر، بے نفع علم، بے اثر دل اور نہ سیر ہونے والے نفس سے پناہ مانگتا ہے۔

۵- وہ فضائل وکمالات ومحاسن، اخلاق حسنہ سے بھی بہت واقف تھا اور ان کا بہت قدرشناس اور طالب تھا، کہتا ہے: مجھے مسکینوں کی محبت عطا فرما، مجھ کو میری آنکھوں میں چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنا، صاف دل اور سچی زبان عطا فرما، میرا باطن میرے ظاہر سے اچھا کردے اور میرا ظاہر نیک کردے۔

اس کے علاوہ ان دعاؤں سے اور بھی فائدے ہیں، بہتوں کو اس آئینہ میں اپنی صورت نظر آجائے گی، اور اپنے چھپے ہوئے یا بھلائے ہوئے عیوب نظر آجائیں گے، بہت سے لوگوں کو اس کے پڑھنے سے اپنے خاص حالات میں بڑی تسکین ہوگی، اور ان کو اپنے زخم کا مرہم مل جائے گا، اور ہر شخص کو اپنے مطابق حال اس میں حصہ مل جائے گا، اس لیے کہ ان دعاؤں کے مانگنے والے پر انسانی زندگی کے تمام دور گزرتے تھے، اس کے گھر میں فاقہ بھی ہوتا تھا، موتیں بھی ہوتی تھیں، وہ بیمار بھی ہوتا تھا، اس کو رنج بھی پہنچتے تھے، فکریں بھی ہوتی تھیں، وہ مقروض بھی ہوجاتا

تھا، اوران سب حالات میں وہ خدا ہی سے کہتا تھا۔

اس کے علاوہ اس میں اخلاق کی بہترین تعلیم ہے، غور کرو، جو رات کو اٹھ کر زبان سے کہا کرے گا کہ ''میں اس بات کا گواہ ہوں کہ سارے بندے بھائی بھائی ہیں'' اس کے دل پر مساوات واخوت انسانی کا کیسا گہرا نقش قائم ہو جائے گا اور اس پر اس کے زبان واقرار کی کیسی مہر لگ جائے گی، جو غریبوں سے محبت کی دعا کرے گا، وہ غریبوں سے محبت کو کیسے ضروری نہ سمجھے گا، جو اپنی نظر میں حقیر اور دوسروں کی نظر میں بڑا بننے کی دعا کرے گا، وہ تکبر سے کتنا دور ہوگا، جو کاہلی، سستی، بزدلی، بخل اور تمام بری صفات سے بچنے کی اور دل کی صفائی اور زبان کی سچائی کی دعا کرے گا، اس کے قلب ودماغ پر پھر اعمال واخلاق کا کیسا اثر پڑے گا۔

وہ بار بار دیکھے گا کہ ایمان کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق کی دعا کی گئی ہے، اور کثرت سے تمام مومن مرد اور عورتوں کے لیے مغفرت اور رحمت مانگی گئی ہے، اور اس کو قبولیت دعا کا ذریعہ بتایا گیا ہے، تو اس کی نظر میں ان چیزوں کی کتنی اہمیت پیدا ہوگی۔

یہ اخلاق ومحبت وفضائل انسانی کی کتنی حکیمانہ خاموش اور مؤثر تعلیم ہے، پھر جو شخص اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، سفر میں آتے جاتے، ہر تقریب، ہر موقع پر دعا کرتا رہے گا، اس کی روحانیت اور تعلق باللہ کا کیا حال ہوگا، اور کیا وہ کبھی خدا کو بھول سکتا ہے، اور کیا اس کا در چھوڑ کر کسی دوسرے کے دروازہ پر جاسکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے، اس لیے اس

میں توحید کی بھی تعلیم ہے۔

یہ دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل مسلمان یا انسان کامل کا تخیل پیش کرتی ہیں، یہ مسلمان اور غیر مسلم سب کے لیے ایک قابل قدر تحفہ اور دین و دنیا کی نعمتوں کا خزانہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ہر انسان کو اس میں اکثر دعاؤں کی ضرورت ہے اور غالباً ان میں کوئی دعا ایسی نہیں جس کے مانگنے میں کسی کی دنیا یا دین کا نقصان ہو۔"(۱)

(۱) ماخوذ از کتاب "دعائیں" از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مطبوعہ مکتبہ اسلام لکھنؤ

بیعت وصحبت

بیعت کی اصطلاح

عربوں میں بیع وشرا میں بات پکی کرنے اور عہد ومعاہدہ کی صورتوں میں ہاتھ میں ہاتھ دے کراطمینان کرنے کا طریقہ تھا، اسی بیع سے بیعت کا لفظ نکلا اور پھر وہ اصطلاح بن گیا، عہد ومعاہدوں کی اور بھی شکلوں میں اس اصطلاح کا استعمال ہونے لگا، چونکہ اس کی اصل بیع وشراء میں ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد ومعاہدہ اور معاملہ کرنے کی تھی، اس لیے دینی مسائل میں پاکیزہ زندگی گزارنے کے لیے عہد کرنے اور اللہ کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے، یہاں تک کہ زندگی کی بھی قربانی دینے کے عہد کے لیے بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عربوں کے اس مزاج کا خیال رکھا اور معاملات وامور کے لیے قرآن نے بھی یہ لفظ استعمال کیا، لیکن اگر یہ بات ماحول اور زمانہ کے فرق سے کسی اور مناسب طریقہ سے اسی حیثیت میں قائم ہوجاتی ہے تو وہ طریقہ اس طریقہ کا قائم مقام سمجھا جائے گا جو اس زمانہ میں اہل عرب میں رائج تھا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم حضرت الحاج عبدالکریم پاریکھ علیہ الرحمہ کی کتاب ''بیعت وربانیت صادقہ'' کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''بیعت وارشاد کا عمل عہد اول سے اصلاح باطن کے کاملین کے یہاں سلسلہ وار قائم رہا ہے اور وہ دراصل اس بیعت سے ماخوذ

ہے، جس کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے، بیعت دراصل گناہوں سے توبہ اور نیک بننے کا وعدہ اور عہد کرنے کا عمل ہے جو کسی مبتدی مسلمان کی طرف سے کسی اجازت یافتہ شیخ و بزرگ کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔

عہد اول میں عربوں میں رواج تھا کہ بیع و شراء کا معاملہ طے ہونے پر یا کوئی عہد و پیمان کرنے پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کرتے تھے کہ یہ طے ہوا اور یہ عہد ہوا، اسی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر عقیدۂ توحید اور دین کی پابندی کا عہد کرنا بھی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے تقریباً اسی طرح ایمانی زندگی اور اس کے لیے قربانی کا عہد لیا تھا، اسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے تا حال تسلسل کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے اور کسی مستند شیخ سے اس کا معتقد بیعت کرتا ہے، اس کے ہاتھ پر توبہ اور عمل صالح کا عہد کرتا ہے، پھر اس کا اپنے اس شیخ سے اصلاح حال کے لیے استاذ و شاگرد جیسا تعلق بھی قائم ہوجاتا ہے اور وہ اس سے دینی مشورے اور اصلاح لیتا ہے۔''

بیعت ہاتھ میں ہاتھ دے کر عہد و معاہدہ کا نام ہے، پھر یہ لفظ ایسا عام ہوا کہ یہ اسی معنی میں استعمال ہونے لگا، پھر عہد و معاہدہ کی مختلف شکلوں کے معنی میں اس لفظ نے وسعت اختیار کرلی جیسے کسی کو گواہ بنا کر، پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال کر عہد کرنے اور دینی مسائل و معاملات میں دو رکعت نماز پڑھ کر، ان باتوں کا عہد کرنے، گناہوں سے باز آنے اور نئی ایمانی زندگی گزارنے کا عہد کرنے اور دوسرے کو اپنے اس عمل سے باخبر کردینے اور گواہ بنادینے کے لئے بھی بیعت کا لفظ عمومیت اختیار کرگیا، عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں اور بیعت کرتیں، آپ یہی اقرار

لیتے لیکن بیعت کے وقت کبھی کسی عورت کے ہاتھ کو آپ کے ہاتھ نے مس نہیں کیا۔

بیعت کے فوائد واثرات

سورۂ ممتحنہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب فرمارہا ہے:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنَٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰٓ أَن لَّا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْـًٔا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَٰدَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَٰنٍ يَفْتَرِينَهُۥ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِى مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾.

(اے نبی! جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو آئیں اس بات پر کہ اللہ کا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور چوری نہ کریں اور زنا نہ کریں اور اپنی اولاد کا قتل نہ کریں اور اپنے ہاتھوں اور پیروں سے تہمت باندھ کر نہ لائیں اور (اس بات پر کہ) کسی مناسب کام میں تیری نافرمانی نہ کریں گی، تو آپ بیعت میں داخل کرلیجئے، اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت چاہئے، یقینی طور پر اللہ تعالیٰ چھوٹے بڑے سب گناہوں کو معاف کردینے والا اور باربار رحم کرنے والا ہے)۔

اللہ عزوجل کا یہ خطاب بہت واضح اور کسی دوراز کار تفسیر وتشریح کا محتاج نہیں، اس سے ایک طرف جہاں ایک بات صاف ہوجاتی ہے کہ بیعت میں داخل ہونا کوئی ایسا ضروری عمل بھی نہیں کہ جس کے نہ کرنے سے گناہ لازم آئے، یا وعید کا مستحق ٹھہرے اور عذاب ووبال کا سزاوار ہو، البتہ یہ بات ظاہر ہورہی ہے کہ گناہوں سے توبہ کے لئے بیعت کی شکل اختیار کرنا مفید ضرور ہے، اور جب نبی پاک صلی اللہ

علیہ وسلم کو اس بات کی اجازت دی جارہی ہے اور بیعت کا ارادہ کرنے والوں کا عمل اللہ کی نگاہ میں پسندیدگی سے دیکھا جارہا ہے، اوران لوگوں کے لئے نبی سے دعائے مغفرت کو کہا جارہا ہے اور پھر اس موقع پر دعا کی قبولیت کا اشارہ بھی دیا جارہا ہے، یہ بات کھل جاتی ہے کہ ایک مسلمان اور صاحب ایمان کو اس خیر میں بھی پیش قدمی کرنی چاہئے، اور بیعت لینے والے کو نبی کی اتباع واسوہ میں رسوخ پیدا کرنا چاہئے، اس لئے کہ یہ وہ عمل ہے جس کی انجام دہی ہر ایک نہیں کرتا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیتے تھے، اس لئے نیابت نبوت کا فریضہ انجام دینے والوں کو اس میں احتیاط کا ہی پہلو پیش نظر رکھنا ہوگا، اوراس کے ساتھ دعاؤں کا اہتمام بھی کرنا ہوگا اور شریعت کے مامورات ومنہیات کا ہر لحہ لحاظ رکھنا ہوگا۔

بیان القرآن میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے سورۂ ممتحنہ کی اس آیت بیعت کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ:

"یہ آیت بیعت کی غرض میں صریح ہے اوراس سے بیعت رسمی کا جس میں عمل کا اہتمام نہ ہو ابطال لازم آتا ہے۔"

بیعت عوام کے لئے تو بیعت توبہ ہوتی ہے اور یہی بیعت خواص کے لئے بیعت تزکیہ واحسان بن جاتی ہے، اسلام لانے والوں کے لئے یہ بیعت گو بیعت اسلام ہوتی ہے، لیکن نبی کے ہاتھ پر بیعت یہ امتیاز رکھتی ہے کہ وہ بیعت لحہ بھر میں بیعت تزکیہ واحسان بن کر اس کی زندگی کے ظاہر وباطن کو یک دم منور کردیتی ہے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

"بیعت سے پہلے میری حالت یہ تھی کہ میری نظر میں آپؐ سے زیادہ مبغوض ہستی دنیا میں کوئی نہ تھی، اگر خدانخواستہ اس وقت مجھے موقع مل جاتا تو اپنی عاقبت ضرور خراب کرلیتا، لیکن بیعت کے بعد میری نظر میں آپ سے زیادہ محبوب ومحترم ذات دنیا کے

پردے میں کوئی نہ تھی، یہاں تک کہ میں نظر بھر کر آپ کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اگر مجھ سے کوئی آپ کا حُلیہ پوچھتا تو واللہ میں آپ کا حلیہ مبارک نہیں بتلا سکتا تھا، اس لئے کہ میں نے آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔‘‘(۱)

اسی طرح حضرت ابومحذورہ، حضرت ثمامہ بن اثال، حضرت ہند بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہم کے واقعات بھی سیرت کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔(۲)

حضرت عبادہ بن الصامتؓ بیعت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اسوہ اور بیان کرتے ہیں، جس سے مرید و مراد کی نوعیت اور فرق بھی معلوم ہوتا ہے، اور بیعت کی اس اعلیٰ قسم کا پتہ چلتا ہے جس میں اس عہد و معاہدہ کو اختیار کرنے کو خود صاحب منصب کہتا ہے، صحیح بخاری کی روایت ہے:

”عن عبادة بن الصامتؓ وكان شهد بدراً، وهو أحد النقباء ليلة العقبة، أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: وحوله عصابة من أصحابه: ”بايعوني على أن لا تشركوا بالله شيئاً، ولا تسرقوا، ولا تزنوا، ولا تقتلوا أولادكم، ولا تأتوا ببهتان تفترونه بين أيديكم وأرجلكم، ولا تعصوا في معروف، فمن وفىٰ منكم فأجره على الله، ومن أصاب من ذلك شيئاً فعوقب في الدنيا فهو كفارة له، ومن أصاب من ذلك شيئاً ثم ستره الله، فهو إلى الله إن شاء عفا عنه وإن شاء عاقبه فبايعناه علىٰ ذلك.“ (۳)

(حضرت عبادہ بن الصامتؓ جو غزوۂ بدر میں شریک تھے اور لیلۃ

---

(۱) مسلم کتاب الایمان۔ (۲) ملاحظہ ہو سیرت سید احمد شہید حصہ دوم از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان۔

العقبہ کے نقباء میں سے ایک تھے، ان سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور آپ کے چاروں طرف صحابہ کی ایک جماعت تھی: آؤ! مجھ سے بیعت کرو، اس بات پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگے، اور نہ چوری کروگے، نہ زنا کروگے، اور نہ اپنی اولاد کو قتل کروگے، اور نہ کسی پر بہتان باندھوگے، اور مشروع باتوں میں خلاف نہ کروگے، جو اس عہد کو پورا کرے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر ہے اور جو ان چیزوں میں سے کسی کا مرتکب ہوگا اور اس کی سزا اس کو دنیا میں مل گئی ہے تو یہ سزا اس کے لئے کفارہ ہوگی اور اگر اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ستاری کی تو آخرت میں اللہ جل شانہ چاہے تو اس کو سزا دیں، چاہے معاف کردیں، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے، (حضرت عبادہؓ فرماتے ہیں کہ) پھر ہم نے ان باتوں پر آپ سے بیعت کی)۔

اسی طرح حضرت عوف بن مالک اشجعی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

”کنا عند النبی صلی اللہ علیه وسلم تسعة أو ثمانية أو سبعة فقال: ألا تبايعون رسول اللّٰه صلی اللہ علیه وسلم فبسطنا أيدينا وقلنا: على ما نبايعك يارسول اللّٰه؟ قال: على أن تعبدوا اللّٰه ولا تشركوا به شيئاً، وتصلوا الصلوات الخمس، وتسمعوا، وتطيعوا -وأسرّ كلمة خفية- قال ولا تسئلوا الناس شيئاً فلقد رأيت بعض أولئك النفر يسقط سوط أحدهم فما يسأل أحداً يناوله إياه.“(۱)

(ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے نو

(۱) مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ۔

تھے یا آٹھ یا سات تھے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلادئے اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس امر پر بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا: ان امور پر کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، پانچوں نمازیں پڑھو، احکام سنو اور مانو اور ایک بات رازدارانہ انداز میں ارشاد فرمائی کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرو۔
راوی کہتے ہیں کہ میں نے ان حضرات میں سے بعض کی یہ حالت دیکھی ہے کہ اگر ان میں سے کسی کا چابک بھی گرجاتا تو بھی کسی سے سوال نہ کرتے کہ وہ اسے اٹھا کر ان کو دیدے)۔

یہ دونوں بیعتیں بیعت اسلام یعنی اسلام لانے اور بیعت جہاد یعنی موت و شہادت کی بیعت نہیں تھی، حضرت عبادہ بن الصامتؓ والی روایت پر حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ تعلیق کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''یہ بیعت نہ بیعت اسلام ہے نہ بیعت جہاد، یہ وہی بیعت ہے جو امور اسلام پر تاکید کے واسطے کی گئی۔'' (یہی مشائخ طریقت کے یہاں رائج ہے)۔

اور حضرت عوف بن مالک اشجعی والی روایت کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب قدس سرہ فرماتے ہیں کہ اس میں مخاطبین چوں کہ صحابہ ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں کہ تحصیل حاصل لازم آتی ہے، اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں بلکہ بدلالت الفاظ معلوم ہے کہ التزام واہتمام اعمال کے لئے ہے پس مقصود ثابت ہوگیا۔(۱)

---

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم: ۱۲۶ بحوالہ الکشف از حضرت تھانوی

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب لکھتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت تھانوی نے حضرت عبادہؓ کی حدیث نقل کی ہے اور اس کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں تصریح ہے کہ جن لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کا امر فرمایا، وہ صحابہ تھے، جس سے ثابت ہوا تھا کہ علاوہ بیعت اسلام وجہاد کے ترک معاصی والتزام طاعات کے لئے بھی بیعت ہوتی تھی، یہی بیعت طریقت ہے، جو صوفیاء میں معمول ہے، پس اس کا انکار ناواقفی ہے۔(۱)

بیعت ایک عہد ومعاہدہ ہے

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے بیعت کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے بہت صاف لکھا ہے کہ:

> ''بیعت کرنا اور سلسلہ میں داخل ہونا کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں ہے، جس کے لئے کچھ ماننا اور کرنا نہ پڑے، محض برکت یا شہرت مقصود ہو، یہ ایک عہد ومعاہدہ اور ایک نئی دینی وایمانی زندگی کا آغاز ہے، جس میں زندگی میں کچھ تبدیلیاں، کچھ پابندیاں اور کچھ ذمہ داریاں ہیں۔''

وہ بیعت کرنے والوں اور اس طریقہ سے سلسلۂ رشد وہدایت وتربیت واصلاح میں داخل ہونے والوں کو توجہ دلاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''سب سے پہلی اور ضروری بات یہ ہے کہ بیعت اور سلسلہ میں داخل ہونا، کلمہ کی تجدید اور اسلامی عہد ومعاہدہ، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق دینی وایمانی زندگی شروع کرنے اور اسی کے مطابق زندگی گزارنے کا قصد وارادہ اور عہد ومعاہدہ سمجھا جائے۔''

---

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم: ۱۲۸ بحوالہ التکشف از حضرت تھانوی

اور اعمال ومقاصد زندگی کے اعتبار سے اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی اور لکھا کہ:

''دینی ودنیوی دونوں کاموں میں ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت کی مشق کی جائے، اخلاق ومعاملات اور زندگی کے معمولات میں بھی اس کا اہتمام کیا جائے تاکہ ان پر عبادات کا ثواب ملے اور ان کو حتی الامکان شریعت اور سنت کے مطابق کرنے کی کوشش کی جائے، اخلاقی ومزاجی کمزوریوں، حسد وکینہ، حد سے بڑھے ہوئے غصے، بدگوئی، اور بدزبانی اور مال ودولت اور دنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت سے بچنے کی امکانی کوشش کی جائے۔''(۱)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جن امور کی بیعت لیتے تھے، خاص طور پر ان امور میں اس قدر محتاط ہوتے تھے کہ اس کے غبار سے بھی اپنے کو صاف رکھتے، اس کے ساتھ پوری زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھال دیتے تھے اور جذبات واحساسات بھی شریعت وسنت کے تابع ہوجاتے تھے۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے:

"عن جرير بن عبدالله رضى الله عنه قال: بايعت النبى صلى الله عليه وسلم على إقام الصلوٰة وإيتاء الزكوة والنصح لكل مسلم." (۲)

(کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے پر بیعت کی، اور اس بات پر کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کروں گا)۔

---

(۱) ملاحظہ ہو سلاسل اربعہ مرتبہ از راقم　　(۲) بخاری ومسلم

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں:

''دوسری روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جریر! اپنے ہاتھ پھیلاؤ تو میں نے عرض کیا کہ کس بات کے لئے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ اس واسطے کہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا تابعدار بنادو اور ہر مسلمان کے لئے خیر خواہی کرو۔ اس کو انہوں نے بہت غور سے سنا، اور آدمی بہت سمجھ دار تھے، اس لئے عرض کیا کہ یارسول اللہ! جہاں تک مجھے طاقت ہے۔

تو اس کے بعد حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا لوگوں کے لئے رخصت کا سبب ہوگیا۔''(۱)

جہاں تک حضرت جریر کا تعلق ہے انہوں نے عہد و معاہدہ کی اپنی طاقت بھر پوری پاسداری کی، علامہ ابن حجر عسقلانی شارح صحیح بخاری اور حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ شارح صحیح مسلم دونوں نے حضرت جریر کی روایت:

''بایعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم علی إقام الصلوٰۃ وإیتاء الزکوٰۃ والنصح لکل مسلم''

کی شرح کرتے ہوئے ان کا یہ نصیحت آموز واقعہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس حد تک وہ نصح و خیر خواہی کا لحاظ و پاس رکھتے تھے کہ معاملہ کرنے میں یہ محسوس کرتے کہ دوسرا ان کی رعایت کررہا ہے اور اپنے مال کی حیثیت سے کم ان کو مال دے رہا ہے تو اسی قیمت میں لیتے جو صحیح قیمت ان کی نگاہ میں اس مال کی ہوتی جیسے کہ گھوڑا خریدنے میں پیش آیا کہ گھوڑے والا ان کو تین سو درہم میں گھوڑا دے رہا تھا وہ سو سو درہم بڑھاتے گئے، ان کے یہ کہنے پر کہ ''اور زیادہ کرو'' بالآخر آٹھ سو درہم میں انہوں نے گھوڑا خریدا کہ وہ خود اس گھوڑے کو فروخت کرتے تو اس قیمت میں کرتے۔

---

(۱) شریعت و طریقت کا تلازم: ۱۳۰

نبی سے عہد و پیان درحقیقت اللہ سے عہد و پیان ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ فتح میں صاف طور پر ارشاد فرمادیا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللّٰهَ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلَىٰ نَفْسِهِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيهِ أَجْراً عَظِيماً﴾

(جو لوگ بیعت کرتے ہیں آپ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر، پھر جو کوئی قول وقرار توڑے (یعنی عہد و پیان کے خلاف کرے) تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، (کہ یہ توڑنا اسی پر جائے گا) اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ (اللہ) اس کو بہت بڑا بدلہ عطا کرے گا)۔

اس آیت کریمہ سے جہاں بیعت نبوی کی بڑی فضیلت معلوم ہورہی ہے کہ درحقیقت نبی کے ہاتھ پر ہاتھ دینا اللہ کو ہاتھ دینا ہے، اس لئے اب اس کی پاسداری سب سے اہم بات ہے، اس لئے کہ اللہ کو ہاتھ دے کر ہاتھ چھڑانا پُرخطر بات ہے، جس سے شدید نقصان بھی سامنے آسکتا ہے، اور اصل چیز اللہ پر اعتماد اور یقین ہے جب اللہ کے لئے ہاتھ دے دیا اور زبان سے اقرار کرلیا، تو پھر راہ کی رکاوٹوں کو دور کرکے جادۂ حق پر جمنا ضروری ہوجاتا ہے، اور اس پر اللہ کی بڑی مدد آتی ہے، لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہاتھ دے کر بیعت کرتے تھے، اسی کو فرمایا گیا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر بیعت کرنا خدا سے بیعت کرنا ہے، یہ جو فضیلت بیعت کرنے والے کی بیان کی گئی اس تعلق سے علامہ شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:

"کیوں کہ حقیقت میں نبی خدا ہی کی طرف سے بیعت لیتا ہے، اور اسی کے احکام کی تعمیل وتاکید بیعت کے ذریعہ کراتا ہے......

اور جب بیعت نبوی کی حقیقت یہ ہوئی تو یقیناً اللہ تعالیٰ کا دست
شفقت وحمایت ان کے ہاتھوں پر ہوگا۔"(۱)

اقسام بیعت

حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے اپنی معرکۃ آراء اور مقبول عام کتاب "حیاۃ الصحابہ" میں بیعت پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے مختلف ابواب اور متعدد روایت جمع کر کے اس کی اہمیت اجاگر کی ہے، انہوں نے اس کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے:

۱-بیعت اسلام۔ ۲-بیعت جہاد۔ ۳-بیعت اعمال اسلام

بیعتِ اسلام

جہاں تک بیعت اسلام کا تعلق ہے تو اس میں کبھی کسی کو تردد اور تذبذب نہیں آیا، اور متعدد واقعات صحیح روایات سے اس سلسلہ میں شاہد عدل ہیں، کتب سیرت میں اس سلسلہ کی مجموعی بیعت "بیعت عقبہ" کے نام سے ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

بیعتِ جہاد

بیعت جہاد کا جہاں تک تعلق ہے، تو قرآن مجید نے خود اس کی گواہی دے دی ہے اور سورۃ الفتح میں اس کی فضیلت یوں بیان کردی گئی ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً﴾.

(یقینی طور پر اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب وہ بیعت کرنے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے، اللہ کو معلوم تھا جو (صدق و

---

(۱) تفسیر عثمانی بر متعلقہ و مذکورہ آیت سورۂ فتح /۱۰

خلوص) ان کے دلوں میں تھا تو (اللہ) نے ان پر تسلی نازل فرمائی اور انھیں جلد فتح عنایت کی)۔

اس کا پس منظر واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغرض عمرہ مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے، حدیبیہ پہونچ کر معلوم ہوا کہ مکہ والے اس بات پر بضد ہیں کہ آپ کو اس ارادے سے باز رکھیں گے، حضرت عثمانؓ کو قریش کے پاس پیام دے کر بھیجا کہ کوئی اور مقصد نہیں ہے، عمرہ کر کے واپس جائیں گے۔ ادھر اطلاع ملی کہ قریش نے حضرت عثمان کو روک لیا اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ شہید بھی کر دئے گئے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ شاید لڑائی کا موقع ہو جائے سب صحابہ سے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر جہاد کی بیعت لی۔(۱)

بیعتِ اعمالِ اسلام

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بیعت کی تینوں قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اسلام پر کبھی جہاد پر کبھی کسی دوسرے امر پر بیعت لیتے تھے، صحیح مسلم میں "وعلی الخیر" کا لفظ آیا ہے، مشائخ طریقت کی بیعت اگر بطریق مشروع ہو تو اسی لفظ کے تحت میں مندرج ہوگی، "حدیبیہ" میں اس بات پر بیعت لی گئی تھی کہ مرتے دم تک میدان جہاد سے نہیں بھاگیں گے۔"(۲)

بیعت شریعت وطریقت

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بیعت طریقت یعنی شریعت پر چلنے کی بیعت کے متعلق لکھتے ہیں:

"حضرات صوفیاء کرام میں جو بیعت معمول ہے جس کا حاصل

---

(۱) ملخص از تفسیر عثمانی: ۶۷۸ مطبع ملک فہد مدینہ منورہ (۲) ایضا ص/۶۸۱

معاہدہ ہے التزام احکام واہتمام اعمال ظاہری وباطنی کا جس کو ان کے عُرف میں ''بیعت طریقت'' کہتے ہیں۔''(۱)

حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے کہا ہے کہ اس میں اعمال اسلام یا التزام احکام دین کی ہی بیعت ہے جس کو علامہ شبیر احمد عثمانی نے صحیح مسلم کے حوالہ سے بیعت کی تیسری قسم ''وعلی الخیر'' بتایا ہے کہ مشائخ طریقت کی بیعت اسی لفظ کے تحت مندرج ہوگی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت کے الفاظ بہت سی سندوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ ''شریعت وطریقت کے تلازم'' میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اردو ترجمہ اس طرح ذکر کیا ہے کہ:

''حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ دفعہ مجھ سے اس پر بیعت لی کہ میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈروں۔''

ایک حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ چھ دن انتظار کر اور ساتویں دن تجھ سے ایک بات کہوں گا اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے، ساتویں دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اولاً تجھے وصیت کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ کے تقوی کی، تنہائی میں بھی اور مجمع میں بھی، خلوت میں بھی جلوت میں بھی، اور جب کوئی بُرائی ہو جائے تو اس کے بعد فوراً کوئی اچھا کام کرلیا کرو اور کسی سے سوال نہ کرنا چاہے، تیرا کوڑا ہی گر جائے اور کسی کی امانت نہ رکھنا۔''

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مرشد ومربی اور شیخ کو انسانی مزاج ونفسیات

(۱) شریعت وطریقت کا تلازم بحوالہ الکشف۔

کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے، اس لئے کہ ایک چیز انفرادی طور پر کسی شخص کے لئے دینی ودنیوی دونوں لحاظ سے نقصان کا باعث ہوتی ہے، مگر اجتماعیت قائم رکھنے اور ملی وانسانی ضرورت کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتی ہے، اسی میں امانت کا رکھنا بھی ہے، اور پھر امانت کی پاسداری کرنا ہے، اگر خیانت کا اندیشہ ہو تو ایسے شخص کو امانت رکھنے سے گریز ضروری ہے، اس لئے کہ طبائع مختلف ہوا کرتے ہیں، اور یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مختلف اشخاص سے ان کے حال یا زمانہ کے تقاضوں کے اعتبار سے بعض ان امور پر بھی بیعت لی جاسکتی ہے جس کی اس وقت زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بیعت کی حقیقت واثبات پر مدلل بحث کی ہے، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بیعت کرنا یا بیعت لینا یہ کوئی واجبی امر نہیں ہے، یہ سنت ہے، اس لئے کہ صحابہ کرام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی، اور اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا۔"(۱)

کوئی دلیل اس پر نہیں کہ بیعت نہ کرنے والا گنہگار ہوگا اور نہ ہی بیعت سے احتراز کرنے والے پر نکیر کی گئی، البتہ اکثر یہ عمل صحیح ایمانی زندگی گزارنے کے لئے معاون ومفید ہوا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے طلب اور شوق کی لاج رکھ لیتا ہے۔

بیعت کی یہ تیسری قسم جو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے اور دین پر چلنے کے خاطر کی جاتی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:

"احادیث مشہورہ میں منقول ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: القول الجمیل فی بیان سواء السبیل تالیف حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

وسلم سے لوگ بیعت کرتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ہجرت اور جہاد پر اور کبھی اقامت ارکان اسلام یعنی صوم وصلوٰۃ، حج وزکوٰۃ پر اور کبھی ثبات اور قرار پر معرکۂ کفار میں۔ چناں چہ بیعت الرضوان ہوئی اور کبھی سنت نبوی کے تمسک پر، اور بدعت سے بچنے پر اور عبادات کے حریص اور شائق ہونے پر، چناں چہ بروایت صحیح ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی، انصاریوں کی عورتوں سے نوحہ نہ کرنے پر، اور ابن ماجہ نے روایت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند محتاج مہاجرین سے بیعت لی اس پر کہ لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کریں، تو ان میں سے کسی شخص کا یہ حال تھا کہ اس کا کوڑا اگر گر جاتا تو خود ہی اپنے گھوڑے سے اتر کر اس کو اٹھا لیتے اور کسی سے کوڑا اٹھا دینے کا بھی سوال نہیں کرتے تھے، اور جس میں کوئی شک وشبہ نہیں وہ یہ ہے کہ جب ثابت ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی فعل بطریق عبادت اور اہتمام کے (نہ بر سبیل عادت) تو وہ فعل سنت دینی سے کم تر تو نہیں ......تو ہم کو چاہئے کہ بیعت کی گفتگو کریں کہ وہ کون قسم سے ہے، تو بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ بیعت منحصر ہے قبول خلافت اور سلطنت پر اور وہ جو صوفیوں کی عادت ہے یا ہم اہل تصوف سے بیعت لینے کی وہ شرعاً کچھ نہیں اور یہ گمان فاسد ہے، بدلیل اس کے جو ہم ذکر کر چکے کہ......

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گاہے (کبھی) بیعت لیتے تھے اقامت ارکان پر اور گاہے تمسک بالسنۃ پر اور صحیح بخاری گواہی دے رہی

ہے، اس پر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جریرؓ پر شرط کی ان کی بیعت کے وقت سو فرمایا کہ خیر خواہی لازم ہے ہر مسلمان کے واسطے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی قوم انصار سے، سو یہ شرط کرلی نہ ڈریں امر خدا میں کسی ملامت گر کی ملامت سے اور حق ہی بات بولیں جہاں سو ان میں سے بعض لوگ امراء وسلاطین پر کھل کر بلاخوف ردّ و انکار کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی عورتوں سے بیعت لی اور شرط کرلی کہ نوحہ کرنے سے پرہیز کریں ان کے سوائے بہت امور میں بیعت ثابت ہے اور وہ امور از قسم تزکیہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ہیں۔"(۱)

بیعت کے اغراض ومقاصد اور اس کے اثرات

انسان کے جذبہ اور نیت کو اس کے مقصد کے حصول میں بنیادی دخل ہوتا ہے، صحیح حدیث میں صاف صاف آیا ہے "إنـمـا الأعمال بالنيات" کہ اعمال کا دار ومدار نیتوں پر ہے (۲) اگر دنیا طلبی پیش نظر ہوتی ہے تو پھر اس کو دین کا حصہ نہیں ملتا، اس لیے جب اللہ کا نام بیچ میں لایا جائے اور اللہ کا واسطہ دیا جائے تو آدمی کو اپنی نیت وارادے کا صحیح تعین کرنا چاہیے۔

بیعتِ معیشت

حضرت شاہ رفیع الدین بن حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنے رسالہ "بیعت" میں بیعت کے اغراض ومقاصد سے بحث کرتے ہوئے اس کا ایک مقصد اور غرض بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" اور اس کا ترجمہ "شفاء العلیل از مولانا خرم علی بلہوریؒ۔ (۲) صحیح بخاری، اول حدیث۔

''برائے تحصیل مال وجاہ یا برائے تحصیل حاجات دنیوی۔''

یعنی یہ ایک عامیانہ مقصد ہے، بزرگوں، اہل اللہ ومشائخ کے پاس دنیوی اغراض لے کر حاضر ہونا اور اسی غرض سے ارادت قائم کرلینا عام بات ہے، اسی لئے ایسے لوگ اس سے نہ کوئی روحانی ترقی اور نہ کوئی دینی فائدہ حاصل کر پاتے ہیں، بلکہ غلط نیت وارادہ کا خمیازہ بھی ان کو بھگتنا پڑ جاتا ہے، علامہ گیلانی نے اس بیعت کا نام ''بیعت معیشت'' رکھا ہے اور اس پر تبصرہ بھی فرمایا ہے، اس پر ان کے شاگرد مولانا ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی ثم کراچوی (مرید وخلیفہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ) نوٹ چڑھاتے ہیں کہ:

> ''پہلے بھی ہوگا مگر آج کل تو یہ حقیقت کھلی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے کہ تجار اور امراء یا پھر افلاس زدہ لوگوں کی بیعت عام طور پر ''بیعت معیشت'' ہی ہوتی ہے، اور ایسے لوگوں کا رجوع ان بزرگوں کی طرف نہیں ہوتا، جہاں کسب معاش کے ذرائع اور صرف دولت ہی کے مدات پر شرعی گرفت کی جاتی ہے اور نفلی اشغال واوراد سے پہلے فرائض وواجبات کی بجا آوری اور منہیات شرعیہ سے عملی توبہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اسی لئے بزرگان دین نے سچے پیر کی پہچان کے جو معیارات لکھے ہیں ان میں اس معیار کو بھی پوری اہمیت دی ہے کہ اس بات کو اچھی طرح دیکھ لیا جائے کہ اس پیر کی طرف رجوع کرنے والے اہل علم و اخلاص ہیں یا اہل دنیا اور غرض پرست۔''(۱)

بیعتِ تبرک

بیعت کرنے والوں یا سلسلہ میں داخل ہونے والوں کی ایک دوسری غرض

---

(۱) مقالات احسانی از مولانا گیلانی، مکتبہ اسعدیہ کراچی: ۵۲-۵۳

تبرک حاصل کرنا ہوتا ہے اور کچھ کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہیں ہوتا، حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے اس بیعت کا نام ''بیعت وسیلت'' رکھا ہے، مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''بہر حال بیعت ''وسیلت'' شاہ صاحبؒ کے نزدیک پیری مریدی کی ایک ایسی شکل ہے جسے کلیۃً بے فائدہ قرار نہیں دیا جاسکتا، جیسے بیعت کی پہلی قسم محض بے معنی ہوتی ہے، یہ رنگ بیعت وسیلت کا نہیں ہے، بلکہ دنیا و آخرت میں اس بیعت سے بھی بیعت کرنے والوں کو فائدہ پہونچتا ہے، ایسا فائدہ جس کی توقع بیعت کی سعادت حاصل کئے بغیر نہیں کی جاسکتی۔''(۱)

بیعتِ شریعت

تیسری غرض توبہ و انابت کا جذبہ طاری ہونے کے بعد شرعی مطالبات کے مطابق زندگی گزارنے کا اندرونی تقاضا ہے، اس جذبہ و نیت سے جو بیعت کی جاتی ہے وہ شاہ صاحب کے نزدیک ''بیعت شریعت'' ہے، بقول علامہ سید مناظر احسن گیلانی علیہ الرحمہ:

''اگرچہ بظاہر یہ خیال گزرتا ہے کہ شریعت کی کتابیں یعنی قرآن بھی ہے، حدیث کی کتابیں موجود ہیں، شوق کی تکمیل کے لئے یہ کافی ہے کہ کتابوں میں دیکھ دیکھ کر غیر شرعی کمزوریوں کا ازالہ کرکے مذہب کے مطابق اپنے آپ کو کرلیا جائے، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ دیکھنے میں یہ مسئلہ خواہ کتنا ہی آسان نظر آتا ہو، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ جیسے طب کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر اور ان سے نسخوں کا انتخاب کرکر کے کوئی اپنا علاج کر نہیں سکتا بلکہ

---

(۱) مقالات احسانی ص/۵۳

کتابوں کے رہتے ہوئے بھی تجربہ کار طبیب کی ضرورت ہوتی ہے، کچھ یہی رنگ شرعی مطالبات اور قوانین کے استعمال کا بھی ہے۔"(۱)

حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ (۱۲۳۳ھ) لکھتے ہیں:

"ایں معنی بدوں تحکیم عالم متقی بر ظاہر و باطن خود منتظم نمی تواند شد چہ دیدن کتاب ہائے شریعت مانند مراجعت کتب طب است بیمار رابدوں حصول بلکہ طب معالجہ بہ ایں قدر را اصلاح مزاج و دفع مرض دشوار است۔"(۲)

یعنی کسی پرہیزگار عالم کی نگرانی اپنے ظاہر و باطن پر جب تک قائم نہ کرلی جائے، اسی کے فیصلوں کا تابع اپنے آپ کو نہ بنالیا جائے، عام حالات کے لحاظ سے شرعی مطالبات کے مطابق اپنے آپ کو کرلینا آسان نہیں ہے، شریعت کی کتابوں کو دیکھ کر، اس کی مثال وہی ہوگی کہ فن طب میں کمال حاصل کئے بغیر کوئی اپنا علاج طب کی کتابوں کو دیکھ دیکھ کر کرنا شروع کردے، ظاہر ہے کہ مزاج کو اپنی اصل حالت کی طرف لے آنا اور بیماری کا ازالہ جیسے محض طبی کتابوں کی مدد سے دشوار ہے، اسی طرح شریعت کی فقط کتابوں کی مدد سے صحیح دینی زندگی کے حاصل کرنے میں کامیابی آسان نہیں۔

شاہ رفیع الدین صاحب نے بیعت شریعت کا نصب العین اور اس کے لئے ذی علم وفہم شیخ و مرشد کے انتخاب اور ان کی خصوصیات بھی بتائی ہیں:

۱- صحیح الفکر اور صحیح الحواس ہو۔

۲- شریعت کے مطالبات کی تعمیل کرانے اور جن باتوں سے شریعت نے منع کیا ہے ان کے متعلق سہل انگاری اور نرمی وچشم پوشی سے کام نہ لیتا ہو۔

۳- مرید کے افتاد طبع، فطری میلانات، استطاعت واستعداد کا صحیح اندازہ

---

(۱) مقالات احسانی ص/۵۴

(۲) رسالہ بیعت از شاہ رفیع الدین بحوالہ سابق: ۵۴-۵۵

کر کے وہ ان ہی باتوں کی طرف اس کی رہنمائی کرے جو اس کے لئے بہتر ہوں اور آسان بھی ہوں۔

اس دینی ایمانی اور شرعی رابطہ قائم کرنے والے کے لئے اتباع وانقیاد کو لازم قرار دیا ہے، اور اس کے مقتضیات ومطالبات پر عمل کرنے والے کے لئے لکھا ہے کہ:

> ''اس بیعت شریعت کے صحیح اقتضاؤں کی تکمیل کر کے مرنے والوں کے لئے آخرت میں (جہنم کے عذاب سے) چھٹکارا نصیب ہوگا، جنت میں داخل ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی میسر آئے گی۔''(۱)

بیعتِ طریقت

چوتھی غرض وغایت دین وشریعت اور عبادت ومعاشرت میں دینی احکام کے مطابق زندگی گزار کر درجہ احسان پر فائز ہونا ہے(۲)

کہ آدمی تمام امور میں دینی ہوں یا دنیا سے متعلق، احکام شریعت کو غالب رکھ کر اپنے کو اللہ کے دربار میں محسوس کرے، جیسے کہ فرمایا گیا ہے:

"أن تعبد اللّٰہ کانك تراه فإن لم تکن تراه فإنه یراك."(۳)

اور جیسے کہ خود اللہ جل جلالہ نے فرمادیا:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ﴾ (٤)

---

(۱) رسالہ بیعت از شاہ رفیع الدین بحوالہ سابق:۵۶

(۲) چودھویں صدی ہجری کے مشہور اور عالی مرتبت عارف ومربی حضرت شاہ حسین حیدرآبادی مرشد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے بڑی بلیغ بات ''احسان'' کے متعلق سے فرمایا کرتے تھے، کہ ایک انسان ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اقرار کر کے ایک سیکنڈ میں کفر سے نکل کر دائرۂ اسلام میں آجاتا ہے اور ایک مسلمان "ان اللّٰہ معنا" کا استحضار کر کے ایک سیکنڈ میں مرتبۂ احسان کو پہنچ جاتا ہے۔"(مقالات احسانی از علامہ گیلانی:۳۱)

(۳) البخاری:باب سوال جبرئیل النبی ﷺ وصحیح مسلم :باب معرفة الایمان والاسلام والقدر

(۴) سورۂ حدید/۴

مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''احسان کا مقام اسلام کے مقام سے بلند و برتر ہے، پھر جیسا کہ دستور ہے ہر فن کو اس فن کے ماہرین اور تجربہ کاروں سے حاصل کیا جاتا ہے، شاہ رفیع الدین صاحب نے لکھا ہے کہ جن لوگوں میں ان کمالات کی تحصیل کا ولولہ جوش مارتا ہے تو وہ کسی ایسے آدمی کا انتخاب کرتا ہے، جو مذکورہ بالا صفات و کمالات سے سرفراز ہو اور خود اسی قسم کے آثار کا ظہور اس شخص کی ذات سے ہو رہا ہو، اور اپنا استاذ یعنی پیر یا شیخ ان ہی کو بنالینا چاہتا ہے اور اسی کی پیروی کی جاتی ہے، اور جن نفسانی و جسمانی مجاہدات کا حکم شیخ کی طرف سے دیا جاتا ہے اسی کی تعمیل کرکے مرید بھی اس راہ کا ماہر ہوجاتا ہے اور اپنے نصب العین کے حصول میں کامیاب ہوجاتا ہے۔''(۱)

آگے وہ لکھتے ہیں:

''مجاہدات نفسانی و جسمانی کے حاصل کرنے کی طرف ایک اجمالی اشارہ شاہ صاحب نے ان الفاظ میں کیا ہے، کہ اس راہ میں روح کو جسمانی آلائشوں سے پاک کرنا اور روحانی انوار اور ربانی اسماء سے اسی روح کو مکمل اور آراستہ کرنا پڑتا ہے۔''(۲)

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے ان بانصیب کاملین راہ طریقت پر فیضان ربانی کو بتاتے ہوئے ان کے مقام و رتبہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''اللہ کے بندوں کے لئے فیض کا سرچشمہ اور لوگوں کی مشکلات کے حل کا ذریعہ ان کی

(۱) رسالہ بیعت از شاہ رفیع الدین، بحوالہ سابق: ۵۷

(۲) ایضا

ذات بن جاتی ہے۔" جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ ان کے وابستگان، متعلقین ومعاونین تیزی سے مراتب عالیہ طے کرتے ہیں، اور عرفان نفس حاصل کر لیتے ہیں۔

بیعتِ حقیقت

حضرت شاہ رفیع الدین صاحب نے اس سے بھی بلند لوگوں کا تذکرہ کیا ہے، اوران کے مقصد حیات کو خالصۃً للّٰہی بتایا ہے کو وہ شروع سے ہی ﴿إِنَّ صَلَاتِـي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰـهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (۱) کا مصداق ہوتے ہیں، اور اللہ کے عشق ومحبت میں سرشار ہوکر بلند مقاصد کے لئے جیتے ہیں اور اسی میں فنا ہوجاتے ہیں، بقول حضرت شاہ رفیع الدین صاحب:

> "حق تعالیٰ اپنے ازلی حسن وجمال کے مشاہدے کا ان کو آئینہ بناتے ہیں اوراپنے مقاصد کے ظہور کا ذریعہ وآلہ ان کو ٹھہراتے ہیں اور روز اول ہی سے حق تعالیٰ ان کی روحوں میں اپنی ذات کی محبت وعشق کا تخم بودیتے ہیں، (اور) کسی نہ کسی وجہ سے خاص موقع پر ایسا ہوجاتا ہے کہ ان کی فطرت میں جوراز چھپا ہوا تھا اندر ہی اندر اس میں شورش اور جوش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جو باتیں ان کے دلوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں اچانک باہر نکل کر بکھر جاتی ہیں۔"(۲)

ان حضرات عالی مقام کی کیفیت وطلب کی طرف شاہ رفیع الدین صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ:

> "اپنے وجود کے ساتھ قیام کا خیال ان کے اندر سے نکل جاتا ہے، تہہ دل سے چاہتے ہیں کہ خدا ہی کے وجود کے ساتھ ان کی بقاء وابستہ ہوجائے۔"(۳)

---

(۱) سورۃ الانعام/۱۶۲ (۲) رسالہ بیعت از شاہ رفیع الدین بحوالہ سابق: ۵۷ (۳) ایضا

درحقیقت ان حضرات عالی مقام کا معاملہ اجتبائی واصطفائی ہوتا ہے، اور خود اللہ رب العزت نے ایک جگہ فرمایا ہے:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (۱)

شاہ رفیع الدین صاحب کے نزدیک ان حضرات کی بیعت حقیقی بیعت ہوتی ہے، لیکن اس میں ان کی استعداد وصلاحیت کو کم، موہبت کو زیادہ دخل ہوتا ہے، اور وہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے سوا ہر شخص کی ذات میں صلاحیت نہیں ہوتی کہ مذکورہ بالا نصب العین تک (بغیر کسی رہنمائی وامداد کے) خود بخود پہنچ جائے۔

''بیعت حقیقت'' کے متعلق مولانا مناظر احسن گیلانی رقم طراز ہیں:

''بیعت حقیقت کی ضرورت اس قسم کے نفوس کو اسی لئے ہوتی ہے کہ جس نصب العین کی تڑپ اور جستجو ان میں جوش زن ہوتی ہے، اس نصب العین تک بہ ذات خود فطرت کے عام قانون کے لحاظ سے نہیں پہنچ سکتے، شاہ صاحب نے اس کے بعد جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیعت کی مذکورہ بالا صورتوں میں تو مریدوں کو خود پیروں کے پاس جانا پڑتا ہے، لیکن ''بیعت حقیقت'' والوں کے ساتھ غالباً کچھ ایسی صورت پیش آتی ہے کہ:

''برائے تربیت ایشاں وایصال بہ ایں مقصد اعلیٰ یکے از کاملین ہر سروقت برایشاں می گمارند۔''

(حق تعالیٰ اس راہ کے ارباب کمال میں سے کسی صاحب کمال کو ان لوگوں کی تربیت کے لئے اور ان کو ان کے نصب العین تک پہنچانے کے لئے مقرر فرما دیتے ہیں۔) (۲)

---

(۱) سورۂ شوریٰ/۱۳

(۲) رسالہ بیعت از شاہ رفیع الدین بحوالہ سابق: ۶۰

مولانا گیلانی کا یہ فیصلہ حق بجانب ہے کہ گویا سمجھنا چاہیے کہ یہ بجائے مرید کے اپنے مشائخ ومرشدین کے مراد ہوتے ہیں۔(۱)

بیعت لینے کے لیے اجازت کی ضرورت

یوں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں صاف طور پر بتادیا گیا ہے ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ یعنی کہ آپ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، اللہ کی طرف سے جو ارشاد ہوتا ہے اسی کے مطابق جو کہنا ہوتا ہے کہتے ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جو مسائل وحالات آتے آپ فوری طور پر کوئی فیصلہ صادر نہ فرماتے، آپ کی نگاہ اوپر لگی رہتی اور وحی کا انتظار ہوتا، سیرت پاک کے مطالعہ سے بھی یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شوق اور اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ کی مرضی ومنشا سے کوئی کام کرتے اور کسی کام کے کرنے کو کہتے ہیں، بیعت لینے کے سلسلہ میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی اسوہ ہمارے سامنے ہے، کہ بیعت کا تقاضا کرنے والوں کو فوراً بیعت نہیں فرمالیا، حکم الٰہی کے منتظر رہے، اور جب اس کی اجازت ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت لی گویہ آیت بیعت خواتین کے تعلق سے ہے، سورۂ ممتحنہ میں ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَنْ لَا يُشْرِكْنَ بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾.

(اے نبی! جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو آئیں اس بات پر کہ اللہ کا شریک کسی کو نہ ٹھہرائیں اور چوری نہ

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو" مقالات احسانی مع دل کی دنیا از مولانا مناظر احسن گیلانی، مکتبہ اسعدیہ کراچی۔

کریں اور زنا نہ کریں اور اپنی اولاد کا قتل نہ کریں اور اپنے ہاتھوں اور پیروں سے تہمت باندھ کر نہ لائیں اور (اس بات پر کہ) کسی مناسب کام میں تیری نافرمانی نہ کریں گی، تو آپ بیعت میں داخل کر لیجئے، اور ان کے لئے اللہ سے مغفرت چاہئے، یقینی طور پر اللہ تعالیٰ چھوٹے بڑے سب گناہوں کو معاف کر دینے والا اور بار بار رحم کرنے والا ہے)۔

اسی طرح سورۃ الفتح کی آیت:

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ، يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ أَيْدِيْهِمْ فَمَنْ نَكَثَ فَإِنَّمَا يَنْكُثُ عَلىٰ نَفْسِهٖ وَمَنْ أَوْفىٰ بِمَا عَاهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهُ فَسَيُؤْتِيْهِ أَجْراً عَظِيْماً﴾.

(جو لوگ بیعت کرتے ہیں آپ سے وہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے، اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر، پھر جو کوئی قول و قرار توڑے (یعنی عہد و پیمان کے خلاف کرے) تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے، (کہ یہ توڑنا اسی پر جائے گا) اور جو کوئی پورا کرے اس چیز کو جس پر اقرار کیا اللہ سے تو وہ (اللہ) اس کو بہت بڑا بدلہ عطا کرے گا)۔

بیعت عرب سماج میں بڑی مہتم بالشان چیز تھی، یہ ایک عہد و پیمان ہے، ایک معاملہ ہے جو اللہ کو گواہ بنا کر کیا جاتا ہے، یہ کوئی رسمی اور شوقیہ چیز نہیں جسے یونہی انجام دے دیا جاتا ہو، اس لیے جو لوگ صدق دل سے ایسا کرتے ہیں، ان کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے، اور جیسا کہ ذکر کیا گیا اگر نئی ایمانی زندگی شریعت و سنت کے مطابق گزارنے کا عہد ہو تو یہ عمل کوئی ایسا عمل نہیں جس کے لیے کچھ کرنا نہ پڑے۔

اجازت کی ضرورت اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ خود رائی سے انسان حظ

نفس کا شکار ہو جاتا ہے، اور تکمیل ضرورت کے بجائے تکمیل خواہش اس کے پیش نظر رہتی ہے، ایک ضرورت اگر کسی سے پوری ہو رہی ہے تو دوسری ضرورتیں بھی ہیں، جن کو پورا کرنے کے لیے افراد کی ضرورت پڑتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی صلاحیتوں کو دیکھ کر الگ الگ مہم پر انہیں لگاتے تھے، اور ضرورت پڑنے پر بعض کاموں کی بعض کو اجازت دی، جیسے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اجتہاد کی اجازت دی، خلفاء راشدین کے طریقہ کو اختیار کرنے کو فرمایا، صحابہ کو ہدایت کا ذریعہ بنایا، اور کتاب وسنت سے رہنمائی حاصل کرنے کی تلقین فرمائی، ان سب باتوں کو جمع کرنے اور ان میں تطبیق دینے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر حال میں مومن کو خودرائی، اعجاب بالنفس اور تفسیر وتشریح بالرائے سے احتراز کرنا چاہئے، اور اہل خشیت وتقویٰ واصحاب فضل وکمال کی رہبری میں اپنا سفر طے کرنا ہے، اور بلا اجازت ومشورہ کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قولی وعملی اسوہ ہے، اور یہی خلفاء راشدین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا اسوہ وطریقہ رہا۔

مرشد کے لیے علم دین کی اہمیت

مولانا کرامت علی جون پوریؒ خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ اپنی کتاب ''القول الثابت'' میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''جس کو دونوں (یعنی احکام شریعت اور اسرار شریعت) کا علم نہیں ہے وہ عالم نہیں ہے اور جب عالم نہیں ہے تو مرشدی کا رتبہ بھی اس کو نہیں ہے۔''

یہ بات مولانا جون پوری نے حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی (سرحلقہ سہروردیہ) کی کتاب عوارف المعارف کے حوالہ سے لکھی ہے، پھر حضرت نظام الدین اولیاء کے علم حاصل کرنے پھر مرید ہونے اور خلافت پانے کا واقعہ ''اخبار الاخیار'' میں

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے نقل کر کے فرماتے ہیں(۱) کہ:

''اس سب مضمون سے ثابت ہوا کہ جو شخص دونوں علم کا عالم نہیں اس سے بیعت کرنا اور اس کو خلافت دینا درست نہیں ہے...... بلکہ جس شخص نے ایسے جاہل سے بیعت کیا ہے اس پر واجب ہے کہ اس کی بیعت سے توبہ کرے اور اس شخص سے کنارہ کشی کرے، فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ اعراف میں ''و أعرض عن الجاهلين'' (اور کنارہ کر جاہلوں سے)۔

الغرض مسلمانوں پر واجب ہے کہ جو شخص کہ مرشدی کا دعویٰ کرتا ہو یا کسی مرشد کی گدی پر بیٹھا ہو، اس کے عقیدہ وعلم اور مذہب کی خوب تحقیق کرلیں اور یہ بات بھی دریافت کرلیں کہ رتبہ مشیخت کا اس کو حاصل ہے یا نہیں، یہ بات دریافت نہ کر کے مرید ہونے سے بڑی بڑی خرابی ہوتی ہے اور اگر کسی مرشد سے وعدہ کر چکا ہے کہ ہم آپ سے بیعت کریں گے اور اس شخص میں علم احکام اور علم اسرار اور رتبہ مشیخت نہ پایا تو اس سے بیعت نہ کرے کیونکہ خلاف شرع کام کا وعدہ کیا تو اس کو وفا کرنا درست نہیں۔''(۱)

شیخ المشائخ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی تصنیف ''القول الجمیل'' (مترجم بنام ''شفاء العلیل'' از مولانا خرم علی بلہوریؒ) میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے یہاں اس میں اس قدر احتیاط تھی کہ اپنے مسترشدین میں رتبہ کمال کو پہنچے ایک مرید کو صرف اس لیے اجازت بیعت وارشاد نہ دی کہ وہ سب کچھ تھے مگر عالم نہ تھے اور جب حلقہ ارادت کے علماء کو یہ سبب معلوم ہوا تو ان میں ایک باکمال شیخ فخر الدین زرادی نے یہ تہیہ کیا کہ جلد ہی انھیں عالم متبحر بنادیں گے جب ایسا ہو گیا تو پھر سلطان الاولیاء نے انھیں اجازت وخلافت سے سرفراز کیا۔ (ملاحظہ ہو: سیر الاولیاء، اخبار الاخبار، تاریخ دعوت وعزیمت حصہ سوم وغیرہ)۔

(۲) القول الثابت ص/۳۱-۳۲ مطبوعہ مطبع محمدی سیالدہ کلکتہ ۱۲۹۲ھ

''بیعت لینے والے میں یعنی پیر اور مرشد میں چند امور شرط ہیں:

شرط اول: علم قرآن اور حدیث کا، اور میری یہ مراد نہیں کہ پلے سرے کا مرتبہ علم کا مشروط ہے بلکہ قرآن میں اتنا علم ہونا کافی ہے کہ تفسیر مدارک یا جلالین کو یا سوا ان کے مانند تفسیر وسیط یا وجیز واحدی کے محفوظ کر چکا ہو اور کسی عالم سے اس کی تحقیق کر لیا ہو، اور اس کے معانی اور ترجمۂ لغات مشکلہ کو اور شان نزول اور اعراب قرآنی اور قصص اور جو اس کے قریب ہے اس کو جان چکا ہو، اور اس کی شرح غریب یعنی لغات مشکلہ کا ترجمہ اور اعراب مشکل اور تاویل معضل کی بنا پر رائے فقہائے دین کی معلوم کر چکا ہو۔

اور عالم ہونا مرشد کا تو ہم نے اس واسطے شرط کیا ہے کہ غرض بیعت سے مرید کو امر کرنا ہے مشروعات کا اور روکنا اس کو خلاف شرع سے اور اس کی رہنمائی طرف تسکین باطنی کے اور دور کرنا بدخوؤں کا اور حاصل کرنا صفات حمیدہ کا پھر مرید کا عمل میں لانا اس کو جمیع امور مذکور میں سو جو شخص عالم اور واقف ان امور سے نہ ہوگا اس سے یہ کیونکر متصور ہوگا۔''(۱)

(ف) مترجم کہتا ہے: سبحان اللہ! کیا معاملہ بالعکس ہو گیا ہے، فقرائے جہاں کو اس وقت میں یہ خبط سمایا ہے کہ پیری مریدی میں علم کا ہونا کچھ ضرور نہیں، بلکہ علم درویشی کو مضر ہے، اس واسطے کی شریعت کچھ اور ہے اور طریقت کچھ اور، حالانکہ صوفیانِ قدیم کی کتب اور ملفوظات میں مثل ''قوت القلوب'' اور ''عوارف

---

(۱) شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص/۱۳

المعارف" اور "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" اور "فتوح الغیب" اور "غنیۃ الطالبین" تصنیف حضرت عبدالقادر جیلانی میں صاف مصرح ہے کہ علم شریعت شرط ہے طریقت اور تصوف کی، یہ بھی جہالت کی شامت ہے کہ جن مرشدوں کا نام صبح شام مثل قرآن اور درود کے ذکر کیا کرتے ہیں ان کے کلام سے بھی غافل ہیں کہ وہ کیا فرما گئے۔(۱)

"اور تیسری شرط بیعت لینے والے کی یہ ہے کہ دنیا کا تارک ہو۔"(۲)

(یعنی نذرانے اور ہدایا وصول کرنے کے لیے دورے نہ کرتا ہو، ہدیے اس قدر نہ لے کہ لوگوں کو حیرانی ہو کہ اتنا سامان کس طرح جائے گا)۔

"اور پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشدین کامل کی صحبت میں رہا ہو اور ان سے ادب سیکھا ہو زمانہ دراز تک، اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو۔"(۳)

---

(۱) شفاء العلیل ترجمہ القول الجمیل ص/۱۵۔

(۲) ایضاً ص/۱۶ (۳) ایضاً ص/۱۷، مستفاد از ماہنامہ الفرقان لکھنؤ (اپریل ۱۹۷۹ء)

باب دوم
سید الاولین والآخرین
حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

انسان کی تخلیق

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً﴾ (۱)

یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خطاب سارے ہی انسانوں سے، پوری نسل آدم وحوا سے ہے، اس میں عرب بھی ہیں عجم بھی، نبی ورسول بھی ہیں اور اولیاء واقطاب بھی، اچھے بھی ہیں اور برے بھی، مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی، کالے بھی ہیں اور گورے بھی، اور رب ذوالجلال والاکرام کا پاس ولحاظ رکھنے کو کہا جارہا ہے یہ یاد دلا کر کہ وہی جس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی ایک جان سے جو پوری نسل انسانی کی مورث ہے، اس کا زوج (جوڑا) پیدا کیا، اور انہی دونوں سے یہ بہت سارے مرد اور عورتیں زمین میں پھیلا دئے۔

---

(۱) سورۂ نساء/۱

یہ نفس واحدہ سیدنا آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں، اوران کی زوج حضرت حوا ہیں، جنھیں اللہ نے پہلے جنت میں رکھا، اور پھر ایک نظام کے تحت انہیں دنیا میں بسایا، اورنسل آدم میں اچھے بھی پیدا کیے اور بُرے بھی، اچھوں پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ بُروں کو صحیح راستہ دکھائیں، چنانچہ انہی اچھوں میں اللہ تعالیٰ کچھ ایسی صلاحیت کے افراد بھی پیدا کرتا رہا جو تعلیم وتربیت اور تزکیہ اور ارشاد وہدایت کا کام زیادہ مؤثر اور پرکشش انداز میں کرسکیں اور مشکل حالات کا سامنا کرنے میں وہ دشواری نہ محسوس کریں، ان ہی میں سے اللہ تعالیٰ نبی اور رسولوں کا انتخاب واصطفا فرماتا رہا، اور ان تک پیغام حق کی رسائی کے لئے فرشتوں میں سے بھی انتخاب فرماتا رہا، خود اللہ نے اپنی اصطفائی سنت کا اظہار یوں فرمادیا ہے کہ:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾(۱)

(اللہ تعالیٰ فرشتوں اورانسانوں میں سے رسولوں کومنتخب کرتا ہے)۔

حضرت آدمؑ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ سارے ہی رسول ونبی خاندانی طور پرانہی کی طرف منسوب ہیں اور سبھی کی خاندانی نسبت آدمی ہے، مردوں کے لیے ابن آدم اور خواتین کے لیے بنت حوا کا محاورہ ان کو یہ نسبت یاددلاتا ہے۔

پھر حضرت نوحؑ کو یہ شرف حاصل ہوا اورانہیں آدم ثانی کہا گیا، ان کے بیٹوں میں سام زیادہ برکت والے ثابت ہوئے اوران کی طرف انبیاء اور رسولوں کو انتساب حاصل ہوا، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط علیہم السلام کوزیادہ شہرت حاصل ہوئی اس لیے کہ ان کی قوموں کا قرآن مجید میں زیادہ تذکرہ آیا ہے، حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا زمانہ ایک ہے۔

مورث اعلیٰ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کوابوالانبیاء کا خطاب

(۱) سورۂ حج/۷۵

ملا، اکثر نبی ان کے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں ہوئے، لیکن تمام نبیوں کے سردار اور تمام ہی رسولوں کے امام اور پوری نسل انسانی کے سردار سیدنا خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حضرت اسماعیل علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل میں ہوئے۔

آپ کے لئے اللہ ذوالجلال والاکرام نے غیر معمولی اہتمام کرایا، اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خصوصیت سے دعا کرائی، انہوں نے جو دعا کی اس میں ان عظیم مقاصد کا واسطہ دیا جس کی پوری انسانیت شدید محتاج تھی، وہ دعا یہ تھی:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ (۱)

(اے ہمارے رب ان میں ان کی ہی قوم کا ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے، بلاشبہ تو زبردست حکمت والا ہے)۔

اللہ نے دعا قبول فرمائی اور آپ کی ولادت سے قبل ہی پچھلی امتوں کو دعا کی قبولیت اور خوشخبری کی اطلاع دی (۲)، اسی لئے آپ کی ولادت باسعادت کے ہوتے ہی دنیا جگمگا اٹھی اور پورے عالم میں ہلچل مچ گئی، اور جب آپ حمل میں تھے تو آپ کی والدہ ماجدہ بی بی آمنہ نے خواب دیکھا جسے انھوں نے دائی حضرت حلیمہ سعدیہ سے اس وقت بیان فرمایا جب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ ماجدہ کے سپرد کرنے آئی تھیں:

---

(۱) سورۂ بقرہ/۱۲۹۔

(۲) چنانچہ پچھلی امتوں کی کتابوں میں اس کے واضح اشارے موجود ہیں، اور قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بات یوں نقل کردی گئی ہے: ﴿ياتي من بعدي اسمه أحمد﴾ (جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا)۔

"قالت: رأيت حين حملت به أنه خرج مني نور أضاء لي قصور بصرى من أرض الشام، ثم حملت به، فو الله ما رأيت من حمل قط كان أخف عليّ ولا أيسر منه، ووقع حين ولدته وإنه لواضع يديه بالأرض رافع رأسه إلى السماء، دعيه عنك وانطقي راشدة."(۱)

(وہ فرماتی ہیں کہ جب مجھے اس بچے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کا استقرار حمل ہوا تو میرے اندر سے ایک روشنی ظاہر ہوئی، جس نے سرزمین شام میں بصریٰ کے محلات کو میرے سامنے روشن کردیا، پھر جب میں حمل سے رہی تو اللہ کی قسم میں نے اس حمل سے زیادہ ہلکا اور آسان کبھی کوئی حمل نہیں دیکھا اور یہ واقعہ بھی ہوا کہ جب ان کی ولادت ہوئی تو وہ اپنے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے ہوئے تھے اور اپنا سر آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے۔ خیر تم ان کا قصہ چھوڑو اور خیر وخوبی کے ساتھ واپس جاؤ)۔

نسب شریف

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اللہ نے ان کی جان قربان کیے جانے کا جو امتحان لیا تھا اس امتحان میں وہ کھرے اترے تھے، اور اس کے صلہ میں اللہ نے نہ صرف ان کے اس عمل کو ہمیشہ کے لیے یادگار بنادیا ہے اور اس کو حج کا حصہ بنا کر عبادت بھی قرار دے دیا، سلسلۂ نسب کی حفاظت کی شہادت کے لئے قرآن مجید سے بڑھ کر اور کس کی شہادت ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا، صحیح مسلم میں ہے:

"عن واثلة بن الاسقع أنه قال: سمعت رسول الله صلى

---

(۱) ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام جلد اول ص/۱۶۲

اللّٰہ علیہ وسلم یقول: إن اللّٰہ اصطفی کنانة من ولد إسماعیل، واصطفی قریشا من کنانة، واصطفی من قریش بنی ھاشم، واصطفانی من بنی ھاشم."(۱)

(حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیلؑ میں کنانہ کو منتخب کیا اور کنانہ کی اولاد میں سے قریش کو منتخب کیا اور قریش میں بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی ہاشم میں میرا انتخاب فرمایا)۔

حضرت اسماعیلؑ کی اولاد در اولاد میں عدنان کی شخصیت زیادہ معروف ہوئی، نام کی تعیین کے ساتھ بلا اختلاف و بلا نزاع ان تک سلسلۂ نسب پہونچتا ہے۔

ظہور قدسی

شہرۂ آفاق سیرت نگار و مؤرخ اسلام علامہ شبلی نعمانیؒ نے جن الفاظ میں تصویر کشی کی ہے تمام زبانوں کے ادب کا بہترین شاہکار ہے، وہ لکھتے ہیں:

''عالم قدس کے انفاس پاک، توحید ابراہیمؑ، جمال یوسفؑ، معجزہ طرازئ موسیٰؑ، جاں نوازئ مسیحؑ سب اسی لیے تھے کہ یہ متاع ہائے گراں اور شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں کام آئیں گے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا، چمنستان سعادت میں بہار آگئی، آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں، اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیم عبد اللہ، جگر گوشہ آمنہ، شاہ حرم، حکمران عرب، فرماں

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتسلیم الحجر علیہ قبل النبوۃ۔

ردائے عالم، شہنشاہ کونین ...... عالم قدس سے عالم امکان میں
تشریف فرمائے عزت واجلال ہوا۔

﴿اللهم صلّ عليه وعلىٰ آله وأصحابه وسلم﴾

تاریخ ولادت کے متعلق مشہور ہیئت دان عالم محمود شاہ فلکی نے
ایک رسالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے دلائل ریاضی سے ثابت
کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۹/ربیع الاول روز
دوشنبہ مطابق ۲۰/اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی تھی۔"(۱)

اس کی وضاحت علامہ شبلی علیہ الرحمہ کے جانشین علامہ سید سلیمان ندویؒ
اپنے توضیحی حاشیہ میں اس طرح کرتے ہیں:

"محمود فلکی نے جو استدلال کیا ہے وہ کئی صفحوں میں آیا ہے، اس کا
خلاصہ یہ ہے:

☆ صحیح بخاری میں ہے کہ ابراہیمؑ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے صغیر السن صاحبزادے) کے انتقال کے وقت آفتاب میں
گہن لگا تھا اور ۱۰ھ تھا (اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی
عمر کا تریسٹھواں سال تھا)۔(۲)

☆ ریاضی کے قاعدے سے حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے
کہ (۱۰ھ) کا گرہن ۷/جنوری ۶۳۲ء کو ۸/بج کے ۳۰/منٹ پر
لگا تھا۔

☆ اس حساب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قمری ۶۳/برس
پیچھے ہٹیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کا سال ۵۷۱ء ہے،

---

(۱) سیرۃ النبی جلد اول طبع جدید دار المصنفین اعظم گڑھ ص/۱۲۰
(۲) صحیح بخاری، ابواب الکسوف باب الصلوۃ فی کسوف الشمس ۱/۱۴۲

جس میں از روئے قواعد ہیئت ربیع الاول کی پہلی تاریخ ۱۲؍اپریل ۵۷۱ء کے مطابق تھی۔

☆ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن اس قدر متفق علیہ ہے کہ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن تھا اور تاریخ ۸؍ سے لے کر ۱۲؍ تک منحصر ہے۔

☆ ربیع الاول مذکور کی ان تاریخوں میں دوشنبہ کا دن نویں تاریخ کو پڑتا ہے، ان وجوہ کی بنا پر تاریخ ولادت قطعاً ۲۰؍اپریل ۵۷۱ء تھی۔(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ''محمد'' رکھا گیا اور عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ عبدالمطلب نے یہ نام رکھا، سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی والدہ نے اور دو تین روز کے بعد حضرت ثوبیہ نے دودھ پلایا (جو ابولہب کی باندی تھیں)، حضرت ثوبیہ کے بعد حضرت حلیمہ سعدیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دودھ پلایا۔''(۲)

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا بعد میں مشرف بہ اسلام ہوئیں البتہ حضرت ثوبیہ کے قبول اسلام سے متعلق مؤرخین کا اختلاف ہے، صرف ابن مندہ نے ان کے اسلام کا تذکرہ کیا ہے، ان ہی کے رشتہ سے حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں رضائی بھائی بھی ہو جاتے ہیں، اس پر سیرت نگاروں کا اتفاق ہے۔''(۳)

(۱) سیرۃ النبی جلد اول طبع جدید دارالمصنفین اعظم گڑھ ص/۱۲۱
(۲) سیرۃ النبی جلد اول طبع جدید دارالمصنفین اعظم گڑھ ص/۱۲۱
(۳) اسد الغابہ ابن الاثیر ۷/۴۷

حوادث اور آزمائشیں

جہاں تک حوادث و آزمائشوں کا تعلق ہے تو دنیا میں آتے ہی ان سے سابقہ پڑا، قبل از ولادت باسعادت والد عبداللہ بن عبدالمطلب وفات پا چکے تھے، رضاعت کے ایام میں جب کہ آپؐ طائف میں بنوسعد میں تھے کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ جو آپ کے مستقبل کی تابناکی کا اشارہ دے رہے تھے، لیکن دائی حضرت حلیمہ سعدیہ اس کی ظاہری شکل کو عام طور وطریقہ سے ہٹ کر ہونے کی وجہ سے گھبرا گئیں اور آپ کو آپ کی والدہ کے سپرد کرنے پہونچ گئیں، گو حضرت آمنہ نے ان کو اطمینان دلانا چاہا مگر ان کی فکرمندی برقرار رہی، بالآخر یہ کہہ کر انہیں رخصت کیا:

"تم چھوڑو ان کو اور خوشی خوشی واپس جاؤ" (۱)

ایام طفولت میں سخت ترین آزمائش یہ پیش آئی کہ چھ برس کی عمر تھی، والدہ ماجدہ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے سفر پر تھے، یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا کی نانہال تھی، بڑا امکان اس بات کا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس جمال وکمال کے ساتھ دنیا میں آئے، اس کا صرف مکہ میں ہی چرچا نہ تھا دور دور شہرہ ہو چکا تھا، آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے کے لئے اقرباء نے اپنے یہاں بلایا ہوگا، کئی مہینہ رہ کر واپس ہو رہے تھے کہ مکہ مدینہ کی درمیانی بستی "ابواء" میں بی بی حضرت آمنہ بیمار پڑیں اور انتقال کر گئیں اور وہیں تدفین بھی ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کم سنی، والد کی محرومی کا احساس کیا کم تھا کہ والدہ کے فراق کے صدمہ سے بھی گزر گئے، ایک خاتون ام ایمن رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، انھوں نے دیکھ بھال کی اور مکہ مکرمہ دادا کی خدمت میں بخیریت پہونچایا، دادا عبدالمطلب کی شفقتوں کی انتہا نہ رہی، لیکن دوسال بعد مہربان وشفیق دادا نے بھی داغ مفارقت دے دیا، اس طرح تقدیر نے آپ کو شروع سے ہی سخت حالات کا مقابلہ کرنے کا عادی بنا دیا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام جلد اول ۱۶۴ سے ۱۶۵

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا تجزیہ ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

''اللہ رب العالمین کو اپنے اس آخری مقرر کردہ نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا عظیم بوجھ ڈالنا تھا جو عام انسان کے بس میں نہیں ہوسکتا، لہٰذا آپ کے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور بلند صفات کا حامل پیدائش کے ہی وقت سے بنایا تھا، پھر اس کے لئے خاص طور پر آپ کو زندگی کے متنوع اور سخت ترین نشیب و فراز سے گزارا، جو انسان میں مختلف حالات کو جھیلنے اور عزم و ہمت سے مناسب راہ نکالنے کے لئے معاون ہوسکے، اولاً آپ کا سابقہ یتیمی کی بے چارگی سے کرایا گیا، پیدا ہونے کے بعد آپ جب ابتدائی شعور کی عمر میں داخل ہوئے تو آپ نے دیکھا کہ آپ کو سایۂ پدری حاصل نہیں، آپ چھ سال کی عمر کو پہونچے تھے کہ سایۂ مادری بھی اُٹھ گیا، جب کہ آپ کے اردگرد سینکڑوں آپ کے ہم سنوں کو ماں باپ کا سایہ حاصل تھا، یہ بات ایک معصوم اور صغیر السن بچہ کے قلب و ذہن کے لئے عموماً ایک سخت ذہنی بے چارگی اور شکستہ دلی کا باعث ہوا کرتی ہے، چھ سال کی عمر میں سایہ مادری بھی اٹھ جانے کے بعد شفقت کرنے کے لئے دادا تھے، وہ بھی آٹھ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے، ان محرومیوں کو کوئی بچہ عموماً بحسن وخوبی نہیں جھیل پاتا، اور اس کی زندگی کی راہ پیچیدہ ہوجاتی ہے، اور زندگی میں اس کی کامیابی مبہم ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن اگر اس بوجھ کو خداداد ہمت سے وہ جھیل لے تو اس کی شخصیت میں مشکل حالات کو جھیلنے اور اس میں ضرورت اور پسند

کی راہ نکالنے کی خاصی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہمت خصوصی طور پر عطا فرمائی جس کی بنا پر آپ میں حالات اور واقعات کے تقاضوں کو مناسب ڈھنگ سے محسوس کرنے اور زندگی کے چیلنجوں کا مناسب ڈھنگ سے مقابلہ کرنے کی سمجھ اور ہمت پیدا ہوئی، اور جلد ہی آپ نے باعزت زندگی کی باغیرت اور سیر چشمی کی راہ اختیار کی اور زندگی کو مشکل حالات کے باوجود عزت نفس اور عالی ہمتی سے آراستہ فرمایا، چنانچہ آپ فکر و شعور کی عمر میں داخل ہونے کے وقت ہی سے اپنے اردگرد کے ماحول کی بے راہ روی کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔" (۱)

انسانی ہمدردی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن حالات سے گزرے ان سے آپؐ کے اندر ملاطفت و مؤانست، ہمدردی، انسانیت نوازی کا جذبہ خصوصیت سے ابھرا، اور اس میں آپ نے اپنے اور پرائے کا فرق نہیں رکھا، مظلوم کی مدد آپ کے پیش نظر رہی، حلف الفضول کا واقعہ اس کے لئے روشن دلیل ہے کہ ایک غریب اور باہری شخص کے حق کی ادائیگی میں ایک معزز شخص عاص بن وائل کی طرف سے زیادتی ہو رہی تھی، تو خاندان کے چند معزز حضرات نے حقداروں کے حق دلانے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل کی، آپ اس میں بھی شریک ہوئے اور جب بھی خاندان یا شہر کے جائز معاملات میں کچھ کرنے کی ضرورت پڑی آپ نے شرکت فرمائی، آپ کی دیانت و امانت کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو اتنا اعتبار ہو گیا تھا کہ لوگ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے اور اعتماد کرتے۔

(۱) رہبر انسانیت/۱۱۲-۱۱۳، دار الرشید لکھنؤ

دوسروں کی حاجت براری، تعاون وہمدردی، مصیبت زدوں کے کام آنا آپ کا اسوۂ حسنہ تھا اور جب پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ نے اس کا بار محسوس کرتے ہوئے "لقد خشیتُ علیٰ نفسی" کہا تو ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے آپ کو آپ کی ان صفات اور اسوۂ حسنہ کا حوالہ دے کر تسلی دی تھی اور اطمینان دلایا تھا، اور کہا تھا کہ:

"کلّا واللّٰہ ما یخزیک اللّٰہ ابداً، انک لتصل الرحم، وتحمل الکل، وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق." (۱)

(ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! کسی بھی صورت میں اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بے روزگاروں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، لوگوں کو ان کا حق دلانے میں مدد کرتے ہیں)۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات اور آپ کے طرز عمل وطریقۂ کار اور لوگوں کے ساتھ معاملات میں دکھ درد میں ہاتھ بٹانا ترجیحی امر ہوتا تھا، چناں چہ غریبوں، یتیموں، بے کسوں اور بے سہاروں کی مدد کے لئے آپ آگے بڑھنے والے ہوتے اور ظالموں کا ہاتھ روکنے والوں میں پیش قدمی کرنے والے ہوتے، حالی نے بہت خوب کہا ہے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی.

عجیب اتفاق ہے کہ جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بعثت نبوی کے بعد حالات سے مجبور ہو کر وطن چھوڑ کر جانے لگے تو ابن الدغنہ نے ان کو انہی صفات کے حوالہ سے روکا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شروع سے اپنی مرضی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی اور طریقہ کے آگے فنا کر چکے تھے۔

تجارت ومعیشت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی افتادِ طبع نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی پر بوجھ نہیں بننے دیا، آغاز شباب سے ہی اپنی آمدنی کے ذرائع خود پیدا کر لئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنوسعد میں تھے تو رضاعی بھائیوں کے ساتھ بکری چرانے میں شرکت کی تھی، چنانچہ آپ کا یہ بکری چرانا بعد میں آپ کے کام بھی آیا، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ لکھتے ہیں:

''جب کہ آپ کچھ بڑے ہوئے اور ضرورت محسوس کی کہ آپ مکہ کے بعض لوگوں کی بکریاں اجرت پر چرائیں، اس وقت آپ کی عمر ۱۰ رسال کی بتائی گئی ہے، وہاں کے ماحول میں کم عمروں کے لئے بکریاں چرانا معاشرہ میں بُرا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا، اور خاص طور پر جب کہ اس سے اقتصادی ضرورت پوری ہوتی ہو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طرح اپنی اقتصادی ضرورت پوری کی، آپ کے چچا ابوطالب جو آپ کے دادا کے بعد آپ کے سرپرست ہوئے تھے، اقتصادی لحاظ سے کوئی خوش حالی نہیں رکھتے تھے، اور یہ بکریاں چرانا ایسا عمل بھی نہ تھا جو صرف آپ ہی کی حیات طیبہ میں ملتا ہو بلکہ متعدد سابق نبیوں میں بھی یہ سلسلہ رہا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اجرت پر بکریاں چرائی تھیں، اور شاید یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکمت کے طور پر کرایا جاتا ہوگا، کیوں کہ بکریاں ایسی جانور ہیں جو مل جل کر کم رہتی ہیں، ادھر اُدھر بھاگتی ہیں، ان کو اکٹھا رکھنا، اور ایک طرف چلانا یہ انسانی افراد کی قیادت کرنے اور ان کو ایک

رُخ پر چلنے کی مشق کرانے کا بھی مزاج بنا سکتا ہے، جس کی ضرورت نبیوں کو پیش آئی ہیں۔"(۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا نکاح -اسلام کی خاتون اول حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے

امانت داری، صداقت، راست بازی، وفاجوئی، ذہانت، چوکسی یہ ساری وہ صفات تھیں جن سے قریشی معاشرہ آپ کو افضل و برتر جاننے لگا تھا، اور عرب معاشرہ نے آپ کو الصادق الامین کا لقب دے دیا تھا، ایک معزز خاندان کی دولتمند خاتون حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اپنی صفات وخصوصیات میں ممتاز وفائق خاتون تھیں، وہ اپنا مال تجارت میں لگا کر باہر سے سامان تجارت منگواتیں، بیوہ ہوجانے پر مشکلات سے دوچار ہوئیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق و امانت کی شہرت سن چکی تھیں بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد کی فرمائش کر ہی ڈالی، اپنا غلام ساتھ کیا، اور آپ کو امین بنایا، بڑے نفع کی تجارت کے ساتھ واپسی ہوئی اور غلام نے منھ بھر بھر آپؐ کی تعریف وتوصیف بیان کی، حضرت خدیجۃ الکبریٰ عقل وفراست اور عزت و وجاہت اور شہرت والی بیوہ خاتون تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ سال بڑی تھیں، انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا ارادہ ظاہر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی کے بعد دونوں خاندانوں کی موجودگی میں ایک باوقار تقریب میں چچا ابو طالب بن عبدالمطلب نے نکاح پڑھایا، اور اس طرح ایک نمونہ کا گھر بسا، پھر کیا تھا ہر معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نہایت تقویت ملی، اور دلی راحت وسکون نصیب ہوا، اولاد بھی ہوئی، تین صاحبزادگان (طیب، قاسم، ابراہیم رضی اللہ عنہم) اور چار صاحبزادیاں (سیدہ زینب، سیدہ رقیہ، سیدہ ام کلثوم، سیدہ فاطمہ

(۱) محسن انسانیت/۱۰۴-۱۰۵

زہراء رضی اللہ عنہن) مگر اولاد نرینہ زندہ نہ رہی، مزید صاحبزادیاں بھی یکے بعد دیگرے آپ کے دنیا میں رہتے ہوئے رخصت ہوئیں، صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں جو بعد از وفات چند ماہ حیات رہیں اور انہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل چلی۔

امام ذہبی لکھتے ہیں:

”وقد انقطع نسب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم إلا من قبل فاطمۃ رضی اللّٰہ عنہا.“(۱)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب شریف صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے چلا ہے)۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے ہی اپنے غلام حضرت زید بن حارثہؓ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت کیا، جو آپ کے بڑے معاون بنے، اور سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والوں میں ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کر کے اپنا رفیق بنالیا تھا، عرب معاشرہ میں متبنیٰ سمجھا جانے لگا تھا، لیکن قرآن مجید نے اس غلط فہمی کی تصحیح کی، اور یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَمَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ﴾(۲)

(محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم میں سے کسی شخص کے باپ نہیں ہیں وہ تو اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں)

وحی و نبوت اور بعثت سے قبل سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آپ کو ہر معاملہ میں بڑی تقویت ملتی رہی تھی، وحی اور نبوت اور اعلان رسالت کے بعد تو انہوں نے دینی و ایمانی بنیاد پر بھی حد درجہ تقویت پہونچائی، حتیٰ کہ دوسروں کی

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲/۱۲۲ (۲) سورۂ احزاب/۴۰

ایذا رسانی سے بھی حفاظت کا ذریعہ بنتی رہیں، اور جب قریش کی عداوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور شعب ابی طالب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے افراد خاندان اور صحابہ چچا ابوطالب کے ساتھ پہاڑ کے ایک درّے میں جہاں خاندان ابوطالب رہا کرتا تھا، محصور ہوئے، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہ صعوبت اُٹھائی، طلح کے پتے کھا کھا کر گزر ہو رہا تھا، حضرت سعد بن ابی وقاص نے سوکھا چمڑا ہاتھ لگ جانے پر بھوننے اور پانی ملا کر کھانے کا اپنا واقعہ ذکر کیا ہے، ایک دن باہر سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے حکیم بن حزام نے تھوڑا گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو بھیجا، اس پر ابوجہل نے ڈاکہ ڈالنا چاہا، مگر کسی رحم دل کے حائل ہوجانے سے ناکام رہا، تین سال اس طرح گزرے۔

نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بہت متاثر ہوا، پھر یہ کہ اسی سال چچا ابوطالب نے بھی رحلت کی، جن کی حمایت، دفاع اور ہمدردی کا معاملہ مشہور ہے، یہ دونوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقویت اور دین کی نصرت کا بڑا ذریعہ تھے، اوران کا آپ کے ساتھ حسن سلوک، حسن صحبت، وفاداری اور حمایت ودفاع کا معاملہ ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور بھی نکاح کیے، لیکن حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی موجودگی میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تجارتی معاملہ وکاروباری اشتراک رہا، یہ خصوصیت اور جگہ نظر نہیں آتی، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہوئی اور اس توسط سے آج جو نسل دنیا میں پائی جاتی ہے اسی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نسلی انتساب حاصل ہے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے ان کا ذکر کرتے اوران کی سہیلیوں اور رشتہ داروں کو جب بکری ذبح فرماتے تو اس کا کچھ حصہ بھیجتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کو وقت دیتے اور ان کی دلجوئی فرماتے، گھر کے بچوں کو محبت دیتے، اور ان کو مانوس کرتے، اور حدود کے اندر ان کی خواہشات کا خیال کرتے، گھر کے بچے بھی آپ ؐ سے اس درجہ مانوس اور محبت کرنے والے تھے کہ معمولی پریشانی بھی دیکھ کر بے قرار ہو جاتے، گھر کے افراد کی تکلیف میں ہاتھ بٹانے کا جذبہ اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ چچا ابو طالب کی پریشانی دیکھ کر ان کے ایک صاحبزادے (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) کو اپنی کفالت میں لے لیا، وہ اس وقت پانچ برس کے تھے اور آپ ؐ سے ۳۰ برس چھوٹے۔

بعثت ورسالت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ مبارکہ شروع سے ہی غیر معقول باتوں اور لایعنی امور سے خالی نظر آتی ہے، خدمت خلق کا جذبہ اور بھلی و معقول باتوں اور مفید امور میں مشغولیت کے ساتھ آپ نے نبوت سے قبل کے ایام گزارے اور کسی پر بار بننے کے بجائے تجارت وکاروبار کو سچائی وامانت داری کا لباس پہنایا، اور انہی لوگوں سے آپ کو زیادہ قرب ومؤانست رہی جو ان صفات میں آپ سے قریب تھے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رفاقت آپ کو پسند تھی، اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام ہی لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے، چنانچہ نبوت کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے وہ ہوئے، معراج کے واقعہ کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے وہ ہوئے، ہجرت کی بات پر فوری طور پر لبیک کہنے والے وہ ہوئے، اور پھر آپ کی وفات کے سانحۂ عظیم کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والے اور لوگوں کو ثابت قدم رکھنے والے بھی وہ ہی تھے۔

بعثت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ایسے خواب نظر آنے شروع ہوئے تھے جو اپنی پوری صحیح تعبیر کے ساتھ حقیقت بن کر سامنے آئے، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بشارت تھی اور تسکین قلب کا سامان بھی، اس کا ایک اثر یہ بھی پڑا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خلوت وعزلت زیادہ محبوب ہونے لگی، اور لوگوں کے اختلاط اور مجلسی ماحول سے اندر سے وحشت ہونے لگی، چنانچہ غار حرا تشریف لے جاتے، وہاں اللہ رب العالمین سے دعا مناجات کرتے، ذکر وعبادت میں مصروف ہوتے اور

اس طرح کئی کئی دن گزر جاتے (۱)

گو مکہ کا ماحول بت پرستی کا تھا لیکن آپ کو اس ماحول کو بدلنا تھا، خود کیسے اس کے قریب جاسکتے تھے، اس سے طبعاً گھن محسوس فرماتے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی صحیح بخاری میں روایت ہے، وہ فرماتی ہیں:

"أول مابدئ به رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم من الوحي الرؤيا الصالحة في النوم فكان لايرى إلا جاء ت مثل فلق الصبح، ثم حبب إليه الخلاء وكان يخلو بغار حراء فيتحنث فيه - وهو التعبد - الليالي ذوات العدد قبل أن ينزع إلى أهله ويتزود لذلك ثم يرجع إلى خديجة فيتزود لمثلها حتى جاء ه الحق، وهو في غار حراء." (۲)

(وحی کی شروعات رؤیائے صادقہ کے ذریعہ ہوئی، جو خواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے وہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا، پھر خلوت کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا میلان ہوگیا اور غار حراء میں خلوت کی یہ ساعتیں آپ گزارنے جاتے اور یکسو ہوکر عبادت کرتے، کئی کئی راتیں گزار کر گھر تشریف لاتے، اور کھانا

(۱) بحیثیت خاتم النبیین کے پوری انسانیت کی ہدایت وارشاد، تعلیم وتبلیغ کا بار آپ پر آنا تھا، اس بار کے تحمل کی پہلے سے قدرۃً تیاری شروع کرادی گئی، وہ مناجات اور ذکر وعبادات کے اعمال اس سلسلہ میں معین ہوتے ہیں، آپ کی امت میں آپ کے جو نائبین ہوئے انہیں بھی اس سنت سے گزرنا پڑا، اس کی مثالیں تاریخ میں بھری پڑی ہیں، اور غالباً بعض عارفین نے اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ ابتدا میں ذکر وخلوت کو اختیار کرنا چاہیے، پھر دوسری طاعات میں لگنا چاہیے، کہ اس سے اخلاص، تعلق مع اللہ میں پہلے مضبوطی آتی ہے، پھر دوسرے اعمال میں اس کی جلوہ گری ہوتی ہے، ایک بار راقم نے یہ بات اپنے مربی ومرشد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس اللہ سرہ العزیز کے سامنے عرض کی تو آپ نے تائید فرمائی اور فرمایا: صحیح لکھا ہے۔

(۲) صحيح البخاري، كتاب الوحي، باب كيف كان بدء الوحي.

وغیرہ ساتھ لے جاتے، پھر جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس تشریف لاتے تو وہ پھر کھانا وغیرہ تیار کر دیتیں، یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء میں ہی تشریف فرما تھے)۔

نبوت وبعثت

انسانیت ہلاکت وبربادی کے دہانے پر کھڑی تھی، طاقتور کمزور کو دبا رہا تھا، بلکہ کچل رہا تھا، عزت پر بٹہ نہ لگے اس کی خاطر ننھی منی بچیوں کو بغیر موت کے مارا جا رہا تھا، معمولی معمولی باتوں پر سالوں برسوں جھڑپیں جاری رہتیں، جگہ جگہ اپنے ہاتھوں سے بنائے مجسموں اور پتھروں کو معبود گڑھ لیا گیا تھا، یہاں تک کہ ہر ہر قبیلے اور پھر ہر قبیلے کی شاخوں نے الگ الگ معبود بنا رکھے تھے، صرف کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھ چھوڑے تھے، ایسے حالات میں جب زمین انسانوں سے تنگ آ چکی تھی، اور انسانیت انسانوں سے مایوس ہو چکی تھی، انسانیت کی صبح صادق غار حراء سے ہی طلوع ہوئی، شروع ہوئی رسالت کے ابدی مشن کے ساتھ، نبوت کے دائمی اثرات کے ساتھ، آفتاب نبوت کی چہار جانب کرنوں کے ساتھ طلوع ہوئی اور اسی پر نبوت اختتام کو پہنچی اور ایسی لازوال ٹھہری کہ اس کا پیغام تا قیامت، اس کے معجزات ابدی، اس کا مشن لامحدود اور اس کی نشانیاں لافانی، صلى الله على صاحبها ألف ألف تحية وسلام.

اسی کی برکت بلکہ نبوت کا معجزہ یہ بھی ہے کہ امت پر سخت سے سخت حالات آئے مگر اس کے افراد کوہ استقامت بن کر سامنے رہے، ایسی ہی استقامتوں نے بڑے بڑے ملکوں، بڑی بڑی سلطنتوں پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا، نہ روم بچا، نہ شام بچا، نہ ایران وعراق، نہ خراسان وترکستان بچنے پائے، قسطنطنیہ کی بھی باری آئی، ہند وسندھ بھی سلام کر بیٹھے، افریقہ کے جنگلات بھی جھک گئے، بربر اور تاتاریوں نے بھی سر تسلیم خم کیا، جب کہ وہ ایسی قومیں تھیں جو کسی بھی حال میں سر تسلیم خم کرنا نہیں جانتی

تھیں، اندلس پر صدیوں حکمرانی رہی، خلافت اسلامی کی شان وشوکت مدتوں قائم رہی، جبکہ خلافت اسلامی کو تارتار کرنے کی سازشیں مدتوں سے رچی جارہی تھیں، حکمرانوں کی جانب سے عدل وانصاف کے ایسے ایسے نمونے سامنے آتے رہے کہ نوشیروانِ عادل کا صرف ایک نام رہ گیا، اور یہاں ایک عادل نہیں عادلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہوگیا۔

بعثت کا حال

وحی کے آغاز اور نبوت وبعثت سے سرفراز کئے جانے کا حال ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی زبانی سنئے:

"حتیٰ جاء ه الحق وهو فی غار حراء، فجاء ه الملك فقال: اقرأ، قال: ما انا بقارئ، قال: فأخذ نی فغطنی حتیٰ بلغ منی الجهد، ثم أرسلنی، فقال: اقرأ، فقلت: ما أنا بقارئ، فأخذ نی، فغطنی الثانية حتیٰ بلغ منی الجهد ثم أرسلنی فقال: اقرأ، فقلت: ما أنا بقارئ، قال: فأخذنی فغطنی الثالثة، ثم أرسلنی فقال: ﴿ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ﴾(١) فرجع بها رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یرجف فؤاده، فدخل علیٰ خدیجة بنت خویلد رضی اللّٰه عنها، فقال: زملونی! زملونی! فزملوه حتیٰ ذهب عنه الروع، فقال لخدیجة وأخبرها الخبر، لقد خشیتُ علی نفسی، فقالت خدیجة: كلّا واللّٰه ما یُخزِیكَ اللّٰهُ أبداً، إنك لَتَصِلُ الرحمَ، وتحمِل الكلَّ، وتكسب المعدوم، وتقری الضیف، وتعین علی نوائب الحق،

(١) سورة العلق/ ١-٣

فانطلقت به خديجة حتىٰ أتت به ورقة بن نوفل بن أسد بن عبد العزىٰ ابن عم خديجة وكان امرأ تنصر في الجاهلية، وكان يكتب الكتاب العبراني، فيكتب من الإنجيل بالعبرانية ماشاء الله أن يكتب وكان شيخا كبيراً، قد عمي، فقالت له خديجة: يا ابن عم! اسمع من ابن أخيك! فقال له ورقة: يا ابن أخي! ماذا ترى؟ فأخبره رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم خبر مارأى، فقال له ورقة: هٰذا الناموس الذى نزل اللّٰه على موسىٰ، ياليتني فيها جذعا، يا ليتني أكون حيا إذ يُخرجك قومك. فقال رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: أو مخرجيَّ هم؟ قال: نعم، لم يأت رجل قط بمثل ماجئت به إلا عودي، وإن يدركني يومك أنصرك نصراً مؤزرا، ثم لم ينشب ورقة أن توفي وفتر الوحي." (۱)

(جب آپ صلی اللہ علیہ پر حق آشکارا ہوا تو آپ غارِ حرا میں تشریف فرما تھے، تو ایک فرشتہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام) آیا اور کہا: پڑھیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تو میں نے کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: تو اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا یہاں تک میری حالت دگرگوں ہوگئی، پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے، میں نے کہا: میں پڑھا نہیں ہوں، تو دوبارہ اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا اور کہا: پڑھیے، میں نے کہا: میں پڑھا نہیں ہوں، تو تیسری بار اس نے مجھے پکڑ کر زور سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا:

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الوحي، باب كيف كان بدء الوحي.

''پڑھیے اپنے اس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا انسان کو، پڑھیے اور آپ کا رب مہربان ہے، جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہیں تھا۔'' اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بارِ رسالت کے ساتھ اس حالت میں گھر لوٹے کہ آپ کا دل دھڑک رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے پاس گئے اور کہا کہ مجھے چادر اوڑھاؤ، مجھے چادر اوڑھاؤ، آپ کو چادر اوڑھا دی گئی، کچھ دیر بعد گھبراہٹ کی کیفیت دور ہوئی، پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اس واقعہ کا پورا حال سنایا اور فرمایا کہ میں تو ڈر گیا تھا، تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! کسی بھی صورت میں اللہ آپ کو رسوا نہیں کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، بے روزگاروں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، لوگوں کو ان کا حق دلانے میں مدد کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، وہ جاہلیت کے زمانہ میں نصرانیت قبول کر چکے تھے، عبرانی زبان میں لکھنا جانتے تھے، عبرانی میں انجیل بھی لکھتے تھے، کافی بوڑھے اور نابینا ہو چکے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ان سے کہا: بھائی اپنے بھتیجے سے ان کا کچھ حال سنئے، ورقہ نے کہا: بھتیجے جو کچھ تم نے دیکھا ہے سناؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا واقعہ سنایا تو ورقہ نے کہا: یہ وہی بڑا فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوا تھا، کاش

میں طاقتور جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب تمہاری قوم تم کو اپنی بستی سے نکال دے گی! تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ میرے اپنے لوگ مجھے نکال دیں گے؟ تو انھوں نے کہا کہ ہاں! کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہے جو تمہاری طرح کی چیز لے کر آیا ہو اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو، اور اگر ایسا دن آنے تک میں زندہ رہا تو میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ پھر کچھ ہی عرصہ گزرا ہوگا کہ ورقہ کی وفات ہوگئی اور وحی کا سلسلہ بھی رک گیا)۔

اقرأ کی وحی کے بعد کچھ وقفہ ہوا، پھر یہ وقفہ ٹوٹا، وحی کا سلسلہ جاری ہوا اور قرآن مجید کا نزول شروع ہوا، حضرت جابر بن عبداللہ انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے متعلق روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بینما أنا أمشي إذ سمعت صوتا من السماء، فرفعت بصري، فإذا الملك الذی جاء نی بحراء جالس علی کرسی بین السماء والأرض، فرعبت منه فرجعت فقلت: زملونی، زملونی! فأنزل الله تعالیٰ: ﴿يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ (۱) فحمی الوحی وتتابع." (۲)

(میں چلتا ہوا جا رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی تو میں نے اپنی نگاہ اوپر اٹھائی تو دیکھا ہوں کہ وہی فرشتہ ہے جو غار حراء میں میرے پاس آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان ایک وسیع و عریض کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، تو میں اس سے خوف زدہ ہوگیا

---

(۱) سورۃ المدثر /۱-۳ (۲) صحیح البخاری، کتاب بدء الوحی أیضاً.

اور گھر واپس ہو گیا اور میں نے کہا کہ مجھے اوڑھاؤ، مجھے اوڑھاؤ، پھر اللہ تعالیٰ نے "یا أیھا المدثر" والی آیت نازل فرمائی اور پھر وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا اور برابر چلتا رہا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ دعوت دینی شروع فرمائی، تبلیغ رسالت کے کام کا آغاز کر دیا، کوہ صفا پر چڑھ کر اللہ وحدہ لاشریک کی ندا لگا دی، اقرباء کو، اہل قبائل مکہ کو اور پھر دور قریب سبھی کو اسلام کی طرف بلانا شروع کر دیا، توحید و رسالت کے اقرار اور دعوت اسلام کے ساتھ اعمال میں تین چیزوں کو خصوصیت سے اختیار کرنے کو کہتے، یہ وہ تین باتیں ہیں جو حضرت ابوسفیان نے قیصر روم ہرقل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بتائی تھیں کہ:

"یأمرنا یعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالصلوٰۃ والصدق والعفاف ."(۱)

(وہ ہمیں نماز ادا کرنے، سچائی اختیار کرنے اور پارسا رہنے کو کہتے ہیں)۔

مکہ مکرمہ میں دعوتی و تبلیغی کوششیں، موافقت ومخالفت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتی کوششیں تیز کر دیں، اور یہ درد وغم روز افزوں بڑھتا ہی رہا کہ کس طرح ایک ایک شخص اس دعوت کو قبول کرے اور کس طرح اپنے کو اللہ کے غضب سے بچانے کا سامان اکٹھا کرے، آپؐ کے رفقاء میں سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے تن من دھن سے پورا ہاتھ بٹانا شروع کیا، چنانچہ جو سمجھدار نوجوان ایمان لے آئے، ان میں حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت زبیر بن العوام، حضرت سعید بن زید، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلوٰۃ.

ارقم بن الارقم، حضرت عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمار بن یاسر، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہم وغیرہ بھی ہیں، اول الذکر سات حضرات عشرۂ مبشرہ میں ہوئے، یہ سب لوگ حضرت ابوبکر کے ہی حصہ میں آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دعوت وتلقین کا عمل چلتا رہا، اور جو لوگ ایمان لے آئے، وہ چھپ چھپا کر نماز وتلاوت وغیرہ کا عمل کرتے، کفار قریش تنگ کرنے اور تکلیف پہنچانے کا کام جاری رکھتے، خاص اقرباء میں ابولہب اور دوسرے نمبر پر ابوجہل زیادہ عداوت پر اتر آئے، ولید بن المغیرہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط بھی اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوجہل، ابولہب اور عقبہ بن ابی معیط اور ان جیسے اور بدمعاشوں نے بڑا ستایا، ابوجہل نے خباثت کی انتہا کرتے ہوئے سجدہ کی حالت میں اونٹ کی اوجھڑی نجاست سمیت ڈالنے پر اکسایا اور عقبہ نے یہ بدبختانہ عمل کیا، حضرت فاطمہ جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اس وقت ۵ یا ۶ سال کی تھیں، بڑی جرأت وہمت کے ساتھ آگے بڑھیں اور اوجھڑی ہٹائی، تب آپ سجدہ سے اٹھے، ابولہب کھل کر تکذیب کرتا، ابوجہل خاک پھینکتا اور برا بھلا کہتا، عقبہ نے ایک خباثت اور کی کہ نماز کی حالت میں ہی حرم کعبہ میں گردن میں چادر لپیٹ کر زور سے کھینچی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور یہ تکلیف دور کی، اور ان خبیثوں سے یہ کہا کہ تم ایسے شخص کو مار ڈالنا چاہتے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مشرکین وکفار کی ہٹ دھرمی اور حق کی اشاعت و تبلیغ میں رکاوٹ دیکھ کر یہ فکر مسلسل دامن گیر تھی کہ کچھ ایسے باہمت، جری لوگ حلقۂ اسلام میں داخل ہو جائیں جن سے دین اسلام کو غلبہ حاصل کرنے میں تقویت حاصل ہو، چنانچہ عمرو بن ہشام (ابوجہل) اور حضرت عمر بن الخطاب کا نام لے کر دعا کی کہ ان دونوں میں کسی کے ذریعہ اسلام کی مدد فرما، اللہ نے دعا قبول کی جس کا دل طاہر تھا وہ

مشرف بہ اسلام ہوا، ابو جہل اپنی خباثتوں کی وجہ سے محروم رہا، چند دن پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے بھی ابو جہل کی خباثت وشرارت کو دیکھ کر اعلان اسلام کر دیا تھا، ادھر بعض دوسرے قبائل کے روساء میں حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ اور قریش کے باوجاہت وبا حیثیت لوگوں میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ وغیرہ ایمان لا چکے تھے، اور اقوام عالم کے افراد کی نمائندگی حضرت صہیب رومی، حضرت سلمان فارسی، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہم کے حصہ میں آئی۔

جن صحابہ کو سخت ایذیتیں دی گئیں، ان میں حضرت یاسر رضی اللہ عنہ، ان کی اہلیہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہاں بھی ابو جہل کی خباثت ہی ظاہر ہوئی اور اس بد بخت نے حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کی شرم گاہ میں نیزہ مارا جس سے وہ اسی وقت شہید ہو گئیں، اس طرح وہ پہلی شہید خاتون اسلام ہیں، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت یاسر رضی اللہ عنہ اور ان کے کنبہ کو یہ کہہ کر صبر وتلقین فرماتے:

"اصبروا یا آل یاسر فإن موعدکم الجنة."

(اے یاسر کے گھر والو! صبر سے کام لو، یقیناً تمہارے لیے جنت کا وعدہ ہے)۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نا قابل یقین حد تک ستایا گیا اور نا قابل بیان ایذائیں دی گئیں، وہ امیہ بن خلف کے غلام تھے، وہ عذاب دینے کے وہ نئے نئے طریقے ایجاد کرتا تھا، آخر میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کیا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ أَحَدٌ، أَحَدٌ کا نعرہ لگاتے جاتے، کہ خدا تو ایک ہی ہے، خدا تو ایک ہی ہے۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ، حضرت خباب رضی اللہ عنہ، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ، ان سب کو بڑی ہی سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں، مگر ان کے صبر واستقلال میں ذرا

بھی فرق نہ آیا، اور پھر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شعب ابی طالب کے محاصرہ میں تین سال اپنے متعلقین واہل خاندان اور اصحاب کے ساتھ گزارنے پڑے، چچا ابو طالب اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے البتہ تکلیفیں اٹھانے میں ساتھ رہتے تھے، انہیں بھی قید بامشقت سے گزرنا پڑا اور وہ بھی محصور ہوئے اور فقر وفاقہ کی سختی اٹھائی، لیکن مسلمانوں کو صبر کی ہی تلقین تھی اور ارشاد ربانی تھا:

"کفوا أیدیکم و أقیموا الصلوٰة." (۱)

(اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کو قائم کرو)۔

صحابہ نے اللہ کی مرضی کو اپنی خواہشات اور تقاضوں پر ترجیح دی اور پوری مکی زندگی اس طرح گزر گئی، یہاں تک کہ طائف کا سخت اذیت ناک واقعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان حالات میں پیش آیا جب آپ قریش مکہ سے مایوس ہوکر سرداران قبائل طائف کی حمایت حاصل کرنے طائف تشریف لائے، مگر وہ لوگ کچھ زیادہ سنگ دل نکلے اور اوباشوں کو آپ پر پتھراؤ پر اُکسایا، جس سے آپ کو زخم بھی آئے اور اللہ کا قہر دشمنوں پر اترا، اور پہاڑوں کے عذاب کے فرشتے تیار تھے کہ حکم ہوتو ان دونوں پہاڑوں کو ملا کر ان خبیثوں کا خاتمہ کردیا جائے، نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس امید میں کہ یہ نہیں تو ان کی اولاد کو سمجھ آئے گی، اوران کی نسلوں میں ایمان اتر سکتا ہے، بددعا سے گریز کیا اور وہ صبر کیا جس کی تاریخ انسانی میں نظیر نہیں مل سکتی، طائف کی دعا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر وتحمل کا حال بیان کرتی ہے۔

بالآخر آپ کی امید شرمندہ تعبیر ہوئی اور چند ہی سال کے بعد طائف نے ایک ایسے فرزند کو جنا جس نے برصغیر میں اسلام کا جھنڈا لہرادیا، لہٰذا آج جتنے مسلمان برصغیر میں ہیں وہ اس کے مرہون منت ہیں، ان سے میری مراد محمد بن قاسم ثقفی ہیں، رحمۃ اللہ تعالی علیہ۔

---

(۱) سورۂ نساء/۷۷

آپ نے عافیت طلب کی اور خود تکلیف گوارہ کی، اللہ نے اس پر آپ کو یہ صلہ دیا کہ معراج سے نوازا اور شب بھر میں مسجد حرام (مکہ مکرمہ) سے مسجد اقصیٰ (فلسطین) اور پھر زمینی سطح سے عرش معلیٰ تک سیر کرائی گئی، جمیع انبیاء کی امامت کرائی گئی، اور بڑے خیر سے نوازا گیا، مزید تحفہ کے طور نماز عطا کی گئی۔

اسراء و معراج

نبی آخر الزماں سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رب العالمین کے الطاف وعنایات میں ایک بڑی عنایت واقعۂ معراج ہے، ایک ہی شب میں ایک ملک سے دوسرے ملک لمحوں میں پہونچ جانا اور اسی شب میں زمینی مسافت لمحوں میں طے کر لینے کے بعد زمین سے آسمان اور آسمان سے ساتویں آسمان اور عرش تک رسائی، انبیاء کی امامت، نمازوں میں تخفیف اور امت کی سہولت کے لئے پچاس وقت سے کم کرا کر پانچ وقت کرالینا، انسانوں کے مختلف طبقات کا ان کے احوال کے اعتبار سے جزا اور سزا کا عبرت انگیز منظر کا مشاہدہ، اولوالعزم انبیاء اور رسولوں سے ملاقاتیں، گفتگو اور کتنی باتیں ہیں جن کی تفصیل میں جایا جائے تو پھر یہ مضمون نہیں رہ جائے گا کتابی عنوان ہو جائے گا، قرآن مجید کے پندرہویں پارہ کا آغاز ہی اس واقعہ سے ہے، ارشاد ربانی ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (۱)

(پاک ذات ہے وہ جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا، جس کے اردگرد کو ہم نے بابرکت بنا رکھا ہے تاکہ ان (بندہ) کو ہم بعض اپنے عجائب (قدرت) دکھائیں،

---

(۱) سورۂ بنی اسرائیل/۱

بے شک سمیع وبصیر وہی (اللہ) ہے)۔

سورۂ نجم پڑھیے، پہلی آیت سے ۱۸ویں آیت تک صاف صاف کھول کر بتادیا گیا، آخر میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ﴾ (۱)

(انہوں نے اپنے پروردگار کی (قدرت) کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے)۔

قرب اور نزدیکی کو بھی ظاہر کردیا گیا، ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ﴾ (۲)

(پھر وہ نزدیک ہوا اور زیادہ نزدیک ہوا، سو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم)۔

اور اس کی بھی وضاحت کردی گئی، ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ﴾ (۳)

(اور انہوں نے اس (فرشتہ) کو ایک بار اور بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہٰی کے قریب)۔

اور ان کی کیفیت بھی ظاہر کردی گئی، ارشاد ہے:

﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ﴾ (٤)

(اُن (پیمبر) کی نگاہ نہ تو ہٹی اور نہ بڑھی)۔

یہ واقعہ کب پیش آیا؟ ۲۷؍رجب المرجب کی شب وہ مبارک شب تھی جس کے نصیب میں خالق اللیل والنہار نے یہ مقدر کیا تھا۔ تھوڑا ہی وقت گزرا تھا جس کے بعد یہ انعام عطا کیا گیا۔ طائف کے دعوتی و تبلیغی سفر میں آپ نے جو تکلیفیں، کلفتیں، مصائب و شدائد برداشت کیے تھے وہ انسانیت کو لرزہ براندام کردینے والی تھیں، کمال

(۱) سورۂ نجم/۱۸۔ (۲) ایضاً/۸-۹۔ (۳) ایضاً/۱۳-۱۴۔ (۴) ایضاً/۱۷

انسانیت یہ جلوہ گر ہوئی کہ اس اختیار کے مل جانے کے باوجود کہ اشارہ تو ان سب موذیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے، اس امید میں کہ ان کی نسل میں کوئی ہدایت یافتہ جنم لے لے، آپ نے سب کچھ سہا اور ایک حرف بھی زبان سے بددعا کا نہ نکالا۔

"وَمَآ أَرۡسَلۡنَٰكَ إِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعَٰلَمِينَ" یوں ہی نہیں آپ کو کہا گیا، جس رب العالمین نے آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا تھا، اسی نے لمحوں میں آپ کو اپنا وہ ظاہری قرب بھی عطا کیا، عظیم مشاہدات بھی کرائے، سرداری اور امامت بھی عطا کی، جس کا احاطہ تصور انسانی میں آنا محال تھا، دشمنوں نے سن کر تمسخر کیا اور دوستوں نے سن کر بیک زبان تصدیق کی۔

سیرت نگار حضرات لکھتے ہیں اور صحیح لکھتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی ایک ضیافت و عزت افزائی تھی، جو آپ کی دلداری و دلنوازی اور طائف کے ان زخموں کو مندمل کرنے اور اس توہین و ناقدری اور بے مائیگی و بے وفائی کی تلافی کے لئے تھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تجزیہ بالکل درست ہے کہ:

> "یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا صحیح تعارف اور اس کی صحیح نشان دہی، آپ کی امامت و قیادت کا بیان، آپ کی امت (جس میں آپ مبعوث ہوئے) کے اصلی مقام و حیثیت عرفی کا تعین اور اس پیغام و دعوت اور مخصوص کردار کی پردہ کشائی کرتا ہے جو اس امت کو اس وسیع و عریض دنیا اور عالمی برادری میں انجام دینا ہے۔" (۱)

صحابہ کی ہجرت

حبشہ کا بادشاہ نجاشی اسلام اور مسلمانوں کے تئیں ہمدردی رکھتا تھا، وہ قبل از اسلام نصرانیت کے صحیح اصولوں پر قائم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا

(۱) نبی رحمت/ ۱۹۷

کہ یہاں صحابہ عزت وناموس کی حفاظت اور کچھ سکون کے ساتھ رہ سکتے ہیں، اپنے صحابہ کو مشورہ دیا کہ وہاں ہجرت کرلیں، چنانچہ جن حضرات صحابہ نے حبشہ ہجرت کی ان میں پہلی جماعت حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قیادت میں گئی، اس کے بعد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی، پھر بہت سے صحابہ یکے بعد دیگرے پہنچے، بعض صحابہ نے اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کی، حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ بھی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تشریف لے گئے، یہ سارے حضرات مجموعی طور پر ۸۳/ تھے، لیکن قریش نے یہاں بھی تعاقب کیا، اوران کے نمائندوں نے نجاشی کو ان مہاجرین کے خلاف برانگیختہ کرنا چاہا، نجاشی نے اپنے پادریوں اور مخلص ارکان سلطنت اور مشیروں کو جمع کیا، حضرت جعفر بن ابی طالب نے نمائندگان قریش کے چند سوالات ملک حبشہ کے توسط سے رکھے، آخر قریشی نمائندہ نے یہ کہا ہم اور یہ ایک دین پر تھے، ہم اسی دین پر قائم رہے، اوران لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا، اور ایک نیا دین اختیار کرلیا، اس پر نجاشی نے صحابہ سے وضاحت طلب کی، حضرت جعفر نے ایسی جامع پُر مغز تقریر کی جس سے نجاشی بڑا متاثر ہوا، رونے لگا، اور سبھی پادریوں ودرباریوں پر بھی گریہ طاری ہوگیا، اور یہ اقرار کرتے ہوئے کہا کہ ''محمد تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی، اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا'' اس کے بعد نجاشی نے مسلمانوں کو بہت اعزاز واکرام سے رخصت کیا۔

صحابہ کی دوسری ہجرت مدینہ طیبہ کی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج کے زمانہ میں منیٰ جاکر تبلیغ اسلام فرمائی، جہاں انصار کے قبیلہ خزرج کے موجود لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا، پھر ان لوگوں نے جاکر مدینہ میں یہ خوشخبری سنائی تو اگلے سال اسی زمانہ میں انصار کے ۱۲/ آدمی آئے، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی، اور دین سکھانے اور دین کا رنگ چڑھانے کے لئے معلم ومربی طلب کیا،

نبوی نگاہ انتخاب صحابی جلیل حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ پر پڑی، ان کی کوششوں سے اسلام کو مدینہ میں فروغ ملنے لگا، یہاں تک کہ جمعہ بھی قائم ہو گیا، پھر اگلے سال اسی زمانۂ حج میں ۷۳ ؍مردوں اور دو عورتوں پر مشتمل قافلہ آیا اور منیٰ کے مقام عقبہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت اسلام کی، مدینہ کو دارالامن والایمان محسوس کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت دی، چھپ چھپا کر صحابہ مدینہ کو اکا دکا پہنچنے لگے، رفتہ رفتہ بڑی تعداد پہنچ گئی، اسی میں قریش کے بدمعاش اور اوباش اپنی شرارتیں جاری رکھتے، حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا سارا مال ومتاع غصب کر لیا، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ہجرت کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت ام سلمہ کو کفار نے الگ کرا دیا، ایک بچہ ساتھ تھا اس کو دونوں سے الگ کر دیا، اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بچہ کو ساتھ لے کر تن تنہا مدینہ کو روانہ ہوئیں، راستہ میں ایک ہمدرد مخلص عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ نے پریشانی دیکھ کر نہایت شریفانہ انداز میں ان کا ساتھ دیا، اور ان کے شوہر تک پہنچانے میں ان کی رہبری کی۔

گھناؤنی سازش

مکہ مکرمہ میں قریش کے سرداروں نے حسد وعداوت کی انتہا کر دی اور یہ پلاننگ کی کہ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کو تکلیفیں دینے سے کام نہیں چلے گا، راستہ سے ہمیشہ کے لئے ہٹا دینا ہی مناسب ہے، چنانچہ شہید کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے، پھر ابوجہل نے اپنی خباثت کو ظاہر کیا اور محاصرہ کی رائے دی، اس طور پر کہ ہر قبیلہ کا اہم فرد دروازے پر رہے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لئے علی الصباح باہر تشریف لائیں تو اکٹھا سبھی وار کریں، اس طرح سارے قبائل سے بنی ہاشم بدلہ نہ لے سکیں گے، ادھر یہ سب رات بھر تیار کھڑے رہے، اس سے قبل ہی اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کر دیا تھا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہجرت

میں ساتھ چلنے کو آپ نے فرمادیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر لٹا کر ۲۷ رصفر المظفر ۱۳ ؁ نبوی جمعرات کو نکلے، یٰسین شریف پڑھ کر خاک میں پھونک کے ان کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے نکلے، پوری حفاظت کے ساتھ اللہ کا وعدہ پورا ہوا کہ ﴿اللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾.

ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وطن کو چھوڑنا عزیز ترین خواہش اور محبوب ترین متاع کی قربانی ہوا کرتی ہے، اور پھر ایسا وطن جہاں بیت اللہ الحرام ہو اور جہاں طفولت اور شباب کا پورا زمانہ بیتا ہو! اللہ نے یہ قربانی بھی اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے لی، ہجرت کے واقعہ میں ہر مسلمان کے لئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتساب رکھنے والے ہر فرد کے لئے آخرت کی زندگی کو اصل زندگی سمجھنے والے ہر شخص کے لئے ایک پیغام ہے، وہ یہ کہ دین کی خاطر اور اللہ کے لئے اپنی عزیز سے عزیز ترین شی کو بھی قربان کرنا پڑے تو اس میں دیر نہیں کرنا چاہیئے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، مدینہ منورہ پہنچ گئے، یہی مدینہ منورہ جو آپ کے قدوم میمنت سے قبل یثرب تھا، اب طیبہ ہو گیا، مسلمانوں کو یہ ہدایت پھیلانے اور دعوت وتبلیغ کا کام کرنے کا ایک نیا اور اچھا مرکز ہاتھ آ گیا، مکہ کے مہاجرین جو بے سروسامان آئے تھے، یہاں آ کر انہوں نے اپنے انصار بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنی معیشت بھی مضبوط کر لی، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے رہے، یہاں ان کی نئی زندگی اور نئی معاشرت تھی، انہوں نے پسند نہیں کیا کہ وہ کسی کے محتاج رہیں اور اقتصادی ومعاشی کمزوری کی بناء پر انہیں دوسروں کے رحم وکرم پر جینا پڑے، اور وہ اسلام کے لئے اپنی نافعیت وصلاحیت ثابت کرنے میں ناکام رہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ منورہ میں پُر جوش استقبال انصار نے

کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس ادا کو اپنے لئے اور اسلام کے لئے ایک احسان سمجھا۔

مکی زندگی محنت ومشقت، قربانی، صبر وہمت اور ظلم سہنے کے ساتھ اللہ کی بندگی کرنے اور اس کے دین کی تبلیغ ودعوت دینے کی تھی، مقابلہ کرنے اور نبرد آزمائی کی حالت میں مسلمان اس وقت نہ تھے اور نہ اس کی اجازت تھی، ہجرت کے بعد صورتحال تبدیل ہوئی، تربیت وتزکیہ کے عمل اور مجاہدہ نفس کے بعد اب جہاد مع الاعداء کی ضرورت تھی، مدنی زندگی معرکوں، جنگوں، فتوحات سے بھری ہے، مصالحت کے ساتھ دعوتی عمل کا بھی اس میں ایک وقفہ ملتا ہے، مگر اس تھوڑے سے وقفہ میں جتنی بڑی تعداد اسلام لا چکی تھی اتنی بڑی تعداد اس سے پہلے پورے عرصہ میں نظر نہیں آئی، پھر فتح مکہ میں اور فتح مکہ کے بعد حجۃ الوداع اور وفات نبوی تک جو تعداد تھی وہ حیرت انگیز تعداد تھی، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سانحۂ ارتحال پیش آیا تو اس وقت مسلمان سوا لاکھ سے اوپر ہو چکے تھے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ہجری سال

دنیا میں جو تقویم رائج ہیں وہ مختلف ہیں، علاقوں اور ملکوں کے اعتبار سے بھی جدا گانہ ہیں، نقطۂ آغاز میں فکر وسوچ الگ الگ ہے، مگر دو جنتریاں دنیا میں زیادہ رائج ہیں، اسلامی ہجری تقویم اور مسیحی کلنڈر، ایک کا آغاز خاتم النبیین سید المرسلین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ ہجرت سے ہوتا ہے، اور دوسرے کا آغاز آخر سے پیشتر نبی حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی ولادت سے ہوتا ہے، پہلے کا دارومدار چاند کی گردش پر ہے، اور دوسرے کا دارومدار سورج کے حساب پر ہے، مسلمانوں کے لیے ان کے دینی فرائض وارکان اور شعائر کے لیے نظام قمری کو طے کیا گیا، اور دن کا آغاز وشمار بھی چاند کے طلوع ہی سے کیا گیا، مہینے اور سال کے آغاز کی خبر یہی چاند دیتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہینے بھر کے روزے اور پھر عیدین اور حج کے ایام اسی

چاند کے نظام کے مطابق متعین کیے اور اپنے اصحاب کو بھی ایسا ہی کرنے کو کہا۔

مسلمانوں نے یہیں سے اپنا کلینڈر شروع کر دیا، تیرہ سال کی مدت گزرنے پر ہجرت یعنی ترک وطن کا حکم ہوا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ ہجرت کی اور اپنے عمل سے یہ پیغام دیا کہ دعوت، عقیدہ اور ایمان کی حفاظت کی خاطر بڑی سے بڑی چیز، محبوب سے محبوب، عزیز سے عزیز جگہ چھوڑنا پڑے چھوڑ دینا ہوگا، اور وطن بھی آپ کا کہاں؟ جہاں بیت اللہ شریف، جس کی محبت، روح اور خون میں پیوست تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اسلامی تقویم کی اساس قرار دے کر اسلامی تقویم کے ہر ماہ و سال، ہر شب و روز سے یہ پیغام دیا جا رہا ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب انھوں نے اس کی حد بندی کرنی چاہی اور ایک نظام حتمی طور پر نافذ کرنا چاہا تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ رائے دی کہ ہجرت مکہ سے مدینہ منورہ جس دن ہوئی اس کو اسلامی تقویم کی اساس قرار دیا جائے، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے اتفاق کیا، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حکم دے دیا کہ تاریخ کا تعین ہجرت نبوی کی بنیاد پر کیا جائے، اس طرح سے یہ مستقل تقویم وجود میں آئی۔

اس طرح بقول مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ یہ محض ایک شخصیت یا جماعت کی یاد تازہ نہیں کرتی بلکہ ایک پیغام کی یاد تازہ کرتی ہے، وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عظیم مقصد کے لیے اپنے وطن عزیز کو خیر باد کہا، اور ایک نئے شہر میں بود و باش اختیار کی، یہ بات ایک پیغام اور ایک بڑے اقدام کو یاد دلاتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا بڑا اقدام اپنی یا اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی جان بچانے کے لیے نہیں کیا بلکہ خدا کے پیغام کو محفوظ کرنے اور اس کو ساری دنیا تک پہنچانے کا موقع مہیا کرنے کے لیے کیا تھا، اور یہ کہ جو ہمت دلاتا ہے کہ کوئی چیز خواہ کیسی ہی نرالی اور کیسی ہی اجنبی ہو اور اس کی راہ میں کیسی ہی رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کی جائیں، اور

کیسے ہی ناسازگار حالات ہوں، اور اس کو کیسی ہی شدید مخالفتوں اور عداوتوں کا سامنا کرنا پڑے، اگر اس سے انسانیت کی فلاح مقصود ہے، نیت میں خلوص ہے، اور ارادہ میں عزم و پختگی ہے تو ساری مخالفتوں کے باوجود وہ پیغام زندہ رہے گا۔

مدینہ منورہ کا قیام

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ میں قبا کی طرف سے داخل ہوئے، قبا میں کئی روز قیام فرمایا اور مسجد کی تعمیر کی جو اسلام کی پہلی مسجد کہلائی، اور قرآن مجید نے تعریف کی:

﴿لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُومَ فِيهِ، فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ (۱)

(وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر پڑی وہ اس کی مستحق ہے کہ آپ اس میں کھڑے ہوں اس میں وہ لوگ ہیں جو پاکی کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے)۔

دوشنبہ کے دن قبا میں داخل ہو کر جمعہ کے روز مدینہ شہر میں تشریف فرما ہوئے، ہر مسلمان آخری درجہ کا خواہشمند تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مہمان ہوں، مگر یہ سعادت وشرف حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا، ان کے دروازے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی بیٹھی، عجیب بات یہ تھی کہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ طیبہ کے قبیلۂ خزرج کی جس شاخ سے تعلق رکھتے تھے، اسی شاخ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کی والدہ تھیں۔

اول مرحلہ میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد کی تعمیر کی فکر ہوئی، چنانچہ آپ نے دو یتیم بچوں کی زمین خریدی حالانکہ وہ دونوں زمین ہدیہ دینے کو تیار تھے،

---

(۱) سورۂ توبہ/۱۰۸

اور تعمیر مسجد کے کام میں خود بنفس نفیس شریک ہوئے، اور یہی مسجد نبوی کہلائی اور اللہ نے ایسی برکت عطا فرمائی کہ ایک نماز پر پچاس ہزار کا ثواب مقرر فرمایا، اسی مسجد کے جنوب ومشرق میں ازواج مطہرات کے لئے حجرے بنوائے، اس مسجد کی ایک بڑی خصوصیت اس کا وہ حصہ ہے جو آپ کی آرام گاہ سے متصل مسجد کے منبر تک واقع ہے، روضة من رياض الجنة (جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری) قرار دیا گیا، گویا اس میں نماز پڑھنا جنت میں نماز پڑھنے کی طرح ہے۔

مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی یہ برکت کھلی ظاہر ہوئی کہ مدینہ کے دو بڑے قبیلے اوس وخزرج میں ٹھنی رہتی تھی، اسلام کے جھنڈے تلے آنے سے اخوت کو بڑھاوا ملا، اور اتحاد قائم ہوا، اس لئے کہ دونوں کے مرشد ورہنما ایک ذات گرامی ہوئی، دوسری طرف مکہ کے مہاجروں سے طبعاً مدینہ کے قبائل کو مناسبت نہ تھی اس لئے کہ دونوں قبیلے الگ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے باہمی مؤاخات کا عمل کرا کر ایک طرح کی قرابت وقربت پیدا فرمادی، اس طرح ایک انصار ایک مہاجر بھائی بھائی ہوا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مؤاخات فرمائی۔

نماز تو مکہ میں فرض ہو چکی تھی، جو معراج کے وقت عرش معلیٰ پر فرض ہو چکی تھی، اور فرضیت سے پہلے بھی نماز کو صحابہ اختیار کئے ہوئے تھے، اور ان کو نماز وصبر کی برابر تلقین تھی۔

"كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ." الخ

(اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو)۔

دشمنوں کی ایذا رسانی جماعت اور اعلان نماز میں مانع بن رہی تھی، مدینہ آکر یہ رکاوٹ دور ہوئی، اس لئے ہجرت کے پہلے سال میں اذان دینا قرار پایا، ایک صحابی کو خواب میں الفاظ اذان تلقین ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تلقین الٰہی

قرار دیا، اور یہ الفاظ حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو سکھلائے اور یہ ذمہ داری ان کو سپرد ہوئی۔

ہجرت کے ایک سال چار ماہ بعد تحویل قبلہ کا حکم آیا، بیت المقدس کی طرف رُخ کے بجائے بیت اللہ کعبہ قدس کی طرف رُخ کا حکم ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خواہش بھی تھی جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کے نتیجہ میں کعبہ کا رخ پشت پر پڑ رہا تھا۔

مسجد نبوی سے متصل ایک چبوترہ ان مسلمانوں کے ٹھہرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا جو آپ کی صحبت میں مستقل رہنا اور دین سیکھنے کے لئے ٹھہرنا چاہتے تھے، یہ جگہ صفہ اور اس کے مقیم اہل صفہ اور اصحاب صفہ کہلائے، ان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی اور فقر وفاقہ کے سخت حالات سے گزرنا پڑتا تھا مگر ان کی قربانیوں سے پہلا اسلامی مدرسہ وجود میں آیا، جو صفہ کے نام سے مشہور ہوا، تا قیام قیامت سارے مدارس دینیہ کا سرچشمہ یہی اول مدرسہ ہے، جہاں تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ کی انجام دہی کے ساتھ مقاصد بعثت کا بدرجۂ اتم ظہور یہاں ہو رہا تھا۔

غزوات

اسلامی غزوات، جنگوں اور مجاہدانہ سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے یہ بات صاف طور پر سامنے آتی ہے کہ صبر وعزیمت کی ایک مدت کے بعد یہ صورت حال پیش آئی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رب کے حکم سے دعوت وتبلیغ کا کام شروع فرمایا کہ جب حکم ہوا: ﴿یَآ اَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِیَابَكَ فَطَھِّرْ﴾ اور ارشاد ہوا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ﴾ تو لوگوں کی شدید مخالفت سامنے آئی، موافقت والے بہت تھوڑے تھے، جو شروع میں چار، پھر چار سے دس اور دس سے بیس اور بیس سے چالیس ہوئے، یہ چالیسویں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم ہیں جن کی جرأت وبے باکی کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، ان کے اسلام لانے سے مسلمانوں کو بڑی تقویت ملی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ وصحابیات ﴿کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ پر عمل پیرا تھے، صبر واستقامت کے پہاڑ بنے ہوئے تھے، اور اپنے رب کی خاموش بندگی کئے جارہے تھے، تکلیفیں سہہ رہے تھے، مصیبتیں اٹھارہے تھے، فاقے برداشت کررہے تھے، ظلم وزیادتی کا جواب نہیں دے رہے تھے، ان سب کے باوجود کفار ومشرکین کی زیادتیوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہ سازشوں پر سازشیں کرتے رہتے تھے، پلاننگ کرتے، منصوبے بناتے کہ مسلمانوں کو مدینہ میں بھی چین وسکون سے بیٹھنے نہ دیں گے، خود تیاری کرتے رہے، ہتھیار بند ہوکر پوری تیاری سے مدینہ کے قریب پہونچے اور بدر کے مقام پر معرکہ حق وباطل ہوا، انصار مقابلہ کے لیے بڑھے تو ان

سے ہاتھ ملانے کے بجائے کفار قریش سے کہا کہ ہمارے ہم پلہ اور ہم سر آئیں، یعنی خاندان قریش کے ہی جیالے ہوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار میں ایک روشن کردار یہ بھی تھا کہ آپ انعام واکرام کے وقت اپنے خاص افراد خاندان کو پیچھے رکھتے اور قربانی کے وقت اوروں سے آگے کرتے، چنانچہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور حضرت عبیدہ بن الحارث رضی اللہ عنہ آگے آئے، مقابلہ ہوا، کفار قریش کے پاس مادی ہتھیار تھے مگر ان کے پاس دعا کا ہتھیار تھا، ایمان کی طاقت تھی، یہی بھاری پڑے، پھر کیا تھا باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی، مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی، اور دشمن اس سے کہیں زیادہ تعداد میں موجود تھے، اور ہتھیار بند تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ ریز اور دعا ومناجات میں منہمک تھے اور دعا بھی عجیب کیف وجلال کی، پوری الحاح وزاری، کمال عبدیت کے ساتھ "اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدُ" کہ بارالٰہا! اگر تیرا فیصلہ اس مٹھی بھر جماعت کے ختم کرنے کا ہی ہے تو تیری عبادت اس زمین پر نہ ہوسکے گی، اگر اللہ چاہتا تو پہلے ہی غلبہ دے دیتا اور دشمنوں کی ہمت بھی کچھ سوچنے کی نہ ہوتی، مگر اپنے پیارے نبی سے یہ کہلا کر پوری امت محمدی کو یہ پیغام دیا کہ تمہارے جینے کا اور بقاء کا ایک ہی مقصد ہے کہ تم اللہ کی بندگی کرتے رہنا اور دوسروں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلاتے رہنا، یعنی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اور دعوت وتبلیغ دین، یہ ہے مقصد حیات، بالآخر مسلمانوں کی طاقت ان کے ایمان ویقین، توکل واعتماد علی اللہ کی بدولت دوگنی، سہ گنی ہوگئی اور مزید فرشتوں کو بھیج کر بھی نصرت فرمائی گئی اور خود اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں اس نصرت کا ذکر فرمایا اور فرمایا: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ اس معجزانہ کلام نے دونوں نصرتوں کو واضح کیا۔

ایک وہ نصرت ومدد جو مقام بدر میں اللہ کی طرف سے ملی، ایسی صورت حال

میں کہ مسلمان پست کمزور اور بے حوصلہ تھے اور وہ غالب آگئے اور وہ نصرت جو واقعہ بدر کے ذریعہ ملی، اور دین اسلام غالب آگیا، مسلمان طاقتور، باحوصلہ اور ناقابل شکست قوم خیال کئے جانے لگے، اور ﴿وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ کی حقیقت آشکارا ہوگئی۔

مشرکین مکہ اب بدر کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنانے لگے، اس کے علاوہ مسلمانوں کو خارجی فتنہ کے ساتھ داخلی فتنہ کا بھی سامنا تھا، گو اس فتنہ کی آگ دبی ہوئی تھی، واقعہ احد میں جو واقعہ بدر کے ایک سال بعد پیش آیا، یہ آگ بھڑکتی دکھائی دی، احد پہاڑ کے دامن میں معرکہ حق وباطل پھر ہوا، اور یہ معرکہ اتنا سخت تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک اسی معرکہ میں شہید ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور عظیم معلم صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسی میں شہید ہوئے۔

اس معرکہ میں مسلمانوں کو زیادہ قربانی دینی پڑی، نتیجہ یہی ظاہر ہوا کہ کفار نے پسپائی اختیار کی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ احد کے واقعہ میں مسلمانوں کے لئے بڑا سبق ظاہر ہوا، اس سبق کو قرآن مجید میں مسلمانوں کے سامنے ظاہر کیا گیا ہے، کہ ان سے جو کمزوریاں ظاہر ہوئیں وہ ان کے قوی الایمان ہونے کی صورت میں نہیں ظاہر ہونا چاہئے تھیں، ان کمزوریوں میں اصل کمزوری یہ تھی کہ مسلمانوں کو کچھ غلط فہمی ہوئی، اور مالی منفعت کی طرف توجہ درمیان جنگ ہوگئی اور پھر افواہیں پھیلیں اور افراتفری ہوئی، بعد میں مسلمان پھر سنبھل گئے لیکن اس کی وجہ سے کچھ نقصان اٹھانا پڑا، اس سے مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر چلنا ہی کامیابی کی شاہ کلید ہے۔

اس کے بعد اہم ترین معرکوں میں غزوۂ خندق ہے، اس کا پس منظر مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ نے یہ لکھا ہے کہ:

"جب مختلف طریقوں اور سازشوں کے اختیار کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کی طاقت اور مضبوطی کو توڑا نہ جاسکا تو مدینہ کے یہودی اور منافقین اور قریش اور ان کے ہمنوا قبائل ان سب نے مل کر ایک زیادہ زوردار اسکیم بنائی کہ ایک بڑی اور متحدہ فوج تیار کر کے مسلمان علاقہ پر حملہ کر کے مسلمانوں کی طاقت توڑ دی جائے۔"(۱)

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ متحدہ محاذ قائم ہوا اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ ایک فوجی معاہدہ کے تحت ذی قعدہ ۵ھ میں چڑھائی کی، قریش کے چار ہزار آدمی تھے، غطفان کے چھ ہزار، مدینہ منورہ کے یہود بنی قریظہ الگ سے شامل ہو گئے، ادھر یہ بڑی تعداد تھی جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین ہزار افراد تھے، صورت حال پُر خطر تھی، حضرت سلمان فارسیؓ نے ایک بہترین مشورہ خندق کھودے جانے کا دیا، یہ مشورہ بڑا مفید ثابت ہوا، مسلمانوں کے صبر واستقامت اور ایمان وعزیمت کا سخت امتحان اللہ نے لیا، اور پھر اللہ نے غیب سے مدد فرمائی، وہ اس طرح ہوئی کہ سخت آندھی آئی اور طوفان آیا، اور دشمنوں کے خیمے اکھڑ گئے، اور اللہ نے مسلمانوں کو فتح وغلبہ عطا فرمایا اور بغیر جنگ کئے فتح حاصل ہو گئی اور دشمن مایوس بدحواس واپس ہوئے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی نے بہت درست تجزیہ کیا ہے کہ:

"یہ آندھی طوفان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت اس مہم کے شروع میں ہی ہو سکتی تھی، لیکن شاید ایمان والوں کے ایمان کی آزمائش لینا تھی، کہ رضائے الٰہی کے لئے تین ہفتہ سخت خطرہ اور مشقت میں رکھا گیا ہے، اس پوری امت میں حضور صلی اللہ علیہ

---

(۱) رہبر انسانیت/۲۴۵

وسلم بحیثیت ذمہ دار اور قائد کے صورت حال پر پوری نظر رکھے ہوئے تھے۔"(۱)

یہود بنو قریظہ نے چوں کہ بدعہدی کی تھی، اور مسلمانوں کے دشمنوں سے دوستی کر کے مسلمانوں کا دوست بن کر دشمنی کی تھی، ان کی اس شرانگیزی اور شرارت کے سامنے آنے پر ان کی سرکوبی ضروری سمجھی گئی اور غزوۂ خندق سے فارغ ہو کر ان کی طرف رخ کیا گیا اور ان کا محاصرہ کر کے ان کا ضروری علاج کیا گیا۔

غزوہ بنی المصطلق کا معاملہ بھی ایسا ہی ہوا کہ وہ لوگ جنگ کے لئے منصوبے بنانے لگے اور حملہ کی تیاری کر رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی ایک جماعت ان کی طرف بھیجی، انھوں نے راہ فرار اختیار کی۔

صلح حدیبیہ

عمرہ ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ کا سفر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع فرمایا، لیکن راستے میں مشرکین مکہ نے رکاوٹیں ڈالیں، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بطور سفیر کے مکہ پہونچے ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب سے بیعت رضوان لی، یہ مقام حدیبیہ میں ببول کے درخت کے نیچے لی گئی، اور اس کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن مجید میں فرمایا ہے، صحابہ کرام حق کے لئے جان دینے کا عہد کرنے کے لیے جوش و وارفتگی کے ساتھ آپ کے چاروں طرف جمع ہو گئے تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی بیعت غائبانہ لی، اس لیے کہ وہ موقع پر موجود نہیں تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا داہنا ہاتھ ان کا ہاتھ قرار دے کر بیعت فرمائی، قریش کے کچھ لوگ حاضر ہوئے اور مصالحانہ بات چیت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کو ترجیح دی جب کہ صحابہ جنگ کے لئے تیار تھے اور اس کے جوش و جذبہ سے سرشار تھے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ

---

(۱) رہبر انسانیت/ ۲۴۸

کے آگے سر تسلیم خم کردیا، دعوتی نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ حق و باطل کے لئے فیصلہ کن معرکہ سے کم نہ تھا، اتنی بڑی تعداد میں قریب آنے کا ایک دوسرے کو موقع نہ ملا تھا جو صلح کے اس عرصہ میں ملا، اس سے اسلام کو سمجھنے کا لوگوں کو موقع ملا اور خوب دین پھیلا۔

دنیا کے حکمرانوں کو دعوتِ اسلام

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پہلے دعوت و تبلیغ کرتے اور صبر و استقامت کے ساتھ اس میں رکاوٹوں کو برداشت کرتے، اور اپنا کام کرتے رہتے، دنیا کے امراء، سلطانوں اور شہنشاہوں کو خطوط لکھے اور دعوت اسلام دی، اس وقت کی بڑی سلطنتیں روم و ایران تھیں اور مصر کو دنیا کے ممالک میں بڑی اہمیت حاصل تھی، کے بادشاہوں میں ایران کے بادشاہ کا رویہ سب سے خراب رہا، اس کا بڑا بُرا انجام ہوا، روم و مصر کے بادشاہوں نے اچھے جوابات دئے، یہ سبھی ممالک اسلام کے زیر نگیں آگئے، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عہد خلافت میں یہ سعادت مقدر تھی۔

غزوۂ خیبر

خیبر کی فتح، فتح مکہ کا پیش خیمہ ہے، خیبر میں یہود مدمقابل تھے، اور بڑی شان و شوکت رکھتے تھے، ناقابل تسخیر قلعوں میں رہتے تھے، اللہ کی مرضی تھی کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ذریعہ قلعہ فتح ہو، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھری مجلس میں فرمایا کہ "کل میں اس شخص کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتا ہے" یہ سن کر سبھی کے اندر یہ امید پیدا ہوئی کہ یہ سعادت اس کے حصہ میں آئے، لیکن اللہ نے یہ سعادت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں رکھی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا دیا اور ان کی قیادت میں قلعہ فتح ہوا۔

فتح مکہ

جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تھے، وہاں

فاتحانہ داخل ہوئے مگر شان فاتحین کی نہیں تھی، نیاز مندانہ کیفیت، عفوو درگزر کرتے ہوئے دشمنوں کو معافی کا پروانہ دیتے ہوئے، مخالفوں پر بہانہ بہانہ سے رحم وکرم کا معاملہ کرتے ہوئے داخل ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے وقت اس سلوک کا یہ اثر پڑا کہ بہت بڑی تعداد آپ کے اس طریقہ کو دیکھ کر ہی ایمان لے آئی، حضرت ابوسفیان کا ایمان لانا اسی وقت کا واقعہ ہے، جنہوں نے ہمیشہ مخالفین کی قیادت کی تھی، اور حضرت ہندہ اسی وقت ایمان لائیں جنہوں نے جنگ احد میں آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کروا کران کا کلیجہ چبایا تھا اور اس طرح دل کی بھڑاس نکالی تھی، اب اسلام پر فدا ہوگئیں۔

روم کے خلاف فوج کشی

فتح مکہ کے بعد حنین کا واقعہ ایک اہم ترین واقعہ ہے جس میں مسلمانوں کی سخت آزمائش ہوئی، فتح مکہ سے پہلے غزوہ موتہ کا معرکہ غیر معمولی اہمیت کا حامل تھا جس میں کئی بڑے جرنیل صحابی شہید ہوگئے تھے، آخر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور زبردست کامیابی حاصل کی تھی، اس کا پس منظر بھی واضح ہے کہ بصری کے حاکم شرحبیل غسانی نے اسلامی سفیر کو باندھ دیا تھا اور پھر شہید بھی کردیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج روانہ فرمائی تھی، اسی معرکہ میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب ملا تھا۔

ان تمام معرکوں میں تبوک کا واقعہ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے، اس کا سبب بھی یہ ہوا تھا کہ رجب ۹ھ میں آپ کو یہ خبر ملی تھی کہ رومی عرب کی شمالی سرحدوں پر حملے کی تیاری کررہے ہیں، اور عربوں کے ان کے ہم مذہب قبائل یکجا ہوگئے ہیں، شہنشاہ روم ہرقل پوری سرپرستی کررہا ہے، جس کے سامنے موتہ میں شکست کا انتقامی جذبہ بھی ہے، گرمی کے سخت موسم اور حالات کی ناسازگاری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیس ہزار فوجوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے، تبوک پہنچ کر ۲۰ دن قیام فرمایا، دشمنوں

پر ایسا رعب طاری ہوا کہ ایلہ کے حاکم یوحنہ نے آکر صلح کر لی اور جزیہ دینے کی پیشکش کی، جو منظور ہوئی، اسی طرح اور بھی دشمنوں کی ٹکڑیاں آتی رہیں، اور جزیہ پر رضامندی ظاہر کرتی رہیں، اور جنگ سے پسپائی اختیار کر لی، حضور محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے رحم وکرم کی درخواست قبول کی اور خوب معافیاں دیں، اور جنگ بندی فرمائی، سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے واقعہ تبوک کا خوب ذکر فرمایا ہے، تمام غزوات، معرکوں، فوج کشیوں کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف عیاں ہو جاتی ہے، کوئی بھی جنگ یا غزوہ بلاوجہ نہیں پیش آیا، مخالفین کی شرارت، دشمنوں کی عداوت، حکمرانوں کا غرور، ان سب غزوات کا بڑا پس منظر رہے، پھر بھی جہاں تک جنگ سے بچنا ممکن ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچے اور بلاوجہ ایک انسان کا بھی خون بہنے نہیں دیا۔ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم۔

اشاعت اسلام

اشاعت اسلام کا مرکز مدینہ منورہ قرار پایا، جوق در جوق لوگ اسلام میں داخل ہوئے، صرف صلح حدیبیہ ۶ھ کے نتیجہ میں جب مسلمان اور غیر مسلموں کا ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا اور معاملات کرنا عرصۂ دراز کے بعد ہوا تو معاشرہ میں انقلاب آگیا، جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد ایمان میں داخل ہوئی، مؤرخین وسیرت نگاروں کے نزدیک اتنی بڑی تعداد میں لوگ اس سے قبل نہیں داخل ہوئے تھے، حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر چودہ سو (۱۴۰۰) یا اس سے کچھ زائد مسلمان رہے ہوں گے، اس کے دو سال بعد فتح مکہ ہوئی، دس ہزار صحابہ تھے، جو نیازمندانہ شان کے ساتھ فاتحانہ داخل ہوئے اور پھر دو سال بعد حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ یا اس سے کچھ زائد بعض تاریخی روایات سے ایک لاکھ تیس ہزار تک کی تعداد معلوم ہوتی ہے، صحابہ اتنی جلدی اس بڑی تعداد کو پہنچ گئے، صورت حال اس طرح پیش آئی کہ وفود کے وفود آتے اور مشرف باسلام ہوتے جاتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ھ میں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر ان کی سربراہی میں حج کروایا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی اس پیغام کے ساتھ روانہ فرمایا تھا کہ اس بات کا اعلان کردیں کہ اب شرک کا نظام ختم ہوچکا اور اب مکہ میں شرک کے ساتھ رہنے کی اجازت نہیں، اب توحید ہی کے ساتھ رہنا ہوگا، مکہ اور تمام متعلقہ عرب علاقے اس طرح شرک، مظاہر شرک اور اس کی ساری علامتوں سے آزاد کرائے گئے، اور وہاں صرف توحید کا ہی نظام طے ہوگیا۔

اس طریقہ سے رمضان ۲ ھ میں بدر میں مسلمان ۳۱۳ رتھے اور ۱۰ ھ میں حج کے موقع پر بھی صرف آٹھ سالہ مدت میں سوا لاکھ سے متجاوز ہوگئے، جب کہ مکی زندگی کے تیرہ سالہ دعوتی دور میں یہ تعداد گویا تین سو ہی تھی یا اس سے بھی کم، اس طرح مدنی فتوحات نے مکی فتوحات سے اسلام اور مسلمانوں کو بے نیاز کردیا، مکہ بھی فتح ہوا جہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نکلنا پڑا تھا، لیکن ہجرت کے بعد واپسی نہیں ہوا کرتی، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام وطن بنانے کے ارادے سے پھر مکہ مکرمہ نہیں آئے، بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ وحج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور پورا مکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے جھنڈے تلے آگیا، جو ہمیشہ برسرپیکار رہے، اور اعداء ومخالفین رہے، نقصان پہونچانے میں پیش پیش رہے، ان کے ساتھ ہی درگزر معافی تلافی کا معاملہ رکھا، اور ایک ایک کرکے لوگ ایمان لاتے گئے، اور اس طرح مکہ کے گھر گھر میں ایمان گھس گیا، اللہ کا کلمہ غالب آگیا، لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، صلی اللہ علیہ وسلم۔

ارکان اسلام کی فرضیت

ارکان اسلام میں رکن اول واعظم صلوٰۃ (نماز) کی فرضیت جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے مکی زندگی کا حصہ بنی البتہ روزہ، زکوٰۃ اور حج مدینہ منورہ میں فرض ہوئے، نماز کے بعد روزے کی فرضیت ہوئی اور آیت نازل ہوئی:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾(۱)

(تم پر بھی روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو)۔

اور یہ روزے رمضان کے مہینہ کے فرض کئے گئے، اس سے قبل مسلمان عاشورہ کا روزہ رکھا کرتے تھے، جو روزے فرض نہیں ہوئے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہ صرف اہمیت دی بلکہ خود ان کا اہتمام رکھا، ان میں عاشورۂ محرم کا روزہ، یوم عرفہ (نویں ذی الحجہ کا روزہ) عشرۂ ذی الحجہ کے روزے اور ایام بیض (اسلامی ہجری مہینہ کے درمیان کے تین دن) کے روزے۔ اس کے ساتھ بعض ایام کے روزے کو روکا بھی جیسے عیدین اور ایام تشریق کے دن، جیسے نماز میں طلوع شمس، زوال شمس اور غروب شمس میں پڑھنے کو منع کیا گیا اور یہ روح پیدا کی گئی کہ انسان کو مسلمان بن کر پوری بندگی کے ساتھ رہنا، اپنی خواہشات پر نہیں اللہ کی مرضی پر چلنا ہے۔

پھر زکوٰۃ کی فرضیت ہوئی، یوں قرآنی ہدایات اور حدیثی تعلیمات میں صدقات وانفاق فی سبیل اللہ کی برابر ترغیب دی جارہی تھی، سورۂ بقرہ میں ایمان بالغیب اور اقامت صلوٰۃ کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کی فضیلت بیان فرمائی گئی:

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾(۲)

(جو لوگ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق عطا کیا ہے اس میں سے (اللہ کے راستہ میں بھی) خرچ کرتے ہیں)۔

---

(۱) سورۂ بقرہ/۱۸۳۔ (۲) سورۂ بقرہ/۳

اور ایک جگہ صاف طور پر فرمایا گیا کہ:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى﴾(۱)

(اور جہنم سے اس تقویٰ شعار کو بچالیا جائے گا جو اپنا مال کو پاک کرنے کے لیے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتا ہے)۔

۲ھ میں زکوٰۃ فرض ہوئی۔

دوسری طرف زکوٰۃ نہ دینے والوں کے لئے سخت وعیدیں آئیں، اس طرح اسلام نے غریب پروری کا باضابطہ نظام مقرر فرمادیا، بعد میں خلفائے اسلام نے اس کا تجزیہ کر کے دیکھا خصوصاً حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں تو ایسا معاشرہ وجود میں آچکا تھا کہ کوئی غریب ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

۹ھ میں حج کی بھی فرضیت ہوئی اور آیت نازل ہوئی:

﴿وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ﴾ (۲)

(اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تمہارے پاس آئیں گے پیدل اور ہر دبلی پتلی اونٹیوں پر سوار ہو کر جو دور دراز علاقوں سے آئیں گی، تاکہ وہ اپنے فائدہ کی چیزوں کا مشاہدہ کریں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۰ھ میں حج فرمایا، اس طرح آپ نے حج فرض ہونے پر ایک ہی حج فرمایا اس طرح اس میں بھی امت کے لئے بڑی سہولت پیدا فرمائی۔

حج اکبر

حج کی فرضیت کے بعد ایک ہی حج ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرکت فرمائی، خطبہ دیا، نماز پڑھائی، یہی حج حجۃ الوداع ہے، حجۃ البلاغ ہے اور

---

(۱) سورۂ لیل/ ۱۷-۱۸ (۲) سورۂ حج/ ۲۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت کی وجہ سے سب سے عظیم حج ہے، حج کی برکتیں یوں ہی لامتناہی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرکت و امامت سے یہ برکات کہاں سے کہاں پہنچ گئیں، یہ حج اکبر نہ ہوگا تو پھر کون ہوگا؟

حضرت سید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے حج کیے؟ کب کیے؟ یہ دونوں سوال اُٹھتے ہیں۔ یہ طے ہے کہ ہجرت کے بعد ایک ہی حج کیا اور وہ ۱۰ھ میں کیا، ایک لاکھ سے زیادہ صحابۂ کرام ساتھ تھے، مدینہ طیبہ سے آپ کے ساتھ حجاج کا جو قافلہ روانہ ہوا وہ بھی ایک بڑی تعداد پر مشتمل تھا، ۲۵/ ذی قعدہ کو سنیچر کے دن مدینہ منورہ سے قافلۂ حج رواں دواں ہوا۔ صحابہ نے مناسک حج آپ سے سیکھے اور پھر سیکھ کر امت کو سکھائے۔ آپ نے مجمع عظیم کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کو کامیابی اور صحیح زندگی گزارنے کا راہ عمل دیا، جامع ترین وعظ فرمایا، اللہ کے جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں اور بندوں کے جو حقوق ہیں ان سے باور کرایا۔ ٹھیک تین ماہ بعد امت کو وداع کہنے والے تھے، وداعی خطاب بھی اسی موقع پر فرمادیا، یہ ایک ایسی وصیت تھی جس میں دو وحدتوں کی دُہائی دی گئی، ایک ''وحدتِ رب'' ایک ''وحدتِ اب'' کہ تم سب کا رب بھی ایک اور اب بھی ایک۔ ایک اللہ کے تم سب بندے ہو، وہی تمہارا پالن ہار، پروردگار، مالک و خالق اور رزاق و کارساز حقیقی ہے اور اسی طرح تم سب ایک فرد آدم کی اولاد، ان کی نسبت سے سب آدمی "إن ربكم واحد وإن أباكم واحد كلكم من آدم وآدم من تراب."

اب کیا علاقائی فروق، نسلی عصبیت، قومی نخوت یہ سب من گھڑت باتیں ہیں، افضل و برتر وہی ہے جو اللہ کا زیادہ پاس ولحاظ رکھنے والا ہو، اللہ کا جتنا سچا اور مخلص بندہ ہو، اس کے رسول سے جس قدر سچی محبت کرنے والا ہو، کتاب وسنت کی جتنی زیادہ پیروی کرنے والا ہو، اب کیوں خون خرابہ، اب کس بات پر لڑنا جھگڑنا؟ جب ہر ایک کا خیر خواہ رہنا ہے، تو بدخواہی کی باتیں کیوں کر؟ حضور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم

صرف کسی ایک قوم کسی ایک ملت، کسی ایک جماعت، کسی ایک نسل کا درد لے کر نہیں آئے بلکہ انسانیت کا درد آپ کے سینہ میں تھا، یہی اس مجمع عظیم کے سامنے ظاہر ہو کر رہا کہ اس جیسا مجمع اس سے پہلے جمع نہیں ہوا تھا: أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ اسی موقع پر کہا، گویا کہ اس مجمع عظیم کو وداع بھی کہا۔ اسی موقع پر یہ آیت کریمہ بھی نازل ہوئی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾(۱)

(آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا)۔

دین آپ پر مکمل کر دیا گیا، اور آپ نے بھی انسانیت پر حجت تمام کر دی۔ ارکان اسلام میں نماز، روزہ، زکوٰۃ کے طریقے اپنے طرز عمل سے سکھلا چکے تھے، اب حج کے اعمال مناسک بھی غور کر کے امت کو بتائے گئے۔ معاشرتی زندگی اور عائلی زندگی کا کون سا جزء باقی چھوڑا جس کے بارے میں بتا نہ دیا ہو۔ قرآن مکمل ہوا۔ آپ کی سیرت طیبہ بھی مکمل ہوئی۔ شریعت تمام ہوئی۔ آئندہ کسی کے لئے یہ نہیں چھوڑا کہ وہ یہ کہہ سکے کہ یہ رہ گیا، یہ کرنے کا تقاضا ہے، زمانہ یہ ردّ و بدل چاہتا ہے۔ کیوں نہ کہا جائے یہ اس حج کو حجۃ الوداع، حجۃ البلاغ، حجۃ التمام۔ اس حج نے امت کے لئے ایسا ذوق و شوق پیدا کر دیا کہ دنیا کے اطراف واکناف سے مسلمان دیوانہ وار ادھر کا رخ کرتے ہیں اور اپنی عاشقانہ اداؤں کے ساتھ مستی و بےخودی میں اپنے رب سے مناجات کرتے ہیں۔ کفن بردوش یہ حاضری اس عشق ومحبت کو بھڑکا دیتی ہے جس کی چنگاری اندر دبی تھی، اللہ کو بھی یہ ادائیں ایسی پسند آتی ہیں کہ وہ نومولود بچہ کی طرح گناہوں سے پاک صاف کر کے انہیں اپنے در سے واپس ان کے گھروں کو بھیجتے ہیں۔

---

(۱) سورۂ مائدہ/۳

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رأفت ورحمت، محبت والفت اس موقع پر اپنے رب کے ساتھ ایسی جلوہ گر ہوئی کہ اس جیسی پچھلی امتوں نے نہ سنی اور نہ دیکھی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا آپ کے بارے میں آپ کے رب نے فرمادیا کہ:

﴿عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾(۱)

(جو چیز تمہاری تکلیف کا باعث ہو وہ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نہایت شاق گزرتی ہے، وہ تم کو بہت زیادہ چاہنے والے ہیں اور تمام مؤمنین کے ساتھ نرم اور مہربان ہیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحۂ عظیم

جس طرح انسانیت کو مسرت کی سب سے بڑی گھڑی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے حاصل ہوئی تھی اور ظلمت کدۂ عالم روشن اور تابناک ہوگیا تھا، ٹھیک اسی طرح آپ کی وفات کے سانحۂ عظیم سے عالم انسانیت کی چولیں ہل گئیں اور عالم اسلام کو وہ صدمہ پہنچا جس کے آگے سارے صدمات ہیچ ہیں اور زبان نبوت نے اس کی توضیح اس طرح کی ہے جیسا کہ سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم میں سے (یا اہل ایمان میں سے) کسی کو بھی کوئی مصیبت پہنچے تو وہ اس مصیبت کے لیے جو اس کو دوسرے کے انتقال سے پیش آرہی ہے اس مصیبت سے تسلی حاصل کرے جو میری وفات سے اس کو پیش آئی ہے اس لیے کہ میری امت میں کسی شخص کو میری وفات

---

(۱) سورۂ توبہ/ ۱۲۸

کے صدمہ سے بڑھ کر کوئی مصیبت پیش نہ آئے گی۔"

اللہ رب العالمین نے جس کو بھی پیدا کیا اس کو زندگی اور موت کے نظام سے مستغنی نہیں فرمایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سب سے پرنور حیات دے کر موت کے نظام سے بھی گزارا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء سابقین اور افراد نوع انسانی کی طرح ایک محدود و معین جسمانی زندگی لے کر آئے تھے اور موت وحیات کے طبعی و عالمگیر قانون سے آپ بھی اسی طرح مستثنیٰ نہ تھے جیسے کہ دنیا کے باقی انسان۔ قرآن مجید میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ، أَفَإِنْ مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ﴾(۱)

(محمد تو بس اللہ کے ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ انتقال کر جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو کیا تم پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ گے)۔

دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُونَ﴾(۲)

(اے نبی! آپ کو بھی موت آنی ہے اور ان لوگوں کو بھی موت آ کر رہے گی)۔(۳)

اور جب تدفین کا عمل پورا ہو گیا تو حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے

---

(۱) سورۂ آل عمران/۱۴۴۔ (۲) سورۂ زمر/۳۰

(۳) ندائے ملت ۱۱ر اپریل ۱۹۷۶ء، تعمیر حیات ۱۰ جنوری ۲۰۰۶ء

جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت وصحبت میں برابر حاضر رہنے والے تھے اور اسی کے لیے وقف تھے جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے بڑے درد سے پوچھا جب وہ تدفین میں شرکت کر کے لوٹے تھے:

"یا أنس! أطابت أنفسكم أن تحثوا على رسول الله صلى الله عليه وسلم التراب."(۱)

(اے انس! تمہارے دل اس بات پر کیسے راضی ہوئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خاک ڈالو)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین اسی مقام پر ہوئی جہاں آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا تھا اور یہ انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے کہ جس مقام پر وہ وفات پاتے ہیں وہیں مدفون ہوتے ہیں، یہ مقام حجرۂ ام المؤمنین سیدہ عائشہ بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہما تھا، غسل دینے اور کفن پہنانے کا مبارک عمل بنی اعمام کے حصہ میں آیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ جو دوہرا رشتہ دامادی کا بھی رکھتے تھے پیش پیش تھے، قبر کھودنے کی سعادت حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئی جو مدینہ منورہ میں اس کے ماہر تھے۔

---

(۱) صحیح بخاری باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ۔

باب سوم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات وہدایات

توحید

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کے معاملہ میں بڑے سخت تھے، ذرا بھی لچک روانہیں رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ تعلیم دی کہ اپنی ضرورت اپنے پروردگار کے سامنے رکھی جائے یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اس ضرورت کو بھی اسی کے سامنے رکھنا چاہیے، اور یہ تعلیم دی کہ سارے کے سارے لوگ اگر اس بات پر جمع ہو جائیں کہ تم میں سے کسی کو نقصان پہنچائیں، وہ اتنا ہی نقصان پہنچا پائیں گے جتنا نقصان اللہ نے لکھ دیا ہے، اور سب کے سب فائدہ پہنچانے کے لئے آ جائیں تو اس سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا پائیں گے جتنا فائدہ اللہ نے مقدر کر دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے سلسلہ میں یہ واضح طور پر فرما دیا کہ میرے سلسلہ میں اس مبالغہ سے کام نہ لینا جیسے نصرانیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے سلسلہ میں مبالغہ کیا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں، بس تم لوگ اس کا بندہ اور پیغمبر ہی کہنا۔

بندگی

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ ہی کے لئے جینا اور مرنا سکھلایا، خصوصیت کے ساتھ دین کے تمام کاموں کو محض اللہ کی رضا کے لئے ہی کرنے کی تعلیم دی اور اس کو اس طور پر سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر تمہارے ڈیل ڈول اور تمہاری شکلوں وصورتوں پر نہیں رہتی، اس کی نظر تو تمہارے دلوں پر رہتی ہے، یعنی جذبہ ونیت کو دیکھ کر وہ فیصلہ فرماتا ہے، اور ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

اطاعت وانقیاد اور اتباع سنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی اور سیرت نبوی کی پیروی کی دعوت دی، اور فرمایا کہ میں تم کو اللہ کا پاس ولحاظ رکھنے اور سننے، ماننے کی وصیت کرتا ہوں، اور یہ بھی فرمایا کہ میرے طریقہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کو اختیار کرنا، اور امیر کی بات ماننے کی بھی وصیت کی، مگر یہ آخری وصیت اس شرط کے ساتھ ہے کہ امیر ایسی بات کرنے اور ماننے کو نہ کہے جس میں اللہ کی نافرمانی ہورہی ہو، مسلم کی روایت میں اتباع سنت کی ترغیب یوں بھی دی گئی ہے کہ جس نے میرے طریقہ سے بے تعلقی برتی وہ مجھ سے نہیں!!!

محبت

اللہ کی محبت، اس کے رسول کی محبت، صحابۂ رسول کی محبت، ان سب تعلق ومحبت کی اہمیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی، اس کے ساتھ اس محبت وتعلق کی اہمیت بھی جو صرف اللہ کے لئے ہو کہ اس سے ایمان کی چاشنی پائی جاتی ہے(۱)، مگر

(۱) مجموع الفتاوی (علم السلوک) میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے غیر اللہ سے محبت کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ محبت جو صرف اللہ کے لیے ہو، یہ صرف مستحسن ہی نہیں بلکہ تقرب الی اللہ کا بڑا ذریعہ بھی ہے، دوسری وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے نہ ہو، اللہ کے ساتھ ہو، یہ محبت اہل کفر وشرک کو معبودان باطل کی محبت کے مانند ہوتی ہے، محبت وتعلق میں اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ساری محبتوں پر غالب رہتی ہے، صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اسے اس کے والد (والدہ) اور اولاد اور تمام ہی لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔''

اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی تیاری کیا کی ہے؟ اعرابی نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کی محبت۔ فرمایا: جس سے محبت ہے اسی کے ساتھ رہو گے۔

اکرام مسلم

نبوی تعلیمات واخلاق میں اکرام مسلم اور احترام انسانیت کے نمونے جا بجا ملتے ہیں، خاص طور پر اکرام مسلم کے سلسلہ میں بڑی تلقین ملتی ہے، محبت والفت، خیر خواہی، تعاون وہمدردی، عزت افزائی، خوش گمانی، تعلیم واصلاح کا عمل، دعوت کا کام، میل ملاپ، ایذاء رسانی سے پرہیز، گالی گلوچ نہ کرنے کی تلقین، اچھے برتاؤ کی تعلیم، عیب جوئی اور غیبت، تہمت، ٹوہ میں لگنے سے بچنے کی تاکید، بے یارومددگار نہ چھوڑنے کا حکم وغیرہ دوسری واضح تعلیمات ملتی ہیں، اور اکرام مسلم کو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک جملہ میں یوں ادا کردیا جب انہوں نے کعبۂ مشرفہ پر نظر ڈالی تو اس کی عظمت کی دُہائی دیتے ہوئے کہا کہ کتنی عظیم تمہاری شان ہے اور مؤمن (تو) اللہ کے یہاں تم سے زیادہ عظیم الشان ہے۔

تجارت وصنعت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے کار رہنا پسند نہیں تھا، اس لئے صحابہ آپ کی

صحبت میں رہنے کے فوائد جاننے کے باوجود کاروبار کو نظرانداز نہیں کرتے تھے، تجارت، صنعت، زراعت اور دیگر پیشوں کو اپنی صلاحیتوں سے ترقی دیتے رہتے تھے، اور اپنی اقتصادی زندگی بھی درست رکھتے تھے، اور بعض صحابہ نے تو محض صحبت نبوی اور تعلیم و تعلم کے لئے اپنے کو فارغ بھی کر رکھا تھا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہیں تھا کہ لوگ مانگنے والے بنیں، اسی لیے آپ نے یہ تعلیم دی کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے، اور دو مضبوط لوگ صدقہ مانگنے لگے تو آپ نے ان کو صدقہ دینے سے گریز کیا، اور ان کو کمانے کی ترغیب دی۔

عزت نفس

خودداری، عزت نفس، زہد و قناعت یہ سب ایک دوسرے کی معاون صفات ہیں، ہوس، حرص و طمع، اور خواہشات نفس کی تکمیل کرنا یہ اس کی مخالف صفات ہیں، اس لئے حرص و ہوس سے دور رہنے کو کہا گیا، اور بقدر کفاف مال و متاع کو پسند کیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کھانا پینا، رہن سہن اسی کے مطابق تھا، ہر چیز ضرورت بھر ہوتی، ضرورت سے زائد چیزوں سے دوسروں کی ضرورتیں پوری کی جاتی تھیں، اور آپ نے یہ فرمایا کہ کوئی بھی شخص اس وقت تک مرے گا نہیں جب تک وہ اپنی روزی حاصل نہیں کر لے گا۔

سخاوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے سخی تھے، اپنے خاطر دوسرے دن کا ذخیرہ نہیں کرتے، روز کا روز خرچ کر دیتے، اپنی ذاتی چیز خواہ کتنی اچھی کیوں نہ ہو اگر دوسرے کی طرف سے پسند کا اظہار ہو جاتا تو پھر بلا تکلف اسے مرحمت فرما دیتے، کیوں کہ روز کا روز خرچ کرنے کا معمول تھا، اس لیے اگر مسجد میں بھی یا نماز کی حالت میں یاد آجاتا کہ فلاں چیز باقی رہ گئی، تو نماز کے فوراً بعد گھر جا کر ضرورتمندوں کو دینے کی تاکید کی۔

ایثار وغم خواری

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ ایک آدمی کا کھانا دو کو کفایت کرے گا، اور دو آدمیوں کا کھانا چار کو اور چار کا آٹھ کو کفایت کرے گا، اسی طرح یہ تعلیم دی تھی کہ جس کے پاس ضرورت سے زائد سامان ہو تو وہ یہ زائد سامان اس کو دے دے جس کے پاس وہ سامان نہیں ہے، اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر پورا عمل تھا، اس سے صحابہ کرام کی ایسی تربیت ہوگئی تھی کہ وہ ضرورت سے زائد مال پر اپنا حق ہی نہیں سمجھتے تھے، اور ضرورت کی چیزوں میں بھی دوسرے ضرورت مندوں کے آجانے پر ایثار وقربانی سے کام لے لیا کرتے تھے۔

خیر خواہی و دادرسی

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک مکمل ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند نہ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے، اور صحیح مسلم میں حضرت ابوسعید خدری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے کہ جس نے کسی کی کسی اچھائی کی طرف رہنمائی کی تو اسے اس اچھائی کے کرنے والے کے اجر کے مطابق اجر ملے گا۔

خیر خواہی مختلف نوعیتوں کی بتائی، اللہ کی خیر خواہی، کتاب الٰہی کی خیر خواہی، پیغمبر خدا کی خیر خواہی، پیشوایان مسلمین اور خواص کی خیر خواہی اور عامۃ المسلمین کی خیر خواہی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق مع اللہ اور شفقت علی الخلق بدرجۂ اکمل واتم تھا، اور آپ ہر خیر کو، اللہ اور اس کی کتاب کے ہر فرمان کو، انسان کے فائدہ کی ہر بات کو ہر فرد بشر تک پہنچانے کے لئے کوشاں رہتے، پھر صحابۂ کرام نے آپ کے مشن کو فروغ دینے اور استحکام بخشنے کی جان توڑ کوششیں کیں، جس سے اسلامی نظام کے نفاذ میں مدد ملی۔

صلح ومصالحت

جھگڑوں کو سلجھانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل حکیمانہ اور ہمدردانہ ہوا کرتا تھا، اور بعض اہم کاموں پر اس کام کو فوقیت دیتے تھے جس سے فریقین خود اس کی اہمیت اور ضرورت کا بڑی حد تک اندازہ کر لیتے، اور اپنے نواسہ حضرت حسن بن علیؓ کی سیادت کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان مصالحت کرائے گا۔

خاندانی زندگی

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خاندانی زندگی میں ماں باپ کے رتبہ کو بڑی اہمیت دی ہے، ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ لوگوں میں حسن سلوک کئے جانے کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ فرمایا: ماں، سوال کرنے والے نے تین بار سوال دہرایا۔ تینوں بار یہی جواب دیا گیا، چوتھی بار پوچھے جانے پر کہا کہ باپ، اور دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی بڑی تاکید کی گئی ہو، بلکہ ماں باپ کے تعلق والوں، ان کے اعزاء واقارب، دوست واحباب ان سب کے ساتھ حسن سلوک کو ماں باپ کے ساتھ ہی حسن سلوک بتایا گیا ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رضاعی ماں باپ کا بڑا احترام فرماتے اور حسن سلوک کرتے تھے، اس سلسلہ کی مختلف روایات احادیث میں موجود ہیں۔

صلہ رحمی

صلہ رحمی کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی اور خود آپؐ اس کا بڑا پاس ولحاظ رکھتے تھے، بخاری ومسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص نے

پوچھا کہ مجھے ایسا عمل بتادیجئے جو مجھے جنت میں لے جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی عبادت کرتے رہو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور نماز پڑھتے رہو، زکوٰۃ دیتے رہو، اور صلہ رحمی کرتے رہو، مسلم کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے صلہ رحمی کے ساتھ بتوں کے توڑنے کے ساتھ بھیجا ہے اور یہ کہ اللہ کی توحید بیان کی جائے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

ایک صحابی اپنا قیمتی مال دے دلا کر ختم کرنا چاہتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایماء ان کو یہ بتایا کہ اسے عزیزوں رشتہ داروں میں دیں۔

اہل وعیال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اہل وعیال پر خرچ کرتے تھے، ان کی ضروریات کی تکمیل کی فکر رکھتے تھے، اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے ایک موقع پر صراحت سے یہ فرمایا کہ تم اپنے ورثہ کو مال دار چھوڑ کر جاؤ یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ دو، کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں اور تم جو بھی اللہ کی خوشنودی کے لئے خرچ کروگے اجر پاؤگے، یہاں تک کہ اپنی بیوی کے منہ میں لقمہ دو اس پر بھی اجر ملے گا۔

بیوی پر شوہر کے جو حقوق بنتے ہیں ان کی بھی تعلیم دی، یہاں تک کہ یہ فرمایا کہ اگر میں کسی کو کسی کے آگے سجدہ کرنے کو کہتا تو عورت سے کہتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، اور یہ بھی فرمایا کہ جو خاتون اس حال میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے راضی ہو وہ جنتی ہے، گھر والوں کے تعلق سے یہ بات بھی فرمائی کہ تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ بہتر ہو اور میں تم سب میں اپنے گھر والوں میں بہتر ہوں، احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر والوں کے شوق وجذبات کی بھی رعایت رکھتے تھے اور سخت گیر واقع نہیں ہوئے تھے، البتہ تعلیم وتربیت

کے عمل کو بھی جاری رکھتے تھے۔

تربیت اولاد میں آپ کا انداز واسلوب حکیمانہ ہوتا تھا، جیسے نماز کا عادی بنانے کے لئے سات سال کی عمر سے شوق دلانے اور دس سال کی عمر میں کوتاہی پر تادیب کرنے کی بات فرمائی اوراس عمر میں پہنچ جانے کے بعد ایک بستر پر سلانے سے منع فرمایا، کھانے پینے میں بھی بچوں کو نظر انداز نہیں فرماتے، اوراس میں نامناسب عمل کو دیکھتے تو روک ٹوک کرتے، حضرت حسن چھوٹے تھے نامناسب چیز منھ میں رکھ لی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو منع فرمایا اور فرمایا کہ اس کو نکالو (منھ سے) تم کو معلوم نہیں ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے، اسی طرح ایک بچہ کا جو آپ کی کفالت میں تھا پلیٹ میں ہاتھ ادھر اُدھر چلا رہا تھا، آپ نے منع فرمایا، اور فرمایا کہ بسم اللہ کرو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ، اور سامنے سے کھاؤ۔

کمزور ومعذور افراد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور اور معذور افراد کا بڑا خیال فرماتے تھے، اور صحابہ کو بھی اس کی تعلیم دیا کرتے تھے، جب کبھی ایسا ہوا کہ کسی مصلحت کی وجہ سے کسی صحابی نے جماعت صحابہ کے کمزور لوگوں کے مقابلہ قریش کے بااثر ونفوذ لوگوں کی طرف دھیان دیا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا اور کمزور افراد کی دلجوئی کا بڑا خیال رکھا، ایک موقع پر ایک مالدار صحابی کو کمزور حیثیت کے صحابہ پر اپنی برتری کا خیال ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کو بھی باقی نہیں رہنے دیا اور فرمایا کہ " هَلْ تُنصرَون و تُرزَقون إلا بِضُعفائِكم" کہ تمہاری نصرت ہوتی ہے اور تمہیں رزق ملتا ہے تمہارے انہی کمزور (اور معذور) افراد کے طفیل (بخاری) اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کی کفالت کرنے والے کی فضیلت، لڑکیوں اور بہنوں کی پرورش کرنے والے کو بشارت دی، بیوہ عورت اور غریب محتاج شخص کی فکر وکوشش کرنے

والے کو مجاہد فی سبیل اللہ کا مرتبہ دیا، دعوتوں خصوصاً ولیمہ کی دعوت میں غریبوں کو پوچھے جانے پر زور دیا، اور ہر موقع پر ان کا خیال رکھا، ان کی دلداری کا بھی دھیان رکھا۔

پڑوسی

پڑوسیوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات بہت واضح اور صریح ہیں، مأکولات و مشروبات میں ان کا خیال، زمین و جائداد کے لین دین میں ان کی رعایت، ہر معاملہ میں ان کے ساتھ اچھے برتاؤ کرنے کی نبوی تعلیمات میں تاکید ملتی ہے، اور یہ سب پڑوسی کے حقوق ہیں، ایک حدیث کے الفاظ ہیں کہ جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو تو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے (بخاری و مسلم) تکلیف نہ ہی جسمانی ہو نہ ہی ذہنی ہو، پڑوسی کی نوعیتیں الگ الگ ہیں: برتاؤ میں نوعیت کا بھی خیال رکھا جائے گا، اس میں بھی ہمارے لئے اسوۂ نبوی موجود ہے۔

مہمان نوازی

مہمان نوازی کی احادیث مبارکہ میں بڑی تاکید آئی ہے، مہمان کے اکرام اور اس کی خاطر تواضع کو کہا گیا ہے، ایک رات کی ضیافت کو تو مہمان کا حق قرار دیا گیا ہے، اور اصل ضیافت تین دن کی قرار دی گئی ہے، اور اس میں بھی ایک دن اور ایک رات خصوصیت کے ہیں۔

میزبان کے لئے جہاں تاکیدات ہیں وہیں مہمان کے لئے بھی ہدایات ہیں، وہ یہ کہ مہمان مہمان ہی کی طرح رہے وہ مقیم نہ بن جائے، میزبان کو بلا وجہ زحمت میں نہ ڈالے، اس کے کاموں میں رخنہ انداز نہ ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کا ایسا مزاج تشکیل دیا تھا کہ وہ مہمان کی آمد سے بڑے ہی مسرور ہوتے اور مہمان نوازی کے لئے منافست کی نوبت آنے لگتی، مہمان کے خاطر اپنا کھانا پینا مؤخر

کر دیتے اور مہمان کو مقدم رکھتے، اور ایسا بھی ہوا کہ جو کچھ تھا مہمان کے لئے پیش کر دیا اور خود بھوکے رات گزار دی۔

شفقت علی الخلق

ساری مخلوق پر شفقت و ترحم یہ بھی نبوی اخلاق میں ہے، آپ نے ہی یہ بشارت دی کہ رحم کرنے والوں اور مہربانی سے پیش آنے والوں پر رحمٰن مہربان ہوتا ہے، جو زمین پر ہیں ان پر رحم کرو جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا، اور یہ بھی فرمایا کہ جو رحم نہیں کیا کرتا اس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا، اور ایک صحابی نے دریافت کیا کہ خادم کو کتنی معافی دی جائے؟ فرمایا: ستر بار روز، اسی طرح کسی کو دیکھا کہ غلام کو کوڑے سے مار رہے ہیں، فرمایا: اللہ اس سے کہیں زیادہ تم پر قدرت رکھتا ہے، جتنی قدرت اور زور تم اس غلام پر رکھتے ہو، اسی طرح ایک موقع پر وعید سنا کر ڈرایا بھی کہ جو لوگوں کو دنیا میں عذاب میں مبتلا کرتے ہیں انہیں اللہ عذاب دے گا۔

جانوروں کے سلسلہ میں بھی اچھے برتاؤ کی ہدایات دیں، اور یہ واقعہ سنایا کہ ایک عورت کو اس بات پر عذاب دیا گیا کہ اس کے پاس بلی تھی اسے اس نے کھلایا پلایا نہیں اور نہ کھانے پینے کے لئے ادھر اُدھر جانے دیا۔ اور ایک واقعہ اس کے برعکس سنایا کہ ایک شخص کو راستہ میں شدید پیاس لگی، اس نے کنویں سے پانی نکالا اور پیا پھر دیکھتا کیا ہے کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی کھا رہا ہے، اس شخص نے کنویں سے پانی لے کر اسے بھی پلایا، اللہ کو اس شخص کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اس کی مغفرت فرما دی، صحابہ نے حضور سے عرض کیا، بہائم (جانوروں) کے تعلق سے بھی ہمارے لئے اجر ہے، فرمایا: ہر جاندار چیز میں اجر ہے، اسی طرح جانوروں کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی تعلیم دی کہ ان پر سوار ہو تو مناسب طریقہ سے ہو، ان کو کھاؤ تو مناسب طریقہ سے کھاؤ، اور بھی ہدایات اور تعلیمات ہیں، یہاں تک کہ ذبح کئے

جانے والے جانوروں کے سلسلہ میں یہ ہدایت کی کہ ذبح کرتے وقت چھری تیز کرلی جائے، یہ سب اس لئے تھا کہ جانوروں کو بھی بلاوجہ اذیت نہ پہنچے۔

نیک صحبت اور اچھا ماحول

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک صحبت، اچھے ہمنشینوں، سازگار ماحول کی اہمیت وضرورت مثالوں اور مختلف طریقوں سے باور کرائی ہے، ان کے جو غیر معمولی اور غیر شعوری اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں، اس کی طرف احادیث میں توجہ دلائی گئی ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے تم میں سے جس کو دوستی کرنی ہو وہ پہلے دیکھ لے کہ کس سے دوستی کرنے جارہا ہے، اسی لئے شادی میں بھی اس کا خیال رکھنے کو کہا اور اس قانون کو بہترین مال قرار دیا جو اپنے ایمان کے ساتھ اپنے شوہر کے ایمان میں معین ومددگار ہو، اسی طرح عورت کے نکاح میں جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ان میں دین دیکھے جانے کی صورت میں کامیابی کی بشارت دی۔

آداب زندگی

غریب پروری، سلام میں پہل، خندہ پیشانی سے ملنا، کسی بھی اچھے کام کو نظر انداز نہ کرنا، اس جذبہ سے مصافحہ کرنا کہ جب دو مسلمان ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں تو ان کے الگ ہونے سے پہلے ہی دونوں کی مغفرت کردی جاتی ہے، آنے والے کا استقبال کرنا، زیادہ تعلق والا ہو تو معانقہ بھی کرنا، کسی کے گھر جایا جائے تو اجازت لی جائے، تین بار ایسا کرنے پر کچھ نہ ہو تو لوٹ آیا جائے، نشست گاہ میں کسی کی جگہ پر نہ بیٹھا جائے، گردنوں کو پھلانگ کر آگے نہ بڑھا جائے، اسی طرح نماز کی صفوں میں جہاں جگہ ملے وہاں بیٹھ جائے، کوئی دو لوگ بات کررہے ہوں بیچ میں گھسا نہ جائے، جس کے چھینک آئے وہ الحمدللہ کہے، اس کا ہم نشیں "یرحمك الله" کہے، پھر اس کو

چاہئے کہ "یھدیکم اللّٰہ ویصلح بالکم" کہے، مریض کی عیادت کی جائے، تیمارداری کی ضرورت ہو تو اس میں بھی حصہ لیا جائے، کھانے کے بھی کچھ آداب ہیں، اللہ کا نام لے کر کھانا کھانا شروع کرے، بھول جائے تو جب یاد آجائے تو ایسا کرے، اور اس کی تلافی بھی کرے، کھانے میں عیب نہ نکالے، پسند ہو تو کھائے ورنہ چھوڑ دے، پلیٹ میں ادھر اُدھر ہاتھ نہ مارے سامنے سے لے، داہنے ہاتھ سے کھائے، پانی پینے میں بھی آداب کا خیال رکھے برتن میں سانس نہ لے، تین سانسوں میں پئے، اللہ کا نام لے کر پینا شروع کرے، جب پی چکے تو اللہ کی حمد بیان کرے، کھڑے ہو کر کھانے پینے میں احتیاط کرے، ماء زم زم کا استثناء ہے، اس کا کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے۔

لباس کے بھی آداب ہیں ان کا بھی لحاظ رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سفید کپڑے پسند تھے، لنگی ہو یا پائجامہ اس کا خیال رہے کہ ٹخنے کھلے رہیں، عورتیں ٹخنے بند رکھیں گی، اگر اللہ نے حیثیت دی ہے تو وہ حیثیت ظاہر بھی ہو، یہ احسان مندی کی بات ہے، مگر کم حیثیت والوں کو کسی لحہ بھی حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھے، ریشمی لباس مرد نہ پہنیں، سونے کا استعمال بھی نہیں کریں گے، دوا کے طور پر ایسا کیا جاسکتا ہے، ایسے موقعہ پر اس کی اجازت ثابت ہے۔

سفر کے بھی کچھ آداب ہیں، تنہا سفر کرنے میں مضرت ہے، اچھا تو یہ ہے کہ تین سے کم نہ ہوں، اور ان میں ایک کو امیر بنالیا جائے، عورت اپنے محارم کے ساتھ ہی سفر کرے، سفر میں کھانے، پینے، سونے کے سب معمولات متاثر ہوتے ہیں، اس لئے سفر میں اتنا ہی رہے، جتنی ضرورت ہو، لمبی مدت غیر حاضری کے بعد رات کو اچانک گھر نہ آئے، سفر واپسی پر پہلے مسجد جائے، دو رکعت نماز پڑھے۔

رہن سہن کے بھی کچھ آداب ہیں، نگاہ اپنے سے کم پر رہے، اونچے پر نہ رہے، تاکہ اللہ کی نعمتوں کی قدر دانی ہو، اور حسد پیدا نہ ہو، راستہ میں بیٹھنے سے گریز

کرے، اگر بیٹھ رہا تو پھر راستہ کے حقوق ادا کرے وہ یہ ہیں کہ نگاہ نیچی رکھے، تکلیف دہ چیز کو ہٹائے (مثلاً کانٹا، پتھر، غلاظت وغیرہ) سلام کا جواب دے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام بھی کرے، مرد وعورت اس کا لحاظ رکھیں کہ وہ مرد وعورت کی پوشیدہ چیزوں پر نظر نہ پڑنے دیں، ایک اوڑھنی دو لوگ نہ اوڑھیں، مرد عورتوں کی مجلسوں میں جانے سے بچیں، مرد اپنی بیویوں کی اور عورتیں اپنے اپنے شوہروں کی قدر کریں، ان ساری چیزوں کی رہنمائی احادیث نبوی سے ملتی ہے۔

خوش اخلاقی اور تواضع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ ترین اخلاق پر فائز تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے خود فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ (القلم: ٤) کہ آپ تو اعلیٰ ترین اخلاق پر فائز ہیں، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جنہوں نے خدمت گزاری کے دس سال صحبت نبوی میں گزارے، کہتے ہیں کہ میں نے دس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی، آپ نے کبھی ''اُف'' بھی نہ کیا، میری کسی زیادتی پر نہ یہ کہا کہ یہ کیوں کیا؟ اور نہ ہی میری کسی کوتاہی پر یہ کہا کہ ایسا کیوں نہیں کیا؟ (بخاری ومسلم) اور انہی سے یہ بھی روایت ہے کہ بچیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ لیتیں اور جدھر چاہتیں لے چلتیں، انہی سے روایت ہے کہ بچوں کے پاس سے آپ گزرتے تو سلام میں پہل کرتے۔

احادیث میں اور سیرت کی کتابوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش اخلاقی اور تواضع کے بکثرت واقعات مذکور ہیں، زبان بڑی صاف ستھری اور پاکیزہ استعمال کرتے تھے، اور بے ہودہ باتوں اور نازیبا کاموں کو بہت ہی ناپسند کرتے، وہ فرماتے تھے کہ اللہ بے ہودہ باتیں کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے، اور یہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن حسن اخلاق سے صائم النہار اور قائم اللیل شخص کا درجہ حاصل

کر لیتا ہے، اور اچھے اخلاق والوں کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ روز قیامت میں ان کی نشستیں مجھ سے قریب تر ہوں گی اور وہ میرے پسندیدہ ترین لوگوں میں ہوں گے، نیکی کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا: نیکی حسن اخلاق ہے، تواضع کے بارے میں فرمایا: تواضع کیا کرو، یہاں تک کہ کوئی کسی چیز پر فخر نہ کرے، اور نہ ہی کوئی کسی پر زیادتی کرے، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ کے لئے جو تواضع کرتا ہے، اللہ اس کو بلندیوں پر پہنچاتا ہے۔

نرمی اور بردباری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نرم طبیعت تھے، نرمی پسند کرتے تھے، طیش میں نہیں آتے تھے، بردبار، پروقار تھے، آسان چیزوں کو اختیار کرتے تھے، البتہ اس میں گناہ کا شائبہ محسوس کرتے تو اس سے بہت دور رہتے اور عزیمت پر ہی عمل کرتے، اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا، اللہ کا معاملہ ہوتا تو پھر انتقام لیتے، ایک موقع پر آپ نے فرمایا: پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے کو قابو میں رکھتا ہے، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو نرمی سے محروم کر دیا گیا وہ خیر کے بڑے حصہ سے محروم کر دیا گیا، مسجد میں ایک اعرابی نے پیشاب کر دیا لوگ تنبیہ کے لئے اس کی طرف بڑھے، آپ نے نرمی سے پیش آنے کی تاکید کی اور فرمایا: چھوڑ دو اور پیشاب پر پانی بہا دو۔

سچائی

سچائی اچھائیوں کو وجود میں لاتی ہے، اور جھوٹ خرابیوں کو جنم دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سچائی کی بڑی تاکید فرمایا کرتے تھے، ہر سنی سنائی بات نقل کرنے کو بھی صحیح نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ اس سے منع کیا، جھوٹ کو اتنا سنگین گناہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک موقع پر چند سوالات کئے گئے، اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کیا مؤمن جھوٹا بھی ہوتا ہے؟ فرمایا: ''نہیں'' ہنسانے کے لئے محفل

سجانا آپ کو پسند نہیں تھا، کہ ایسا شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، آپ نے فرمایا تھا کہ بربادی ہو ایسے شخص کی جو لوگوں کو ہنسانے کے لئے باتیں کرتا تو جھوٹ بولتا ہے، بربادی ہو اس کی، بربادی ہو اس کی۔

امانت داری اور وفاداری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وعدہ کے بڑے پکے تھے اور بڑے امین تھے، عرب آپ کو "الصادق الأمين" کہتے تھے، آپ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں، باتیں کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو پورا نہیں کرتا، امانتیں اس کے پاس رکھائی جاتی ہیں تو خیانت کرتا ہے (بخاری ومسلم) اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ عہد کرتا ہے تو عہد کو توڑتا ہے، لڑتا جھگڑتا ہے تو گالی گلوچ کرتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ بچوں کو بہلانے پھسلانے کے لئے اچھے اچھے وعدے کئے جائیں اور پھر پورے نہ کئے جائیں، اللہ اور اس کے رسول سے عہد کو توڑنے والوں کے بارے میں دشمنوں کے نرغہ میں آجانے کی بات فرمائی۔

شرم وحیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیا کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے اور یہ کہ حیا سے خیر ہی وجود میں آتا ہے، اور یہ کہ بے حیائی جس چیز میں آجاتی ہے، اسے داغدار کر دیتی ہے، اور یہ کہ حیا اسلام کے اخلاق میں ہے، اور یہ کہ شرم وحیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو، اور یہ کہ حیا سر، آنکھ، دماغ، کان، ناک اور پیٹ، ہاتھ پیر سبھی چیزوں میں ہو، سبھی چیزوں میں اللہ کا پاس ولحاظ رہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیا کا حال یہ تھا کہ جب وہ کسی ایسی چیز کو دیکھتے جو آپ کو ناگوار گزرتی، صحابہ کہتے ہیں اس کا اثر ہم لوگ آپ کے روئے انور پر محسوس کرتے۔

صبر و شکر

مؤمن کی آزمائش صبر و شکر کے ذریعہ سے بار بار کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے دونوں پر بڑا اجر و ثواب رکھا ہے، حضرت صہیب کی روایت صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مؤمن کا معاملہ ہی عجیب ہے، اس کا تو سب کچھ خیر خواہی ہے، اور یہ بات مؤمن کے علاوہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں، خوشی اور اچھائی کے موقع پر شکر گزار ہوتا ہے تو یہ اس کے لئے خوبی کی بات ہوتی ہے، پریشانی اور برائی کے موقع پر صبر و برداشت سے کام لیتا ہے تو اس میں بھی اس کے لئے خیر ہی خیر ہوتا ہے، سنن ترمذی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک نمازوں میں کھڑے رہتے کہ قدم مبارک ورم کر جاتے، صحابہ عرض کرتے کہ آپ کو اللہ نے معصوم کر دیا ہے، آپ کیوں اتنی تکلیف اُٹھاتے ہیں؟ فرماتے کہ کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود تو اللہ کی حمد و ثنا اور اس کے شکر و احسانمندی میں سرشار رہتے ہی تھے، صحابہ کی بھی ایسی تربیت فرمائی تھی کہ ان پر اس کا عکس پڑا تھا، ایک لقمہ بھی کھاتے تو اللہ کا شکر کرتے، ایک گھونٹ پانی پیتے تو اللہ کا شکر کرتے، دوسرا کوئی شخص احسان کرتا تو اس کے بھی بڑے ممنون ہوتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی تھی کہ جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ کا بھی شکر گزار نہیں بنتا، چنانچہ صحابہ نے دونوں باتوں کو جمع کیا تھا۔

جہاں تک صبر و برداشت کا تعلق ہے تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا اسوہ ہمارے سامنے ہے، آپؐ نے فرمایا کہ مؤمن اور مؤمنہ پر آزمائشیں آتی رہتی ہیں، اس کی اپنی ذات کے تعلق سے، اس کے مال و اولاد کے تعلق سے، یہاں تک کہ وہ اللہ سے ملے گا، اس پر گناہ نہ رہے گا (ترمذی) اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مسلمان کی فضیلت بتائی جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور لوگوں کی اذیتوں پر

صبر سے کام لیتا ہے، ایک عورت قبر کے پاس کھڑی رو رہی تھی، آپؐ نے اس سے فرمایا: اللہ سے ڈرو۔ اس نے پلٹ کے جواب دے دیا کہ پرے ہٹ تمہیں تو میری جیسی مصیبت پہنچی نہیں، حضور خاموش رہے، وہ بعد میں بڑی شرمندہ ہوئی کہ وہ نہ پہچان پائی تھی یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پھر آ کر اس نے معافی مانگی، پھر آپ نے اس کو یہ نصیحت کی کہ پہلی چوٹ پر برداشت سے کام لینا ہی صبر ہے۔

توکل

جب غار ثور کے آس پاس مشرکین پہنچ گئے تھے، اس وقت حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ خیال آیا کہ اگر یہ ہمارے نقش قدم دیکھ لیں گے تو ہمیں بھی دیکھ لیں گے، ایسے دو کے بارے میں تم کیا سوچ رہے ہو جن کا تیسرا اللہ ہے، اور ایک موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ بات دہرائی کہ جب انہیں آگ میں ڈالا گیا، انہوں نے بس یہ کہا تھا" حسبنا اللّٰہ و نعم الو کیل" اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب اختیار کرنے کے ساتھ تمام امور میں مسبب الاسباب پر نگاہ جمائے رکھنے کی تعلیم دی، اور ایک بار یہ بات ایک مثال سے سمجھائی کہ صحیح مسلم میں ہے کہ جنت میں ایسے لوگ جائیں گے جن کے دل پرندوں کے دل کے مانند ہوں گے۔

تقویٰ

تقویٰ کئی طرح کا ہے، سب سے پہلے یہ ہے کہ شرک سے تقویٰ اختیار کیا جائے، پھر یہ ہے کہ معاصی سے تقویٰ اختیار کیا جائے، پھر شبہ کی چیزوں سے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سلسلہ میں اور عورتوں کے تعلق سے خاص طور پر تقویٰ اختیار کرنے کو فرمایا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا یہ طریقہ بھی بتایا ہے کہ جہاں کہیں رہا جائے اللہ کا پاس ولحاظ رکھا جائے، کوئی برائی ہو جائے تو اس کا اثر مٹانے کے لئے اچھائی کا عمل کیا جائے، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیا جائے،

حلال وحرام کے سلسلہ میں یہ تعلیم دی کہ حلال وحرام واضح ہیں، ان کے درمیان کچھ شبہ کی چیزیں ہیں جن کی حقیقت اکثروں کو معلوم نہیں، ان کے سلسلہ میں بھی آپ نے احتیاط کی تعلیم دی ہے، اور حضرت حسن بن علیؓ (نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے نانا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم نقل کی ہے کہ "دع مایریبك إلیٰ مالا یریبك" (شک والی چیزوں کو چھوڑ دو، جس میں شبہ نہیں ان کو اختیار کرو)۔

استقامت

جس نیک کام کو شروع کیا جائے پھر اس کو کیا جاتا رہے، چاہے تھوڑا ہی کیوں نہ ہو، اس میں کچھ کوتاہی ہوجائے تو چاہیے کہ دوسرے وقت اس کی تلافی کرلے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ رات کے معمولات میں کوئی فرق واقع ہوجاتا تو دن میں اس کی تلافی کرلیا کرتے تھے۔

میانہ روی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبادت بھی کرتے تھے، معاملات بھی کرتے تھے، حقوق العباد بھی ادا کرتے تھے، گھر میں بھی وقت دیتے تھے، بعض صحابہ کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حال میں دیکھا کہ وہ صرف عبادت ہی میں لگے ہیں تو ان کی زندگی اور امور کی طرف بھی متوجہ کیا، اور حسب استطاعت وطاقت عبادت کے معمولات اختیار کرنے کی تعلیم دی، نیند کے غلبہ کی صورت میں سونے کو فرماتے، یہاں تک کہ نیند کا اثر زائل ہوجائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت وتقریر میں اس بات کا لحاظ رکھتے تھے کہ سننے والا اکتائے نہیں، نمازوں میں بھی اس کا خیال رکھتے تھے کہ بچے، کمزور، بیمار، معذور افراد بھی ہیں۔

قرآن مجید کی تلاوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی تلاوت کی ترغیب طرح طرح

سے دی، مثالوں سے بھی اس کی اہمیت اوراس کے دوررس اثرات کو سمجھایا ہے، جیسے تلاوت کرنے والے مومن کی مثال اس پھل سے دی ہے جس کی خوشبو اور مزا دونوں بہت خوب ہوتا ہے اور جو تلاوت نہیں کرتا اس کی مثال اس پھل سے دی ہے جو میٹھا تو ہوتا ہے، مگر خوشبو ندارد، اور اسی طرح ایسے شخص کے لئے دوگنے اجر کی بات فرمائی ہے جو قرآن مجید تلاوت کرتا ہے مگر زبان اٹکتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض آیات قرآنی اور بعض سورتوں کے الگ الگ دینوی فائدے بھی بتائے، اور فتنوں سے حفاظت کا سامان بھی بتایا ہے، مثلاً سورۂ کہف کے جمعہ کے دن اس کی پابندی کرنے والے پر دجال کا زور نہیں چلے گا، رات میں بستر پر آکے آیت الکرسی پڑھنے سے شرور وفتن اور شیاطین سے حفاظت کا سامان ہے، سورۂ تبارك الذی میں شفاعت ومغفرت کا سامان ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سورۂ قل هو الله أحد، قل أعوذ برب الفلق اور قل أعوذ برب الناس کے تعلق سے یہ معمول تھا کہ رات کو سوتے وقت ہتھیلیوں کو ملا کر اس میں دم فرماتے اور پھر سر چہرہ اور جسم کے اگلے حصہ پر ہاتھ پھیر لیا کرتے، تین بار ایسا کیا کرتے، اسی طرح جب کوئی تکلیف ہوتی، یہ سورتیں پڑھ کر دم کرلیا کرتے، قرآن مجید کی تلاوت کا بڑا اہتمام فرماتے، اور قرآن مجید بعض صحابہ سے سنتے بھی، اور تلاوت کے دوران اور سننے کے دوران آپ پر کیفیت طاری ہوجاتی، خشیت نمایاں ہوجاتی، آنکھیں ڈبڈبا جاتیں بلکہ بہہ پڑتیں۔

اذکار

اللہ کی یاد، اس کا دھیان، اس کا استحضار یہ وہ دولت ہے جس کو نصیب ہوجائے اسے پھر اس سے بڑھ کر کسی دولت کی تمنا نہیں رہ جاتی، اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے: ﴿ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴾ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث قدسی میں مروی ہے کہ اللہ فرماتا ہے جب بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، وہ مجھے اگر اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں، وہ

اگر مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے ایسے مجمع میں جو اس مجمع سے کہیں زیادہ بہتر ہے یاد کرتا ہوں (بخاری و مسلم)

اللہ کا نام لینا زبان کے لئے انتہائی شرف کی بات ہے، زبان کے اثرات جسم کے روئیں روئیں پر پڑتے ہیں، زبان کو کسی چیز کا مزہ چکھا دیا جائے تو پھر جسم اس سے محظوظ ہوتا ہے، ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اسلام کے احکام بہت سارے ہو گئے ہیں، ایسی جامع چیز مجھے بتا دیجئے جسے میں مضبوطی سے پکڑ لوں، فرمایا: اپنی زبان اللہ کے ذکر تر رکھو (ترمذی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اذکار میں لآ إلـه إلا الله کو سب سے افضل قرار دیا ہے، اس سے ایمان کی تجدید بھی ہوتی رہتی ہے اور گناہوں کے اثرات زائل ہوتے ہیں اور قلب منور ہوتا ہے اور اس کا اہتمام کرنے والا رسوا نہیں ہوتا، سبحان الله و بحمده سبحان الله العظيم کو بھی بڑے ثواب کا کلمہ بتایا ہے، اور امام بخاری نے اس کی فضیلت والی حدیث پر اپنی صحیح مکمل کی ہے، اور لا حول و لا قوة إلا بالله کو ایک حدیث جنت کا خزانہ قرار دیا ہے، اور اللہ نے اس میں دل، روح اور جسم کے امراض کی شفا بھی رکھی ہے، اور بھی اذکار ہیں جن کی آپ نے تعلیم دی، اپنی چہیتی صاجزادی سيدة نساء أهل الجنة حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو سوتے وقت ۳۳ بار سبحان الله، ۳۳ بار الحمد لله اور ۳۳ بار الله أكبر پڑھنے کی تاکید فرمائی، اور الله أكبر کو ۳۴ بار کرنے کو ایک روایت میں ہے سبحان الله کو ۳۴ بار کرنے کو کیا، اس طرح سو کی تعداد ہو جاتی ہے، اس میں آخرت کا جو اجر اور اللہ کی رضا کا جو سامان ہے وہ الگ ہے، دنیا میں الگ فائدے ظاہر ہوتے ہیں، زندگی اور دوسرے اعمال خیر میں نورانیت اور برکت ہوتی ہے، پریشانیاں اور مصائب دور ہوتے ہیں، مشقت کے کاموں میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور تعب نہیں ہوتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جن حالات میں اس کی تعلیم دی اس کا پس منظر یہی بتاتا ہے۔

اسی طرح ترمذی اور بیہقی کی روایت میں اللہ تعالیٰ کے ۹۹ اسماء وصفات کی بھی بڑی فضیلت آئی ہے کہ جس کی یادداشت اور دھیان میں یہ رہیں گے وہ جنتی ہے یعنی اس کے لیے اعمال خیر کرنا آسان ہو جائے گا اور اعمال شر سے حفاظت ہوگی۔

دعا

دعا یعنی اللہ سے سوال کیا جائے، اللہ سے مانگا جائے، اللہ کے سامنے اپنی ضرورت رکھی جائے، اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ بس میں ہے وہ اللہ کے ہی بس میں ہے، یہ ایسا عمل ہے جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کا مغز قرار دیا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ دعا ہی ہے جو تقدیر پر بھی اثر ڈالتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں صرف اپنی ذات کے لئے نہیں تھیں، پوری امت کے لئے، پوری انسانیت کے لئے ہوتی تھیں، اور صرف اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے ہی نہیں قیامت تک کے آنے والے لوگوں کے لئے ہوا کرتی ہیں، بعض ایسے مواقع بھی آئے ہیں کہ آپ کو بددعا دینی پڑی مگر ایسے مواقع بہت کم ہیں، اور جو ہیں بھی وہ دین کے تعلق سے ہیں، اپنی ذات کے خاطر کبھی کسی کو بددعا نہیں دی، طائف میں کیسے سخت حالات آئے، مگر آپ نے بددعا نہیں دی، بلکہ ہدایت کی دعا ہی دیتے رہے، امت کو بھی آپ نے دعا کرنے اور دعا دینے کی تلقین فرمائی، پیٹھ پیچھے دعا کی فضیلت بھی بتائی کہ یہ خود دعا کرنے والے کے حق میں خصوصیت سے قبول ہوتی ہے، دعاؤں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع دعائیں پسند تھیں، اور یہ دعا بڑی پسندیدہ تھی جو آپ اکثر مانگا کرتے تھے، (بخاری ومسلم میں وہ یوں ہے) اللّٰھم آتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة وقنا عذاب النار.

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سستی، بزدلی، کنجوسی، بے بسی، سخت بڑھاپا، عذاب قبر اور زندگی اور موت کی آزمائشوں سے خصوصیت سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے اور

تزکیۂ نفس وتقویٰ کی زندگی کی دعا کیا کرتے تھے، جب کہ آپ تقویٰ کے سب سے اعلیٰ معیار پر تھے، اور تزکیہ کے سب سے بلند مقام پر تھے، عمل مقبول، علم نافع، اور پاکیزہ روزی اور قلب سلیم کی بھی دعائیں مانگتے جب کہ یہ ساری چیزیں آپ کو بدرجۂ اتم حاصل تھیں مگر آپ کے اس عمل میں امت کے لئے نمونہ تھا، اس طرح دعاؤں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جو احادیث مبارکہ میں موجود ہے، اور اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تصنیف کی گئی ہیں، بعض انبیاء کی دعائیں بھی آپ سے منقول ہیں، کوسنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ اپنے کو نہ کوسو، نہ اولاد کو، نہ اپنے خدمت گزاروں کو اور نہ ہی اپنے اموال کو، کونسی گھڑی ہو جس میں کوسا گیا وہ لگ جائے۔

مخصوص اوقات کی دعائیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، صبح کی، شام کی، رات کی، سونے کی، جاگنے کی، بیوی سے ملاقات کرنے کی، بیت الخلاء جانے کی، بیت الخلاء سے نکلنے کی، دسترخوان کی، لباس پہننے کی، گھر سے نکلنے کی، سواری کی، سفر سے واپسی کی، مسافر کو رخصت کرنے کی، آزمائش میں مبتلاء شخص کو دیکھنے کی، آندھی کے وقت کی، بارش کی، چاند دیکھنے کی، عیادت کی، بینائی سے محروم شخص کے لئے اور اس طرح موقع موقع کی دعائیں منقول ہیں، جن کا اہتمام کیا جانے لگا تو بہت سے مصائب وامراض اور مشکلات خود بخود درفع ہو جائیں گے۔

توبہ، انابت اور استغفار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی نہایت پاکیزہ تھی، مگر اس پاکیزگی کے باوجود، توبہ کے جملوں اور مغفرت ورحمت کی دعاؤں کا اہتمام رہتا اور انابت کی کیفیت طاری رہتی، یہ آپ کی تواضع بھی تھی، اور اس میں امت کی تربیت کا سامان بھی تھا، آپ نے اس کی مختلف نوعیتوں اور مثالوں سے تعلیم دی ہے اور بہترین آدمی

وہ قرار دیئے ہیں جن سے غلطیاں سرزد ہوں اور وہ فوراً توبہ کرتے ہیں، استغفار کو لازم پکڑنے والے کے لئے آپ کی پیشین گوئیاں بھی ہیں کہ مشکلات اس کی دور ہوں گی، جہاں سے گمان وخیال بھی نہ ہوگا وہاں سے رزق پہنچے گا، تنگیاں فراخی ووسعت میں بدل جائیں گی، استغفار کے بعض ایسے کلمات کی بھی تعلیم دی جن سے بڑے بڑے گناہ بھی معاف ہوجاتے ہیں، استغفار کے بعض ایسے کلمات بھی بتائے جن کو اگر پورے یقین کے ساتھ بندہ کہتا ہے اور اسی دن یا جس رات کو کہا اسی رات کو وہ مرجاتا ہے تو اس کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔

درود شریف

درود شریف ایک ایسا عمل ہے جو صرف انسانوں پر لازم نہیں کیا گیا، فرشتے بھی اس پر مامور ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود ورحمت بھیجتا ہے، اور مؤمنین سے اس کا مطالبہ ہے وہ بھی درود کا اہتمام کریں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے درود شریف پڑھنے والے کے متعلق فرمایا کہ جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار رحمت بھیجتا ہے، اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ روز قیامت میں مجھ سے قریب ترین لوگ وہ ہوں گے جو مجھ پر زیادہ سے زیادہ درود بھیجتے ہوں گے، اور امت کو اس پر بھی اطمینان دلایا کہ تم جہاں کہیں سے درود بھیجو گے وہ مجھے پہنچے گا، جمعہ کے دن خصوصیت سے درود شریف کے اہتمام کی تاکید فرمائی، اذان سننے کے بعد بھی درود شریف کے اہتمام کی تاکید فرمائی، دعاؤں میں زیادہ سے زیادہ درود شریف کے اہتمام کو مسائل ومشکلات کا حل بتایا اور مغفرت کا سامان بھی۔

حضرت کعب بن عجرہ کی روایت صحیح بخاری ومسلم میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باہر ہم لوگوں کے پاس تشریف لائے تو ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ آپ پر سلام کیسے بھیجیں، اس سے بھی

واقف کرادیں کہ درود کیسے بھیجیں؟ فرمایا: کہو:

اللّٰهم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت
علیٰ إبراهیم وعلیٰ آل إبراهیم إنك حمید مجید.
اللّٰهم بارك علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما بارکت
علیٰ إبراهیم وعلیٰ آل إبراهیم إنك حمید مجید.

باب چہارم

ازواج مطہرات (امہات المومنین)

وذریت طیبہ رضی اللہ عنہم اجمعین

(از افادات)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی قدس سرہ

اپنے آقا اور دو جہاں کے سردار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں اور اولاد کا حال معلوم کرنے کا اشتیاق ہوا کرتا ہے اور ہر مسلمان کو ہونا چاہئے بھی، اس لیے مختصر حال ان کا لکھا جاتا ہے کہ تفصیلی حالات کے لیے تو بڑی ضخیم کتاب چاہئے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جن پر محدثین اور مؤرخین کا اتفاق ہے گیارہ عورتوں سے ہوا، اس سے زیادہ میں اختلاف ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ ان سب میں پہلا نکاح حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے ہوا، جو بیوہ تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اس وقت ۲۵ ربرس کی تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ ربرس کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد بھی بجز حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سب انھیں سے ہوئی، جن کا بیان بعد میں آئے گا۔

۱-اُمّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی سب سے اول تجویز ورقہ بن نوفل سے ہوئی تھی، مگر نکاح کی نوبت نہیں آئی، اس کے بعد دو شخصوں سے نکاح ہوا، اہل تاریخ کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں پہلے کس سے ہوا، اکثر کی رائے یہ ہے کہ پہلے عتیق بن عائذ سے ہوا، جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی، جن کا نام ہند تھا، اور وہ بڑی ہو کر مسلمان ہوئیں اور صاحب اولاد بھی، اور بعضوں نے لکھا ہے کہ عتیق سے ایک لڑکا بھی ہوا، جس کا نام عبداللہ یا عبد مناف تھا، عتیق کے بعد پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوہالہ سے ہوا، جن سے ہند اور ہالہ دو اولاد ہوئیں، اکثروں نے کہا ہے کہ دونوں لڑکے تھے، اور بعضوں نے لکھا ہے کہ ہند لڑکا ہے اور ہالہ لڑکی ہے، ہند حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔

ابوہالہ کے انتقال کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔ جس وقت کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر ۴۰ ربرس کی تھی، نکاح کے بعد ۲۵ ربرس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور رمضان المبارک ۱۰ ؁ھ میں ۶۵ ربرس کی عمر میں انتقال فرمایا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بے حد محبت تھی اور ان کی زندگی میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، ان کا لقب اسلام سے پہلے ہی سے طاہرہ تھا، اسی وجہ سے ان کی اولاد جو دوسرے خاندانوں سے ہے وہ بھی بنوالطاہرۃ کہلاتی ہے۔

ان کے فضائل حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں، ان کے انتقال پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قبر مبارک میں اتر کر دفن فرمایا تھا، نماز جنازہ اس وقت تک مشروع نہیں ہوئی تھی، ان کے بعد اُسی سال شوال میں حضرت عائشہ اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہما سے نکاح ہوا، اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں میں کس کا نکاح پہلے ہوا، بعض مؤرخین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح پہلے ہونا

لکھا ہے اور بعضوں کی رائے یہ ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے پہلے ہوا، بعد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے۔

۲-اُمّ المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا بھی بیوہ تھیں، ان کے والد کا نام زمعہ بن قیس ہے، پہلے سے اپنے چچازاد بھائی سکران بن عمرو رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، دونوں مسلمان ہوئے اور ہجرت فرما کر حبشہ تشریف لے گئے اور حبشہ میں سکران کا انتقال ہوگیا، بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مکہ واپس آکر انتقال فرمایا۔

ان کے انتقال کے بعد ۱۰ ؁ نبوی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے کچھ دنوں بعد ان سے نکاح ہوا اور رخصتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی سے سب کے نزدیک پہلے ہی ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تو کثرت سے نماز میں مشغول رہنا تھی ہی، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے عرض کیا کہ رات آپ نے اتنا لمبا رکوع کیا کہ مجھے اپنی ناک سے نکسیر نکلنے کا ڈر ہوگیا، (یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھیں، چونکہ بدن کی بھاری تھیں، اس وجہ سے اور بھی مشقت ہوئی ہوگی)، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا طلاق دینے کا ارادہ فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے خاوند کی خواہش نہیں، مگر یہ تمنا ہے کہ جنت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں داخل رہوں، اس لیے مجھے آپ طلاق نہ دیں، میں اپنی باری عائشہ رضی اللہ عنہا کو دیتی ہوں، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا اور اس وجہ سے ان کی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آتا تھا۔

۵۴ھ یا ۵۵ھ میں اور بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اخیر زمانۂ خلافت میں وفات پائی، ان کے علاوہ ایک سودہ اور بھی ہیں جو قریش ہی کی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کا ارادہ فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ

مجھے ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبوب آپ ہیں، مگر میرے پانچ چھ بچے ہیں، مجھے یہ بات گراں ہے کہ وہ آپ کے سرہانے روئیں چلائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس بات کو پسند فرمایا، تعریف کی اور نکاح کا ارادہ ملتوی فرمادیا۔

۳- اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے شوال ۱۰ نبوی میں ہوا، جس وقت کہ ان کی عمر چھ سال کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں یہی صرف ایک ایسی ہیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا، اور باقی سب سے نکاح بیوگی کی حالت میں ہوا، نبوت سے چار سال بعد یہ پیدا ہوئیں اور ہجرت کے بعد جب کہ ان کی عمر کونواں برس تھا، رخصتی ہوئی، اور ان کی اٹھارہ سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، اور ۶۶ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان المبارک ۵۷ھ کو منگل کی شب میں ان کا وصال ہوا، خود ہی وصیت فرمائی تھی کہ مجھے عام قبرستان میں جہاں اور بیبیاں دفن کی گئی ہیں، دفن کیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حجرۂ شریفہ میں نہ دفن کیا جائے، چنانچہ جنت البقیع میں دفن کی گئیں، عرب میں یہ مشہور تھا کہ شوال کے مہینہ میں نکاح نامبارک ہوتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا نکاح بھی شوال میں ہوا، رخصتی بھی شوال میں ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں کون سی مجھ سے زیادہ نصیبہ ور اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت خولہ رضی اللہ عنہا حکیم کی بیٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نکاح نہیں کرتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کس سے، عرض کیا: کنواری بھی ہے، بیوہ بھی ہے، جو منظور ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت

فرمایا: تو عرض کیا کہ کنواری تو آپ کے سب سے زیادہ دوست ابوبکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی عائشہ رضی اللہ عنہا ہے، اور بیوہ سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا تذکرہ کر کے دیکھ لو، وہ وہاں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ اُمّ رومان رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ میں ایک بڑی خیر و برکت لے کر آئی ہوں، دریافت کرنے پر کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا سے منگنی کرنے کے لیے بھیجا ہے، حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا نے کہا وہ تو ان کی بھتیجی ہے، اس سے کیسے نکاح ہوسکتا ہے؟ اچھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو آنے دو، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت گھر پر موجود نہ تھے، ان کے تشریف لانے پر ان سے بھی یہی ذکر کیا، انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے نکاح ہوسکتا ہے؟ حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے اسلامی بھائی ہیں، ان کی لڑکی سے میرا نکاح جائز ہے، حضرت خولہ رضی اللہ عنہا واپس ہوئیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جواب سنایا، وہاں کیا دیر تھی، کہا بلالاؤ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نکاح ہوگیا۔

ہجرت کے بعد چند مہینے گزر جانے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ آپ اپنی بیوی عائشہ کو کیوں نہیں بلا لیتے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان مہیا نہ ہونے کا عذر فرمایا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نذرانہ پیش کیا، جس سے تیاری ہوئی اور شوال ۱ھ یا ۲ھ میں چاشت کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے دولت کدہ پر رخصتی ہوئی۔

یہ تین نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت سے پہلے ہوئے، اس کے بعد جتنے نکاح ہوئے وہ ہجرت کے بعد ہوئے۔

۴- اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نبوت سے پانچ برس قبل مکہ میں پیدا ہوئیں، پہلا نکاح مکہ ہی میں خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے ہوا، یہ بھی پرانے مسلمان ہیں، جنھوں نے اول حبشہ کی ہجرت کی، پھر مدینہ طیبہ کی ہجرت کی، بدر میں بھی شریک ہوئے اور اسی لڑائی میں یا احد کی لڑائی میں ان کے ایسا زخم آیا جس سے اچھے نہ ہوئے اور ۲ ھ یا ۳ ھ میں انتقال فرمایا، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ ہی آ گئی تھیں، جب بیوہ ہو گئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ میں حفصہ کا نکاح تم سے کرنا چاہتا ہوں، انھوں نے سکوت فرمایا، اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ذکر فرمایا، انھوں نے فرمادیا کہ میرا تو اس وقت نکاح کا ارادہ نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں حفصہ کے لیے عثمان سے بہتر خاوند اور عثمان کے لیے حفصہ سے بہتر بیوی بتاتا ہوں، اس کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ۲ ھ یا ۳ ھ میں خود نکاح کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہا کا نکاح اپنی صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے کر دیا۔

ان کے پہلے خاوند کے انتقال میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ بدر کے زخم سے شہید ہوئے یا احد کے، بدر ۲ ھ میں ہے اور احد ۳ ھ میں، اسی وجہ سے ان کے نکاح میں بھی اختلاف ہے۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ

سے فرمایا کہ جب تم نے حفصہ کے نکاح کا ذکر کیا تھا اور میں نے سکوت کیا تھا، تمہیں اس وقت ناگواری ہوئی ہوگی، مگر چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان سے نکاح کا تذکرہ فرما چکے تھے، اس لیے نہ تو میں قبول کرسکتا تھا اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو ظاہر کرسکتا تھا، اس لیے سکوت کیا تھا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ ملتوی فرما دیتے تو میں ضرور کرلیتا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سکوت کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انکار سے بھی زیادہ رنج تھا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، رات کو اکثر جاگتی تھیں اور دن میں کثرت سے روزہ رکھا کرتی تھیں، کسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک طلاق بھی دی تھی، جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا، اور ہونا بھی چاہیے تھا، حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا کہ اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے کہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے رجوع کرلو، یہ بڑی شب بیدار اور کثرت سے روزہ رکھنے والی ہیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خاطر بھی منظور ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع فرمالیا۔

جمادی الاولیٰ ۴۵ھ میں جبکہ ان کی عمر تقریباً ۶۳ ربرس کی تھی، مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا، بعض نے ان کا انتقال ۴۱ھ میں اور عمر ۶۰ ربرس لکھی ہے۔

۵- اُمّ المومنین حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ہوا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی خزیمہ کی بیٹی ہیں، جن کے پہلے نکاح میں اختلاف ہے، بعض نے لکھا ہے کہ پہلے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا تھا، جب وہ غزوۂ احد میں شہید ہوئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کیا، اور بعض نے لکھا کہ ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد ان کے بھائی عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے ہوا، جو بدر میں شہید ہوئے، اس

کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کے ۳۱ (اکتیس) مہینے بعد رمضان المبارک ۳ھ میں نکاح ہوا، آٹھ مہینے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور ربیع الآخر ۴ھ میں انتقال فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا دو ہی بیبیاں ایسی ہیں جن کا وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا، باقی ۹؍بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک زندہ تھیں، جن کا بعد میں انتقال ہوا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی سخی تھیں، اسی وجہ سے ان کا نام اسلام سے پہلے بھی اُمّ المساکین یعنی (مسکینوں کی ماں) تھا۔

۶-اُمّ المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ابوامیہ کی بیٹی تھیں، جن کا پہلا نکاح اپنے چچازاد بھائی ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ہوا تھا، جن کا نام عبداللہ بن عبدالاسد تھا، دونوں میاں بیوی ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، کفار کے ہاتھ سے تنگ آکر اول دونوں نے حبشہ کی ہجرت کی، وہاں جاکر ایک لڑکا پیدا ہوا، جن کا نام سلمہ تھا، حبشہ سے واپسی کے بعد پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی (جس کا قصہ بہت مشہور ہے)، مدینہ منورہ پہنچ کر ایک لڑکا عمر اور دو لڑکیاں درہ اور زینب پیدا ہوئیں، حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ دس آدمیوں کے بعد مسلمان ہوگئے تھے، بدر اور احد کی لڑائی میں بھی شریک ہوئے تھے، احد کی لڑائی میں ایک زخم آگیا تھا جس کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی، اس کے بعد صفر ۴ھ میں ایک سریہ میں تشریف لے گئے تو واپسی پر وہ زخم پھر ہرا ہوگیا اور اسی میں ۸؍جمادی الثانیہ ۴ھ میں انتقال کیا۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اس وقت حاملہ تھیں اور زینب رضی اللہ عنہا پیٹ میں تھیں، جب وہ پیدا ہوئیں تو عدت پوری ہوئی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

نے نکاح کی خواہش فرمائی تو انھوں نے عذر کر دیا، اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا، انھوں نے عرض کیا کہ میرے بچے بھی ہیں اور میرے مزاج میں غیرت بہت زیادہ ہے اور میرا کوئی ولی یہاں ہے نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بچوں کا اللہ محافظ ہے، اور یہ غیرت بھی انشاء اللہ جاتی رہے گی اور کوئی ولی اس کو ناپسند نہیں کرے گا، تو انھوں نے اپنے بیٹے حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا نکاح کر دو، اخیر شوال ۴ ھ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا، بعض نے ۳ ھ میں اور بعض نے ۲ ھ میں لکھا ہے۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ یہ دعا کرے:

"اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْنِيْ خَيْراً مِّنْهَا."

(اے اللہ! مجھے اس مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کا نعم البدل نصیب فرما)۔

تو اللہ جل شانہ اس کو بہترین بدل عطا فرماتے ہیں۔ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد میں یہ دعا تو پڑھتی تھی مگر یہ سوچتی تھی کہ ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے؟ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح کرا دیا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان کے حسن کی بہت شہرت تھی، جب نکاح ہو گیا تو میں نے چھپ کر حیلہ سے جا کر دیکھا تو جیسا سنا تھا اس سے زیادہ پایا، میں نے حفصہ رضی اللہ عنہا سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے کہا نہیں ایسی حسین نہیں ہیں جتنی شہرت ہے۔

امہات المومنین رضی اللہ عنہن میں سب سے اخیر میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۹ ھ یا ۶۲ ھ میں ہوا، اس وقت ۸۴ رسال کی عمر تھی، اس لحاظ سے نبوت سے تقریباً ۹ ربرس پہلے پیدا ہوئیں، حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ان سے نکاح ہوا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان میں مقیم

ہوئیں، انھوں نے وہاں دیکھا کہ ایک مٹکے میں جو رکھے ہیں اور ایک چکی اور ہانڈی بھی، انھوں نے خود جو پیسے اور چکنائی ڈال کر ملیدہ تیار کیا اور پہلے ہی دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ملیدہ کھلایا جو نکاح کے دن اپنے ہی ہاتھ سے پکایا تھا۔

۷- اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے حالات

ان کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے ہوا، یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہیں، ان کا پہلا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنّیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کیا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد اللہ جل شانہ نے خود ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کردیا، جس کا قصہ سورۂ احزاب میں بھی ہے، اس وقت ان کی عمر ۳۵ رسال کی تھی، مشہور قول کے موافق ذیقعدہ ۵ ھ میں نکاح ہوا، بعض نے ۳ ھ میں لکھا ہے، مگر صحیح ۵ ھ ہے اور اس حساب سے نبوت سے گویا ۱۷ رسال قبل ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کو اس پر فخر تھا کہ سب عورتوں کا نکاح ان کے اولیاء نے کیا اور ان کا نکاح اللہ جل شانہ نے کیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جب ان کو طلاق دی اور عدت پوری ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس پیام بھیجا، انھوں نے جواب میں عرض کیا کہ میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتی، جب تک اپنے اللہ سے مشورہ نہ کرلوں اور یہ کہہ کر وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی اور یہ دعا کی کہ یا اللہ! تیرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، اگر میں ان کے قابل ہوں تو میرا نکاح ان سے فرمادے، ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف کی آیت ”فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا“ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری بھیجی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا خوشی کی وجہ سے سجدہ میں گرگئیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کا ولیمہ بڑی شان سے کیا، بکری ذبح کی اور گوشت روٹی کی دعوت فرمائی، ایک ایک جماعت کو بلایا جاتا تھا اور جب وہ فارغ ہوجاتی تھی تو دوسری جماعت اسی

طرح بلائی جاتی، حتی کہ سب ہی لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا، حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی سخی تھیں اور بڑی محنتی، اپنے ہاتھ سے محنت کرتیں اور جو حاصل ہوتا وہ صدقہ کر دیتیں، ان ہی کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ مجھ سے سب سے پہلے مرنے کے بعد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا، بیبیاں ظاہری لمبائی سمجھیں، اس لیے لکڑی لے کر سب کے ہاتھ ناپنے شروع کر دیئے، دیکھنے میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے لمبا تھا، مگر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال سب سے پہلے ہوا، جب یہ سمجھیں کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد صدقہ کی کثرت تھی، روزے بھی بہت زیادہ رکھتی تھیں، ۲۰ھ میں انتقال فرمایا، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی، ۵۰ر برس کی عمر تھی۔

۸- اُمّ المومنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ان کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بنت حارث بن ابی ضرار سے ہوا، یہ غزوۂ مریسیع میں قید ہو کر آئی تھیں، اور غنیمت میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصہ میں آئیں، قید ہونے سے پہلے مسافع بن صفوان کے نکاح میں تھیں، حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کو ۹ر اوقیہ سونے پر مُکاتب کر دیا، مکاتب اس غلام یا باندی کو کہتے ہیں جس سے یہ مقرر کر لیا جائے کہ اتنے دام تم اگر دے دو تو تم آزاد۔ (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے)۔

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی قوم کے سردار حارث کی بیٹی جویریہ ہوں، جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی ہے آپ کو معلوم ہے، اب اتنی مقدار میں میں مکاتب ہوئی ہوں، اور یہ مقدار میری طاقت سے باہر ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امید پر آئی ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تجھے اس سے بہتر راستہ بتاؤں کہ تجھے مال ادا کر کے آزاد کرا دوں اور تجھ سے نکاح کر لوں، ان کے لیے اس سے بہتر کیا تھا، بخوشی منظور کر لیا

اور ۵ھ میں مشہور قول کے موافق اور بعضوں نے ۶ھ میں اس قصہ کو بتایا ہے، نکاح ہوگیا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب سنا کہ بنوالمصطلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سسرال بن گئی تو انھوں نے بھی اس رشتہ کے اعزاز میں اپنے اپنے غلام آزاد کردیئے، کہتے ہیں کہ ایک حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے سوگھرانے آزاد ہوئے، جن میں تقریباً سات سو آدمی تھے، اس قسم کی مصلحتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سب نکاحوں میں تھیں، حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نہایت حسین تھیں۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اس لڑائی سے تین دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ یثرب (مدینہ منورہ) سے ایک چاند چلا اور میری گود میں آگیا، کہتی ہیں کہ جب میں قید ہوئی تو مجھے اپنے خواب کی تعبیر کی امید بندھی، اس وقت ان کی عمر ۲۰؍سال کی تھی، اور ربیع الاول ۵۰ھ میں صحیح قول کے موافق ۶۵؍برس کی عمر میں مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا، اور بعضوں نے ان کا انتقال ۵۶ھ میں ۷۰؍برس کی عمر میں لکھا ہے۔

۹- اُمّ المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ام المومنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہیں، ان کے نام میں اختلاف ہے، اکثروں نے رملہ اور بعضوں نے ہند بتایا ہے، ان کا پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ میں ہوا تھا، دونوں میاں بیوی مسلمان ہوگئے تھے، کفار کی تکالیف کی بدولت وطن چھوڑنا پڑا اور حبشہ کی ہجرت دونوں نے کی، وہاں جاکر خاوند نصرانی ہوگیا، یہ اسلام پر باقی رہیں، انھوں نے اسی رات میں اپنے خاوند کو خواب میں نہایت بری شکل میں دیکھا، صبح کو معلوم ہوا کہ وہ نصرانی ہوگیا ہے، اس تنہائی میں اس حالت میں ان پر کیا گزری ہوگی، اللہ ہی کو معلوم ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہ نے اس کا نعم البدل یہ عطا فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آگئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس پیام بھیجا کہ ان کا نکاح مجھ سے کردو، چنانچہ نجاشی نے ایک عورت ابرہہ کو ان کے

پاس اس کی خبر کے لیے بھیجا، انھوں نے خوشی میں اپنے دونوں کنگن جو پہن رہی تھیں، اس کو عطا کر دیئے اور پاؤں کے چھلے کڑے وغیرہ متعدد چیزیں دیں، نجاشی نے نکاح کیا اور اپنے پاس سے چار سو دینار مہر کے ادا کیے اور بہت کچھ سامان دیا، جو لوگ مجلس نکاح میں موجود تھے ان کو بھی دینار دیئے اور کھانا کھلایا، اس میں اختلاف ہے کہ یہ نکاح ۷ھ میں ہوا جیسا کہ اکثر کا قول ہے، یا ۶ھ میں جیسا کہ بعض نے کہا ہے، صاحب تاریخ خمیس نے لکھا ہے کہ ان کا نکاح ۶ھ میں ہوا اور رخصتی ۷ھ میں، جب یہ مدینہ طیبہ پہنچیں، نجاشی نے بہت سی خوشبو اور سامان جہیز وغیرہ دے کر ان کو نکاح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا، بعض کتب تواریخ واحادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باپ نے نکاح کیا، مگر یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ ان کے باپ اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ اس قصہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں، ان کے انتقال میں بہت اختلاف ہے، اکثر نے ۴۴ھ بتایا ہے، اور اس کے علاوہ ۴۲ھ اور ۵۵ھ اور ۵۰ھ وغیرہ کے اقوال بھی ہیں۔

۱۰- اُمّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حیی بن اخطب (خیبر کے سردار) کی بیٹی تھیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہیں، اول سلام بن مشکم کے نکاح میں تھیں، اس کے بعد کنانہ بن ابی حقیق کے نکاح میں آئیں، اس سے نکاح اس زمانہ میں ہوا تھا کہ خیبر کی لڑائی شروع ہوگئی تھی اور ان کا خاوند قتل ہوگیا تھا، خیبر کی فتح کے بعد دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک باندی مانگی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرحمت فرمادیا، چونکہ مدینہ میں (یہودیوں کے) دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر آباد تھے، اور یہ ان کے سردار کی بیٹی تھیں، اس لیے لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بات بہت سے لوگوں کو ناگوار ہوگی، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نکاح

میں لے لیں تو بہت سے لوگوں کی دلداری ہوگی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کو خاطر خواہ عوض دے کر ان کو لے لیا اور ان کو آزاد فرما کر نکاح کرلیا، اور خیبر سے واپسی میں ایک منزل پر ان کی رخصتی ہوئی، صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس جو چیز کھانے کی ہو، وہ لے آئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس متفرق چیزیں کھجور، پنیر، گھی وغیرہ جو تھا، وہ لے آئے، ایک چمڑے کا دستر خوان بچھا دیا، اور اس پر وہ سب ڈال دیا گیا اور سب نے شریک ہوکر کھالیا، یہی ولیمہ تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختیار دے دیا تھا کہ اگر تم اپنی قوم اور اپنے ملک میں رہنا چاہو تو آزاد ہو، چلی جاؤ، اور میرے پاس میرے نکاح میں رہنا چاہو تو رہو، انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں شرک کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا کرتی تھی، اب مسلمان ہوکر کیسے جاسکتی ہوں، اس سے مراد غالباً ان کا وہ خواب ہے جو انھوں نے مسلمان ہونے سے پہلے دیکھا تھا کہ ایک چاند کا ٹکڑا میری گود میں ہے، اس خواب کو انھوں نے اپنے خاوند کنانہ سے کہا، اس نے ایک طمانچہ اس زور سے منھ پر مارا کہ آنکھ پر اس کا نشان پڑ گیا اور یہ کہا کہ تو یثرب کے بادشاہ کے نکاح کی تمنا کرتی ہے، ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ آفتاب ان کے سینہ پر ہے، خاوند سے اس کو بھی ذکر کیا، اس نے اس پر بھی یہی کہا کہ تو چاہتی ہے کہ یثرب کے بادشاہ کے نکاح میں جائے، ایک مرتبہ انھوں نے چاند کو دیکھا کہ گود میں ہے، تو اپنے باپ سے ذکر کیا، اس نے بھی ایک طمانچہ مارا، اور یہ کہا کہ تیری نگاہ یثرب کے بادشاہ پر جاتی ہے، ممکن ہے کہ چاند کا وہی ایک خواب خاوند اور باپ دونوں سے کہا ہو، یا چاند دو مرتبہ دیکھا ہو، رمضان المبارک ۵۰ھ میں صحیح قول کے موافق انتقال ہوا اور تقریباً ۶۰ ربرس کی عمر پائی، خود کہتی ہیں کہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تو میری عمر ۱۷ رسال کی نہیں ہوئی تھی۔

۱۱- ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حارث بن حزن کی بیٹی ہیں، ان کا اصلی نام برّہ تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر میمونہ رکھا تھا، پہلے سے ابورحم بن عبدالعزی کے نکاح میں تھیں، اکثر مؤرخین کا یہی قول ہے، اور بھی بہت سے اقوال ان کے پہلے خاوند کے نام میں ہیں، بعض نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی دو نکاح ہوئے تھے، بیوہ ہو جانے کے بعد ذیقعدہ ۷ھ میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے، موضع سرف میں نکاح ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ عمرہ سے فراغت کے بعد مکہ میں رخصتی ہو جائے، مگر مکہ والوں نے قیام کی اجازت نہ دی، اس لیے واپسی میں سرف ہی میں رخصتی ہوئی اور سرف ہی میں خاص اسی جگہ جہاں رخصتی کا خیمہ تھا ۵۱ھ میں صحیح قول کے مطابق انتقال ہوا، اور بعض نے ۶۱ھ میں لکھا ہے، اس وقت ان کی عمر ۸۱ برس کی تھی اور اسی جگہ قبر بنی، یہ بھی عبرت کا مقام ہے اور تاریخ کا عجوبہ ہے کہ ایک سفر میں وہاں نکاح ہوا اور دوسرے سفر میں وہاں رخصتی ہوئی اور عرصہ کے بعد اسی جگہ قبر بنی۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میمونہ رضی اللہ عنہا ہم سب میں زیادہ متقی اور صلہ رحمی کرنے والی تھیں، حضرت یزید بن اصم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کا مشغلہ ہر وقت نماز تھا یا گھر کا کام، اگر دونوں سے فراغت ہوتی تو مسواک کرتی رہتی تھیں۔

جن عورتوں کے نکاح پر محدثین و مؤرخین کا اتفاق ہے، ان میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سب سے آخری نکاح ہے، ان کی درمیانی ترتیب میں البتہ اختلاف ہے، جس کی وجہ سے ان نکاحوں کی تاریخ میں اختلاف ہے، جیسا کہ مختصر طور پر معلوم ہوا، ان گیارہ بیویوں میں سے دو کا وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے

ہو چکا تھا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا اور حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کا، باقی نو بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت موجود تھیں، ان کے علاوہ اور بھی نکاح بعض محدثین اور مؤرخین نے لکھے ہیں، جن کے ہونے میں اختلاف ہے، اس لیے انھیں بیبیوں کا ذکر لکھا ہے جن پر اتفاق ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

مؤرخین اور محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار لڑکیاں ہوئیں اور اکثر کی تحقیق یہ ہے کہ ان میں سب سے بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں، پھر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، پھر حضرت سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا ہیں۔

لڑکوں میں البتہ بہت اختلاف ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حضرات بچپن ہی میں انتقال فرما گئے تھے اور عرب میں اس زمانہ میں تاریخ کا اہتمام کچھ ایسا نہ تھا، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جیسے جاں نثار بھی اس وقت تک کثرت سے نہیں ہوئے تھے، جو کہ ہر بات پوری پوری محفوظ رہتی، اکثر کی تحقیق یہ ہے کہ تین لڑکے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ ہوئے، بعضوں نے کہا کہ چوتھے صاحبزادے حضرت طیب رضی اللہ عنہ اور پانچویں حضرت طاہر رضی اللہ عنہ تھے، اس طرح پانچ ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر دونوں ایک ہی صاحبزادہ کے نام ہیں، اس طرح چار ہوئے، بعض نے کہا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کا نام طیب اور طاہر تھا، اس طرح تین ہی لڑکے ہوئے، اور بعضوں نے دو لڑکے اور بھی بتائے ہیں، حضرت مطیب رضی اللہ عنہ اور حضرت مطہر رضی اللہ عنہ، اور لکھا ہے کہ طیب رضی اللہ عنہ اور مطیب رضی اللہ عنہ ایک ساتھ پیدا ہوئے، اس طرح سات لڑکے ہوئے، لیکن اکثر کی تحقیق تین لڑکوں کی ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری اولاد حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سوا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی سے پیدا ہوئی۔

۱- حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے حالات

لڑکوں میں حضرت قاسم رضی اللہ عنہ سب سے پہلے پیدا ہوئے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان سے بڑی تھیں یا چھوٹی، حضرت قاسم رضی اللہ عنہ نے بچپن ہی میں انتقال فرمایا، دو سال کی عمر اکثر نے لکھی ہے اور بعضوں نے اس سے کم یا زیادہ لکھی ہے۔

۲- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے حالات

دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے اور اسی وجہ سے ان کا نام طیب اور طاہر بھی پڑا، اور بچپن ہی میں انتقال ہوا، ان کے انتقال پر اور بعض نے لکھا ہے کہ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے انتقال پر کفار بہت خوش ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسل منقطع ہوگئی، جس پر سورۂ "إِنَّا أَعْطَيْنَا" نازل ہوئی اور کفار کے اس کہنے کا کہ جب نسل ختم ہوئی تو کچھ دنوں میں نام مبارک بھی مٹ جائے گا، یہ جواب ملا۔

۳- حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے حالات

تیسرے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے، جو ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بالاتفاق ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے آخری اولاد ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں دن ان کا عقیقہ کیا اور دو مینڈھے ذبح کیے اور بالوں کے برابر چاندی صدقہ فرمائی اور بالوں کو دفن کرایا، حضرت ابو ہند بیاضی رضی اللہ عنہ نے سر کے بال اتارے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام پر نام رکھا ہے، اور ۱۶ ؍مہینے کی عمر میں ان صاحبزادہ نے بھی ۱۰ ؍ربیع الاول ۱۰ھ میں انتقال

فرمایا، بعضوں نے ۱۸ر مہینے کی عمر بتلائی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ابراہیمؓ کے لیے جنت میں دودھ پلانے والی تجویز ہوگئی۔

۴- حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حالات

صاحبزادیوں میں سب سے بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں، اور جن مؤرخین نے اس کے خلاف لکھا ہے، غلط ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح سے پانچ برس بعد جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۳۰ر برس کی تھی، پیدا ہوئیں، اور اپنے والدین کی آغوش میں جوان ہوئیں، مسلمان ہوئیں اور اپنے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا، غزوۂ بدر کے بعد ہجرت کی، جس میں مشرکین کی ناپاک حرکتوں سے زخمی ہوئیں، اور اسی بیماری کا سلسلہ اخیر تک چلتا رہا، یہاں تک کہ ۸ھ کے شروع میں انتقال فرمایا، ان کے خاوند بھی ۶ھ یا ۷ھ میں مسلمان ہوکر مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے، اور ان ہی کے نکاح میں رہیں، ان سے دو بچے ہوئے، ایک لڑکا، ایک لڑکی، لڑکے کا نام علی رضی اللہ عنہ تھا، جنھوں نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد بلوغ کے قریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال فرمایا، فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹنی پر جو سوار تھے، وہ یہی حضرت علیؓ تھے۔

لڑکی کا نام حضرت امامہ رضی اللہ عنہا تھا، جن کے متعلق حدیث کی کتابوں میں کثرت سے قصہ آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں سجدہ کرتے، تو یہ کمر پر سوار ہوجاتیں، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تک زندہ رہیں، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد جو ان کی خالہ تھیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان سے نکاح کیا اور ان کی شہادت کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے ان کا نکاح ہوا، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کوئی اولاد ان سے نہیں ہوئی، البتہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے بعضوں نے ایک لڑکا یحیٰی لکھا ہے، اور بعضوں نے انکار کیا ہے، کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد حضرت علی رضی اللہ

عنہ کا نکاح بھانجی سے کردیا جائے، ان کا انتقال ۵۰ھ میں ہوا۔

۵-حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں، جو اپنی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے تین برس بعد پیدا ہوئیں، جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۳۳ ربرس کی تھی، اور بعضوں نے حضرت رقیہ کو حضرت زینب سے بڑی بتایا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے چھوٹی تھیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے بیٹے عتبہ سے نکاح ہوا تھا، جب سورۂ لہب نازل ہوئی تو ابولہب نے ان سے اور ان کے دوسرے بھائی عتیبہ سے جس کے نکاح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں، یہ کہا کہ میری ملاقات تم دونوں سے حرام ہے اگر تم محمد (ﷺ) کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو، اس پر دونوں نے طلاق دے دی، یہ دونوں نکاح بچپن میں ہوئے تھے، رخصتی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی، اس کے بعد فتح مکہ پر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے شوہر عتبہ مسلمان ہو گئے تھے، مگر بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکے تھے اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرصہ ہوا ہو چکا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے دونوں مرتبہ حبشہ کی ہجرت کی تھی، اس کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی ہجرت کا حکم ہونے والا ہے، اور مدینہ منورہ میری ہجرت کی جگہ ہوگی، تو صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ کی ہجرت شروع کردی، اسی سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی یہ دونوں حضرات بھی مدینہ طیبہ پہنچ گئے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ بدر میں تشریف لے جانے لگے تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمارداری کے واسطے مدینہ میں چھوڑ گئے، بدر کی فتح کی خوشخبری مدینہ

طیبہ میں اس وقت پہنچی جب یہ حضرات حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو دفن کر کے آ رہے تھے، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دفن میں شرکت نہ فرما سکے، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے یہاں رخصتی بھی نہیں ہو سکی تھی تو اولاد کا کیا ذکر، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک صاحبزادہ جن کا نام حضرت عبداللہ تھا، حبشہ میں پیدا ہوئے تھے جو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد تک زندہ رہے اور چھ سال کی عمر میں ۴ھ میں انتقال فرمایا اور بعض نے لکھا ہے کہ اپنی والدہ سے ایک سال پہلے انتقال کیا، ان کے علاوہ کوئی اور اولاد حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے نہیں ہوئی۔

۶- حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے حالات

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں، اس میں اختلاف ہے کہ ان میں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میں کون بڑی تھیں، اکثر کی رائے یہ ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بڑی تھیں، اول عتیبہ بن ابی لہب سے نکاح ہوا، مگر رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ سورۂ لہب کے نازل ہونے پر طلاق کی نوبت آئی، جیسا کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے بیان میں گزرا، لیکن ان کے خاوند عتیبہ مسلمان نہیں ہوئے، طلاق دی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر نہایت گستاخی، بے ادبی اور نامناسب الفاظ بھی زبان سے نکالے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی کہ یا اللہ اپنے کتوں میں سے ایک کتا اس پر مسلط فرما، حضرت ابو طالب اس وقت موجود تھے، باوجود مسلمان نہ ہونے کے سہم گئے اور کہا کہ ان کی بددعا سے تجھے خلاصی نہیں، چنانچہ عتیبہ ایک مرتبہ شام کے سفر میں جا رہا تھا، اس کا باپ ابولہب باوجود ساری عداوت اور دشمنی کے کہنے لگا کہ مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بددعا کی فکر ہے، قافلہ کے سب لوگ ہماری خبر رکھیں، ایک منزل پر پہنچے، وہاں شیر زیادہ تھے، رات کو تمام قافلہ کا سامان ایک جگہ جمع کیا اور اس کا ٹیلہ سا بنا کر اس پر عتیبہ کو سلایا، اور قافلہ کے تمام آدمی چاروں طرف سوئے، رات کو شیر آیا اور سب

کے منہ سونگھے، اس کے بعد ایک زقند لگائی اور اس ٹیلہ پر پہنچ کر عتیبہ کا سر تن سے جدا کر دیا، اس نے ایک چیخ ماری، مگر ساتھ ہی اس کا کام تمام ہو چکا تھا۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ مسلمان ہو گیا تھا، اور یہ قصہ پہلے بھائی کے ساتھ پیش آیا، بہر حال حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہروں میں سے ایک مسلمان ہوئے، دوسرے کے ساتھ یہ عبرتناک واقعہ پیش آیا، اسی واسطے اللہ والوں کی دشمنی سے ڈرایا جاتا ہے، خود اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: "من عادیٰ لي ولیاً فقد آذنته بالحرب"(۱) (جو میرے کسی ولی سے دشمنی مول لے گا تو اس کے ساتھ میرا اعلان جنگ ہے)۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ربیع الاول ۳ھ میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا بھی نکاح بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے ام کلثوم کا نکاح آسمانی وحی کے حکم سے عثمان سے کیا، بعض روایات میں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما دونوں کے متعلق یہی ارشاد فرمایا، پہلے خاوند کے یہاں تو رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور شعبان ۹ھ میں انتقال فرمایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے انتقال کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر میری سو لڑکیاں ہوتیں اور انتقال کرتیں تو اسی طرح ایک دوسری کے بعد سب کا نکاح عثمان سے کرتا۔

۷- حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کے حالات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی صاحبزادی جنتی عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا جو عمر میں اکثر مؤرخین کے نزدیک سب سے چھوٹی ہیں، نبوت کے ایک سال بعد جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف ۴۱ر برس کی تھی، پیدا ہوئیں، اور بعض نے نبوت سے پانچ سال پہلے ۳۵ر سال کی عمر میں لکھا ہے، کہتے ہیں

---

(۱) صحیح بخاری، باب التواضع (م)

کہ ان کا نام فاطمہ الہام یا وحی سے رکھا گیا، "فَطَمَ" کے معنی روکنے کے ہیں، یعنی یہ جہنم کی آگ سے محفوظ ہیں، ۲ ھ محرم یا صفر یا رجب یا رمضان میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے نکاح ہوا، اور نکاح سے سات ماہ اور پندرہ دن بعد رخصتی ہوئی، یہ نکاح بھی اللہ جل شانہ کے حکم سے ہوا، کہتے ہیں کہ نکاح کے وقت آپ رضی اللہ عنہا کی عمر ۱۵/سال ۵/ماہ کی تھی، اس سے بھی اکتالیسویں سال میں پیدائش یعنی پہلے قول کی تائید ہوتی ہے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر ۲۱/سال ۵/ماہ یا ۲۴/سال ڈیڑھ ماہ کی تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام صاحبزادیوں میں ان سے زیادہ محبت تھی، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر کو تشریف لے جاتے تو سب سے اخیر میں ان سے رخصت ہوتے اور جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے ان کے پاس تشریف لے جاتے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ابوجہل کی لڑکی سے دوسرے نکاح کا ارادہ فرمایا تو ان کو رنج ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو رنج پہنچایا اس نے مجھے رنج پہنچایا، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی زندگی میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا، آپ رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد آپ کی بھانجی حضرت امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا، جس کا ذکر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیان میں گزرا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ مہینے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں اور ایک روز خادمہ سے فرمایا کہ میں غسل کروں گی، پانی رکھ دو، غسل فرمایا، نئے کپڑے پہنے، پھر فرمایا کہ میرا بستر گھر کے بیچ میں کر دو، اس پر تشریف لے گئیں اور قبلہ رخ لیٹ کر داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھا اور فرمایا کہ بس اب میں مرتی ہوں، یہ فرما کر وصال فرمایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا سلسلہ انھیں سے چلا اور انشاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا، ان کی چھ اولاد، تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں، سب سے اول حضرت حسن رضی اللہ عنہ نکاح سے دوسرے سال میں پیدا ہوئے، پھر حضرت

حسین رضی اللہ عنہ تیسرے سال میں یعنی ۴ھ میں، پھر حضرت محسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، جن کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا، صاحبزادیوں میں سے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا، اسی وجہ سے بعض مؤرخین نے ان کو لکھا بھی نہیں، دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت عمر امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے ہوا، جس سے ایک صاحبزادے زید اور صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہما پیدا ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عون بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا، ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بچپن ہی میں انتقال کرگئی، ان کے انتقال کے بعد ان کے تیسرے بھائی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے ہوا، ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور انھیں کے نکاح میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا، اور اسی دن ان کے صاحبزادے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بھی انتقال ہوا، دونوں جنازے ساتھ ہی اٹھے اور کوئی سلسلہ اولاد کا ان سے نہیں چلا، یہ تینوں بھائی عبداللہؓ، عونؓ اور محمدؓ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے اور حضرت جعفر طیارؓ کے بیٹے ہیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیسری صاحبزادی حضرت زینبؓ تھیں، جن کا نکاح عبداللہ بن جعفرؓ سے ہوا، اور دو صاحبزادے عبداللہ اور عون پیدا ہوئے، اور ان کے ہی نکاح میں انتقال فرمایا، ان کے انتقال کے بعد عبداللہ بن جعفر کا نکاح ان کی ہمشیرہ حضرت ام کلثومؓ سے ہوا تھا، یہ اولاد حضرت فاطمہؓ سے ہے، ورنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دوسری بیویوں سے جو بعد میں ہوئیں اور بھی اولاد ہے، مؤرخین نے حضرت علیؓ کی تمام اولاد ۳۲ رلکھی ہے، جن میں ۱۶ رلڑکے اور ۱۶ رلڑکیاں اور حضرت حسنؓ کے ۱۵ رلڑکے اور ۸ رلڑکیاں اور حضرت حسینؓ کے ۶ رلڑکے اور ۳ رلڑکیاں ہوئیں۔ رضی اللہ عنهم و أرضاهم أجمعين و جعلنا بهديهم متبعين، والله أعلم وعلمه أتم. (۱)

---

(۱) منقول از حکایات صحابہ ص/۱۴۴-۱۴۷

باب پنجم

امت محمدی کا امتیاز واعجاز خلافت نبوت اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم

خلافت کیا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت وجانشینی کا مسئلہ امت پر چھوڑا، اس میں بڑی حکمت یہ تھی کہ اگر کسی ایک کا نام حتمی طور پر طے کردیتے تو ان کی بات نہ ماننے کی صورت میں کفر لازم آجاتا، لیکن بعض ایسے کام کیے جس میں امت کو اشارہ دے دیا لیکن فیصلہ امت پر چھوڑا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی نیابت کے لیے متعین کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس شوریٰ بنا کر ان سب کو مجاز کیا اور ان کو ان ہی میں اپنا امیر منتخب کر لینے کو کہا، یہ تین طریقے سامنے آئے اور یہ طریقے ایسے ہیں جن میں اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔

سلب خلافت کی وجوہات

سلب خلافت وعزل امارت ایک اہم مسئلہ ہے جس کی ضرورت بار بار نہیں پڑتی لیکن بعض وقت ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں یہ فیصلہ لینا پڑتا ہے، اس سلسلہ

میں بڑی رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دو بڑی مثالیں پیش کیں۔

ایک تو اس وقت جب ان کو شبہ ہوا کہیں کسی منافق کو تو کوئی ایسی ذمہ داری نہیں دے دی گئی ہے، اس وقت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ صاحب سرّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے معلوم کرنا چاہا، انھوں نے کسی کا نام نہیں بتایا، مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی فراست سے تاڑلیا اور معزول کر دیا۔

اور دوسرا واقعہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا ہے کہ ان کو معزول کر دیا اس لیے کہ لوگوں کا ان پر اعتماد بہت بڑھ گیا تھا، جس سے لوگوں کا ایمان متأثر ہو رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کے بجائے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی جنگی صلاحیتوں کی بنا پر ان کی ذات پر اعتماد بڑھ رہا تھا، اس لیے عین میدان جنگ میں ان سے لواء لے کر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو دے دیا تا کہ جن لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ پیدا ہو گیا ہو وہ جان لیں کہ مومنین کی فتح کسی کی ذاتی قابلیت کی بناء پر نہیں بلکہ اللہ کی نصرت و تائید کی بنا پر ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی مصلحتیں اور اسباب معزولی کے ہو سکتے ہیں جیسے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے جھنڈا لے کر ان کے صاحبزادہ حضرت قیس بن عبادہ رضی اللہ عنہما کو دے دیا کہ فتحیابی کے جوش میں ان کے منھ سے "الیوم یوم الملحمة" کے الفاظ سرزد ہو گئے تھے، اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت للعالمینی جوش میں آتی ہے اور "الیوم یوم المرحمة" فرماتے ہوئے عفو عام کا اعلان فرماتے ہیں، تا کہ لوگ جان لیں کہ اسلام کسی کی دشمنی کا انتقام لینے نہیں بلکہ لوگوں کو اپنے ہی جیسے لوگوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی میں لانے اور دنیا کی تنگی سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچانے اور تمام ادیان باطل کے ظلم و تشدد سے نجات دلا کر اسلام کے

عدل وانصاف کے سایہ میں جگہ دینے کے لیے آیا ہے۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں امت محمدی کو بھی شمار کرتے ہوتے امت محمدی کے امتیازات وخصوصیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں، ان تمام صفات وخصوصیات کی جامع جماعت صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر خلفائے راشدین کی تھی، وہ لکھتے ہیں:

> ''آپ کی امت ہر فضیلت میں تمام امتوں سے زیادہ مکمل ہے، اگر تمام دنیا کی قوموں کے علم کا ان کے علم سے مقابلہ کیا جائے تو ان کے علم کی برتری ثابت ہوگی، اگر ان کے دین وعبادت اور اطاعت الٰہی کو ان کے دین وعبادت وطاعت الٰہی کے مقابلہ میں لایا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے زیادہ دین دار ہیں، اگر شجاعت وجہاد فی سبیل اللہ، اللہ کے راستہ میں صبر علی المکارہ اور جفاکشی کو دیکھا جائے تو ان کا پلہ بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اگر سخاوت وانفاق اور فراخ دلی اور بلند حوصلگی کو دیکھا جائے تو ان ہی میں زیادہ سخاوت وکرم نظر آتا ہے، یہ تمام فضائل ومکارم اخلاق ان مسلمانوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے حاصل ہوئے، اور آپ ہی کی ذات سے انھوں نے اخذ کیے اور آپ ہی نے ان کو ان کا حکم دیا، آپ کی بعثت ونبوت سے پہلے وہ کسی کتاب کے پیرو نہ تھے، جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکمیل فرمائی ہوتی جیسے کہ حضرت مسیح تورات کی شریعت کی تکمیل کے لیے تشریف لائے تو حضرت مسیح کے پیرووں کے فضائل و علوم کچھ تورات سے ماخوذ تھے کچھ زبور سے کچھ اور تعلیمات انبیاء سے اور کچھ حضرت مسیح سے اور کچھ حصہ حواریوں کے بعد

بعض دوسری تعلیموں اور فلاسفہ وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہیں،
لیکن امت محمدی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نہ کسی کتاب
کا وجود تھا اور نہ کسی نبی کی تعلیم تھی، بلکہ ان میں سے اکثر تو موسیٰ،
عیسیٰ اور داؤد علیہم السلام اور تورات اور زبور پر بھی آپ ہی کے
ذریعہ ایمان لائے، آپ ہی نے ان کو تمام انبیاء پر ایمان لانے
اور تمام کتب منزلہ کے اقرار کا حکم دیا اور انبیاء علیہم السلام کے
درمیان تفریق کرنے کی ممانعت کی۔"(۱)

امت پر اعتماد اور کسی کو خلافت کے لیے نامزد نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری ایام میں یہ محسوس کر لینے کے بعد کہ وقت موعود قریب ہے کچھ وصیتیں نصیحتیں انفرادی و اجتماعی فرمائیں اور ایسے اشارے بھی دیئے کہ جس سے دوسرے بھی محسوس کر لیں کہ آپ کو دنیا میں زیادہ دن رہنا نہیں ہے، اور اس کا سب سے بڑا اشارہ اس آیت کریمہ کا نزول تھا جو آپ پر اس وقت نازل ہوئی جبکہ عرفہ کے دن عرفات کے میدان میں وقوف فرما رہے تھے کہ:

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي
وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (۲)

(آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین تم پر مکمل کر دیا اور اپنی
نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا)

اللہ کی جانب سے اس واضح اشارے کے پالینے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے لیے کہ وہ آپ کے بعد کس پر زیادہ اعتماد کریں اور کون شریعت کے منشا و مزاج سے زیادہ واقف اور آپ کے اسوہ حسنہ سے زیادہ قریب ہے اور کون دین کے لیے زیادہ قربانی اور خدمات رکھتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۲۷۹/۵ بحوالہ الجواب الصحیح ۸۲/۴ (۲) سورۂ مائدہ/۶

تعلق ومحبت میں زیادہ بڑھا ہوا ہے اپنے طرز عمل سے تو ایسے بعض اصحاب کے لیے اشارے دیئے اور کسی کو کوئی اہم ذمہ داری دی اور کسی کام میں نیابت سپرد فرمائی لیکن باقاعدہ کسی کو اپنی خلافت اور نیابت نبوت کے لیے نامزد نہیں کیا بلکہ اس اہم کام کو امت پر چھوڑ دیا جبکہ امت اس کام کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتی تھی اور افراد امت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے لیے تقاضہ کرنے کا کسی صورت میں حق بھی رکھتے تھے اور وہ اسلام کی تعلیم کا سب سے سچا نمونہ، دین کے سب سے زیادہ مزاج شناس اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فیض صحبت اور تربیت کا بہترین نتیجہ تھے اس لیے ان کی نگاہ اللہ رب العالمین کی وحی پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ پر ہی ہر وقت جمی رہتی تھی، وہ اپنی خواہشات اور تقاضوں کو آپ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے طریقہ کے آگے فنا کر چکے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں تو کسی جلد بازی اور استعجاب سے کام نہیں لیا لیکن سانحہ عظیم کی خبر سنتے ہی کچھ دیر کے لیے تو یہ کیفیت ان میں ہوئی کہ جیسے ہوش اُڑ گئے ہوں لیکن فوراً سنبھل گئے اور پھر اسی ہستی کو اپنا امیر اور اپنے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ وجانشین منتخب کیا اور اپنی دینی ارشاد وتربیت اور دنیوی معاملات میں بھی رہبری و رہنمائی کے لیے چنا جو اس نازک وقت میں اور انسانی تاریخ کے سب سے حیران کن لمحہ میں بھی ایک لمحہ کے لیے بھی جادہ استقامت سے نہیں ہٹا تھا اور جس کی رفاقت و صحبت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی نازک گھڑی میں جبکہ ہجرت کا فیصلہ فرمالیا تھا اختیار کیا تھا اور وہ شخصیت جو آپ کے مزاج سے سب سے زیادہ ہم آہنگ اور آپ کے اسوہ سے سب سے زیادہ قریب اور سب سے طویل صحبت ورفاقت رکھنے والی اور سب سے پہلے آپ کی رسالت ونبوت پر ایمان لانے والی تھی کہ جس کی خصوصیات و صفات اور مزاجی ہم آہنگی واخلاقی قربت اور قربانی وخدمات کا اعتراف اس طرح فرمایا تھا کہ ''اگر میں کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا'' (صحیح بخاری) اور نماز میں ان کو

آگے کیا اور امامت کے لیے بڑھایا اور اسی طرح جس حج میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف نہیں لے جاسکے تو انھیں امیر الحجاج بنایا، امت نے آپ ہی کو اپنی دینی و دنیوی قیادت و امامت اور خلافت کے لیے چنا اور اس مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے بھی مقدم رکھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ بات آب زر سے لکھی جانے کے لائق ہے کہ ہم نے اپنی دینی امامت کے لیے ان کو جب پسند کیا تو دنیوی امامت میں کیسے نہ کرتے، ان کے الفاظ ہیں:

علامہ حافظ ابن عبدالبر اندلسی استیعاب میں نقل کرتے ہیں:

”عن قيس بن عُبادة قال قال لي علي بن أبي طالب أن رسول الله صلى الله عليه وسلم: مَرِض ليالي و أياما ينادى بالصلوة فيقول: مروا أبا بكر يصلي بالناس، فلما قبض رسول الله صلى الله عليه وسلم نظرت فإذا الصلوة عَلَم الإسلام وقُدّام الدين فرضينا لدنيانا من رضي رسول الله صلى الله عليه وسلم لديننا فبايعنا أبابكر رضى الله عنه.“(۱)

(قیس بن عبادہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دن اور کچھ راتیں بیمار رہے، اس زمانہ میں نماز کے لیے جب اذان ہوتی تھی تو فرماتے تھے کہ ابوبکر کو حکم پہنچادو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں، پھر جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو میں نے غور کیا کہ نماز اسلام کا جھنڈا ہے اور دین کا رکن (اعظم) ہے، لہٰذا ہم نے اپنی دنیا کی پیشوائی کے لیے اس شخص کو پسند کرلیا

(۱) الاستيعاب في معرفة الاصحاب ۹۷/۳

جس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دین کی پیشوائی کے لیے پسند فرمایا اور ہم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی)۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے اپنا ایماء ظاہر فرما دیا تھا اور یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت میں ذرہ برابر توقف نہیں کیا۔

وکیل اہل سنت والجماعت مولانا عبدالسلام فاروقی لکھنوی خلفائے اربعہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی خلافت راشدہ کو من جانب اللہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اہل سنت والجماعت جو خلفائے راشدین کی خلافت من جانب اللہ مانتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ چاروں خلفاء مہاجر ہیں، ان میں اہلیت خلافت کا ہونا اور جو ان میں خلیفہ ہوا اس کی خلافت کا پسندیدۂ خدا ہونا قرآن مجید میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ موجود ہے، نیز یہ کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔"(۱)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت اسلام کی صداقت اور نبوت محمدی کی حقانیت کی دلیل ہے

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ رقمطراز ہیں:

"امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے یہ بات بھی بڑے کام کی لکھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی جانشینی و خلافت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے کمال کی ایک دلیل ہے اور اس

(۱) شیعوں کے گیارہ سوالات کے فیصلہ کن جوابات از مولانا عبدالسلام فاروقی ص/۱۰

بات کا ثبوت ہے کہ آپ رسول برحق تھے، اور آپ کا مزاج مزاج نبوت تھا، مزاج سیاست نہ تھا، اور آپ کو دنیا کے بادشاہوں اور سلاطین عالم سے کوئی مناسبت نہیں جو ہمیشہ اپنے بیٹے یا اپنے خاندانی آدمی کو اپنا جانشین بناتے ہیں، اگر آپ میں بھی معاذ اللہ سلطنت اور خاندان پرستی کا کوئی شائبہ ہوتا تو حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے علاوہ بنی ہاشم کے اور بھی بہت سے افراد تھے جن کو اپنا جانشین بنا کر ایک خاندانی سلطنت کی بنیاد رکھی جاسکتی تھی اور اس اثر و اقتدار کو جو آپ کو من جانب اللہ حاصل تھا اپنے خاندان میں محفوظ کیا جاسکتا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا کمال ہے اور جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ رسول برحق تھے، کوئی دنیاوی بادشاہ نہیں تھے، اس لیے بادشاہوں کی عادت قدیمہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو ترجیح دیتے ہیں اور ان ہی کو حکومتیں سپرد کرتے ہیں اور اس سے وہ اپنے نزدیک اپنی سلطنت کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح اطراف و نواح کے والیوں اور حکمرانوں کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا بھی یہی دستور ہے، بنو بویہ، بنی سلجوق (سلاجقہ) اور مشرق و مغرب اور شام و یمن کے تمام سلاطین و ملوک اپنے ہی عزیزوں کو اور اپنے خاندانی لوگوں کو حکومت کے حوالہ کرتے ہیں، اسی طرح سے عیسائی اور مشرکین بادشاہوں کا بھی یہی معمول ہے، فرنگی بادشاہ اور چنگیز خاں کے

خاندان کے بادشاہوں کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ سلطنت بادشاہ کے خاندان میں باقی رہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ شاہی خاندان میں سے ہے، یہ شاہی خاندان میں سے نہیں ہے، یہ ہڈی کا ہے، یہ ہڈی کا نہیں ہے، اس بنا پر حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تولیت اور اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور اپنے چچا زاد بھائی علی رضی اللہ عنہ، عقیلؓ، ربیعہؓ ابن الحارث بن عبدالمطلب، ابوسفیانؓ بن الحارث بن عبدالمطلب وغیرہ کا خلیفہ نہ بنانا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اس شاہی آئین کے پابند نہیں تھے، ان کے علاوہ بنی عبد مناف میں حضرت عثمانؓ بن عفان، خالدؓ بن سعید بن العاص، ابانؓ بن سعید بن العاص وغیرہ موجود تھے، اور بنو عبد مناف کا خاندان قریش میں سب سے جلیل القدر اور نسب میں آپ سے قریب تر تھا، یہ اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندہ اور اللہ کے رسول ہیں، اور وہ کوئی بادشاہ نہیں ہیں، کیونکہ انھوں نے خلافت کے بارے میں کسی کو محض قرب نسب یا خاندانی شرف کی وجہ سے آگے نہیں کیا بلکہ ایمان وتقویٰ کی بنا پر، اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت آپ کے بعد اللہ ہی کی عبادت کرے گی اور اللہ ہی کے حکم پر چلے گی، قومی یا خاندانی یا ذاتی سربلندی اور علو فی الارض اس کا مقصود نہیں، یہاں تک کہ بعض انبیاء کے لیے جس سلطنت کی اجازت دی گئی اس تک کو اختیار نہیں کریں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اختیار دیا کہ آپ عبد رسول رہیں یا پیغمبر بادشاہ، آپ

نے اسی کو اختیار کیا کہ آپ عبد رسول رہیں، درحقیقت حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کی تولیت اسی کا تتمہ تھا، اس لیے کہ اگر آپ اپنے اہل بیت میں سے کسی کو اپنا قائم مقام بنا جاتے تو ان لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا کہ آپ نے مال اپنے ورثاء کے لیے جمع کیا ہے۔"(۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت

جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے ان کے عہد خلافت میں کئی بڑے اہم کام انجام پائے، اور فتوحات ہوئیں، اور احکام اسلام کی تنفیذ کا سلسلہ قائم رہا، عدل قائم ہوا، اور قرآن مجید کی خدمت کی آخری شکل جمع قرآن انجام پائی، علامہ ابن کثیر نے چند جملوں میں پورے عہد کا خلاصہ کر دیا ہے کہ:

"وجبی الخراج من المشارق والمغارب إلى حضرة أمير المؤمنين عثمان بن عفان رضي الله عنه وذلك ببركة تلاوته ودراسته وجمعه الأمة على حفظ القرآن ولهذا ثبت في الصحيح أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: "إن الله زوى لي الأرض فرأيت مشارقها ومغاربها و يبلغ ملك أمتي ما زوى لي منها." فها نحن نتقلب فيما وعدنا الله ورسوله وصدق الله رسوله فنسأل الله الإيمان به وبرسوله والقيام بشكره على الوجه الذي يرضيه عنا."(۲)

(مشرق ومغرب سے خراج حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پہنچتا تھا

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۲/۲۹۹-۳۰۱ بحوالہ منہاج السنۃ ۴/۱۲۶

(۲) بحوالہ تفسیر ابن کثیر، سورۂ نور، آیت استخلاف فی الارض۔

اور یہ ان کے قرآن مجید سے شغف، اس کی خدمت وتلاوت، مطالعہ اور امت کو قرآن مجید کی حفاظت کے کام پر جمع کرنے کا نتیجہ وبرکت تھی اور صحیح روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو سمیٹ دیا، تو میں نے اس کے مشرق ومغرب کو دیکھا اور میری امت کا اقتدار وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک میرے لیے زمین کو سمیٹا گیا۔'' اور آج ہم مزے کر رہے ہیں، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدہ کے نتیجہ میں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل سچ فرمایا تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے اس پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا سوال کرتے ہیں اور اس شکر کی توفیق مانگتے ہیں جس سے وہ راضی ہو)۔

استخلاف فی الارض کا وعدہ اور خلافت راشدہ کا تحقق

سورہ نور میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُم فِيْ الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِيْ ارْتَضَى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئاً وَمَن كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُوْلَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾(۱)

(تم میں جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے بھلے کام کیے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضرور زمین میں حاکم بنائے گا جیسا اس نے ان کے پہلوں کو حاکم بنایا اور ان کے لیے ان کے اس دین کو

---

(۱) سورہ نور/۵۵

ضرور طاقت عطا فرمائے گا جس کو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے
اور ضرور ان کے خوف کو اطمینان سے بدل دے گا (بس) وہ میری
بندگی کرتے رہیں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جس نے
اس کے بعد بھی انکار کیا تو وہی لوگ نافرمان ہیں)۔

ایمان اور عمل صالح کو اختیار کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے اور کفر و شرک اور مظاہر کفر و شرک سے نفرت اللہ کو اس قدر پسند ہے کہ اس راہ میں مجاہدہ و مشقت اور قربانی سے کام لینے اور ہر رکاوٹ کا مقابلہ اور ہر قسم کے حالات کو جھیلنے پر پھر اللہ عسر کے بعد یسر، خوف کے بعد امن، فتنوں کے بعد سلامتی اور دین پر عمل کے بعد اس کی تنفیذ اور دوسروں کو عمل کرانے کی فضا قائم کرنے اور ماحول بنانے کی صلاحیت و قدرت اس طور پر عطا فرما دیتے ہیں کہ وسائل اس کے تابع اور حالات اس کے لیے سازگار ہوتے چلے جاتے ہیں حتی کہ ارباب حکومت و اقتدار بھی اس کی غلامی میں آجاتے ہیں یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے جسے تاریخ انسانی میں بار بار اللہ دہراتا رہا ہے اور انبیاء و رسل کی خلافت اور ان کے وارثین کی خلافت کا یہ ایک سلسلہ ہے جو بلا انقطاع اپنے صحیح تسلسل کے ساتھ جاری و ساری ہے، اس لیے جو ایمان و یقین توکل واعتماد علی اللہ کے صحیح فکر و شعور کے ساتھ عمل صالح اور رشد و ہدایت کی زندگی گزارتا ہے اور جس قدر شرک و کفر اور ان اعمال سے جن میں اس کی بو بھی آرہی ہوتی ہے دور رہتا ہے اور نفرت کرتا ہے اور دوسروں کے دلوں میں نفرت پیدا کرتا ہے تو یہ اللہ کی سنت نظر آتی ہے کہ اللہ اسے وہ سطوت و اقتدار دیتا ہے جو دلوں اور دماغوں پر ہوتا ہے یہی اس خلافت ارضی کی باطنی صورت ہے جس کی طرف مفسر قرطبی اشارہ کرتے ہیں کہ:

"قال ابن العربی: "...... هذا وعد عام فی النبوة والخلافة
وإقامة الدعوة وعموم الشريعة، فنفذ الوعد فی كل أحد
بقدره وعلى حاله حتى فی المفتين والقضاة والأئمة

وليس للخلافة محل تنفذ فيه الموعدة الكريمة إلا من تقدم من الخلفاء."(۱)

(ابن العربی کہتے ہیں: "...... یہ وعدہ استخلاف نبوت وخلافت، اقامت دعوت، تعمیم شریعت، سب کے لیے عام ہے، اور اس وعدہ کا نفاذ ہر ایک کے ساتھ اس کے حال اور منزلت کے بقدر ہوا، یہاں تک کہ افتاء وقضاء امامت کے رجال میں بھی نافذ ہوا، خلافت میں اس کا محل وہی خلفاء ہیں جو گزر چکے)۔

لیکن اللہ نے وہ ظاہری خلافت باطنی خلافت کے ساتھ اپنے منتخب بندوں کے لیے بھی مقرر فرمائی جنھوں نے اسلام کی نشر واشاعت اور اعلاء کلمۃ اللہ اور دعوت الی التوحید میں آخری نبی سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور سخت ترین حالات سے گزر کر اسلام کی بنیادوں کو مضبوط کیا تھا، اور اپنے وطن مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنی پڑی تھی، یہی وہ حضرات ہیں جنھیں استخلاف اور تمکین فی الارض کی کھلی بشارت "لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ" کہہ کر دی گئی اور مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ "وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ" اور یہ خوشخبری بھی دی گئی کہ "وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا" علامہ شبیر احمد عثمانی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ وعدۂ الٰہی چاروں خلفاء رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں پورا ہوا، اور دنیا نے اس عظیم الشان پیشین گوئی کے ایک حرف کا مصداق اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"

اور بعض شبہات کا ازالہ کرتے ہوئے مفسر قرطبی ابن العربی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"فإن قيل هذا الأمر لا يصح إلا في أبي بكر وحده،

(۱) تفسیر آیۃ استخلاف قرطبی

فأما عمر و عثمان فقتلا غيلة، وعليّ قد نوزع في الخلافة، فقلنا: ليس في ضمن الأمن السلامة من الموت بأي وجه كان، وأما علي فلم يكن نزاله في الحرب مذهبا للأمن، وليس من شرط الأمن رفع الحرب، إنما شرطه ملك الإنسان لنفسه باختياره، لا كما كان أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم بمكة." ثم قال في آخر كلامه:

"وحقيقة الحال أنهم كانوا مقهورين فصاروا قاهرين، وكانوا مطلوبين فصاروا طالبين، فهذا نهاية الأمن والعز."(۱)

(اور اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ بات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں درست نہیں، چونکہ حضرت عمر و حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو بھی دھوکہ سے شہید کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کے سلسلہ میں بھی تنازعہ پیش آیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ امن کے ضمن میں ہر طرح کی موت سے سلامتی شامل نہیں، جہاں تک حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو ان کا میدان جنگ میں اترنا امن کے لیے خطرہ نہیں تھا، چونکہ امن کی شرط جنگوں کا ختم ہونا نہیں بلکہ امن کی شرط انسان کو اپنے آپ پر با اختیار تصرف ہونا ہے نہ کہ وہ صورت حال جو مکہ مکرمہ میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھی۔"

اور آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) تفسیر آیۃ استخلاف قرطبی

''حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ پہلے مقہور تھے، بعد میں قاہر ہو گئے، پہلے دشمن ان کے تعاقب میں تھے، اب وہ دشمنوں کے تعاقب میں تھے، اور یہ امن و سلامتی اور شوکت و غلبہ کا آخری درجہ ہے۔''

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

''یہ وعدہ (استخلاف و تمکین فی الارض اور خوف کے بعد امن کا) ان لوگوں کے ساتھ کیا گیا ہے، جو سورۂ نور کے نزول کے وقت موجود، اسلام اور صحبت نبوی سے مشرف، اور دین کی نصرت و تائید میں شریک تھے۔

اس وعدہ کا اطلاق حضرت معاویہ، بنوامیہ اور بنوعباس پر نہیں ہوتا، جو اس وقت یا تو اسلام نہیں لائے تھے یا مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے۔

یہ بات نہ تو ممکن ہے نہ معقول کہ اس پوری جماعت مسلمین کو خلافت فی الارض سے سرفراز کیا جائے، اور وہ سب بیک وقت منصب خلافت پر فائز ہوں، اس لیے اس سے کچھ خاص افراد ہی مراد لیے جاسکتے ہیں۔

''لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ یعنی لیستخلفنّ جمعاً منهم، و''انقیاد'' لوازم اوست'' یعنی ان میں سے ایک جماعت کو خلیفہ بنایا جائے گا، اور انقیاد و طاعت اس کے لیے شرط ہے، پھر یہ کہ جب اس وعدہ کا تحقق ہوگا تو دین علیٰ اکمل الوجوہ ظہور میں آئے گا، اور اس کو پورا اقتدار اور اختیار حاصل ہوگا، ایسا نہیں، جیسے اثنا عشری حضرات کہتے ہیں کہ خدا کو جو دین پسند ہے وہ ہمیشہ مستور و مختفی رہتا ہے اور اسی بنا پر ائمہ اہل بیت نے ہمیشہ تقیہ سے کام لیا اور

ان کو اپنے دین کے کھلم کھلا اعلان کی کبھی قدرت حاصل نہیں ہوئی "وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمْ دِینَهُمُ الَّذِی ارْتَضَىٰ لَهُمْ" (ان کے لیے پسند کرلیا ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وہ دین خدا کا پسندیدہ اور منتخب دین نہیں جس کا اس زمانہ خلافت میں اعلان واظہار نہ کیا جاسکے۔

اسی طرح فرماتا ہے "وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْناً" اس زمانہ استخلاف میں اللہ تعالیٰ خوف و ہراس کی فضا کے بجائے امن واطمینان کی فضا پیدا کردے گا، اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مستخلفین اور بقیہ مسلمان اس وعدہ کی تکمیل کے وقت امن و اطمینان کے ساتھ ہوں گے، نہ ان کو مختلف الادیان کفار کا کوئی ڈر ہوگا اور نہ کسی اور جماعت یا طاقت کا اندیشہ۔(۱)

خلافت کی ضرورت اور اس کے کام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

"اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں، ان میں عبد و معبود کے تعلق کی اصلاح و تنظیم، پھر اس کی ترویج و توسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے، ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب، پرسکون اور پرامن زندگی کے فضا ہموار کرنا بھی ہے، جس میں خالق کے فرائض، مخلوق کے حقوق، دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے، جن کی صلاحیت انسان کی فطرت میں

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۵/۲۶۴-۲۶۶ بحوالہ ازالۃ الخفاء ۱/۲۰

ودیعت کی گئی ہے، اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت، ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو، جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں، کبھی خودساختہ قوانین سے، کبھی مطلق العنانی اور جاہ و اقتدار کی ہوس سے، اس کے لیے ایک منزل من اللہ قانون، آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت وحاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت وامارت ضروری ہے، جہاں تک شریعت الٰہی کا تعلق ہے، اس کے منزل من اللہ، معصوم عن الخطأ، اغراض و مفادات، تعصبات اور جنبہ داریوں سے بلند و بالاتر ہونے کا عقیدہ ضروری ہے، اور جہاں تک خلافت وامارت کا تعلق ہے، اس کا اس شریعت کے صحیح ترجمان ونمائندہ، اور انسانی طاقت و ارادہ کی حد تک بے جا حمایت وعصبیت، مداہنت اور عدم مساوات سے دور رہنا ضروری ہے۔"(۱)

خلافت راشدہ یا خلافت نبوت

خلافت راشدہ دراصل خلافت نبوت ہے، یوں تو انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے، اور دوسری مخلوقات کو اس سے وابستہ کردیا، اس انعام کی جو انسان قدر کرتا ہے اور اس کا طریقہ راہ نبوت سے قریب تر ہوتا ہے، وہ اس کا صحیح مصداق ہوتا ہے، اس کی خلافت خلافت راشدہ بلکہ خلافت کا درجہ پالیتی ہے، زمینی سطوت واقتدار کے ساتھ اس خلافت کی مدت حدیث پاک میں تیس سال بیان کی گئی، جس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دو سال، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دس سال اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بارہ سال اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے (جس میں حضرت

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت ۲۵۹/۵

حسن رضی اللہ عنہ کی چھ ماہ کی مدت بھی شامل ہے) چھ سال ملا کر تیس سال ہوتی ہے، جیسا کہ سفینہ (مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی روایت میں ہے۔(۱)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت، خلافت نبوت کا امتداد اور تکمیل ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا اور دین کا مزاج اور شریعت کی روح کو سمجھنا اور اللہ کی مرضی کا مسلسل خیال اس میں آپسی روابط و تعلقات پر اللہ کے تعلق اور اس کی پسند کو ترجیح دینا اس کا سب سے بڑا امتحان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ عظیم کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پیش آیا تھا، اور وہ اس امتحان میں پوری طرح کھرے اترے تھے، دوسرا بڑا امتحان سیدنا حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کے بعد حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے سامنے تھا، اور ایسے حالات میں جب امت کا شیرازہ بکھرتا دکھائی دے رہا ہو تو ایسے حالات میں دین و شریعت کے احکام اور سنت کی اتباع کو دیکھنا اور لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرنا اور باغیوں سے قتال اور قصاص اور حدود کے نفاذ میں تعجیل کے بجائے عدل و قسط کے دامن کو مضبوطی سے تھامنا، یہ وہ مشترکہ روح ہے جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں نظر آتی ہے، حکیم الاسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے بڑی بالغ نظری اور مؤرخانہ بصیرت و فراست سے اس کا تجزیہ کیا ہے، وہ رقم طراز ہیں:

> ''یہی اتباع، خلافت راشدہ کی روح ہے، اور یہی وہ پہلو ہے جو حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی خلافتوں میں پورے طور پر مشترک ہے، ایک نے فتوحات کا شاندار نمونہ پیش کیا،

---

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتب حدیث و سیر و تاریخ۔

دوسرے نے انتہائی فتنوں اور آزمائشوں اور اپنی خلافت کے پر آشوب دور میں نبوت کی جانشینی کا حق ادا کر کے دکھلا دیا، اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے معیار سے بال برابر ہٹنا اور اپنے اصول میں ذرہ برابر ترمیم اور ادنیٰ لچک پیدا کرنا بھی گوارہ نہیں کیا، بیت المال کی آمد و خرچ کے معاملہ میں عمال و حکام کے عزل و نصب میں وہ اسی پل صراط پر قائم رہے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے تیز ہے۔

یہ کام مؤرخ کا ہے کہ وہ صدیقی اور علوی دور خلافت کی تفصیلات مرتب کرے اور ان کے اسباب و نتائج سے بحث کرنے، گہری نظر رکھنے والے کی نگاہ میں اصل چیز اتباع ہے، اور اس لحاظ سے اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت درحقیقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا طبعی امتداد و تسلسل نظر آئے گا اور دونوں میں بنیاد، روح اور مزاج کا کوئی فرق نہیں محسوس ہوگا۔‘‘ (۱)

اور محدث جلیل مولانا عبدالرشید نعمانی تحریر فرماتے ہیں:

’’اصل بات یہ ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحۂ رحلت کے ہوش ربا واقعہ نے وقتی طور پر بعض اکابر صحابہ کے دل و دماغ پر شدت غم سے ایسی کیفیت طاری کر دی تھی کہ وہ بعض معاملات میں بروقت صحیح فیصلہ نہ کر سکے، لیکن حق تعالیٰ نے جانشین پیغمبر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اس وقت مقام تمکین پر فائز رکھا، اور باوجود اس کے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے داغ مفارقت کا سب سے زیادہ اثر قلب صدیق ہی پر تھا، مگر

---

(۱) سیرت سید احمد شہید ۲/۴۹۶

آپ کسی مقام پر بھی شدت جذبات سے مغلوب نہ ہوئے اور جو مسئلہ بھی پیش آیا اس کے بارے میں بروقت صحیح فیصلہ فرمایا، یہی کیفیت کم وبیش حضرت ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے مظلوماً شہید ہوجانے پر پیش آئی کہ بہت سے حضرات اکابر صحابہ بھی اس وقت شدت جذبات میں صحیح فیصلہ کرنے سے قاصر رہے(۱) مگر حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو اس خلافت نبوی کے منصب پر فائز تھے، ان کو حق تعالیٰ نے مقام تمکین پر فائز فرمایا، اور جو مسئلہ بھی اٹھا، بروقت اس کے بارے میں صحیح فیصلہ صادر کرنے کی توفیق ارزانی فرمائی، یہ الگ بات ہے کہ چونکہ آپ کی نسبت ہارونی تھی، جیسا کہ صحیح حدیث میں آتا ہے "أنت منی بمنزلة هارون من موسیٰ" (تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تھی) اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء اولوالعزم سے تشبیہ دی ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابراہیم وعیسیٰ علیہم السلام سے اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو حضرت نوح وحضرت موسیٰ علیہما السلام سے، اس لیے جیسا امت کا اتحاد واتفاق خلافت شیخین رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں ظاہر ہوا، حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں نہ

---

(۱) اکابر صحابہ رضی اللہ عنہ سے ایسے اقوال بھی منقول ہیں، جس میں ان کو شدید ندامت اور تأسف تھا کہ انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے آنے میں کیوں عجلت سے کام لیا، اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے تو تلافی مافات میں شہادت سے قبل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک نمائندہ کے ہاتھ پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے تجدید بیعت بھی فرمائی۔ (تفصیل کے ملاحظہ ہو: المرتضیٰ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا عبد الرشید نعمانی کی کتاب: حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ)

ہوسکا، یہ ایک امر واقعہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کو انبیاء اولوالعزم سے مشابہت کی بنا پر حق تعالیٰ کی طرف سے وہ تمکن و اقتدار نصیب ہوا جو حضرات ختنین رضی اللہ عنہما کو نصیب نہ ہوسکا، اور حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام سے مشابہت تامہ حاصل تھی اس لیے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں امت حضرت ہارون کی اتباع میں جمع نہ ہوسکی، حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی ان کی اقتدا میں جمع نہ ہوسکی، مگر اس میں حضرت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کوئی قصور نہ تھا۔" (۱)

خلافت راشدہ کا ایک بڑا امتیاز اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس طرح اس میں معاشرت و سیاست کی کلیات و جزئیات اسلامی رنگ میں رنگ دیا گیا، اس طرح ایمانیات واخلاقیات کے ایک ایک پہلو کو بھی پیش کر کے صالح ایمانی معاشرہ قائم کردیا گیا، اس میں اگر الحاد و بے دینی وارتداد، نفاق، شرک اور فسق وفجور، شقاق وعداوت، قتل وسفاکی کے واقعات نظر آتے ہیں تو اس موقع پر خلفائے راشدین کے اقدام نے قیامت تک کے لیے ایسے حالات میں اقدام وعمل کی وہ نظیر پیش کردی جس کی روشنی میں ہمیشہ رہنمائی حاصل کی جاسکتی ہے، اس طرح پورے دین کی تعلیمات کو خواہ ان کا تعلق ظاہر حال سے ہو یا باطن حال سے، انفرادی زندگی سے ہو یا اجتماعی زندگی سے ان چاروں خلفاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام کردیا اور یہ ثابت کردکھایا کہ خواہ کتنے ہی سخت حالات ہوں ان پر چلنا مشکل نہیں، اس طرح علم کا ایک عظیم الشان قصر تعمیر ہوگیا، اس طرح وہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی

---

(۱) ملاحظہ ہو: حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ از مولانا عبدالرشید نعمانی ص/۹۵-۹۶

تھی: "أنا مدينة العلم و عليّ بابها." چنانچہ خلفائے ثلاثہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورے اور پھر اقتدار ملنے اور منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد فیصلے ایسے سامنے آئے جن سے علم و عمل کے وہ دروازے کھلتے ہیں، جن سے علم و عمل اور ہدایت کے جواہرات اور موتیوں تک رسائی آسان ہو جاتی ہے، جن سے انسان اپنے دل کو نور نبوت سے منور اور دماغ کو علم نبوت سے روشن کر سکتا ہے۔

خلفائے اربعہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین)
بے نظیر وحدتِ امتزاج و وحدتِ منہاج

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

راقم سطور کے نزدک خلافت راشدہ اور ارکان اربعہ کی یہ تعبیر صحیح نہیں کہ وہ چند مختلف المزاج و مختلف الاغراض، متبائن الاسالیب اشخاص کے اتفاقی مجموعہ کا نام ہے اور یہ چاروں حضرات چار مختلف سیاستوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں، بخت و اتفاق نے ان کو ایک زنجیر (خلافت و قیادت اسلامی) میں جوڑ دیا، ان میں سوائے ایمان واخلاص اور صداقت اور حقانیت کے کوئی مشترک عنصر نہیں، جو لوگ زیادہ تاریخی بصیرت و دقت نظر کا اظہار کرنا چاہتے ہیں وہ خلافت راشدہ کو دو حصوں اور خلفائے راشدین کو دو گروپوں پر تقسیم کرتے ہیں، خلافت راشدہ کے پہلے حصے یا دور کو اسلام کی ترقی و پیش قدمی اور دوسرے دور کو اسلام کے تنزل اور وقوف سے تعبیر کرتے ہیں، پہلے دور کا امام صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ عنہما کو مانتے ہیں اور دوسرے دور کا امام عثمان غنی اور علی مرتضٰی رضی اللہ عنہما کو کہتے ہیں، میرے نزدیک یہ تقسیم جسارت سے خالی نہیں، میرے نزدیک یہ چاروں حضرات فرداً فرداً خلافت نبوی کا مظہر اتم اور مصداق کامل تھے، ذاتی فضائل و مناقب اور ان کی بنا پر تفاوت درجات کو الگ کر کے خلافت راشدہ کا مزاج اور اس کی روح ان میں سے ہر ایک میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔

خلافت راشدہ کیا ہے؟ خلافت نہ اسلامی مملکت کی وسعت کا نام ہے نہ کثرت فتوحات کا، نہ کامیابیوں کے تسلسل کا، اگر معیار یہی ہوتو پھر ولید بن عبدالملک اور ہارون الرشید کوسب سے بڑا خلیفہ راشد ماننا پڑے گا، خلافت راشدہ نام ہے نبی کے مزاج اور طرز زندگی میں نیابت کاملہ کا، نبوت کا امتیازی مزاج کیا ہے؟ ایمان بالغیب کی قوت، اطاعت الٰہی کا جذبہ صادق وکامل، غیب پر شہود، احکام پر مصالح وفوائد کو قربان کرنا، دنیا پر آخرت اور غنیٰ پر فقر وزہد کو ترجیح دینا، اسباب دنیا سے کم سے کم متمتع ہونا اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتع کرنے کی کوشش کرنا، یہ وہ اجمال ہے جس کی تفصیل پوری سیرت محمدی ہے اور جس کے مظاہر بدر وخندق کے معرکے، تبوک کا سفر، حدیبیہ کی صلح، مکہ کی فتح اور ۲۳ برس کی وہ زاہدانہ زندگی ہے جس کا اول شعب ابی طالب کی اسیری اور جس کا آخر زندگی کی وہ آخری شب ہے جس میں گھر میں چراغ بھی نہ تھا اور زرہ نبوی تیس صاع جو کے عوض میں ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔

اس معیار سے ان خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی زندگی اور دور خلافت خلافت راشدہ کا مکمل نمونہ تھا، جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج اور طرز زندگی کی پوری نمائندگی تھی، واقعہ ارتداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بے نظیر صلابت واستقامت اور اس فتنۂ عالم آشوب میں مٹھی بھر جماعت صحابہ کے ساتھ پورے ملک عرب سے جنگ کرنے کا عزم اور فیصلہ، پھر عین اس نازک وقت میں جبکہ ایک ایک سپاہی جیش کا قائم مقام تھا اور اسلام کا مرکز ثقل (مدینہ طیبہ) دشمنوں کے نرغے میں تھا، جیش اسامہ کو شام کی جانب روانہ کردینے اور منشائے نبوی کی تکمیل میں (حالات وتغیرات کا لحاظ کیے بغیر) اصرار، پھر مسلمانوں کی موت وحیات کی اسی فیصلہ کن گھڑی میں دنیا کی دو عظیم ترین شہنشاہتوں (رومۃ الکبری اور فارس اعظم) میں جنگ کا سلسلہ چھیڑ دینا، ایمان واطاعت کا وہ واقعہ ہے جس کی نظیر صرف انبیاء اور ان

کے خلفائے اولوالعزم کی تاریخ میں مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ زمانہ خلافت وفتوحات میں ایسی زاہدانہ زندگی گزارنا جس میں بیت المال کے روزینہ سے منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے اور بچوں کا منہ میٹھا کرنے کی بھی گنجائش نہ تھی اور پھر انتقال کے وقت اس پوری رقم کو جو زمانہ خلافت میں (مسلمانوں کے فیصلے سے) بیت المال سے اپنی گزراوقات کے لیے تھی ذاتی زمین فروخت کرکے بیت المال کو واپس کردینے اور اس پورے سامان کو جس کا خلافت کے دور میں اضافہ ہوا تھا بیت المال میں منتقل کردینے کی وصیت زہد وایثار کے ایسے واقعات ہیں جن کی نظیر شاہد انبیاء علیہم السلام کی زندگی کے علاوہ کہیں اور نہ مل سکے اور جو اسی اصل کا "ظِل" ہے، جس کی خلافت اولیٰ کا شرف ان کو حاصل تھا۔

اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا روم وشام کی جنگوں اور یرموک و قادسیہ کے معرکوں میں افواج کی تعداد و اسلحہ کے بجائے اللہ کی فتح ونصرت اور اسلامی افواج کے اعمال واخلاق اور تعلق باللہ پر اعتماد، یرموک کے معرکہ کے موقع پر (جس سے سخت معرکہ تاریخ اسلام میں کم پیش آیا ہوگا) اسلام کے مظفر ومنصور قائد اور اسلامی افواج کے سپہ سالار و معتمد سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اسلامی افواج کی قیادت علیا سے معزول کردینا اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ جیسے نرم خو ونرم مزاج کو قائد مقرر کرنا، عظیم ترین عمال کا بے لاگ احتساب، جبلہ بن الایہم جیسے سردار قوم اور بادشاہ پر ایک غریب فزاری کے مقابلہ ومعاملہ میں قصاص جاری کرنا، ایسی ایمان واطاعت کی مثالیں ہیں جو نبوت کا مزاج اور خلافت راشدہ کا تمغۂ امتیاز ہے۔

پھر ان کا زہد واحتیاط جس نے عام الرمادہ (قحط عام) میں ان کو ہر ایسی غذا سے باز رکھا جو عام مسلمانوں اور ان کی وسیع مملکت کی عام آبادی کو میسر نہیں تھی، یہاں تک کہ لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اس قحط نے طول کھینچا تو وہ بچ نہیں سکیں گے اور ان

کی زاہدانہ زندگی اور تقشف جس نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے اسی زاہدانہ زندگی کا پرتو ہے، جس کی اصل وظل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ اول کی نیابت ان کے حصہ میں آئی تھی۔

اسی طرح وہ ثبات واستقامت اور وہ عزم و یقین جس کا اظہار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بلوائیوں کی شورش اور ترک خلافت کے مقابلہ کے موقع پر کیا تھا اور بالآخر مظلومانہ شہادت پائی، پھر اسباب غنیٰ کی فراوانی و موجودگی میں اپنی ذاتی زندگی میں زہد وایثار کا اظہار جو ان کے تین نامور پیشروؤں کی میراث تھی، حکومت کے مہمانوں اور عام مسلمانوں کو امیرانہ اور پر تکلف کھانا کھلانا اور خود گھر میں جا کر زیتون کے تیل سے روٹی کھانا وہ صحیح خلافت ہے جس کی خلعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پہنائی اور جس کے اتارنے سے انھوں نے صاف انکار کر دیا۔

خلافت نبوت کا یہی مزاج اور زندگی کا یہی انداز اسی سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی ابن عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں پورے طور پر نمایاں و روشن ہے، اس طلائے خالص اور اس جوہر اصلی پر جمل اور صفین کی جنگوں کا جو عارضی غبار پڑ گیا ہے اس کو اگر آپ ہٹا دیں تو اس گوہر آبدار کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر دے اور خلافت نبوت کے وہ تمام خصائص نظر آ جائیں جو اس کے تین پیشروؤں اور زندگی کے رفیقوں میں مشترک ہیں، حکم اور اصول پر مصلحت و سیاست کو قربان کرنا، خلافت کے بقا واستحکام کے لیے ان تمام طریقوں اور تدبیروں کے اختیار کرنے سے انکار کر دینا جو اہل حکومت اختیار کرتے ہیں، لیکن خلافت نبوت کے امین کے لیے ان کی گنجائش نہیں، عمال حکومت اور ارا کین مملکت میں سے ایسے اصحاب کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر دینے میں تامل نہ کرنا جو اس کی نظر میں ورع وتقویٰ کے اس بلند معیار پر نہیں جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے خلفائے چھوڑ کر گئے ہیں اور جو اس نظام خلافت کے شایان شان ہے، اصول وعقیدہ کی خاطر اور خلافت کو منہاج نبوت پر

باقی رکھنے کے لیے ان تمام ناخوشگوار فرائض کو انجام دینا جو اس کے لیے سوہان روح ہے، لیکن عقیدہ اور مومن کے یقین کا تقاضا اور وقت کا مطالبہ تھا، خلافت کی پوری مدت کو ایک مسلسل مجاہدہ، ایک مسلسل کشمکش، ایک مسلسل سفر میں گزارنا لیکن نہ تھکنا، نہ مایوس ہونا، نہ بددل ہونا، نہ شکایت کرنا، نہ راحت کی طلب، نہ محنت کا شکوہ، نہ دوستوں کا گلہ، نہ دشمنوں کی بدگوئی، مدح وذم سے بے پروا، جان سے بے پروا، انجام سے بے پروا، نہ ماضی کا غم، نہ مستقبل کا اندیشہ، فرض کا ایک احساس مسلسل اور سعی کا ایک سلسلہ غیر منقطع، دریا کا سا صبر، سورج اور چاند کی سی پابندی، ہواؤں اور بادلوں کی سی فرض شناسی، معلوم ہوتا ہے جس طرح ذوالفقار ان کے ہاتھ میں سرگرم و بے زبان ہے اسی طرح وہ کسی اور ہستی کے دست قدرت میں سرگرم عمل اور شکوہ وشکایت سے ناآشنا ہیں۔

ایمان واطاعت کا وہ مقام ہے جو ''صدیقین'' کو حاصل ہوتا ہے، لیکن اس کا پہچاننا اور ان نزاکتوں اور مشکلات سے واقف ہونا بڑے صاحب نظر اور صاحب ذوق کا کام ہے، اس لیے ان کی زندگی اور ان کی عظیم شخصیت کا پہچاننا ایک بڑا امتحان بن گیا ہے، اور وہ اہل سنت کا ایک امتیاز ہے، ان ایمان بالغیب اور اس جذبہ اطاعت کا ظہور جس ماحول اور جس ناخوش گوار واقعات کی شکل میں ہوا، وہ اس ماحول اور ان واقعات سے بہت مختلف ہے، جن میں ان کے پیشرو خلفا کے ایمان بالغیب اور جذبہ اطاعت کا اظہار ہوا تھا، اس لیے بہت سے مؤرخین اور اہل قلم اور مدعیان فکر ونظر بھی اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، وہ جس کو داخلی فتنے اور مسلمانوں کی خانہ جنگی کہتے ہیں، ہم ان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ صرف معذور بلکہ ماجور پاتے ہیں، ہم اگرچہ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ فریق مقابل (اہل شام) ایک اجتہادی غلطی کا مرتکب تھا، اس لیے اس کی تضلیل وتفسیق ہرگز درست نہیں، لیکن ہم یہ بھی عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں جو کچھ کیا وہ ایمان واطاعت کے جذبہ اور

ادائے فرض کی روح کے ساتھ کیا، اس لیے یہ عمل ان کے لیے تقرب و رفع درجات کا باعث تھا۔

پھر ان کی زاہدانہ زندگی خلافت نبوت کا پرتو کامل اور خلافت صدیقی و خلافت فاروقی کا نور تھی، یہ فقر و زہد، تقشف و قناعت کی ایسی زندگی تھی کہ اس زمانہ کے بڑے بڑے زہاد اس میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتے تھے اور بالآخر ان کے منتخب عمال حکومت اور ان کے قریب ترین عزیز بلکہ حقیقی بھائی عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی ان کا ساتھ نہ دے سکے۔

درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں جو ایمان بالغیب اور ایمان بالآخرت پیدا کیا، اس نے ان کے ذہن و دل، سیرت و اخلاق، زندگی اور کردار اور معیشت و سیاست کو ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا تھا، عسر و یسر، کامیابی و ناکامی، فقر و فاقہ اور امارت و حکومت میں اسی کا بے تکلف اظہار ہوتا تھا، اس ایمان کے سلسلۂ معجزات کا سب سے طاقتور اور سب سے نمایاں و ممتاز کڑیاں خلفائے راشدین ہیں، وہ اسی معنی میں خلفائے راشدین ہیں کہ نبوت کا یہ مزاج اور نبی کی یہ میراث ان کی طرف منتقل ہوئی ہے اور انھوں نے اس مزاج و منہاج میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل نیابت کی، نافہم یہ سمجھے کہ یہ بھی کسی بادشاہ وقت یا حاکم شہر کی نیابت کا مسئلہ ہے اور سوال ان فوائد سے کسی شخص اور اس کے خاندان اور متعلقین کے متمتع ہونے کا ہے جو اس کی مسند پر بیٹھے گا اور ساری کشمکش اسی بات کی تھی، حالانکہ سوال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض انجام دینے اور اسی کی سی زہد و تقشف اور ایثار و قربانی کی زندگی گزارنے، خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ محنت کرنے اور کم سے کم راحت و فراغت حاصل کرنے کا سوال تھا اور اس میں کیا شبہ ہے کہ خلفائے راشدین نے یکے بعد دیگرے اس حق کو ادا کر کے دکھایا، نبوت خلافت الٰہی ہے اور خلافت راشدہ خلافت نبوی ہے، اخلاق و صفات الٰہی میں بڑا درجہ ''صمدیت'' کا ہے،

اورخدا کی شان "یُطعِمِ و لا یُطعَم" کی ہے، انسان اس مقام تک تو کیا پہنچ سکتا ہے، اس کی معراج یہی ہے کہ وہ دوسروں کو زیادہ سے زیادہ فیض پہنچائے اور ان سے کم سے کم فیض اٹھائے، جہاں تک "یطعم" (دوسروں کو کھلانے) کا تعلق ہے اس کا ہاتھ کشادہ، اس کی ہمت بلند اور جہاں تک "یطعم" (دوسروں کا کھانے) کا تعلق ہے، اس کا ہاتھ کشیدہ اور اس کی نظر بلند رہے

عدیل ہمت سا قیست فطرت عرفی
کہ حاتم دگران و گدائے خویشتن است

راقم کے نزدیک اسلام کی زندگی میں پیش آنے والے تمام ادوار و مراحل کی نمائندگی خلافت راشدہ کے اس مختصر سے دور میں (جو چالیس سال سے متجاوز نہیں) کردی گئی ہے اور ہر آنے والے کو ناگزیر دور کے لیے اس میں رہنمائی کا سامان ہے، آغاز کا اقبال و ترقی اور فتنہ آشوبی کے دور میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اس کی رہنمائی ہم کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ اور خلافت راشدہ سے حاصل ہوتی ہے، عروج و شباب اور امن و نظام کے زمانہ میں کس استقامت اور ایمان و یقین کا مظاہرہ کرنا چاہیے، اس کی رہنمائی ہم کو فاروق اعظم کے دور خلافت میں ملتی ہے، مخالفتوں، شورشوں اور فتنوں اور بے نظمی اور انتشار کے وقت کس ثبات و استقامت، کس پامردی اور دلیری اور کس ایمان و یقین کی ضرورت ہے، اس کا نمونہ ہم کو حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی زندگی میں ملتا ہے، اگر اسلامی تاریخ کے ذخیرہ میں صرف خلافت راشدہ کے دو باب (جو دراصل ایک ہی باب کی دو فصلیں ہیں) اور صرف خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کا نمونہ نہ ہوتو یہ رہنمائی ناتمام ہوتی اور دور انتشار اور دور فتن کے لیے مسلمانوں کے پاس تقلید و اتباع کے لیے کوئی امام اور پیشوا نہ ہوتا، جس امت کے لیے قیامت تک باقی رہنے اور تمام انسانی ادوار اور تاریخ کے نشیب و فراز سے گزرنا مقدر تھا، اس کے لیے دونوں

طرح کے نمونوں کی ضرورت تھی اور خلافت راشدہ نے اپنے پورے اجزاء کے ساتھ ان نمونوں کو فراہم اور اس رہنمائی کو مکمل کر دیا۔

"رضی اللہ تعالیٰ عن أبی بکر وعمر وعثمان و علی وأرضاھم وأکرمھم وجزاھم عن الإسلام وعن ھذہ الأمة خیر الجزاء."

باب ششم

سرگروہ اہل صدق ووفا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

خلافت نبوت یا خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اولین اسلام لانے والوں میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ گھر کے افراد شمار ہوتے تھے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کم سن بھی تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی کفالت میں تھے، حضرت زید بن حارثہؓ غلاموں میں تھے اور آزاد کردہ غلام تھے، حضرت خدیجہ زوجۂ مطہرہ تھیں، عمر میں بڑی تھیں اور پندرہ سال بڑی تھیں، درحقیقت اندرون خانہ سب سے زیادہ تقویت کا باعث یہی بی بی تھیں، باہر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ذات گرامی اس معاملہ میں تن تنہا تھی اور پورے طور سے مؤید، متفق، موافق، حلیف، رفیق اور مکمل فدائی تھے، ہر قربانی دینے کو تیار، محبت سے سرشار، مزاج میں ہم آہنگ، اخلاق میں قریب تر، منشا کو سمجھنے میں بڑے زیرک اور باریک بیں، بہترین راز دار، اور سب سے معتبر اور سب سے زیادہ معتمد تھے، اوران کی یہ صفت شروع سے آخر تک قائم رہی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ فرمایا تو رفاقت وصحبت کے لئے انہی کا انتخاب کیا، اور گھر میں اپنا جانشین زیر کفالت عم زاد حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کو مقرر کیا، اور اسلام کے پہلے حج میں ۹ھ میں انہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر تعلیم مناسک کے فرائض انجام دلائے، اور ساتھ میں کچھ ذمہ داریاں خاندانی قربت وقرابت کے باعث حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی سپرد کیں، اور جب مرض وفات میں بیماری کی شدت کی وجہ سے مسجد نبوی میں بھی جانا مشکل ہو رہا تھا تو انہی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امامت صلوٰۃ کے لئے آگے کیا، اور انہوں نے نمازوں کی امامت کی، اور آخری دن کی نماز میں تو یہاں تک ہوا کہ تکبیر واقامت ہو چکی تھی، لوگ نماز میں تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجرہ کا پردہ ہٹا کر منظر دیکھا اور خوشی کا اظہار کیا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مصلیٰ پر تھے، کچھ محسوس کر کے پیچھے ہٹنا چاہا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہ کرنے کا اشارہ کیا۔(۱)

اور اسی مرض وفات میں ایک بار منبر پر تشریف لا کر وقت موعود کے قریب آجانے کا آپؐ نے اشارہ فرمایا تھا اور کہا تھا کہ

"إن عبداً خيره الله من أن يؤ تيه من زهرة الدنيا ماشاء وبين ما عنده فاختار ما عنده." (۲)

(اللہ نے اپنے بندے کو اختیار دیا ہے کہ وہ یا تو دنیا کی بہاروں اور نعمتوں میں سے جس قدر چاہے لے لے یا آخرت کی جو نعمتیں اللہ کے پاس ہیں ان کو لے لے، تو اس بندے نے آخرت کی وہ نعمتیں پسند کرلیں، جو اللہ کے پاس ہیں)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فوراً سمجھ گئے، جذبات پر قابو نہ رکھ سکے،

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح مسلم و بخاری۔ (۲) ایضاً۔

روپڑے اور بے ساختہ کہا:

"فديناك بآبائنا و أمهاتنا." (۱)

(ہم اور ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں)۔

قارئین حضرت ابوبکرؓ کے اس فدایانہ تعلق کا کچھ اندازہ لگا چکے ہوں گے، ان کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلق ومحبت اور دین کے لئے ان کی قربانی اوراعانت ونصرت کے اعتراف کے جو الفاظ کہے وہ مختلف حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں، اسی حدیث کے آخر میں بروایت بخاری ومسلم جو الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ اس طرح ہیں: فرماتے ہیں کہ:

"إن أمنّ الناس عليّ في ماله وصحبته أبوبكر ولو كنت متخذاً خليلاً غير ربّي لاتخذت أبابكر خليلاً ولكن أخوة الإسلام ومودته، لا يَبقَيَنّ في المسجد باب إلا سُدّ إلا باب أبي بكر."(۲)

(یہ حقیقت ہے کہ لوگوں میں سے جس شخص نے میرے ساتھ سب سے زیادہ حسن سلوک کیا، اپنے مال سے اور اپنی صحبت (یعنی خادمانہ رفاقت) سے وہ ابوبکر ہیں اور اگر میں اپنے پروردگار کے سوا کسی کو خلیل (یعنی جانی دوست) بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اسلامی اخوت ومودت کا خاص تعلق ابوبکر سے ہے (اسی کے ساتھ آپؐ نے یہ ہدایت فرمائی کہ) مسجد میں کھلنے والے سب دروازے بند کردیئے جائیں سوائے ابوبکر کے دروازے کے، بس اسی کو باقی رکھا جائے)۔

اوراسی مرض وفات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں یہ داعیہ اور

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "معارف الحدیث/۲۴۲-۲۴۴

(۲) صحيح البخاري، باب الخوخة والممر في المسجد، كتاب الصلوٰة.

تقاضا پیدا ہوا کہ کوئی نوشتہ لکھ دیا جائے، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم في مرضه ادعى لي أبا بكر أباك، وأخاك، حتىٰ أكتب كتاباً، فإني أخاف أن يَتَمَنّى مُتَمَنٍّ ويقول قائل: أنا أولىٰ، ويأبى الله والمؤمنون إلا أبابكر." (۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض میں مجھ سے فرمایا کہ اپنے والد ابوبکر کو اور اپنے بھائی (عبدالرحمٰن) کو میرے پاس بلالو تاکہ میں ایک نوشتہ (وصیت نامہ کے طور پر) لکھادوں، مجھے خطرہ ہے کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرے اور کوئی کہنے والا کہے کہ میں زیادہ مستحق ہوں اور اللہ اور مؤمنین ابوبکر کے سوا کسی کو قبول نہ کریں گے)۔

بعد میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوشتہ لکھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا بلکہ یہاں تک کہا: "ایتونی بکتفٍ أکتب لکم کتاباً" کہ شانہ کی ہڈی لے آؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھادوں، جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوگے، فرمایا: "لا تضلوا بعده أبداً" (بخاری ومسلم کی یہ روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے)۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ہی دوسرے الفاظ سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں چند اشخاص جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "هَلُمّوا أكتب لكم كتاباً لن تضلوا بعده" (آؤ میں لکھ دوں (یعنی لکھادوں) تمہارے لئے ایک نوشتہ کہ ہرگز گمراہ نہ ہوگے اس کے بعد) لیکن اسی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شدید تکلیف ہے اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے وہ اللہ کی کتاب تمہارے لئے

---

(۱) صحيح مسلم، باب من فضائل أبي بكر الصديق رضي الله عنه.

(یعنی تمہاری ہدایت کے لئے اور گمراہی سے حفاظت کے لئے) کافی ہے، یہ بھی بخاری ومسلم کی روایت ہے۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنے کی زحمت دینے سے ہچکچائے، مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے:

"أمرني النبي صلى الله عليه وسلم أن آتيه بطبق (أي كتف) يكتب ما لا تضل أمته بعده."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم فرمایا تھا کہ میں طبق (یعنی کتف) لے آؤں، تاکہ آپ ایسی تحریر لکھا دیں، جس کے بعد آپ کی امت کبھی گمراہ نہ ہو)۔

اور حضرت علیؓ اپنی حکمت ودانش وفراست وبصیرت اور مزاج شناس نبوت کی حیثیت سے آگے کے مسائل کو بھی بھانپ گئے تھے، صحیح بخاری میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اس وقت کی کیفیت کا حال منقول ہے، جب حضرت عباس عم الرسول صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا تھا کہ اب احتضار کا وقت قریب ہے، اور یہ محسوس کر کے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا:

"اذهب بنا إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم فلنسئله في من هذا الأمر، إن كان فينا علمنا ذلك وإن كا ن في غيرنا علمناه فأوصىٰ بنا، فقال عليؓ: إنا والله لئن سألناها رسو ل الله صلى الله عليه وسلم فمنعناها لا يعطيناها الناس وإني والله لا أسالها رسول الله صلى الله عليه وسلم."(۲)

---

(۱) فتح الباری جزء اول/۱۰۶ مطبوعہ انصاری دہلی ۱۳۰۴ھ

(۲) معارف الحدیث ۸/۲۵۱ بحوالہ فتح الباری

(تم ہمارے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چلو، ہم آپ سے دریافت کریں کہ (آپؐ کے بعد) یہ کام (یعنی کار خلافت ونبوت) کس کے پاس رہے گا؟ اگر ہمارے (یعنی اہل خاندان) کے سپرد ہونے والا ہوگا تو ہم کو معلوم ہوجائے گا اور اگر ہمارے علاوہ کسی کے سپرد ہونے والا ہوگا تو ہم کو اس کا علم ہوجائے گا، اور آپ ہمارے بارے میں وصیت فرمادیں گے۔

تو حضرت علیؓ نے کہا کہ اگر ہم نے خلافت کے بارے میں آپ سے سوال کیا اور آپؐ نے ہم کو منع فرمادیا (یعنی خلافت ہم کو سپرد نہ کرنے کا فیصلہ فرمادیا) تو خدا کی قسم (آپ کے منع فرمادینے کے بعد) لوگ ہم کو خلافت نہ دیں گے، تو میں تو خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلافت کا سوال نہیں کروں گا)۔

امام زہری رحمہ اللہ جو اس حدیث کے رواۃ میں ہیں اور کثیر الروایات راوی اور تابعی جلیل ہیں فرماتے ہیں کہ یہ خاص اسی دن صبح کا واقعہ ہے جس دن سہ پہر کو آپؐ نے وفات پائی۔

خلافت کے مسئلہ میں یا یہ کہیں کہ نیابت نبوت کی انجام دہی کے معاملہ حضرت علیؓ کا یہ احتیاط کا رویہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے کہ یہ ایسی چیز نہیں کہ خود سے طلب کی جائے، خود سے آنے پر بڑی مبارک اور تقدیری بات سے یہ قضیہ حل ہوجاتا ہے کہ من جانب اللہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں یہ قرعہ فال نکل چکا تھا اور تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو کمال جامعیت کے ساتھ ان کی شخصیت اس عظیم منصب کی سب سے زیادہ حقدار تھی، حدیث کے بڑے عالم ومصنف حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''معارف الحدیث'' جلد ہشتم /۲۶۲ میں اس کا

تجزیہ کرتے ہوئے اپنی تحقیق اس طرح پیش کرتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد کے لئے ...... حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمایا تھا، لیکن بعد میں جب آپ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ تقدیر الٰہی میں یہ طے ہو چکا ہے تو آپؐ نے تحریر لکھوانے کا ارادہ ترک فرمادیا، تو یہ بات قابل فہم ہے ......علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں اسی حدیث قرطاس کی شرح میں لکھا ہے:

"قال البیهقی وقد حکی سفیان بن عیینه عن أهل العلم قیل إن النبی صلی اللہ علیه وسلم أراد أن یکتب استخلاف أبی بکرؓ ثم ترك ذلك اعتماداً علی ما علم من تقدیر اللہ تعالیٰ ذلك، کما همّ فی أول مرضه حین قال وا رأساه، ثم ترك الکتاب وقال: یأبی اللہ والمؤمنون إلا أبابکر ثم قدمه فی الصلوٰة."(۱)

(امام بیہقی علیہ الرحمہ نے بیان کیا ہے کہ سفیان ابن عیینہ نے (جو اس حدیث قرطاس کے ایک راوی ہیں) اہل علم سے نقل کیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمادیں، (اور اس کے لئے تحریر لکھوادیں) پھر آپ نے یہ معلوم ہونے پر کہ تقدیر الٰہی میں یہ طے ہو چکا ہے، اس کے لکھانے کا خیال ترک فرمادیا، جیسا کہ اسی مرض کے ابتداء میں (جب آپ نے فرمایا تھا: وا رأساه!) حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں تحریر

---

(۱) عمدۃ القاری ۲/۱۷۱ طبع مصر

لکھوانے کا خیال فرمایا تھا پھر لکھوانے کا خیال ترک فرمادیا تھا اور فرمایا تھا: "یابی اللہ والمؤمنون إلا أبابکر (اور بجائے کچھ لکھوانے کے) آپ نے ان کو نماز کی امامت کرنے کا حکم فرمادیا (یہ گویا عملی استخلاف تھا)۔

مولانا نعمانی علیہ الرحمہ کہتے ہیں:

''ملحوظ رہے کہ سفیان بن عیینہ تبع تابعین میں سے ہیں انہوں نے جن اہل علم سے نقل کیا ہے، ان میں غالباً حضرات تابعین بھی ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ اس حدیث قرطاس کے بارے میں ان کی یہ رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے بارے میں تحریر لکھوانے کا ارادہ فرمایا تھا، حضرات تابعین کی بھی یہ رائے رہی ہے۔''(۱)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے قبل ہی مسئلہ نیابت نبوت، خلافت نبوت مل بیٹھ کر فوری طور پر حل کرلیا گیا، تاکہ امت تھوڑی دیر کے لئے بھی بغیر امیر کے نہ رہے، اور خارجی عناصر کو لمحہ بھر کے لئے بھی ریشہ دوانیوں کا موقع نہ ملے، اور حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ رسول اللہ قرار پائے، اس طرح یہ بات بھی حقیقت بن کر سامنے آگئی کہ وہی اب سب سے افضل ہیں، اور وہی اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے، اور اگر فوری طور پر نہیں تو بعد میں صحابہ کا اس پر اجماع ہوگیا تھا، اور حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت اس درجہ معتبر اور مسلم تھی کہ انہوں نے اپنے بعد خلافت کے لئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تو ان کو بھی بلانزاع تسلیم کیا گیا۔

جہاں تک حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا تعلق ہے، روافض ان کی بیعت کو تقیہ پر محمول کرتے ہیں، اور توقف اور تاخیر اور بیعت نہ کرنے کا بھی الزام لگاتے ہیں، یہ

---

(۱) معارف الحدیث ۲۶۲/۸-۲۶۳

سب ان کی طرف سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پر صریح بہتان ہے، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ نے جو تحقیق پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ:

''اہل سنت کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ذرا بھی توقف بیعت صدیقی میں نہیں کیا، بعض روایات میں جو توقف تین دن یا چھ ماہ کا منقول ہے، علمائے اہل سنت نے لکھا ہے کہ یا تو یہ روایات معلول ہیں یا مؤوّل، اور تاویل یہ بیان کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کئی بار بیعت کی، اور یہ تکرار بیعت محض اس لیے تھی کہ فتنۂ رفض کا انتساب ان کی طرف نہ ہو سکے، فتنۂ رفض کی خبر بطور پیشین گوئی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ سن چکے تھے اور یہ بھی سن چکے تھے کہ وہ لوگ اپنے کو میری طرف منسوب کریں گے، اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بڑا اہتمام اس امر کا کیا کہ یہ ان کی طرف منسوب نہ ہو سکے۔''(۱)

خلافت نبوی کے مطالبات اور خلیفہ کی ذمہ داریاں

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی، تبلیغی، دعوتی، تربیتی اور تطہیری تمام ذمہ داریوں کو انجام دینا اور نبی کی امت کی اسی طرح فکر کرنا جیسی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تھی کہ امت کو ارتداد، گمراہی، انحراف عن الدین، بے عملی، اور غلط افکار ونظریات اور باطل خیالات ورجحانات سے بھی بچانے کی فکر کرنا، اس کے لئے عہد ومعاہدہ، بیعت ومیثاق، تعلیم وتلقین، تفہیم، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر تمام شکلوں سے اور اگر جہاد وقربانی اور قوت وطاقت یہاں تک کہ قتال کرنا پڑے تو اس میدان کو بھی اختیار کرنا ہوگا، اس کے ساتھ دین وایمان کے شعبوں میں اعلیٰ وادنیٰ کے فرق اور واجب وسنت

(۱) ابوالائمہ کی تعلیم ص/۳۳ از مولانا عبدالشکور فاروقی ناشر مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ

کے فرق کوملحوظ رکھنے اوراس میں مزاج نبوت اور مزاج دین وشریعت سے واقفیت اور جوش سے نہیں ہوش سے، صرف جذبات سے نہیں بلکہ حقیقت وواقعیت پرنظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں دینی احکام کے نفاذ وتنفیذ اور جزاءوسزا کے دنیوی نظام میں اسلامی تعلیمات کونافذ کرنے میں بھی حکمت ومصلحت اور باریک بینی سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، کہ ذراسی چوک دائمی نقصان کا باعث بن سکتی ہے، چناں چہ دین ودنیا کے تمام پہلوؤں پرنظر رکھ کر دین وملت کی مصلحت اورانسانیت کے مفاد میں جو بہتر ہو وہ کیا جائے، خلافت نبوت اور دنیوی بادشاہت ونظام حکومت وسلطنت اپنے اصول، مطمح نظراور مقصد میں متصادم نظام ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو صدائے نبوت کیوں قیصر وکسریٰ (روم وایران) کے نظاموں کو اسلامی نظام اور ایمانی دعوت قبول کرنے کوکہتی اور پھر خلافت نبوت نے دوسرے نظامہائے حکومت واقتدار کو اسلامی نظام کے تابع کیا اور یہ باور کرایا کہ حق کیا ہے، اور عدل کیسے قائم ہوتا ہے، اور دو متحارب گروہ کس طرح ایک پلیٹ فارم پرجمع ہوجاتے ہیں، خلافت راشدہ کے تیس سال اس کے شاہد عدل ہیں، جلیل القدر عالم دین مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے خلافت نبوت کی حقیقت کواس طرح واضح کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ خلافت نبوت دنیوی بادشاہت اور حکومت سے بالکل مختلف چیز ہے، (ان دونوں میں ویسا ہی فرق ہے جیسا کہ دین اور دنیا میں فرق ہے) خلافت نبوت کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین حق کی دعوت واشاعت، امت کی تعلیم وتربیت، اعلاء کلمۃ اللہ، جہاد وقربانی اور نظام عدل کے قیام کا جوکام وحی الٰہی کی رہنمائی میں نبی ورسول ہونے کی حیثیت سے جس طریق ومنہاج پر اور جن اخلاقی اصولوں کی پابندی کے ساتھ انجام دے رہے تھے، وہی کام آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین اور قائم مقام کی حیثیت سے
اس طریقہ ومنہاج پر اور انہی اصولوں کی پابندی کے ساتھ کتاب
وسنت اور اسوۂ نبوی کی رہنمائی میں انجام دیا جائے۔
اسی کو خلافت نبوت اور خلافت راشدہ کہا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ
دنیوی بادشاہت کی طرح پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بھرا
بستر ہے۔''(۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے اور جب وہ ظاہری و باطنی طور پر اس منصب پر فائز ہوگئے اور امت ان پر مجتمع ہوگئی تو بعض لوگوں نے انھیں "یا خلیفة الله" کہا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس سے منع کیا اور خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے کو کہا۔(۲)

یہ ان کے ایمان و توحید میں نہایت درجہ حساس ہونے کی بات تھی اس لیے کہ خلافت میں اصل کی غیر موجودگی کے معنی مضمر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے ﴿وهو معكم أينما كنتم﴾.

اسی طرح خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب محسوس کیا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پر امت کو حد سے زیادہ اعتماد ہو رہا ہے جس سے اللہ پر اعتماد متأثر ہو رہا ہے تو ان کے عزل کا حکم صادر کر دیا۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے سلسلہ میں عقیدت و محبت میں غلو دیکھا تو ان لوگوں کو عبرت ناک سزا دی۔ عقیدہ اور ایمان میں یہ حساسیت امت کے لیے ہر دور میں رہنما ثابت ہوئی ہے۔

خلافت نبوت کا بار اٹھانے والا چاہے ظاہری خلافت ہو یا باطنی خلافت

---

(۱) معارف الحدیث جلد ہشتم/ ۲۵۱-۲۵۲

(۲) ملاحظہ ہو ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء مصنفہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ

کبھی حق بات میں کتمان اور تقیہ سے کام نہیں لے گا اور کبھی کسی منکر پر خاموش نہیں بیٹھے گا کہ اس کی خاموشی منکر کو معروف بنا دے گی، بحیثیت مجموعی امت محمدی کو انسانیت کی ہدایت کے لیے خلافت عطا کی گئی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کی واضح دلیل ہے:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾.

(تم خیر امت ہو، سارے انسانوں کے لیے ظہور میں لائے گئے ہو، معروف (نیکی) کا حکم دیتے ہو، منکر (برائی) سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان ویقین رکھتے ہو)۔

بیعت خلافت نبوت

خلافت ہو یا امارت اس کی اہلیت واستحقاق کی شرط اول یہ ہوتی ہے کہ اس کی اس میں طلب نہ ہو، چنانچہ خلافت جسے خلافت راشدہ سے تعبیر کیا گیا اور جس کی مدت زبان نبوت نے تیس سال بتائی تھی، جو ظاہراً ایک پیشین گوئی تھی اور وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت پر اس طرح پوری ہوئی کہ ان کے بعد ان کے بڑے فرزند حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر اہل حل وعقد نے بیعت کی اور چھ ماہ (رمضان ۴۰ھ تا ربیع الاول ۴۱ھ) کی مدت میں وہ خلافت کے ظاہری حق اور اقتدار وحکومت کے مسئلہ سے دست بردار ہو گئے اور اس طرح پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری پیشین گوئی پوری ہوئی کہ:

”إن ابني هذا سيد، لعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين.“ (۱)

(بیشک میرا یہ بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ دو بڑے

---

(۱) بخاری، ، كتاب الصلح ، باب قول النبي صلى الله عليه وسلم للحسن ابني هذا سيد ......

گروہوں کو جوڑے گا)۔

اس طرح خلافت نبوت جس کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور خلافت ۱۳ ربیع الاول ۱۱ھ سے شروع ہوا تھا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذریعہ پوری امت مسلمہ کو ایک جھنڈے تلے لے آنے پر ۱۲ ربیع الاول ۴۱ھ کو اختتام کو پہنچا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جب امت کو اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی واقعی وفات ہوگئی ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے محبت وعشق اور جذبات پر دینی حقائق کو غالب رکھتے ہوئے صحابہ کو یقین دلایا تھا کہ یہ ایک حقیقت ہے جو وقوع پذیر ہوچکی ہے اور پھر جب یہ محسوس کیا کہ اب لوگ مسئلہ خلافت نبوت و امارت اسلامی پر غور وخوض کررہے ہیں اور صورت حال اس طرح تھی کہ مسلمانوں میں دو ہی بڑے گروہ تھے جن کی قرآن نے تعریف کی تھی ایک مہاجرین دوسرے انصار اور مہاجرین میں بھی خانوادۂ نبوت کے افراد اپنی اس قربت کے امتیاز کی وجہ سے اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے تھے، انصار کے بڑے حضرت سعد بن عبادہ خزرجی رضی اللہ عنہ تھے اور انصار ان ہی کو بڑا مان رہے تھے، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اکابر سابقین اولین مہاجرین میں تھے اور ان کی اس فضیلت کا سب کو اعتراف تھا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسئلہ استخلاف میں سب کو خاموش اور یک زبان کرنا چاہا اور اس مسئلہ میں دخل اندازی کر کے اتحاد واتفاق سے کام لینے کو کہا اور جب ماحول سازگار ہوگیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی بعض خصوصیات وامتیازات کی بنا پر (کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے'' اور حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو "أمين هذه الأمة" فرمایا تھا) کے نام پیش کیے کہ جن کے ہاتھ پر چاہو بیعت کرلو، فرمایا:

"هذا عمر وهذا أبو عبيدة فأيهما شئتم فبايعوا"(۱)

(یہ عمر ہیں اور یہ ابوعبیدہ ہیں، تو ان میں سے جس سے چاہو بیعت کرلو)۔

مگر یہ دونوں حضرات اپنی جلالت شان، وسعت علم اور گہرائی فہم کے ہوتے ہوئے ان کی اس متواضعانہ شان کو کہاں قبول کر سکتے تھے کہ ان کی فضیلت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرب واختصاص اور زہد وقربانی سے وہ دونوں بڑے واقف تھے، دونوں نے بیک زبان ہوکر کہا:

"لا والله لا نتولى هذا الأمر عليك، فإنك أفضل المهاجرين وثاني اثنين إذ هما في الغار، وخليفة رسول الله صلى الله عليه وسلم على الصلوة، والصلوة أفضل دين المسلمين، فمن ذا ينبغي له أن يتقدمك أو يتولى هذا الأمر عليك، ابسط يدك نبايعك."(۲)

(بخدا ایسا نہیں ہوسکتا، اس بار خلافت کو آپ کے ہوتے ہوئے ہم لوگ اٹھائیں، آپ "ثانی اثنین" ہیں اور نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب رہے، اور نماز مسلمانوں کے دین کا سب سے افضل رکن ہے، کون آپ پر پیش قدمی کرسکتا ہے اور آپ کے ہوتے ہوئے اس بار خلافت کو اٹھا سکتا ہے، ہاتھ بڑھایئے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں)۔

ان دونوں بزرگ شخصیتوں کے اس بیان واعتراف اور حق گوئی کا یہ اثر پڑا کہ سردار انصار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت بشیر بن سعد نے اسی وقت آگے بڑھ کر بیعت کرلی، اسی طرح انصار کی اوسی شاخ کے قائد حضرت اسید بن

(۱) ملاحظہ ہوں: کتب تاریخ اسلامی وخلافت راشدہ وکتب سیرت صدیقی۔

(۲) تاریخ طبری ۲/۴۴۳، طبع دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۸۸ء۔

حفیر رضی اللہ عنہ نے فوراً پیش قدمی کی اور اپنے اوسی بھائیوں کو بھی آمادہ کیا، ان سب نے بیعت کی، جوق در جوق لوگ آتے رہے اور بیعت کا سلسلہ جاری رہا، قبیلہ اسلم کی جماعتیں آئیں اور بیعت کا سلسلہ جاری رہا، مدینہ کی گلیاں تنگ ہوگئیں، لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے، قبیلہ اسلم کا حال دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمومی نصرت کا یقین ہوگیا اور یہ یقین ہوگیا کہ اب اس مسئلہ میں نزاع نہیں رہا، فرمایا: "ما هو إلا أن رأيت أسلم فأيقنت بالنصر." (۱)

رہا حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ تو اہل شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، جہاں تک اہل بیت نبوت حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ بنو ہاشم اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بات ہے تو ان حضرات نے فوری طور پر بیعت نہیں کی لیکن اس مسئلہ سے اتفاق رکھا، اس تاخیر کے گو سیرت نگاروں نے مختلف اسباب بیان کیے ہیں منجملہ ان اسباب کے یہ بھی ہے کہ یہ حضرات تجہیز و تکفین اور تدفین کے مسائل میں مشغول تھے اور اس موقع پر گھر والوں کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں ان کو انجام دے رہے تھے لیکن تدفین کے مسئلہ میں اتفاق نہیں ہو رہا تھا کہ کہاں ہو؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلا مسئلہ تدفین کا حل کیا اور کہا جس مقام پر نبی کی وفات ہوتی ہے وہیں اس کی تدفین ہوتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بات سے اتفاق کیا اور فرمایا کہ "میں نے بھی ایسا ہی سنا ہے" استاذ احمد رضا مؤلف کتاب "ابوبکر الصدیق اول خلفاء الراشدین" لکھتے ہیں:

"ولما اختلفوا في موضع دفنه قال أبوبكر: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: ما مات نبي قط إلا يدفن حيث تقبض روحه، قال علي: وأنا أيضا سمعته، فرفع فراشه ودفن." (۲)

---

(۱) تاریخ طبری ۲/۲۴۴۔

(۲) أبوبكر الصديق أول خلفاء الراشدين، ص/۳۸

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین کے سلسلہ میں جب لوگوں کے مابین اختلاف رائے ہوا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ہر نبی کی تدفین وہیں ہوتی ہے جہاں اس کی روح قبض کی جاتی ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی تائید کی اور کہا کہ میں نے یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، چنانچہ بستر مبارک ہٹا کر اسی جگہ تدفین عمل میں آئی)۔

خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا خطبہ

خلافت نبوت کی بیعت لینے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عاجزی وانکساری اور اس کے ساتھ عزم وارادہ کی پختگی اور اپنے منہج کا اظہار کیا یہ خلافت نبوت کے منصب پر بیٹھنے والی وہ شان تھی جسے آگے چل کر ہر خلیفہ راشد کو اختیار کرنا تھا، اور یہی چیز خلافت نبوت اور بادشاہت کا کھلا فرق بتاتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منبر پر چڑھے اور اللہ کی حمد وثنا بیان کی اور مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"أيها الناس قد وُلِّيت عليكم ولستُ بخيركم، فإن أحسنت فأعينوني وإن أسأت فقوِّموني، الصدق أمانة والكذب خيانة، والضعيف فيكم قوي عندي حتى آخذ له حقه، والقويّ عندي ضعيف حتى آخذ منه الحق إن شاء الله تعالىٰ، لا يدع أحد منكم الجهاد فإنه لا يدعه قوم إلا ضربهم الله بالذل، أطيعوني ما أطعت الله ورسوله، فإذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي

عليكم، قوموا إلى صلاتكم رحمكم الله."(۱)

(لوگو! مجھے تمہارا خلیفہ بنایا گیا ہے، حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں، اگر اچھا کام کروں تو میرا تعاون کرنا اور اگر غلطیاں ہوں تو میری اصلاح کرنا، سچائی ایک امانت ہے، اور دروغ گوئی خیانت، تمہارا ایک کمزور انسان میرے نزدیک اس وقت تک طاقتور ہے جب تک اس کا حق اسے نہ دلا دوں، اور طاقتور اس وقت تک کمزور رہے گا جب تک اس سے حق وصول نہ کرلوں، انشاء اللہ، تم میں سے کوئی فریضۂ جہاد کو ترک مت کرے، کیونکہ جو قوم بھی جہاد ترک کردیتی ہے، اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کردیتا ہے، میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کروں، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں، اپنی نماز کے لیے کھڑے ہوجاؤ، اللہ تم پر رحمت نازل فرمائے)۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ خطبہ دین ودنیا کی جامعیت کا حامل ہے جس میں ایک طرف وہ دین وشریعت کی پاسداری اور اقتداء شریعت واتباع سنت کی ضمانت لے رہے ہیں اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے سعی بلیغ پر ابھار رہے ہیں، دوسری طرف حدود مملکت میں بسنے والوں کو انصاف دینے اور دفاعی نظام کو مضبوط کرنے کی بات بھی کہہ رہے ہیں۔

خانوادۂ نبوت کے افراد کی نصرت وحمایت

خلیفہ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے سب طرف سے حمایت ونصرت حاصل ہوتی چلی گئی اور جو شورشیں برپا ہوئیں، ارتداد

---

(۱) الجزء الثاني من تاريخ الكامل لابن الأثير

کی شکل میں، مانعین زکوٰۃ کی صورت میں اور نبوت کے نئے نئے دعووں کے طور پر کہ یہ ایک مقابلہ کی شریعت لانے کی گہری سازش تھی، چھوٹے بڑے مقابلوں سے کچل دی گئیں، ایک سازش یہ بھی رچی جارہی تھی کہ خانوادۂ نبوت کو ایک فریق کی شکل دے دی جائے کہ ان کے حامیوں میں یہ عصبیت پیدا کیے جانے کا بہترین موقع ہے کہ خلیفہ کا تعلق خاندان نبوت سے نہیں ہے، گو مصاہرت کا تعلق ضرور ہے لیکن حقیقی تعلق نہیں ہے، حضرات اہل بیت کرام نے پہلے ہی وہلہ میں اس فکرہ کو دبا دیا، وہ اس طور پر ہوا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین کا کام پورا ہو گیا اور نماز پڑھی جانے لگی تو اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مقدم رکھا اور دین و شریعت کے ان دونوں مزاج شناسوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر کی حیثیت رکھنے والوں پر کہ ایک کا درجہ صدیق کا اور ایک کا شہید کا تھا سبقت لے جانا اچھا نہ تھا، یہ حضرت علی، حضرت عباس، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کے غایت درجہ کے اس تعلق کی بات ہے جو ان لوگوں کو آپ سے تھا۔

استاذ احمد رضا مصری مؤلف سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسلسلۂ خلفاء راشدین وحضرات حسنین رضی اللہ عنہم (۱) اپنی کتاب "ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ" میں لکھتے ہیں:

"وبعد أن غسل رسول الله و كفن وضع على سرير وأدخل عليه المسلمون أفواجا يقومون ويصلّون عليه، ثم يخرجون ويدخل آخرون ولم يؤمهم في الصلاة عليه إمام حتى إذا فرغت الرجال، دخلت النساء ثم

---

(۱) استاذ احمد رضا ان مصنفین میں ہیں جو بحث و تحقیق میں دقت نظر اور اعتدال و انصاف سے کام لیتے ہیں ایک عرصہ تک جامعۃ القاہرہ مصر سے وابستہ رہے اور وہاں کے کتب خانہ کے امین بھی رہے۔

دخل الصبيان، وكان أول من دخل أبوبكر و عمر فقالا: "السلام عليك أيها النبى ورحمة الله وبركاته" ومعهما نفر من المهاجرين والأنصار قدر ما يسع البيت، فسلموا كما سلّم أبوبكر وعمر، وصفوا صفوفا لا يؤمهم عليه أحد فقال أبوبكر وعمر: وهما فى الصف الأول حيال رسول الله (صلى الله عليه وسلم): "اللّٰهم إنا نشهد أن قد بلّغ ما أنزل عليه ونصح لأمته وجاهد فى سبيل الله، حتى أعزّ الله دينه، وتمت كلماته، فآمنّا به وحده لا شريك له، فاجعلنا يا إلهنا ممن يتبع القول الذى أنزل معه وأجمع بيننا وبينه حتى يعرفنا ونعرفه، فإنه كان بالمؤمنين رؤوفا رحيما، لانبتغى بالإيمان بدلا، ولا نشترى به ثمنا أبدا."

فيقول الناس آمين آمين، ثم يخرجون ويدخل غيرهم ولما فرغوا نادى عمر خلوا الجنازة وأهلها."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب غسل دیا جاچکا، کفن پہنایا جاچکا تو جسد اطہر کو تخت پر رکھا گیا اور جماعت در جماعت اہل اسلام داخل ہونے لگے جو کھڑے ہوتے اور نماز ادا کرتے پھر باہر نکل جاتے اور دوسرے اندر آجاتے وہ اسی طرح کرتے، نماز کی امامت کسی نے نہیں کی، حتی کہ مرد سب کے سب جب نمازوں سے فارغ ہوگئے تو عورتوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور جب عورتوں کا سلسلہ پورا ہوگیا تو بچوں کا سلسلہ شروع ہوا، پہلے

---

(۱) ابوبکر الصدیق (ط: دارالکتب العلمیہ بیروت لبنا) ص/ ۳۸-۳۷

جو بزرگ داخل ہوئے تھے وہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما تھے، دونوں نے داخل ہوتے ہی سلام پیش کیا: "السلام علیك أیها النبی ورحمة الله وبرکاته" ان دونوں بزرگوں کے ساتھ کچھ مہاجر وانصار بھی تھے، حجرۂ مبارکہ کی جتنی وسعت تھی اسی لحاظ سے یہ لوگ اندر آچکے تھے، ان سب نے اسی طرح سلام پیش کیا جیسے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے پیش کیا تھا، اور نماز کے لیے صف بندی کی اور امامت کسی نے نہیں کی، حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل سامنے صف اول میں (جیسے نماز جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے جاتا ہے) کھڑے تھے، بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ:

''بارالٰہا! ہم گواہ ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ان پر نازل ہوا (پورا کا پورا بے کم وکاست) پہنچا دیا، امت کے ساتھ پوری خیرخواہی سے کام لیا، اللہ کی راہ میں جہاد کیا، حتی کہ اللہ نے دین کو سربلند کیا اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا، ہم اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لائے، تو اے بارالٰہا! ہم کو ان لوگوں میں شامل فرما جو اس کے ماننے والے اور اس پر عمل کرنے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا، اور ہم لوگوں کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع فرما، وہ ہمیں پہچان لیں اور ہم ان کو پہچان لیں، وہ واقعی ایمان کے ساتھ بڑے ہی شفیق ومہربان تھے، ہم ایمان کے بدلے کسی چیز پر راضی ہونے والے نہیں، اور نہ اس کے بدلے کسی اور چیز کے خریدار ہیں۔''

جو لوگ دعا سن رہے تھے وہ آمین آمین کہتے جا رہے تھے، پھر وہ

باہر نکل گئے اور دوسرے آتے اور دعا کرتے اور نکل جاتے، حتی
کہ جب سب نے یہ سعادت حاصل کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ
عنہ نے ندا لگائی کہ بھائیو! اب جنازہ کے پاس سے ہٹ جاؤ)۔

جہاں تک نفس بیعت کا تعلق ہے تو اس میں دیر سویر کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کو ایک قضیہ نامرضیہ بنا کر پیش کیا جائے جیسا کہ مؤرخین کا وطیرہ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی پسماندگان پر نظر ڈالی جائے تو ایک طرف صرف ازواج مطہرات ہیں اور دوسری طرف اولاد میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جن کو آپ نے "بضعة منی" (یعنی جسم کا حصہ جگر گوشہ) کہا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سبھی صاحبزادیاں اور صاحبزادے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک میں ہی وفات پا چکے تھے، سچ پوچھا جائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہ صبر کا ایسا مرحلہ تھا جس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا اور ان کے لیے تسکین کا سامان صرف اسی میں تھا جو بات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اپنی وفات کا اشارہ دیتے ہوئے کہی تھی اور جب ان کے تأثر کو دیکھا تو دوسری بات ان ہی کے سب سے پہلے ملنے کی فرمائی جس پر ان کی مسرت ظاہر ہوگئی، جیسا کہ حضرت عائشہ ام المؤمنین رضی اللہ عنہا کی معروف ومشہور روایت ہے گویا بس اب حضرت فاطمہ جگر گوشۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کا اشتیاق وانتظار تھا کہ یہ گھڑی کتنی جلد آجائے اور یہ جو بات ان کی نسبت سے مؤرخین نے حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کی بابت لکھی ہے اور اسی کو بعد کے وقائع نگار نقل کرتے چلے آئے ہیں:

"كانت فاطمة أرسلت إلى أبي بكر تسأله ميراثها من رسول الله مما أفاء الله عليه بالمدينة وفدك وما بقي من خمس خيبر، فأبى أبوبكر أن يدفع إليها شيئا، لأن رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قال: "لا نورث، ما

تـركـنـا فهـو صـدقة" فوجدت فاطمة على أبي بكر في ذلك ولم تكلمه حتى توفيت." (١)

(حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں میراث کی بابت کہلوایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مال فئی مدینہ وفدک کا اور جو خیبر کا خمس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھا، ان کے حوالہ کریں، تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حصہ میں سے کچھ دینے سے انکار کر دیا اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''ہماری میراث (مال ومتاع) نہیں جاری ہوگی، اور جو کچھ ہم چھوڑیں گے وہ صدقہ ہوگا۔'' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اس معاملہ میں کچھ خفگی رہی، پھر اپنی وفات تک انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی بات نہیں کی)۔

واقعہ کی گہرائی میں جایا جائے تو یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہتی کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن کر مطمئن ہوگئی ہوں گی کہ تسلیم ورضا کی پیکر وہ ہمیشہ رہیں نہ کہ یہ کہ انھیں ملال ہوا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بات سمجھ میں نہیں آئی، ملال انھیں اس پر ہوا کہ یہ سوال ہی کیوں کیا؟ اور خاموش ہوگئیں، اور یہ کہ اہل بیت نبوت نے ان کا خیال کر کے بیعت خلافت میں تاخیر کی، یہ ان کے احترام کی وجہ سے تھی کہ بضعۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں، اور جیسے ہی ان کی وفات ہوگئی ان حضرات نے بیعت خلافت بلا چوں چرا کر لی، اس سے امام زہریؒ کی یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے جو ان سے مؤرخین نقل کرتے آئے ہیں:

(١) أبو بكر الصديق ص/٣٤ لأحمد رضا مصري.

"قال الزهري: بقي علي وبنوهاشم والزبير ستة أشهر لم يبايعوا أبابكر حتى ماتت فاطمة رضی اللّٰه عنها فبايعوه." (۱)

(امام زہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم نے چھ مہینے تک حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی یہاں تک کہ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا تو ان لوگوں نے بھی بیعت کرلی)۔

اہل بیت نبوت کو جو بعض امتیازات وخصوصیات حاصل تھیں جس میں فطری طور پر گھر کے باہر کے لوگ شریک وسہیم نہیں ہوا کرتے یہ خیال پیدا ہونا بعید از قیاس بات نہیں کہ نبوت کی خلافت کا شرف وسعادت بھی ان ہی کے حصہ میں آئے گا اور ایسا ہوا لیکن تقدیری طور پر تقدیم وتاخیر کے ساتھ ہوا تھا کہ ان کے حصہ میں خلافت نبوت کا آخری حصہ آیا، البتہ سمع وطاعت، نصرت وحمایت کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ رکھا، اور مفید مشوروں اور خیر خواہانہ طرز عمل اور ایمانی خدمات میں ذرا پیچھے نہیں ہٹے، اسلام کی تقویت ہی پیش نظر رہی، "کون" پر نہیں "کیا" پر نگاہ جمی رہی۔ (۲)

اسد الغابۃ میں بروایت یحییٰ بن عروہ المرادی منقول ہے کہ:

"قال سمعت عليا رضی اللّٰه عنه يقول: قبض النبی صلی اللّٰه عليه وسلم وأنا أری أني أحق بهذا الأمر، فاجتمع المسلمون علی أبی بكر، فسمعت وأطعت، ثم إن أبابكر أصيب، فظننت أنه لا يعدلها عنّی، فجعلها فی

(۱) أبو بكر الصديق ص/٣٤ لأحمد رضا مصری.

(۲) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے المرتضیٰ میں اور علامہ شبلی نعمانیؒ نے الفاروق میں ان حقائق پر اچھی روشنی ڈالی ہے، وہ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

عمر، فسمعت و أطعت، ثم إن عمر أصيب، فظننت أنه لا يعدلها عنّی، فجعلها فی ستة أنا أحدهم، فولوها عثمان، فسمعت و أطعت، ثم إن عثمان قتل، فجاء وا فبایعونی طائعین غیر مکرهین."(۱)

(میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو مجھے خیال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کا سب سے زیادہ حق دار میں ہی ہوں، لیکن سارے مسلمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر متفق ہوگئے، تو میں نے بھی ان کی سمع و طاعت قبول کرلی، پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو پھر مجھے اپنا استحقاق زیادہ نظر آیا لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حق دار قرار دے دیا، تو میں نے ان کی بھی اطاعت قبول کرلی، پھر جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی شہادت پیش آئی تو مجھے اپنے خلیفہ ہونے کا یقین تھا لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس معاملہ کو چھ نامزد لوگوں پر چھوڑ دیا، ان چھ میں ایک میں بھی تھا، تو ان لوگوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرلیا، تو میں نے بھی ان کی اطاعت قبول کرلی، پھر جب حضرت عثمان رضی اللہ کہ مظلومانہ شہادت کا واقعہ پیش آیا تو لوگوں نے بلاکراہت میرے ہاتھ پر بیعت کرلی اور بہ سر و چشم میری اطاعت قبول کرلی)۔

---

(۱) اسد الغابہ ۳/۶۰۹ طبع دار الفکر بیروت ۱۹۸۹ء

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے صاف طور پر یہ بات بتادی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع امت تھا، اوران کا معاملہ بھی پورے طور پر سمع وطاعت اور انقیاد واتباع کا تھا اور صرف اتنا ہی نہیں ان کے فیصلوں کو بھی قبول کرتے تھے، چنانچہ حضرت عمر کی خلافت کے لیے نامزدگی اور پھر تیسرے نمبر پر حضرت عثمان کے انتخاب کو بھی شرعی بنیاد پر صحیح سمجھتے ہوئے تسلیم کیا، اوران حضرات کا پورا ساتھ دیا، اور جب خود ان کا نمبر آیا تو انھوں نے بیعت مکرہ یعنی مجبور کر کے اور ناگواری کے ساتھ بیعت کو پسند نہیں کیا، یہی خلافت نبوت خلافت راشدہ کی شان ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی رئیس الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو مجبور نہیں کیا تھا اوران کی خاموشی کو کافی سمجھا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا معاملہ رہا کہ انھوں نے باغیوں کا بھی سر قلم کرنا گوارہ نہ کیا، اور شہید ہو گئے۔(۱) رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

مدعیان نبوت کی سرکوبی اور مرتدین سے مقابلہ

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ارتداد کے اکا دکا واقعات عہد نبوی میں بھی پیش آئے ہیں، نبوت کے جھوٹے دعویداروں نے بھی سر اٹھانا شروع کردیا تھا، لیکن ملی خطرہ بن کر اور اجتماعی طور پر ایک مسئلہ بن کر یہ فتنہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوا جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا آغاز ہوا، یہ ارتداد بھی دو حیثیتوں سے ظاہر ہوا ایک کلی حیثیت سے دین سے پھر جانے کا ہے، دوسرا جزوی طور پر انکار ادائیگی زکوٰۃ ہے، نبوت کے جھوٹے دعوے دار مسیلمہ کذاب،

---

(۱) اور صرف یہی نہیں بلکہ اور بھی جن صحابہ نے جن کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خصوصیت کا معاملہ رہا تھا اس مسئلہ میں بعض مصلحتوں سے جلد بازی سے گریز کر رہے تھے ان کو بھی مجبور نہیں کیا، مؤرخین نے ان تاخیر سے بیعت ہونے والوں میں حضرت سلمان فارسی، حضرت براء بن عازب، حضرت مقداد بن عمرو، حضرت ابوذر غفاری، حضرت عمار بن یاسر، حضرت خالد بن سعید، حضرت عتبہ بن ابی لہب اور حضرت ابوسفیان اموی کا نام ذکر کیا ہے۔(بحوالہ احمد رضا ص/۳۵)

اسود عنسی، طلیحہ بن خویلد میں مسیلمہ کذاب ایسا شخص تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مکتوب لکھ کر یہ فارمولہ پیش کیا تھا کہ نبوت کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے، زمین کے نصف حصے پر ہماری حکومت چلے اور نصف پر آپ کی مانی جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ لکھا تھا:

"من محمد رسول اللہ إلیٰ مسیلمة الکذاب: أما بعد فإن الأرض للّٰہ یورثها من یشاء من عباده والعاقبة للمتقین."(۱)

(کہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور نتیجہ تو متقیوں کے ہی حق میں ہوگا)۔

مسیلمہ کا معاملہ اس لیے بھی مسلمانوں کے لئے چیلنج اور شدید ابتلاء کا باعث تھا کہ مسیلمہ کے ساتھ ایک بڑی جماعت تھی، جس میں قبائلی عصبیت بھی اپنا رنگ جما رہی تھی، چنانچہ مسیلمہ کو اپنا جھوٹا سمجھ کر بھی ساتھ دینے والوں میں سے ایک نے یہ بات کہی: "کذاب ربیعة أحبّ إلینا من صادق مضر"(۲) (ربیعہ کا جھوٹا ہمیں مضر کے سچے سے محبوب ہے)، ایسے حالات میں اس فتنہ کو دبانا اور یہ بھی اس وقت جب کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ عظیم پیش آیا تھا، اوران لوگوں کا ایمان جو ابھی پورے طور سے اسلام میں پورے طور سے داخل نہیں ہوے تھے، ڈگمگا گیا تھا۔

امام ذہبی کہتے ہیں:

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں:

"لو نزل بالجبال الراسیات ما نزل بأبی لهاضها، إشرأب النفاق بالمدینة، وارتدت العرب، فواللّٰہ ما اختلفوا فی نقطة إلا طار أبی بحظها من الإسلام."(۳)

---

(۱) التفسیر الکبیر للامام الرازی جزء/۱۲،صفحة/۱۹

(۲) البدایہ والنهایة لابن الاثیر ۳۳۱/۳، مقتل مسیلمه الکذاب لعنه اللّٰہ.

(۳) الخلفاء الراشدون من تاریخ الاسلام للذهبی ص/۱۶، ط: دارالکتب العلمیه بیروت.

(میرے والد صاحب کو جو آزمائشیں پیش آئیں وہ اگر جمے جمائے پہاڑوں کو پیش آجاتیں تو انہیں چور چور کردیتیں، مدینہ میں نفاق نے سر اٹھایا اور عرب قبائل ارتداد کا شکار ہوئے، بخدا لوگوں کو جس مسئلہ میں بھی اختلاف ہوا، والد صاحب نے فوراً اسلام سے اس کا حل پیش کردیا)۔

مفسر قرطبی مؤرخ ابن اسحاق کے حوالہ سے کہتے ہیں:

''ارتداد دو قسم کے تھے ایک تو پوری شریعت مطہرہ سے خروج کا اور دوسرا زکاۃ کے وجوب سے انکار کا، اس اعتراف کے ساتھ کہ ہم الگ نماز پڑھیں گے، اور روزہ رکھیں گے، زکاۃ نہیں دیں گے۔'' (۲۱۹/۶)

تو ایک طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ عظیم تھا جس نے پوری ملت کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ایسے وقت میں ملت کو تھامنا اور اجتماعیت کو باقی رکھنا خود کارِ دشوار تھا، پھر ان بغاوتوں کا مقابلہ اور ان فتنوں کی سرکوبی کہ جن کے لیے ان دشوار گزار حالات میں اور ملت کے لیے امتحان کی سب سے سخت گھڑی میں اپنی طاقت کے بکھر جانے کے خدشہ کے پیش نظر جب کہ دشمن تاک میں ہو اور سازشوں کا جال ڈال چکا ہو، کبار صحابہ بھی پس وپیش میں تھے، کہ اپنی طاقت کو کمزور نہ ہونے دیا جائے، اور مرکز اسلام کو خطرہ میں نہ پڑنے دیا جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو کہ دین کے معاملہ میں کسی رورعایت کے قائل نہ تھے، انھیں بھی دبے دبے الفاظ میں اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کے خیال سے اپنی معروض رکھنی پڑی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"لما توفی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم واستخلف أبوبكر بعده، وكفر من كفر من العرب، قال عمر بن

الخطاب لأبی بکر: کیف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلی الله علیه وسلم أمرت أن أقاتل الناس حتیٰ یقولوا لا إله إلا الله، فمن قال لا إله إلا الله فقد عصم منی ماله ونفسه إلا بحقه وحسابه علیٰ الله."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ منتخب کرلیا گیا تھا، اور کچھ عرب قبائل کفر وارتداد کر بیٹھے تھے، عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا! بتایئے تو کیسے آپ لوگوں سے برسرِ پیکار رہ سکیں گے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، مجھے تو اس وقت تک لوگوں سے برسرِ پیکار رہنے کو کہا گیا ہے، جب تک وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ نہیں کہہ دیتے، جس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اس نے میری طرف سے اپنی جان ومال کو محفوظ و مامون کرلیا)۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ایمانی غیرت اور "أینقص الدین وأنا حیّ" کا نعرۂ مستانہ

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صاف اور صریح طور پر اپنا "أینقص الدین وأناحی"(۲) (کہ میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہو، یہ نہیں ہونے دیا جائے گا) والا موقف دہرایا، جس میں صدیقیت کی وہ اعلیٰ شان ظاہر ہوتی ہے جس نے انہیں رأس الصدیقین بنادیا، اور خلافتِ نبوت کا انہیں سب سے زیادہ حقدار ٹھہرایا، یہ ان کے مزاج نبوت سے قرب ومناسبت کی آخری درجہ کی بات تھی کہ دین کی

---

(۱) صحیح البخاری رقم: ۷۲۸۴ باب الاقتداء بسنن رسول الله صلی الله علیه وسلم، کتاب الاعتصام.

(۱) مشکوة المصابیح رقم: ۶۰۳۴ باب مناقب أبی بکر رضی الله عنه بروایت رزین.

حفاظت اور شریعت کی صیانت وبقاء پر ذرا آنچ آنے دینا گوارہ نہیں کیا اور اس میں لمحہ بھر کی تاخیر بھی روا نہ رکھی، اور ایسے کسی بھی فتنہ اور سازش کے سلسلہ میں ذرا بھی لچک اور نرمی نہیں برتی، کہ ایسا کرنا دین کو تحریف کے دروازے پر ڈالنے اور ملت کو ارتداد کے راستہ پر کرنے کے مترادف ہوگا، انہوں نے کہا کہ:

"واللّٰہ لأقتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکاۃ فإن الزکوۃ حق المال واللّٰہ لو منعونی عقالا کانوا یؤدونہ إلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لقاتلتھم علی منعہ."(۱)

(بخدا میں ضرور بالضرور ایسے لوگوں سے مقاتلہ کروں گا جو زکوۃ و نماز میں امتیاز برتتے ہیں زکوۃ مالی حق ہے، بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی دینے سے بھی باز رہے جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ادائیگی کیا کرتے تھے تب بھی میں ان سے یہ معمولی زکوۃ نہ دینے پر جنگ کروں گا)۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ یقین ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جو کہہ رہے ہیں اس پر وہ منجانب اللہ مامور ہیں، اور ان کا یہ اقدام بروقت اور برمحل ہے اور دین کی سب سے بڑی ضرورت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"فواللّٰہ ما ھو إلا رأیت اللّٰہ عز وجل قد شرح اللّٰہ صدر أبی بکر للقتال فعرفت أنہ الحق."(۲)

(بخدا اس کے بعد میرا خیال اللہ عزوجل کی طرف گیا تو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اللہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کا مقاتلہ (لڑائی) کے بارے میں شرح صدر فرمادیا ہے میں سمجھ لیا کہ یہی حق ہے)۔

---

(۱) صحیح البخاری رقم: ۷۲۸٤ باب الاقتداء بسنن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم.

(۲) صحیح مسلم کتاب الایمان، رقم: ۲۰

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قرآنی فضیلت

چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قبائل عرب میں ارتداد کی آگ بجھانے کے لئے دستے روانہ کئے، ایک خونریز لڑائی کے بعد مسیلمہ کذاب مارا گیا، ایک دوسری لڑائی میں طلیحہ کی جماعت تتر بتر ہوگئی، وہ بچ نکلا، اور اسلام کا اعلان کردیا، دیگر جگہوں پر جہاں جہاں لوگ بھیجے گئے تھے، سب کامیاب و بامراد واپس آئے، اس طرح قرآن کی وہ پیشین گوئی بھی پوری ہوئی جس میں مسلمانوں میں ارتداد کا خطرہ کا ذکر تھا اور یہ اشارہ تھا کہ ان کے نقصان کو ختم کرنے کے لئے جماعت کھڑی ہوگی اور یہ وہ جماعت ہوگی جو اللہ کو پسندیدہ ہوگی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس آیت کریمہ کے اولین مصداق ثابت ہوئے، وہ آیت یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾(۱)

(اے ایمان والو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے سو اللہ عنقریب ایسے لوگوں کو لائے گا جنہیں وہ محبوب رکھتا ہوگا اور وہ اسے محبوب رکھتے ہونگے، مومنوں کے لئے رحمت اور شفقت والے ہونگے کافروں کے مقابلہ سخت و زبردست ہونگے، اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے ڈرے سہمے نہیں ہوں گے یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا وسعت والا ہے بڑا علم والا ہے)۔

---

(۱) سورۂ مائدہ/۵۴

آیت بالا میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد فتنوں، خطرات اور امت میں آنے والے اس دور ارتداد کی پیشین گوئی ہے وہیں اسلام کی ابدی بقاء اور حفاظت کی بھی پیشین گوئی ہے، کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ لا کھڑا کرے گا، جو دین کے لئے قربانی دینے والے اور اللہ کی مرضی و پسند کو اپنی ترجیحات میں رکھنے والے اور جم کر ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے اور اللہ کے خوف کے آگے کسی بات کا خوف واندیشہ رکھنے والے ہوں نہ گے، وہ مومنین کے لئے تو بڑے ہی نرم خو، بے آزار، شفیق و مہربان ہوں گے مگر کفر و شرک کے سلسلہ میں ان میں ذرا بھی لچک اور نرمی نہ ہوگی، اور اصحاب کفر و شرک کے مقابلہ وہ مضبوط و سخت اور غالب رہنے والے ہونگے ان کا سامنے والا ان سے دبے گا یہ ان سے نہیں دبنے والے ہونگے، توحید کے معاملہ میں بڑے سخت ایمان و یقین میں خوب پختہ اور عزم و ہمت میں مضبوط ہوں گے، اور دین کی حفاظت و بقاء کے کام کے لئے وہ جو مناسب طریقہ کار اختیار کریں گے اس میں سعی بلیغ سے کام لینے والے ہوں گے۔

یہ حقیقت ہے کہ ایسے مومنین صادقین دین کے مفاد کو آگے رکھتے ہیں اور ان کا عمل عجب و ریاء اور کبر سے خالی ہوتا ہے، برابر وہ اللہ سے لو لگاتے ہیں، تعلق مع اللہ خوب مضبوط ہوتا ہے، اور جماعت کے ساتھ سامنے آتے ہیں، دین کا درد اور ملت کی فکر ان پر اس درجہ حاوی ہوتا ہے کہ وہ دوسرے تقاضوں اور ضروریات کو دین و ملت کو درپیش خطرہ کے پیش نظر پس پشت ڈال دیتے ہیں دین و ملت کی تاریخ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سے برابر ایمان و اسلام سے رشتے کمزور کر دینے والے اور تعلق منقطع کر دینے والے خطرات اور چیلنج سامنے آتے رہے، مگر انکے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ برابر اپنے پسندیدہ بندوں کا اصطفاء فرماتا رہا، سب سے بڑا خطرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سانحۂ عظیم کے بعد اس وقت پیش آیا، جب وفات کے سانحۂ عظیم سے متاثر ملت نڈھال تھی اور پھر مذہبی ایمانی وارکانی

وحدت کوارتداد کی لہریں پارہ پارہ کرنے میں لگی تھیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو ارتداد کے مقابلہ کے لئے کھڑا کیا اور انہوں نے خلافت کا بار اٹھانے کے ساتھ سب سے پہلے اس کی فکر کی اور صحابہ کی جماعتوں کو الگ الگ ان فتنوں کے مقابلے کے لیے بھیجا، اور فتنوں کے علمبردار اور ان کے حاشیہ بردار مارے گئے، جو بچے وہ قید کئے گئے، اور جس کو توفیق ہوئی وہ رجوع الی الاسلام کی دولت سے سرفراز ہوا، یہ فتنہ اسلام کی ابدی بقا اور حفاظت کے لئے چیلنج تھا، اگر اس وقت اس فتنہ کو پنپنے کا موقع ملتا تو ہمیشہ کے لئے اسلام اپنی صحیح تصویر کھو سکتا تھا، چنانچہ ارتداد کے اس سب سے عظیم فتنہ کے مقابلہ کے لئے اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اپنے سب سے محبوب شخص اور محبوب جماعت کا انتخاب واصطفاء فرمایا اور یہ مقولہ محاورہ بن گیا "رِدّة ولا أبا بكر لها" (ارتداد کا عالم ہے اور اس کے مقابلہ کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ جیسا کوئی مردِ میدان موجود نہیں ہے)۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کے ان تین گروہوں کا مقابلہ کیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی ظاہر ہو گئے تھے۔ جیسے اسود عنسی کی جماعت، مسیلمہ کذاب کا گروہ، اور طلیحہ کا فرقہ، ان تینوں کو ختم کرنے کے ساتھ ان فتنوں کو بھی تہ تیغ کیا جو کہ اپنی کیت و کیفیت میں ان فتنوں کے جیسے نہیں تھے، جیسے سجاح جو کہ عورت تھی مگر مدعی نبوت ہوئی، اور وہ قبائل جنہوں نے زکوۃ کا انکار کیا، اور کثیر بیونت کے ساتھ ایک نئے اسلام کو پیش کرنے کی کوشش کی، ارتداد آیا کیسے؟ اس کے متعدد وجوہ ہو سکتے ہیں جن میں حسد تعلّی جیسے اسباب کے ساتھ عصبیت، دلوں میں اسلام کا پورا نہ اترنا، اور کفار و مشرکین سے موالات، دوستانہ روابط بھی نظر آتے ہیں، اور یہ ایسے اسباب ہیں جن کو عہدِ صدیقی کے فتنوں کا جائزہ لینے والا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا، جہاں تک موالات کفار و مشرکین کا تعلق ہے تو ماقبل آیات سے اس کا اشارہ مل جاتا ہے، جس میں ایک جگہ یہود و نصاریٰ کے تعلق

سے ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾(۱)

(اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہے)۔

اور مابعد آیت میں آیت ارتداد سے متصل ہی میں یہ فرمادیا گیا ہے:

﴿إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ﴾(۲)

(تمہارے دوست تو بس اللہ اور اس کا رسول اور ایمان والے ہیں جو اقامت صلوٰۃ کرتے ہیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہیں، اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں)۔

ایک خطرہ

ان تینوں آیات کے ربط کو دیکھتے ہوئے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول اور مؤمنوں کے بجائے اہل کفر وشرک اور الحاد سے ربط بڑھائے گا تو لازمی طور پر وہ ان کے افکار وخیالات اور رجحانات کا اثر لے گا، جس کے نتیجہ میں اس کا ایمان ویقین جاتا رہے گا، اور وہ شک میں پڑ کر الحاد وزندقہ کا شکار ہوجائے گا، اور اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا اپنا ملی تشخص اور اسلامی ثقافت و تہذیب خطرہ میں پڑجاتی ہے، اور اس کا ذہن وفکر تبدیل ہوجاتا ہے، بھلے وہ اپنا دین حق ترک نہ کرے، اور تبدیلی مذہب کا اعلان نہ کرے، لیکن اس کا ذہن ودماغ اور جذبات وافکار بدل جاتے ہیں، اور اس کا رشتہ عقائدی وحدت اور ارکانی وحدت سے کٹ جاتا ہے۔

---

(۱) سورۂ مائدہ/۵۱

(۲) ایضا/۵۵

فضائل ومناقب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دین میں جو پیش قدمی، اور ایثار وقربانی میں جو سبقت حاصل رہی اور جس طرح انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، اور اپنے سارے تقاضوں اور خواہشات کو دبایا اس نے انکو صحابہ میں سب سے اونچے مقام پر فائز کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں جو ارشادات فرمائے ان میں سے کوئی ایک ارشاد بھی ان کی سبھی صحابہؓ پر فضیلت وفوقیت کے لئے کافی ہے، اس سلسلے میں ایک واقعہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے جس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق خاص طور پر ظاہر ہو رہا ہے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی نے واقعہ اس طرح نقل کیا ہے کہ:

> ''ایک دن حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے چل رہے ہیں تو آپ نے تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ کیا تم ایسے شخص کے آگے چلتے ہو جو دنیا وآخرت میں تم سے بہتر ہے اور فرمایا کہ دنیا میں آفتاب کا طلوع وغروب کسی ایسے شخص پر نہیں ہوا جو انبیاء کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ سے بہتر اور افضل ہو۔''(۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں، اور اسی لئے ان کے فضائل ومناقب کم شمار کئے جاتے ہیں، کہ ان کا افضل واتقی اور اصدق ہونا

---

(۱) معارف القرآن از مفتی شفیع عثمانی، تفسیر سورہ حجرات۔

ایک قطعی چیز بن گیا، قرآن مجید میں ان کے نام کے ساتھ ان کا ذکر گو نہیں ہے، لیکن متعدد موقعوں پر ان کی خصوصیت وامتیاز کی طرف قرآن مجید نے اشارہ کردیا ہے جس میں سب سے واضح اشارہ ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ قَالَ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾(۱) ہے، جس سے ان سے اللہ کی معیت کا حاصل ہونا قطعی طور پر معلوم ہو رہا ہے اور یوں اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعداد ایک بڑی تعداد ہے لیکن صحابیت میں خصوصیت اس آیت سے انہی کو حاصل ہو رہی ہے، اس طرح قطعی طور پر ان کا صحابی ہونا خود قرآن نے بتادیا، اسی طرح سورۃ اللیل میں ان کے تقویٰ کے اعلیٰ مقام پر فائز ہونے، اور تزکیہ کے بلند رتبہ پر پہنچنے اور اللہ کی مرضی ومحبوب ہونے کا قرائن سے واضح اشارہ موجود ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ، وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزَىٰ، إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ، وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾(۲)

(اور اس (بھڑکتی ہوئی آگ یعنی جہنم) سے بچادیں گے بڑے ڈرنے والے کو جو اپنا مال دل پاک کرنے کے لئے دیتا ہے، اور نہیں ہے اس پر کسی کا احسان جس کا بدلہ دے، سوائے اپنے رب کی مرضی چاہنے کے جو سب سے برتر اعلیٰ ہے اور آگے وہ راضی ہوگا)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی ان آیات کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر چہ یہ مضمون آیت کا عام ہے لیکن روایات کثیرہ شاہد ہیں کہ ان آخری آیات کا نزول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں ہوا اور یہ بہت بڑی دلیل ان کی فضیلت و برتری کی ہے، زہے نصیب اس بندے کے جس کے اتقی ہونے کی

---

(۱) سورۂ توبہ/۴۰۔ (۲) سورۂ لیل/۱۷تا۲۱

تصدیق آسمان سے ہو، ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ اور خود حضرت حق سے اس کو ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ کی بشارت سنائی جائے، فی الحقیقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ کی بشارت ایک انعکاس ہے، اس بشارت عظمیٰ کا جو آگے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں آ رہی ہے ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾.(۱)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اللہ اور اس کے رسول کے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام محبوبیت کو اچھی طرح سمجھا تھا، اسی لئے ایک موقع پر فرمایا، جیسا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا:

"أبو بكر سيدنا وخيرنا وأحبنا إلىٰ رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم."(۲)

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے تو رو پڑتے تھے اور ایک بار تو یہ فرمایا کہ میں دل سے چاہتا ہوں کہ میرے تمام عمر کے عمل ان کے ایام زندگی کے ایک دن کے عمل کے برابر اور ان کی زندگی کی راتوں میں سے ایک رات کے عمل کے برابر ہو جائیں، جہاں تک رات کا تعلق ہے تو یہ وہ خاص رات ہے جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر میں غار کی طرف چلے تو جب غار کے پاس پہنچے (اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غار کے اندر جانا چاہا) تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ خدا کی قسم آپ

---

(۱) فوائد عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند۔

(۲) جامع ترمذی کتاب المناقب باب مناقب ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

ابھی غار میں داخل نہ ہوں پہلے میں غار کے اندر جاؤں گا تو وہاں اگر کوئی موذی چیز ہوگی تو جو گزرے گی مجھ پر گزرے گی آپ محفوظ رہیں گے پھر ابوبکر غار کے اندر چلے گئے، اور اس کی صفائی کی، اس غار میں ایک طرف چند سوراخ نظر آئے، تو اپنے تہبند (لنگی) میں سے پھاڑ کر ان کے ٹکڑوں اور چیتھڑوں سے ان سوراخوں کو بند کیا، لیکن دو سوراخ باقی رہ گئے، تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سوراخوں میں اپنے دونوں پاؤں اَڑا دیئے، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا، کہ اب آپ اندر تشریف لے آئیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم غار کے اندر تشریف لے گئے، اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کی گود میں سر مبارک رکھ کر سو گئے، (اسی حالت میں) ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں میں سانپ نے کاٹ لیا، لیکن اس اندیشہ سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ نہ کھل جائے، آپ بیدار نہ ہو جائیں اسی طرح بیٹھے رہے، حرکت بھی نہیں کی یہاں تک کہ تکلیف کی شدت سے آپ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر گرے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی) فرمایا کہ ابوبکر تم کو کیا ہوا؟ انہوں نے عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں مجھے سانپ نے کاٹ لیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس جگہ پر جہاں سانپ نے کاٹا تھا) اپنا آبِ دہن ڈال دیا تو حضرت ابوبکر کو جو تکلیف ہو رہی تھی وہ اسی وقت چلی گئی، پھر بعد میں (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات سے کچھ پہلے) اس زہر کا اثر لوٹ آیا اور وہی ان کی وفات کا سبب بنا۔

اور جہاں تک دن کا تعلق ہے، تو یہ وہ دن ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور عرب کے بعض علاقوں کے لوگ مرتد ہو گئے، اور انہوں نے فریضۂ زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: کہ اگر وہ لوگ اونٹ کا پاؤں باندھنے کی رسی دینے سے بھی انکار کریں گے، تو میں انکے خلاف جہاد کروں گا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے عرض کیا، اے خلیفۂ رسول اللہ! ان لوگوں کے خلاف تالیف اور نرمی کا معاملہ کیجئے، تو انہوں نے غصہ کے ساتھ مجھے فرمایا:

"أجبّار فی الجاهلية وخوّار فی الإسلام؟ إنهٗ قد انقطع الوحی وتمّ الدين أينقص الدين وأنا حي؟"(۱)

(تم زمانۂ جاہلیت میں تو بڑے زور آور اور غصہ ور تھے کیا اسلام کے دور میں بزدل اور ڈرپوک ہو گئے ہو، (یہ کیسا انقلاب ہے) وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا، دین مکمل ہو چکا، کیا دین کو ناقص کیا جائے گا، اس میں کمی کی جائے گی، اس حال میں کہ میں زندہ ہوں (یہ نہیں ہو سکتا)۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کیا مقام تھا، اس کو ان کے صاحبزادے حضرت محمد بن الحنفیہؒ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"قلت لأبی أي الناس خير بعد النبی صلی اللّٰه عليه وسلم؟ قال أبوبكر! قلت ثم من؟ قال عمر."(۲)

(میں نے اپنے والد ماجد سے عرض کیا کہ امت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بہتر و افضل کون ہے؟ تو

---

(۱) مشكوٰة المصابيح رقم: ٦٠٣٤ باب مناقب أبی بكر رضی اللّٰه عنه، كتاب المناقب.

(۲) البخاری رقم: ٣٦٧١ باب قول النبی صلی اللّٰه عليه وسلم: "لو كنت متخذا خليلا."

انہوں نے فرمایا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، میں نے کہا کہ ان کے بعد کون؟ فرمایا حضرت عمر رضی اللہ عنہ)۔

اس کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی روایات ہیں جن سے صاف طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تمام صحابہؓ پر فضیلت ظاہر ہوتی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے مہتم بالشان عبادت نماز میں اپنی جگہ امامت کے لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو کہا، اور ترمذی کی روایت میں تو یہاں تک ہے کہ فرمایا: "لا ینبغی لقومٍ فیهم أبو بکر أن یؤمهم غیره." (۱)

وفات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سانحۂ عظیم کے بعد امت کے لئے دوسرا سب سے بڑا صدمہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کا تھا، اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عاشقانہ وفدائیانہ تعلق جو شروع دن سے جب حجازی قافلہ میں کوئی دوسرا نہیں تھا قائم ہوا اور پوری گرم جوشی کے ساتھ آخر تک اسی جذبۂ ایثار و محبت اور فدائیت کے ساتھ قائم رہا، چنانچہ عمر میں ایک ہی اور مرض وسبب وفات میں بھی تقریباً یکسانیت ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیبر میں ایک یہودی نے زہر دیا تھا جس سے فوری طور پر تو نقصان نہیں پہنچا تھا، لیکن جب مدت عمر پوری ہونے لگی تو اس کے اثرات عود کر آئے، اور یہی سبب وفات بنا، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سانپ نے غار میں ڈسا تھا، وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لعاب دہن سے اپنا اثر نہ دکھا پایا، لیکن مدت عمر پوری ہونے لگی، تو اس کے اثرات ظاہر ہوئے، اور یہی وفات کا سبب بنا تھا، اس طرح ان کو شہادت فی سبیل اللہ کی سعادت وفضیلت بھی نصیب ہوئی۔

خلیفہ کی نامزدگی

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی علالت کے زمانے میں نیابت

---

(۱) الترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب أبی بکر و عمر کلیهما، رقم الحدیث: ۳۵۷۳

نبوت کا مسئلہ صاف کر دیا تھا، اور باہمی مشورے سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا نام طے کر دیا تھا۔

دو اہم دعاؤں کا اہتمام

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ سیکھا، اور سب سے زیادہ ساتھ دیا، اور ہر نرم و گرم موقع پر وہ ساتھ رہے، اور پورے تن من دھن کے ساتھ رہے۔ دو اہم دعائیں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو سکھائی تھیں، ایک تو اس وقت جب صبح و شام کے لئے دعا کے الفاظ چاہے تو یہ دعا تعلیم دی:

"اللهم فاطر السموٰت والأرض عالم الغيب والشهادة لا إلـٰه إلا أنت رب كل شيء ومليكه، أعوذبك من شر نفسي ومن شر الشيطان وشركه، وأن اقترف على نفسي سوءً أو أجرّهٔ إلى مسلم." (١)

دوسری دعا نماز کے اختتام کی ہے، یہ بھی ان کی ہی طلب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی تھی:

"اللهم إني ظلمت نفسي ظلماً كثيراً ولا يغفر الذنوب إلا أنت فاغفرلي مغفرةً من عندك وارحمني إنك أنت الغفور الرحيم." (٢)

اس دعا کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ نماز کو کامل اور کامل سے بھی بڑھ کر اس کے اعلیٰ معیار پر کر دیتی ہے، اور نماز کے اندر جو کمیاں اور کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، ان کا کفارہ یہ دعا بن جاتی ہے۔

---

(۱) الترمذی، کتاب الدعوات، حدیث: ۳۵۲۹

(۲) ایضا حدیث: ۳۵۳۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فدائیانہ تعلق

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو والہانہ تعلق تھا، اس کا اندازہ واقعہ بدر کے اس حصہ سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و مشرکین کو ساز و سامان سے لیس اور تعداد میں خاصا دیکھا اور اہل ایمان کی تعداد کم اور بے سروسامانی کی حالت میں دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال گزرا کہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت اس حادثہ میں ختم ہوگئی تو پھر میرے رب کی بندگی زمین پر کون کرے گا، اب کوئی دوسرا نبی و رسول آنا ہی نہیں ہے، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چینی بہت بڑھ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں ایسا محو ہوئے کہ دونوں ہاتھ پھیلائے اور اپنے رب کو پکار رہے تھے اور قبلہ رخ تھے اور گریہ و زاری میں اپنے رب سے یوں فریاد کر رہے تھے:

"اللھم أنجز لی ما وعدتنی، اللھم آتنی ما وعدتنی، اللھم إن تھلك ھذہ العصابة من أھل الإسلام لا تعبد فی الأرض."

(بارالہا! میرے لیے وہ پورا فرما جس کا تیرا مجھ سے وعدہ ہے، بارالہا! مجھے وہ عطا فرما جس کا تیرا مجھ سے وعدہ ہے، بارالہا! یہ مٹھی بھر جماعت مسلمانوں کی اگر نہ رہی تو پھر روئے زمین پر تیری بندگی نہ ہو سکے گی)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا پورے انہماک سے اور بآواز بلند مانگ رہے تھے، اور گریہ وزاری سے آپ کا یہ حال تھا کہ چادر مونڈھے پر سے گری جا رہی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے یہ کیفیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ درد و کرب دیکھا نہیں گیا، پیچھے سے آکر خدمت اقدس میں عرض کیا کہ:

"یا نبی اللہ کفاك مناشدتك ربك فإنه سینجزلك ما وعدك."

(اے اللہ کے نبی! آپ کی اپنے رب سے مناجات اب بہت ہوگئی، اس نے آپ سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کرے گا)۔
ان کا یہ عرض کرنا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ﴾ (۱)

(جب لگے تم اپنے رب سے فریاد کرنے تو اس نے تمہاری فریاد سن لی کہ میں ضرور یکے بعد دیگرے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا)۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے نازل فرمائے اور ان کے ذریعہ مدد کا سامان فراہم اور کیا اور تقویت پہنچائی۔(۲)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق اور فدائیت کا معاملہ روز اول سے رہا اور اس وقت سے رہا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی نہیں ہوئی تھی اور جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی برحق ہونے کا اعلان فرمایا اور دعوت اسلام دی تو افراد خانہ سے باہر یہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فوری طور پر اسلام قبول کیا اور تصدیق کی، اس طرح معراج کا واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل واقعہ ہے، اس وقت آپ کی محبت وتعلق کا امتحان مشرکین نے لینا چاہا اور بغیر نام لیے کہا کہ کوئی ایسا کہے کہ ہم شب بھر میں آسمانوں کی سیر کر آئے اور یہ پیش آیا تو تم کیا کہو گے؟ انھوں نے اپنی بات کہی، اس پر ان لوگوں نے کہا تمہارے نبی تو ایسا ہی کہہ رہے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا وہ کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں، جب ہم ان کی یہ بات مان چکے کہ ساتویں آسمان سے لمحوں میں فرشتہ آتا ہے اور ان تک پیغام پہنچا کر جاتا ہے تو یہ تو کچھ نہیں۔

اسی طرح ہجرت کے موقع پر جس طرح ساتھ دیا اور سارے خطرات مول

(۱) سورۂ انفال/۹
(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب سورۃ الانفال رقم: ۳۰۸۱

لیے اور غار ثور میں قیام کے دوران جو راحت پہنچائی اور اپنی جان و مال سے جو قربانیاں دیں اس سے روایات بھری پڑی ہیں۔

نبوی مزاج واخلاق سے مشابہت اور دیگر امتیازات وخصوصیات

حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تشبیہ بالانبیاء کو عقلاً وعملاً ثابت کیا ہے اور اس سلسلہ میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں، قوت عقلیہ میں رؤیائے صالحہ، تعبیر رؤیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فراست وبصیرت سے موافقت ومطابقت، اتباع کامل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک منشا کا خیال اور اس کا نفاذ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور شریعت و سنت کا فہم کامل۔(۱)

اسی طرح قوت عملیہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو بڑی مشابہت تھی، چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے جو بات کہی اور جو اوصاف ومحاسن گنائے کہ آپ یہ یہ کرتے ہیں، آپ کو اللہ تعالیٰ ضائع نہیں کرے گا، ٹھیک اسی طرح جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنے گھر سے ہجرت کے لیے مجبور ہونا پڑا اور پھر ابن الدغنہ راستہ میں مل گئے اور یہ کہتے ہوئے واپس لے آئے کہ آپ ان صفات کے حامل ہیں، آپ کو کون نکال سکتا ہے۔

اسی طرح ان کا توحید پر جمنا، دین وایمان پر استقامت، اللہ کی راہ میں سارا کا سارا مال خرچ کر دینا اور اللہ پر کامل توکل واعتماد اور غایت درجہ کی ورع واحتیاط، ایک بار مشکوک ومشتبہ دودھ پی لیا، فوراً اس کو قے کے ذریعہ نکالا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا تھا، جب انھوں نے صدقہ کا کھجور منہ میں رکھ لیا تھا، تواضع، شفقت علی الخلق، دوسروں کے عیوب کو چھپانا، امام

(۱) إزالة الخفاء عن خلافة الخلفاء.

غزالی نے آپ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

"لو أخذت شارباً لأحببت أن يستره الله، ولو أخذت سارقاً لأحببت أن يستره الله." (۱)

(اگر میں نے کسی شرابی کو پکڑا تو میری خواہش ہوتی ہے کہ اللہ اس کی ستر پوشی فرمائے، اور اگر کسی چور کو پکڑا تو میری خواہش ہوتی کہ اللہ اس کی ستر پوشی فرمائے)۔

اسی طرح ہر معاملہ میں اللہ کی رضا ڈھونڈنا اور اس کے عین مطابق عمل کرنا اور پھر اس دعا کا اہتمام کہ:

"اللهم أرني الحق حقاً وارزقني اتباعه وأرني الباطل باطلاً وارزقني اجتنابه."

(اے اللہ مجھ پر حق کی حقانیت آشکار فرما اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما، اور مجھ پر باطل کو واضح کردے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرما)۔

لایعنی اور فضول کام اور بات سے حد درجہ احتراز واجتناب فرماتے، مال کی محبت اور جاہ کی محبت جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سب سے آخر میں نکلتی ہے، ان کے اول تصدیق کے عمل سے ہی بالکل نکل چکی تھی، جب خیر وخیرات کا وقت آتا، لوگ کچھ اپنی ضروریات کے لیے بھی چھوڑتے لیکن حضرت ابوبکر سب کا سب حاضر کر دیتے، منصب وغیرہ کے تعلق سے ان کا ایک طرف عمل دوسری طرف قول دونوں گواہ ہیں کہ ان کو اپنے لیے اس کی کبھی فکر نہ ہوئی، جب خلیفہ کے انتخاب کا وقت آیا تو خود ہی دوسرے کا نام پیش کر دیا اور خود ان کا اس سلسلہ میں ملفوظ ہے:

"والله ما كنت حريصاً على الإمارة قط ولا طلبتها من الله في سره ولا علانية." (۲)

---

(۱) احیاء العلوم ۴/۵۰۷۔ (۲) ازالۃ الخفاء ۳/۷۲

(خدا کی قسم! میں کبھی حکومت کا خواستگار نہیں ہوا، اور نہ اللہ سے کبھی اس کی طلب کی، نہ چھپ کر اور نہ کھل کر)۔

اور تزکیہ اس درجہ ہو چکا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے فرمایا:"إن اللّٰه نزع الخيلاء منك."(۱) (بیشک اللہ نے آپ کے دل سے تکبر نکال دیا ہے)۔

حاجت صرف اللہ کے سامنے رکھتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی منشا اور حکم کی تعمیل کا سب سے زیادہ خیال ہوتا۔

مسند احمد کی روایت ہے، ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں:

''حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اونٹنی پر سوار ہوتے اور کوئی چیز گر جاتی تو دوسرے کو زحمت دینے کے بجائے خود اٹھانے کی کوشش کرتے، لوگ کہتے کہ آپ کہہ دیتے تو ہم ہی اٹھا دیتے، اس پر فرماتے: "إن حبيبي رسول الله صلى الله عليه وسلم أمرني أن لا أسأل الناس شيئا." (کہ میرے حبیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کیا کروں)۔(۲)

اس کے علاوہ اللہ کی خشیت، آخرت کے حساب کا خوف، چڑیا کو دیکھ کر کہنا کہ کاش میں تمہارے جیسا ہوتا، تمہارا درخت پر بیٹھنا، پھل کھانا، پھر اڑ جانا اور کوئی حساب اور عذاب تم پر نہیں۔ ذکر کا استحضار اس قدر تھا کہ فرمایا کہ جو جانور شکار ہوتا ہے اور جو درخت کاٹا جاتا ہے وہ اس کی تسبیح کی غفلت سے ہوتا ہے۔(۳)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ہمہ وقت حضوری کی جو کیفیت حاصل تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سانحہ

---

(۱) سنن ابی داؤد رقم: ۴۰۸۵ (۲) مسند احمد۔ (۳) ازالۃ الخفاء ۳/۷۳

وفات کی خبر سے سبھی تھوڑے لمحہ کے لیے اس حال میں آگئے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، سب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سنبھالا اور سمجھایا اور ذہنوں میں جو شکوک وشبہات تھے ان کو دور کیا۔

قرآن مجید سے بہت شغف تھا، خوب تلاوت کرتے، خوب اچھا یاد تھا، معانی کا خوب استحضار تھا، مشکلات قرآن کی شرح فرمائی، ان کے خطبوں میں اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں اور آج جو قرآن مجید دنیا کے چپہ چپہ میں مشرق ومغرب میں عام ہے، یہ اصلاً حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر وتوجہ کا نتیجہ ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی درخواست پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جمع کرانے کا کام کیا۔

حدیث شریف کی اشاعت میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے، اگرچہ حدیثیں بہت کم بیان کیں، لیکن حدیثوں پر نظر سب سے زیادہ تھی، اس کی ایک وجہ ان کی اس میں احتیاط تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ مختلف پہلوؤں سے دین کے استحکام کے کام میں مشغول ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے متعلق جو دو چار بڑے اہم مسئلے تھے، مسئلہ موت وحیات نبی صلی اللہ علیہ وسلم، آپ صلی اللہ علیہ وسلم تدفین کہاں ہو، کیفیت نماز جنازہ، میراث نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت کے انعقاد کا مسئلہ، یہ سارے مسائل آپ کے ہی اقدام سے حل ہوئے۔

نبوت وخلافت کا فرق واضح کیا، اور منصب نبوت اور منصب خلافت کی تشریح کی، یہ اس وقت کہ جب وہ خلیفہ منتخب ہو چکے تھے اور واضح کیا کہ جو معاملہ لوگ نبی کے ساتھ کرتے تھے وہ خلیفہ کے ساتھ اس طور پر نہیں ہوگا کہ نبی معصوم ہوتا ہے اور ان پر وحی کا نزول ہوتا ہے، خلیفہ کا معاملہ اس سے جدا ہے۔

باب ہفتم

سرگروہ اہل حق ویقین

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

مقام ومرتبہ

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ صحابہ اور خلفاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں وہ ممتاز شخصیت ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تقویت اور اس کے فروغ واشاعت اور اس کی تعلیمات واحکام کی تنفیذ اور زمانہ کی دو سپر پاور رومن امپائر (روم) پرشین امپائر (ایران) یعنی قیصر وکسریٰ کی حکومت کو زیر کر کے اسلام اور مسلمانوں کے زیر اثر لانے کا وہ عظیم کارنامہ انجام دیا کہ جس نے ان کی شخصیت کو دنیا کی نہایت قدآور شخصیتوں میں نمایاں مقام دلایا، جن خصوصیات وصفات کی حامل یہ شخصیت تھی ان میں ظاہری رعب وداب، ہیبت وشوکت، جاہ وجلال کے ساتھ باطنی فراست وبصیرت مزاج نبوت سے قربت، اور حق کی خاطر کسی کی پرواہ نہ کرنے کا مزاج، اور باطل کی بیخ کنی کے لئے فوری اقدام کے اعلیٰ درجہ کی صلاحیت نے ان کو زبان نبوت سے فاروق کا خطاب دلایا، ان کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ان کے بلندی مقام کو پورے طور سے واضح کرتا ہے کہ:

"لو كان بعدي نبياً لكان عمر بن الخطاب." (١)
(اگر بالفرض میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نبی ہوتے)۔

اسی طرح یہ ارشاد بھی ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے کہ:
"لقد كان فيما قبلكم من الأمم مُحَدَّثون فإن يلك في أمتي أحد فإنه عمر." (٢) (تم سے پہلی امتوں میں محدث یعنی ایسے لوگ ہوتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی نعمت سے خاص طور پر نوازے جاتے تھے، تو اگر میری امت میں سے کسی کو اس نعمت سے خاص طور پر نوازا گیا تو وہ عمر ہیں)۔

اسی طرح معاصرین ورفقاء میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا یہ اعتراف بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ "ما كنا نُبعِد أن السكينة تنطق على لسان عمر." (٣) (کہ ہم لوگ اس بات کو بعید نہیں جانتے تھے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی زبان پر سکینہ بولتا ہے)۔

خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اظہار تشکر اور تحدیث نعمت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی بات کی تصدیق کرتا ہے، وہ یہ کہ:

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے تین باتوں میں اپنے خداوند تعالیٰ سے موافقت کی (یعنی میری رائے وہ ہوئی جو اللہ تعالیٰ کا حکم آنے والا تھا) مقام ابراہیم کے بارے میں، اور پردے کے مسئلہ میں، اور غزوۂ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں۔'' (۴)

---

(۱) روایۃ عقبہ بن عامر - الترمذی، باب فی مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۶۱۹/۵
(۲) رواہ أبو ہریرہ - صحیح البخاری و مسلم، باب بدء الوحی۔
(۳) جامع معمر بن راشد، حدیث: ۲۰۳۸۰، وفضائل الصحابۃ لأحمد بن حنبل، حدیث: ۵۰
(۴) صحیح بخاری و مسلم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت احتیاط سے لیتے ہوئے تین موافقات کا ذکر کیا، علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں ۲۱ مقامات ایسے بتائے ہیں جس میں اللہ کا حکم آنے سے پہلے اس کا انکے قلب پر پہلے ہی اثر پڑ جانے اوراس کے نتیجہ میں پیش قدمی کرنے کی بات بھی ظاہر ہوتی ہے، دور حاضر کے جلیل القدر عالم ومصنف مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے ایسے پندرہ مقامات کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''واقعہ یہ ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں کم از کم پندرہ ایسے مقامات کا ذکر ملتا ہے کہ کسی مسئلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک رائے ہوئی ، یا ان کے قلب میں داعیہ پیدا ہوا کہ کاش اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آجاتا، تو وہی حکم وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آگیا۔''(۱)

قبول اسلام کا واقعہ

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عزت وشوکت اور غلبہ عطا فرمایا، اور آپ کی ذات سے اسلام کو وہ تقویت پہونچی جس کا تصور آسان نہ تھا اور یہ سب کچھ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء کا اثر تھا جو آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ نے پورے طور سے اس کے جزئیات وکلیات کے ساتھ قبول فرمائی، جس کا آغاز آپ کے اسلام لانے سے ہوا، حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ:

> ''اللهم أعز الإسلام بأبي جهل بن هشام أو بعمر بن الخطاب فأصبح عمر فغدا علیٰ النبي صلى الله عليه وسلم فأسلم ثم صلّیٰ في المسجد ظاهرا.''(۲)

---

(۱) معارف الحدیث ۸/۳۰۷ مطبوعہ الفرقان بکڈپو نظیر آباد لکھنؤ

(۲) مسند أحمد وجامع ترمذی، باب مناقب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۵/۶۱۸

(اے میرے اللہ اسلام کو عزت اور قوت عطا فرما ابوجہل بن ہشام کے ذریعہ یا عمر بن الخطاب کے ذریعہ، چنانچہ صبح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، اور اسلام قبول کیا اور مسجد حرام میں علانیہ نماز پڑھی)۔

ابوعبداللہ حاکم کی ''دلائل النبوۃ'' کے حوالہ سے مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں کہ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہن کے گھر میں جب ان سے سورۂ طٰہٰ سنی شروع کی اور جب بہن نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُـوَ لَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل کی دنیا میں انقلاب آ گیا، اور بول اٹھے کہ بیشک وہی اور صرف وہی الٰہ اس لائق ہے، کہ اس کی عبادت کی جائے اور کلمہ شہادت پڑھا، پھر بہن ہی کے گھر میں رات گزاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کی تڑپ دل میں پیدا ہوگئی، بار بار کہتے تھے: "واشوقاہ إلیٰ محمد" اسی حال میں حضرت خباب بن الارت رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے اور ان کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آج رات برابر دعا کرتے رہے کہ اے اللہ عمر بن الخطاب یا ابوجہل بن ہشام کے ذریعہ اسلام کو عزت اور قوت عطا فرما! اور میرا خیال ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تمہارے حق میں قبول ہوگئی، اس کے بعد صبح کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور اسلام قبول کیا، اور اسی وقت کہا کہ: ''ہم لات

اور عزیٰ کی پرستش کرتے تھے وادیوں کے نشیب میں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر، اور اللہ کی عبادت کریں ہم چھپ چھپا کر؟ یہ نہیں ہوگا، خدا کی قسم ہم اللہ کی عبادت علانیہ خانۂ کعبہ کے صحن میں کریں گے۔"(۱)

ان حالات میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اقدام کیا، جب کہ مسلمان علانیہ مسجد حرام میں نماز ادا نہیں کر پا رہے تھے، فتح الباری شرح صحیح البخاری میں مصنف ابن ابی شیبہ اور طبرانی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ شہادت موجود ہے کہ:

"واللّٰه ما استطعنا أن نصلي عند الكعبة ظاهرين حتى أسلم عمر رضي اللّٰه عنه."(۲)

(خدا کی قسم عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے سے پہلے ہماری یہ طاقت نہ تھی کہ ہم بیت اللہ کے قریب میں علانیہ نماز پڑھ سکتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد ہی ہمارے لئے یہ ممکن ہوا)۔

علم نبوت سے مناسبت

علم نبوت سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو جو مناسبت تھی وہ ظاہر باہر بات ہے نبوی علم کو جس طرح انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں منتقل کیا، اور اس کی روشنی میں طرز حیات کی وہ قندیل روشن کی کہ جس کی روشنی میں نظامہائے حکومت و سیاست کے لئے وہ نمونہ سامنے آیا، جس سے بہتر نمونہ کوئی دوسرا اپنی جامعیت و کمال کے ساتھ سامنے نہیں آسکا، اور یہ بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

---

(۱) معارف الحدیث ۳۱۰/۸

(۲) فتح الباری، مستدرک حاکم، باب مناقب امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ ۹۰/۳

خواب کی تعبیر وتفسیر تھی جسے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے خود زبان نبوت سے سنا تھا صحیح بخاری وصحیح مسلم کی روایت ہے:

"عن ابن عمر قال سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: بین أنا نائم أتیت بقدحِ لبنٍ فشربت حتیٰ إنی لأری الرّیّ یخرج فی أظفاری ثم أعطیت فضلي عمر بن الخطاب قالوا فما أوّلتهٗ یا رسول اللّٰہ؟ قال: "العلم."(۱)

(حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ نے بیان فرمایا کہ میں سو رہا تھا اسی حال میں میرے پاس دودھ کا بھرا ہوا پیالہ لایا گیا تو میں نے خوب سیر ہوکر پیا، یہاں تک کہ میں نے سیرابی کا اثر اپنے ناخنوں تک میں محسوس کیا پھر میں نے وہ دودھ جو میرے پینے کے بعد بچ گیا تھا وہ عمر بن الخطاب کو دیدیا کہ وہ اس کو پی لیں، بعض صحابہ نے عرض کیا کہ آپ نے اس کی کیا تعبیر دی ؟ آپ نے فرمایا کہ "علم")۔

اسی طرح ایک دوسرا خواب بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق بتایا، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

" سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم یقول: بینا أنا نائم رأیت الناس یُعرَضون عليّ وعلیهم قُمُص، منها ما یبلغ الشدی، ومنها مادون ذلك، وعُرِض عليّ عمر بن الخطاب وعلیه قمیص یجرّہ قالوا فما أوّلت ذلك

---

(۱) صحیح البخاری، باب فضل العلم ۴۳/۱

یارسول اللّٰہ؟ قال: الدین."(۱)

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا کہ اس حالت میں کہ میں سویا ہوا تھا میں نے خواب میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے سامنے لائے جاتے ہیں اور وہ سب کرتے پہنے ہوئے ہیں ان میں سے کچھ کے کرتے ایسے ہیں جو صرف سینے تک ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے کرتے سینے سے کچھ نیچے تک ہیں، اور عمر بن الخطاب بھی میرے سامنے لائے گئے، ان کا کرتا اتنا لمبا تھا کہ زمین تک پہنچتا تھا، اور وہ اس کو زمین پر گھسیٹ کر چلتے تھے بعض صحابہ نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیا تعبیر دی؟ آپ نے فرمایا کہ "دین")۔

مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے خواب میں دودھ پینے اور کرتے کی لمبائی کے علم و دین سے مناسبت پر اچھی گفتگو کی ہے وہ کہتے ہیں:

"علمائے عارفین نے کہا ہے کہ علم حق کی صورت مثالیہ دوسرے عالم میں دودھ کی ہے جو شخص خواب میں دیکھے کہ اس کو دودھ پلایا جا رہا ہے، اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس کو علم حق نافع عطا ہوگا، دودھ اور علم حق میں یہ مناسبت ظاہر ہے کہ دودھ جسم انسانی کے لئے بہترین نافع غذا ہے۔

اسی طرح علم حق جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو روح کے لئے بہترین اور نافع ترین غذا ہے، لباس اور دین میں یہ مناسبت اور مشابہت ظاہر ہے کہ لباس سردی اور دھوپ کی تپش وغیرہ میں

---

(۱) صحیح بخاری، باب بدء الوحی ۱/۱۲

اس عالم کی آفات وتکالیف سے جسم انسانی کی حفاظت کرتا ہے،
اور سامان زینت ہے اور دین عالم آخرت میں سامان زینت
ہوگا اور عذاب سے حفاظت کا ذریعہ ووسیلہ)۔(۱)

علم وحی سے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی مناسبت، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بہترین مشیر وصادق رفیق ووزیر ہونا، اور وفات نبوی کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت نبوت میں ان کا بھرپور ساتھ دینا اور پھر اپنے دس سالہ عہد خلافت میں نیابت نبوت اور خلافت اسلامی کی جس طرح خدمت کی اور امت و انسانیت کی رہنمائی کی اس سے ان دونوں خوابوں کی تعبیر بہت جلد سامنے آگئی، اور آپ کی حقانیت وربانیت عالم آشکارا ہوگئی، اتنے روشن دلائل کے بعد بھی آپ کے بعض ان اقدامات کو ناپسندیدگی سے دیکھا جائے جو امت کے مفاد اور دین کی روح و مزاج کو سمجھ کر آپ نے کئے تھے جن میں ایک اہم مسئلہ تراویح کی جماعت اور بیس رکعت کی حد بندی کا بھی ہے، امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ثبت أن أبي بن كعب رضى الله عنه كان يقوم بالناس
عشرين من ركعة في قيام رمضان ويوتر بثلاث."(۲)

درحقیقت یہ ناپسندیدگی کج فہمی اور دین کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے اور تفقہ کی کمی کا اثر۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقام ومرتبہ کو سمجھنے کے لئے وہ روایت واحادیث کافی وشافی ہیں جن میں وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو انتقال کے بعد ہی اسی مقام ومرتبہ پر رکھا، اس طرح وہ

---

(۱) معارف الحدیث ۸/۳۱۲-۳۱۳

(۲) مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ ۲۳/۱۱۲

دربار نبوت میں حاضری دینے والے سبھی اہل ایمان کا سلام وصول کرتے ہیں اور خراج عقیدت پاتے ہیں، یہاں پر راقم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتا ہے، جو انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا، حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ جن کی کتب شیعہ و ردّ شیعیت پر بڑی نظر اور صحابہ کرام خصوصاً حضرات خلفائے راشدین و اہل بیت کے سلسلہ میں گہری واقفیت ہے وہ لکھتے ہیں کہ اس خط کو تمام شارحین نہج البلاغہ نے نقل کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ ہم اس کو علامہ ابن میسم بحرانی کی شرح (نہج البلاغہ مطبوعہ طہران جزء ۱-۳) سے نقل کرتے ہیں:

وكان أفضلهم في الإسلام كما زعمت وأنصحهم لله ولرسوله الخليفة الصديق وخليفة الخليفة الفاروق ولعمري إنّ مكانهما في الإسلام لعظيم وإن المصاب بهما لجُرح في الإسلام شديد، يرحمهما الله وجزاهما بأحسن ما عملا." (۱)

(اور اسلام میں سب سے افضل اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اخلاص رکھنے میں سب سے بڑھ کر جیسا کہ تم نے بیان کیا خلیفہ صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور خلیفہ کے خلیفہ فاروق رضی اللہ عنہ اور قسم مجھے اپنی جان کی کہ بہ تحقیق ان دونوں کا مقام اسلام میں بڑا ہے اور بہ تحقیق ان کی وفات سے اسلام کو سخت زخم پہنچا، اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت نازل کرے اور ان کو ان کے اچھے کاموں کا بدلہ دے)۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ ارشاد:

"خير الأمة بعد نبيها أبو بكر ثم عمر رضي الله عنهما."

(۱) ابوالائمہ کی تعلیم ص/ ۱۷، از مولانا محمد عبدالشکور فاروقیؒ مکتبہ فاروقیہ دریائی ٹولہ لکھنؤ

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے بہتر
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ)۔

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ لکھتے ہیں کہ:

''یہ روایت علم حدیث کی سب سے بڑی معتبر کتاب صحیح بخاری میں بھی ہے، اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے کہ "رواه ثمانون نفساً عن علي بن أبي طالب" یعنی اسی (۸۰) آدمیوں نے اس قول کو علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔''

درویشی اور زہد وقناعت

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ عظیم پیشین گوئیاں بھی پوری ہوئیں، جن میں قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کا زیر ہونا بھی تھا، ان بڑی فتوحات کے نتیجہ میں جو تمدن بلاد عربیہ میں داخل ہوا، اس کا مقابلہ کسی ایک فرد کی بات نہ تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی انفرادی زندگی میں اس کا جس طرح مقابلہ کیا اس کا غیر معمولی اثر پورے اسلامی وعربی معاشرے میں پڑا، کہ امیر المؤمنین وخلیفۃ المسلمین کا تمام اختیارات حاصل ہونے کے بعد یہ معاملہ ہے تو دوسروں کا اس دوڑ میں آگے بڑھنے کا جذبہ خود سرد پڑنے لگا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس طرز زندگی کے چند واقعات علامہ ابن جوزی کی کتاب ''مناقب عمر بن الخطاب'' (ترجمہ شاہ حسن عطا سلونی مرحوم) سے نقل کئے جاتے ہیں:

''مجاہد (تابعی) کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار فرمایا کہ سب سے زیادہ بھرپور انداز میں اور سب سے بہتر شکل

میں انسانی زندگی صبر و رضا میں ظہور پاتی ہے۔"

"الاحوص بن حکیم نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے گھی میں پکا ہوا گوشت لایا گیا جسے کھانے سے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ بیک وقت دو لذتوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"ابن سعد اور ابن عمر دونوں سے مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک شادی کا مقصد تلذذ نفسانی نہیں بلکہ نسل انسانی کا دوام تھا۔"

"حسن کہتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے روز اول سے اپنی شہادت کے دن تک مرغن غذاؤں سے پرہیز کیا۔"

"حبیب بن ابی ثابت سے ان کے چند دوستوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بیان کیا تھا: ایک بار چند عراقی جن میں جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے آپ سے ملنے آئے، تھوڑی دیر کے بعد ان لوگوں کے لئے کھانا آیا، یہ کھانا نان اور روغن زیتون پر مشتمل تھا، جو حضرت عمرؓ کی عام غذا تھی، امیر المؤمنین نے محسوس کیا، کہ عراقی ذرا تکلف سے کھانا کھا رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی نگاہ نے اس بات کو تاڑ لیا، آپ نے فرمایا: مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ کیوں اتنے تکلف سے کھانا کھا رہے ہو، تم کو تو شیریں اور ترش، گرم اور سرد بھی اقسام کی غذائیں مطلوب ہوں گی، مگر یہ غذائیں کام و دہن کی لذت کے سوا ہمیں کیا دیتی ہیں؟"

"عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے بھی بعینہٖ یہی روایت بیان کی ہے،

مگر اس میں یہ اضافہ ہے، کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل عراق سے یہ بھی کہا تھا، کہ اگر وہ چاہتے تو عراقیوں کو انواع واقسام کی غذائیں بھی کھلوا سکتے تھے، لیکن ان کی خواہش تھی کہ أذهبتم طيباتكم فى حياتكم الدنيا کی قرآنی موعظت ایزدی کے پیش نظر دنیوی لذتوں کو اخروی لذتوں کے لئے قربان کر دینا چاہئے۔"

"اسی نوع کی بات سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیوی لذتوں کی طرف آنے سے انہیں اللہ نے روک رکھا ہے، ورنہ وہ ان تمام ماکولات اور مشروبات سے پوری طرح واقف ہیں۔"

"حضرت حسن (تابعی) سے روایت ہے کہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے، اگر وہ چاہتے تو انتہائی لطیف اور خوش ذائقہ غذائیں کھاتے اور بے حد عیش وآرام سے اپنے شب وروز گزارتے، اور انہیں مختلف قسم کی لذائذ اور ماکولات سے مکمل واقفیت ہے، لیکن انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ قومیں اور امتیں اسی لذتِ کام ودہن کا شکار ہوکر ہلاک وبرباد ہوئی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: کہ دنیوی لذت کے پیچھے انسانوں نے اپنے کو اصل لذتوں سے محروم کرلیا۔"

"خلف بن حوشب کہتے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، میں نے دین ودنیا کے معاملہ میں بہت غور کیا، اور میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں گا تو دین جائیگا، اور دین کی طرف پوری طرح راغب ہو جاؤں گا تو میری دنیا

برباد ہو جائے گی، بہت غور وخوض کے بعد میں نے طے کیا، کہ میں وہ قبول کرلوں جسے بقاء ہے، اور اس چیز کو مٹ جانے دوں، جو یوں بھی مٹ جائے گی۔"

"حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ایک اور سوز انگیں اور رقت آمیز روایت بیان کی ہے جو یہ ہے: عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تقریر کر رہے تھے، یہ وہ دَور تھا جب انہوں نے خلافت کا بار گراں سنبھال رکھا تھا، ان کے کرتے میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔"

"حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بھی ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف غور سے دیکھا تو انہیں امیر المؤمنین کی قمیص میں محض مونڈھوں پر چار پیوند نظر آئے۔"

"ابو عثمان النہدی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے: کہ انہوں نے چمڑے سے اپنے کرتے کے پیوند درست کر لئے تھے، اور ایک اور موقع پر جب وہ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے ان کی یہ شان تھی کہ ان کے کرتے میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے، ان پیوندوں میں کم از کم ایک پیوند سرخ رنگ کے چمڑے کا تھا۔"

"ابن سعد اور عبد العزیز بن ابی جمیلہ رضی اللہ عنہما کا بیان ہے: ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جمعہ میں کچھ دیر ہوگئی چنانچہ منبر نبوی پر جلوہ فگن ہوتے ہی انہوں نے قوم سے اپنے دیر سے آنے کی معذرت چاہی اور فرمایا کہ دراصل ان کے پاس ایک ہی قمیص تھی، اور اسے درست کیا جارہا تھا تا کہ کہنیاں کھلی نہ رہ سکیں۔"

"یہی روایت قتادہ نے بھی روایت کی ہے مگر اس میں تاخیر کا

سبب قمیص کی درستی نہ تھا اس کا دھویا جانا تھا، امت کے قائد و رہنما کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا تھا، اور وہ اسی کو دھودھو کر پہنتا تھا۔"(۱)

اصلاحیات

نیابت نبوت کی ذمہ داری جس سیاست اور باریک بینی کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبھائی وہ انہی کا حق تھا، اور جب کہ دنیا کی بڑی بڑی قومیں دستر خوان اسلام پر نعمتیں چننے آرہی تھیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی ملہم من اللہ اور مضبوط وطاقتور شخصیت کی قیادت وامامت کی ضرورت تھی انہوں نے اس موقع پر عقائد واخلاق کے شعبہ میں روح اسلام کی جو محافظت کی اور جابجا اصلاحات فرمائیں، اس قوت اور صراحت کے ساتھ کوئی دوسری صراحت نہیں ملتی، علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ نے آپ کی ان خدمات کا خلاصہ اس طرح تحریر کیا ہے، الفاروق ۲/ ۲۰۷ میں وہ لکھتے ہیں:

"اسلام نے شرک کو کس زور وشور کے ساتھ مٹایا، لیکن غور سے دیکھو تو قبروں مزاروں کے ساتھ عوام ایک طرف، خواص کا جو طرز عمل ہے اس میں اب ابھی کسی قدر شرک کا مخفی اثر موجود ہے، گو استفادہ عن القبور اور حصول برکت کے خوشنما الفاظ نے ان پر پردہ ڈال رکھا ہے۔"

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان نازک اور مشتبہ مسائل میں جس طرح اصل حقیقت کو سمجھا ہے، اور اس جرأت ودلیری سے اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کیا، اس کی نظیر صحابہ کے زمانے میں

---

(۱) حیات فاروق اعظمؓ از امام ابن الجوزی ترجمہ شاہ حسن عطا، ص/ ۲۳۲-۲۳۵، مطبوعہ قاضی حمید الدین ناگوری اکیڈمی کراچی۔

بھی بہت کم ملتی ہے، الٰہیات کا ایک بڑا نازک مسئلہ قضاء وقدر کا مسئلہ ہے، جس میں عموماً بڑے بڑے ائمہ مذاہب کو غلطیاں واقع ہوئیں، یہاں تک کہ اکابر صحابہ میں سے بھی بعضوں کو اشتباہ ہوا، طاعون عمواس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا سفر کیا، تو مقام سرغ میں پہونچ کر معلوم ہوا کہ وہاں وبا کی نہایت شدت ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ کیا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس خیال سے کہ جو کچھ ہوتا ہے، قضائے الٰہی سے ہوتا ہے، نہایت طیش میں آکر کہا: "أ فِراراً من قدر الله" یعنی کیا قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہنے اس نازک مسئلہ کو ان مختصر اور بلیغ الفاظ میں حل فرمایا: "نعم نفرّ من قدر الله إلى قدر الله" یعنی ہاں ہم خدا کے حکم سے خدا کے حکم کی طرف بھاگتے ہیں۔"(۱)

"اسلام کا اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے، اسی بناء پر کعبہ اور حجر اسود وغیرہ کے احترام کا حکم ہے، لیکن اس کی صورت صنم پرستی سے بہت کچھ ملتی جلتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تمام مذاہب میں اسی اصول سے رفتہ رفتہ صنم پرستی قائم ہوگئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہنے مختلف موقعوں پر لوگوں کو اس کی غلطی میں پڑنے سے باز رکھا، ایک بار حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر علانیہ کہا: "إني أعلم أنك حجر و أنك لاتضر و لاتنفع" (میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ فائدہ پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان)۔"

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فعل مذاق عام سے جس قدر الگ

---

(۱) واقعہ کی تفصیل کے لئے صحیح مسلم باب الطاعون دیکھیں۔

تھااس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ بہت سے محدثین نے جہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے وہاں یہ روایت بھی اضافہ کی ہے کہ اسی وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو ٹوکا اور ثابت کیا کہ حجر اسود فائدہ اور نقصان دونوں پہونچا سکتا ہے، کیوں کہ وہ قیامت میں لوگوں کی نسبت شہادت دے گا۔"

"ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درخت کے نیچے لوگوں سے بیعت لی تھی اس بناء پر یہ درخت متبرک سمجھا جانے لگا تھا، اور لوگ اس کی زیارت کو آتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر اس کو جڑ سے کٹوا دیا۔"

عدل وقضا کے سلسلہ میں ہدایات

(كتاب سيدنا عمر بن الخطاب إلى أبي موسى الأشعري رضي الله عنهما).

بسم الله الرحمن الرحيم

"من عبد الله عمر أمير المؤمنين إلى عبد الله بن قيس (يعني أبا موسى الأشعري) سلام عليك، أما بعد!

فإن القضاء فريضة محكمة وسنة متبعة، فافهم إذا أدلي إليك فإنه لا ينفع تكلم بحق لا نفاذ له.

آس بين الناس في مجلسك ووجهك، حتى لا يطمع شريف في حيفك، ولا ييأس ضعيف من عدلك، ولا يخاف ضعيف جورك.

البينة على المدعي واليمين على من أنكر، والصلح جائز بين الناس (وفي بعض الروايات: المسلمين) إلا صلحا

أحل حراما أو حرّم حلالا.

ولا يمنعنك قضاء قضيته بالأمس فراجعت فيه نفسك وهديت لرشدك أن ترجع إلى الحق، فإن الحق قديم لا يبطله شيء، واعلم أن مراجعة الحق خير من التمادى فى الباطل.

الفهم الفهم فيما يتلجلج فى صدرك مما ليس فيه قرآن ولا سنة، واعرف الأشياء والأمثال، ثم قس الأمور بعد ذلك، ثم اعمد لاحبها وأقربها إلى الله وأشبهها بالحق فيما ترى.

اجعل لمن ادعى حقا غائبا أمدا ينتهى إليه، فإن أحضر بينة أخذ بحقه، وإلا استحللت عليه القضاء، فإن ذلك أبلغ فى العذر وأجلى للعمى.

والمسلمون عدول بعضهم على بعض فى الشهادة إلا مجلودا فى حد، أو مجرّبا عليه شهادة زور، أو ظنينا فى ولاء أو قرابة.

إن الله تولى منكم السرائر و درأ عنكم بالبينات، وستر عليهم الحدود إلا بالبينات والأيمان.

وإياك والغضب والقلق والضجر والتأذى بالخصوم فى مواطن الحق التى يوجب الله به الأجر ويحسن الذخر، فإنه لمن صلحت سريرته فيما بينه وبين الله ولو على نفسه، أصلح الله ما بينه وبين الناس، ومن تزين للدنيا بغير ما يعلم الله منه شأنه الله عز وجل، فإنه سبحانه

وتعالى لا يقبل من العبادة إلا ما كان خالصا، فما ظنك بثواب غيّر الله عز وجل فى عاجل رزقه وخزائن رحمته.

والسلام عليك."

(حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ایک خط حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے نام)۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اللہ کے بندے امیر المومنین عمر بن الخطاب کی طرف سے عبداللہ بن قیس یعنی ابوموسیٰ اشعری کے نام۔ السلام علیکم۔

امابعد! نظام قضا کا قیام ایک محکم فریضہ اور ایک ایسی سنت ہے جس کا ہمیشہ اتباع کیا گیا ہے، لہٰذا جب کوئی مقدمہ تمہارے سامنے پیش ہو تو تم اس کو اچھی طرح سمجھ لو، اس لیے کہ اس حق کے اظہار کا کوئی فائدہ نہیں جس کا نفاذ نہ ہو۔

اپنی مجلس اور لوگوں کی طرف توجہ میں لوگوں کے درمیان برابری اور مساوات قائم رکھو تا کہ کوئی بااثر آدمی یہ غلط امید نہ رکھے کہ تم سے کسی کے خلاف کوئی زیادتی کرالے گا اور کوئی کمزور شخص اس سے مایوس نہ ہو کہ اس کو تمہارے ہاں سے عدل وانصاف ملے گا اور اسی طرح کمزور شخص تمہاری سختی سے خوف زدہ نہ ہو۔

ثبوت پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور جو دعوی کے صحت کا منکر ہو وہ قسم کھائے گا، لوگوں (مسلمانوں) کے درمیان ہر قسم کی صلح، مصالحت اور راضی نامہ جائز ہے، سوائے ایسی صلح کے جس کسی حرام کو حلال کیا جائے اور کسی حلال کو حرام کیا جائے۔

اگر تم نے کل کوئی فیصلہ کیا ہے اور آج تم نے اس پر دوبارہ غور وفکر کیا ہے اور تم کو راہ راست کی طرف رہنمائی حاصل ہوگئی ہے تو محض یہ بات کہ تم کل ایک فیصلہ کر چکے ہو، تمہیں ہرگز ہرگز حق کی رجوع کرنے سے باز نہ رکھے، اس لیے کہ یاد رکھو کہ حق اٹل حقیقت ہے اس کو کوئی دوسری چیز باطل نہیں ٹھہرا سکتی اور یاد رکھو کہ باطل پر اڑے رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ حق کی طرف رجوع کرلیا جائے۔

جن معاملات میں قرآن وسنت کی کوئی ہدایت موجود نہیں اور وہ تمہارے دل میں کھٹکتے ہیں ان کے بارے میں خوب غور وفکر اور سمجھ بوجھ سے کام لو، ایسے نئے نئے مسائل حل کرنے کے لیے تم پہلے قرآن وسنت میں موجود ملتے جلتے مسائل اور اصولوں سے واقفیت حاصل کرو اور پھر نئے معاملات کو ان اصولوں پر قیاس کرلو، اس کے بعد جو حل تمہاری رائے میں اللہ کو زیادہ محبوب اور اس کی مرضی سے زیادہ قریب اور حق سے زیادہ مشابہ معلوم ہو اس کو اختیار کرلو۔

جو شخص تمہارے سامنے یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس اپنے موقف کی تائید میں کوئی حق بات موجود ہے جو اس وقت وہ پیش کرنے سے قاصر ہے تو اس کو اتنی مہلت دو کہ وہ اس بات کو پیش کرسکے، اس مہلت کے اندر اندر اگر وہ کوئی ثبوت لے آیا تو وہ اس کی بنیاد پر اپنا حق لے لے گا، ورنہ بصورت دیگر تمہارے لیے جائز ہوگا کہ تم اس کے خلاف فیصلہ دے دو، اس لیے کہ ایسا کرنے سے اس کو کوئی عذر پیش کرنے کا موقع نہ ملے گا اور اس

کی بے بصیرتی اس پر واضح ہو جائے گی۔

مسلمان سب کے سب عادل ہیں، اور ایک کی گواہی دوسرے کے خلاف قابل قبول ہے، سوائے اس شخص کے جس کو کوئی سزائے حد دی گئی ہو، یا اس کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہو کہ وہ جھوٹی گواہی دیتا ہے، یا اس (کی جانب داری) کے بارے میں اس وجہ سے بدگمانی کی جارہی ہو کہ وہ صاحب معاملہ کا (جس کے حق میں گواہی دے رہا ہے) کوئی رشتہ دار یا تعلق دار ہے۔

جہاں تک (گواہی کے معاملہ میں) لوگوں کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی باتوں کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی ہے، اب تمہاری ذمہ داری صرف یہ ہے کہ پیش کردہ ثبوت کی بنیاد پر فیصلہ کرو، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حدود سے بچالیا ہے کہ سوائے واضح اور مضبوط ثبوت یا قسم کے حد جاری نہیں ہوسکتی۔

فیصلہ کے وقت غصہ سے پرہیز لازم ہے، تنگ دلی اور پریشانی سے بچو، لوگوں کی مقدمہ بازی سے اکتاہٹ اور تکلیف محسوس نہ کرو، اس لیے کہ یہی وہ مواقع ہیں جہاں تمہیں حق نافذ کرنا ہے، یہ کام تمہارے لیے اللہ کے ہاں اجر کا موجب اور آخرت میں بہترین ذخیرہ کا سبب بنے گا، جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان حق کے معاملہ میں نیت کو صاف اور خالص کر لیتا ہے، چاہے اس کا نتیجہ اس کے اپنے ہی خلاف پڑ رہا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملات کو بھی صاف اور خالص کر دیتے ہیں، لیکن اس کے برعکس اگر کوئی شخص دنیا کے سامنے خود کو اس

طرح مزین کر کے پیش کرے گا کہ اصل حقیقت جس کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اس سے مختلف ہو، تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ رسوا کرے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف وہی عبادت قبول کرتا ہے جو اسی کے لیے خالص ہو، تو بتاؤ، تمہارا کیا خیال ہے اس اجر وثواب کے بارے میں جو اللہ تعالیٰ نے دنیاوی رزق اپنی رحمت کے خزانوں کے شکل میں اپنے بندوں کے لیے متعین کیا ہے؟

والسلام علیکم۔"

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نام)۔

"أما بعد!

فإنني كتبت كتابا في القضاء ما لم آلك ونفسي فيه خيرا، ألزم خمس خصال، يسلم لك دينك، وتأخذ فيه بأفضل حظك:

١ – إذا تقدم إليك الخصمان فعليك بالبينة العادلة واليمين القاطعة.

٢ – وأدن الضعيف حتى يشتد قلبه وينبسط لسانه.

٣ – وتعاهد الغريب، فإن لم تعاهده ترك حقه ورجع إلى أهله.

٤ – فربما ضيع حقه من لم يرفع به رأسه.

٥ – وعليك بالصلح بين الناس ما لم يستبن لك فصل القضاء."(١)

(١) مبسوط سرخسی ٦٦/١٦

''امابعد!

میں نے اس سے قبل بھی تمہیں ایک خط لکھا تھا، جس میں میں نے اپنے اور تمہاری بھلائی کی باتیں لکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، اب تم پانچ باتوں پر مضبوطی سے جمے رہو، اس میں تمہارا دین بھی سلامت رہے گا اور تم اپنے نصیب کا بہترین حصہ بھی حاصل کرسکو گے:

۱- جب فریقین تمہارے سامنے پیش ہوں، تو تم صرف عادلانہ ثبوت اور پختہ قسم ہی کی بنیاد پر فیصلہ کرو۔

۲- کمزور کو قریب آنے کا موقع دو، تاکہ اس کا دل مضبوط ہو اور اس کی زبان کھلے۔

۳- پردیسی کا خیال رکھو، اس لیے کہ اگر تم اس کا خیال نہ رکھو گے تو اپنا حق چھوڑ کر اپنے گھر چلا جائے گا۔

۴- اس لیے کہ جو شخص پردیسی اور کمزور شخص کی ہمت افزائی نہیں کرے گا وہ اس کے حق کو ضائع کردے گا۔

۵- جب تک فیصلہ پورے طور پر واضح ہو کر سامنے نہ آجائے، اس وقت تک مصالحت کرانے کی کوشش کرتے رہو۔''

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خط قاضی شریح رضی اللہ عنہ کے نام)۔

"لا تشار ولا تمار ولا تبع ولا تبتع فی مجلس القضاء، ولا تقض بین اثنین وأنت غضبان."(۱)

''عدالت کے اندر:

۱- نہ تو کسی سے جھگڑا کرو۔

---

(۱) البیان المبین ۲/۷۵ بحوالہ جمہرۃ رسائل العرب، احمد ذکی صفوت ۱/۲۸۱

۲- نہ بلا وجہ بحث ومباحثہ کرو۔

۳- نہ خرید وفروخت کرو۔

۴- اور نہ ہی غصہ کی حالت میں کبھی دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرو۔"

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا طریقۂ استخلاف اور بعض اشارات وہدایات

چونکہ خلافت راشدہ ظاہر و باطن اور شریعت وطریقت دونوں میں نیابت نبوت کی حیثیت رکھتی تھی، اس لیے حضرات خلفائے راشدین علاقوں اور مقامات میں اپنا نمائندہ بھیجنے میں نائب کو اوصاف خلیفہ سے متصف دیکھنا چاہتے تھے، اور خلافت عظمیٰ کے لیے جس کی حیثیت جانشین کی تھی اسی کو ترجیح وفوقیت دی، جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ اعتماد اور دربار رسالت سے زیادہ قرب و اختصاص اور ایمانی فراست اور تفقہ فی الدین کے ساتھ لوگوں کے معاملات میں باریک بین اور عدل وقسط میں ممتاز پایا، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نگاہ میں زمانہ کے حالات اور خلیفہ کے اوصاف میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کوئی نہ تھا، اس لیے ان ہی کو طے کر دیا، اور اسی پر اجماع امت رہا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس جماعت میں سے نام تجویز کیے جنہیں زبان نبوت سب پر فائق قرار دے چکی تھی، اور ان میں جس کے اندر کوئی وصف زیادہ پایا، اس کے نام کو مقدم رکھا، لیکن فیصلہ شوریٰ کے حوالہ کر دیا، وہ شوریٰ جو خود انھوں نے نامزد کی تھی، اور کسی کے متعلق ان کے کسی اقدام سے جو کسی مصلحت سے کیا گیا تھا غلط فہمی کا امکان پایا جاتا، اس کا بھی ازالہ کیا اور بطور مشاہد ایک نام اپنے لائق رکن خاندان بلکہ خاندان میں جانشین اور نہایت معتمد علیہ فرزند حضرت عبداللہ بن

عمر رضی اللہ عنہ کا اضافہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی جانشینی کے تعلق سے ان حالات میں وصیت کرنی پڑی جب وہ زخموں سے چور مرض الموت میں تھے، لیکن دل ودماغ اور قویٰ پورے حاضر تھے، موجود متعلقین نے یہ عرض کیا:

"أوص يا أمير المؤمنين، استخلف"

(اے امیر المومنین وصیت فرمادیجیے، خلیفہ نامزد کردیجیے)۔

اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ نہیں دیا، کچھ بعد والوں کے لیے رکھا اور کچھ کا پابند کیا، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طریقہ دونوں کی رعایت رکھی، صحیح بخاری کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"قال: ما أحد أحق بهذا الأمر من هؤلاء النفر أو الرهط الذين توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو عنهم راض، فسمّى علياً، وعثمان، والزبير، وطلحة، وسعداً، وعبد الرحمن بن عوف، وقال: يشهدكم عبد الله بن عمر وليس له من الأمر شيئ، -كهيئة التعزية له- فإن أصابت الإمرة سعدا فهو ذاك، وإلا فليستعن به أيكم ما أمّر فإني لم أعزله من عجز ولا خيانة."(۱)

(میں اس امر خلافت کا حقدار ان لوگوں کو زیادہ سمجھتا ہوں، جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے خوش ہوکر گئے، پھر (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے) حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت زبیر، حضرت طلحہ، حضرت سعد اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہم کے نام لیے، اور فرمایا عبداللہ بن عمر تم لوگوں

---

(۱) الجامع الصحيح للإمام البخاري بحاشية المحدث السهارنفوري تحقيق الدكتور تقي الدين الندوي، كتاب فضائل الصحابة باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان رضي الله عنه ۷/۴۵۵-۴۵۶

کے ساتھ رہیں گے، ان کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں - البتہ ان کی دلجوئی کے لیے ہے- اگر سعد (بن ابی وقاص) کو امارت ملتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جو امیر ہو وہ ان کو نظر انداز نہ کرے، میں نے ان کو کسی معذوری اور خیانت کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا)۔

مدائنی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان حضرات سے یہ بھی فرمایا تھا کہ اس صورت میں جب تین ہم رائے ہو جائیں اور تین ہم رائے ہوں تو عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو حکم بنالیا جائے، اور جب اس صورت پر عمل نہ ہو سکے تو جن کے ساتھ سعد اور عبدالرحمٰن بن عوف ہوں تو ان کو فوقیت دی جائے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ اشارہ بھی دیا جیسا کہ مدائنی کا اضافہ ہے، فرمایا:

"وما أظن أن يلى هذا الأمر إلا عليّ أو عثمان، فإن ولّى عثمان فرجل فيه لين، وإن ولى عليّ فستختلف عليه الناس."(۱)

(لگتا ہے کہ اس بار خلافت کے امین علی یا عثمان ہوں گے، اگر عثمان ہوتے ہیں تو وہ ایک نرم خو شخص ہیں، اور اگر علی ہوئے تو لوگ ان پر جمع نہیں ہو پائیں گے)۔

ہدایات اور وصیتیں

خلفائے راشدین جو خود خلافت کے شرائط پر پورے اترنے والے اور خلیفہ کے اوصاف کے جامع اور اپنے اپنے وقت کے مرشد امت اور اتالیق امت تھے،

---

(۱) الجامع الصحيح للإمام البخاري بحاشية المحدث السهارنفوري تحقيق الدكتور تقي الدين الندوي، كتاب فضائل الصحابة باب قصة البيعة والاتفاق على عثمان رضي الله عنه ۷/۴۵۵-۴۵۶

انھوں نے اپنی نیابت اور مقامی خلافت کے لیے جن لوگوں کا انتخاب کیا ان میں وہ انتظامی اوصاف کے ساتھ ارشاد و ہدایت اور تربیت و تعلیم کا سلیقہ بھی دیکھتے تھے، مولانا شبلی نعمانی علیہ الرحمہ کی تحقیق ہے کہ:

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس بات کا سخت اہتمام تھا کہ عاملوں کے جو فرائض ہیں، ایک ایک ان سے واقف ہو جائے، چنانچہ بارہا مختلف مقامات اور مختلف موقعوں پر اس کے متعلق خطبے دیئے، ایک خطبہ میں جو مجمع عام میں دیا تھا، عاملوں کو مخاطب کر کے یہ الفاظ فرمائے:

"ألا وإني لم أبعثكم أمراء ولا جبارين ولكن بعثتكم أئمة الهدى، يهتدى بكم، فأدوا على المسلمين حقوقهم ولا تضربوهم فتذلوهم ولا تحمدوهم فتفتنوهم، ولا تغلقوا الأبواب دونهم، فيأكل قويهم ضعيفهم ولا تستأثروا عليهم فتظلموهم."(١)

(یاد رکھو کہ میں نے تم لوگوں کو امیر اور سخت گیر مقرر کر کے نہیں بھیجا ہے کہ لوگ تمہاری تقلید کریں، تم لوگ مسلمانوں کے حقوق ادا کرو، ان زدوکوب نہ کرو کہ غلطی میں پڑیں، ان کے لیے اپنے دروازے نہ بند رکھو کہ زبردست کمزوروں کو کھا جائیں، ان سے کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہ دو کہ یہ ان پر ظلم کرنا ہے)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی احتیاط کا عالم یہ بھی تھا کہ وہ صحابہ مہاجر و انصار سے مشورہ بھی کرتے اور ان کو اپنے ان فیصلوں پر گواہ بناتے، اور عامل سے یہ عہد لیتے کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا،

---

(١) كتاب الخراج/٦٦

باریک کپڑا نہ پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا، دروازے پر دربان نہ رکھے گا، اہل حاجت کے لیے دروازہ ہمیشہ کھلا رکھے گا۔(۱)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے جانشین کے لیے جو وصیت فرمائی، وہ یہ تھی، انھوں نے فرمایا:

"أوصی الخلیفة من بعدی بالمهاجرین الأولین أن یعرف لهم حقهم ویحفظ لهم حرمتهم، وأوصیه بالأنصار خیرا، الذین تبوؤا الدار والإیمان من قبلهم، أن یقبل من محسنهم، وأن یعفی عن مسیئهم، وأصیه بأهل الأمصار خیرا، فإنهم ردء الإسلام، وجباة المال، وغیظ العدو، وأن لا یؤخذ منهم إلا فضلهم عن رضاهم، وأوصیه بالأعراب خیرا، فإنهم أصل العرب ومادة الإسلام، أن یؤخذ من حواشی أموالهم وترد علی فقرائهم، وأوصیه بذمة الله وذمة رسوله صلی الله علیه وسلم أن یوفی لهم بعهدهم، وأن یقاتل من ورائهم ولا یکلفوا إلا طاقتهم."(۲)

(میں اپنے بعد خلیفہ کو مہاجرین اولین کے تعلق سے وصیت کرتا ہوں کہ وہ ان کے حقوق کا پاس رکھے، اوران کی عزت وناموس کا خیال رکھے، اورانصار کے تعلق سے بھی حسن سلوک کی وصیت کرتا ہوں، جو پہلے سے ایمان کے ساتھ یہاں مقیم ہیں، ان میں جو اچھا برتاؤ رکھے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جائے اور

---

(۱) الفاروق۲/۲۹

(۱) الجامع الصحیح للإمام البخاری بحاشیة المحدث السهارنفوری تحقیق الدکتور تقی الدین الندوی، کتاب فضائل الصحابة باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان رضی الله عنه ۷/۴۵۷-۴۵۸

جس کی طرف سے اچھی روش نہ ہو اس سے درگذر کیا جائے)۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی ان ہدایات میں امت اور انسانیت کے لیے کتنی خیر خواہی کا سامان ہے، کافر حربی ہو یا ذمی، چہ جائیکہ مسلمان مہاجرین و انصار اور دیگر تمام مسلمان سبھی کے حقوق کا پورا خیال رکھا گیا، شہر اور گاؤں سبھی کے لوگوں کی رعایت ہے، اور اسی میں یہ لطیف اشارہ اور اس بات کی طرف کھلا ایماء نظر آتا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے جو ان سب باتوں کا خیال رکھ سکے، چنانچہ اہل شوریٰ میں بعض حضرات اپنے حق سے دست بردار ہو گئے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ دو کے ثالث بنے اور باہمی مشورہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ترجیح حاصل ہوئی، اور انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔

خدمات کا اجمالی تذکرہ

مولانا شبلی نعمانی علیہ الرحمہ اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''الفاروق'' کا اختتام کرتے ہیں تو اس میں ان کی تمام خدمات جلیہ وخفیہ اور نوع بہ نوع اوصاف وکمالات کا خلاصہ پیش کر دیتے ہیں، وہ اختتامیہ اس طرح ہے:

> ''تمام دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا حکمراں دکھا سکتے ہو جس کی معاشرت یہ ہو کہ قمیص میں دس دس پیوند لگے ہوں، جو کاندھے پر مشک رکھ کر غریب عورتوں کے یہاں پانی بھر آتا ہو، فرش خاک پر پڑا رہتا ہو، بازاروں میں پڑا پھرتا ہو، جہاں جاتا ہو جریدہ وتنہا چلا جاتا ہو، اونٹوں کے بدن پر اپنے ہاتھ سے تیل ملتا ہو، دربار نقیب وچاؤش، حشم وخدم کے نام سے آشنا نہ ہوں، اور پھر یہ رعب و داب ہو کہ عرب و عجم اس کے نام سے لرزتے ہوں، اور جس طرف رخ کرتا ہو، زمین دہل جاتی ہو، سکندر و

تیمور تیس تیس ہزار فوج رکاب میں لے کر نکلتے تھے، تب ان کا رعب قائم ہوتا تھا، عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سفر شام میں سواری کے ایک اونٹ کے سوا اور کچھ نہ تھا، لیکن چاروں طرف غل پڑا ہوا تھا کہ مرکز عالم جنبش میں آ گیا ہے۔

اب علمی حیثیت پر نظر ڈالو، صحابہ میں سے جن لوگوں نے خاص اس کام کو لیا تھا اور رات دن اسی شغل میں بسر کرتے تھے مثلاً عبداللہ بن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم، ان کے مسائل اور اجتہادات کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مسائل اور اجتہادات سے موازنہ کرو، صاف مجتہد و مقلد کا فرق نظر آئے گا، زمانہ مابعد میں اسلامی علوم نے بے انتہا ترقی کی، اور بڑے بڑے مجتہد اور ائمہ فن پیدا ہوئے، مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام بخاریؒ، غزالیؒ و رازیؒ، لیکن انصاف سے دیکھو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس باب میں جو کچھ ارشاد کیا اس پر کچھ اضافہ ہو سکا؟

مسئلہ قضا و قدر، تعظیم شعائر اللہ، حیثیت نبوت، احکام شریعت عقلی یا نقلی ہونا، احادیث کا درجہ اعتبار، خبر آحاد کی قابلیت، احتجاج، احکام خمس و غنیمت، یہ مسائل شروع اسلام سے آج تک معرکۃ الآراء ہیں اور ائمہ فن نے ان کے متعلق ذہانت اور طباعی کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا ہے، لیکن انصاف کی نگاہ سے دیکھو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان مسائل کو جس طرح حل کیا تھا تحقیق کا ایک قدم ہی اس سے آگے بڑھ سکا، تمام ائمہ فن نے یا ان کی پیروی کی، یا انحراف کیا تو علانیہ غلطی کی۔

اخلاق کے لحاظ سے دیکھوتو انبیاء کے سوا اور کون شخص ان کا ہم پایہ مل سکتا ہے، زہد و قناعت، تواضع، انکسار، خاکساری اور سادگی، راستی وحق پرستی، صبر ورضا، شکر وتوکل، یہ اوصاف ان میں کمال کے ساتھ پائے جاتے تھے، کیا لقمان، ابراہیم ادہم، ابوبکر شبلی، معروف کرخی رحمہم اللہ میں اس سے بڑھ کر پائے جاسکتے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس خصوصیت یعنی جامعیت کونہایت خوبی سے بیان کیا ہے، اور ہم اسی پر اپنی کتاب ختم کرتے ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں:

"سینۂ فاروق اعظم را بمنزلۂ خانہ تصور کن کہ درہائے مختلف دارد، در ہر درے صاحب کمالے نشستہ، در یک در مثلاً سکندر، ذوالقرنین، باآںہمہ سلیقہ ملک گیری، و جہاں ستانی وجمع جیوش و برہم زدن اعداء ودر دیگر نوشیراونے باآں ہمہ رفق ولین ورعیت پروری وداد گستری (اگر چہ ذکر نوشیروان درمبحث فضائل حضرت فاروق سوء ادب است) و در در دیگر امام ابوحنیفہ یا امام مالکے باآں ہمہ قیام بہ علم فتوی واحکام، ودر در دیگر مرشدے مثل سیدی عبدالقادر جیلانی یا خواجہ بہاء الدین، ودر در دیگر محدثے بروزن ابوہریرہؓ وابن عمرؓ، ودر در دیگر حکیمے مانند مولانا جلال الدین رومی یا شیخ فریدالدین عطار، ومردان گرداگرد ایں خانہ ایستادہ اندر، وہر محتاجے حاجت خودرااز صاحب فن درخواست می نماید وکامیاب می گردد۔"(۱)

---

(۱) اختتامیہ الفاروق از علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ

شہادت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک انصاف کے نتیجہ میں مجوسی غلام ابولولو جو حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کا تھا اور ان کی ناحق شکایت لایا تھا) نے عین اس حالت میں جب مسجد نبوی میں صفیں بندھ چکی تھیں، اور اقامت کے بعد نماز بھی شروع ہوگئی تھی، اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر وار کیا، اور پھر صفوں کو چیرتا ہوا دودھاری چاقو سے دائیں بائیں حملہ کرتے ہوئے باہر بڑھا، تیرہ نمازی زخمی ہوئے، اور سات ایسے شدید زخمی ہوئے کہ وہ شہید ہوگئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تین روز بعد زخموں کی تاب نہ لاکر خلعت شہادت میں ملبوس ہوئے، اور قاتل جیسے گرفت میں آیا، قصاص سے بچنے کے لیے خودکشی کر بیٹھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اللہ نے جو ایمانی استقامت عطا فرمائی وہ یہاں پھر جلوہ گر ہوئی، گو وہ شدید زخمی تھے، ہوش وحواس پوری طرح بیدار تھے، امت کی اجتماعیت اور نماز کی جماعت کا اس قدر خیال کہ اس حالت میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر (جو ان کے پیچھے ہی تھے) امامت کے لیے آگے کر دیا، مختصر نماز پڑھائی، نماز جب ہو چکی تو اہل مسجد واقعہ کی سنگینی سمجھ سکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ فکر اس کی تھی کہ یہ واقعہ کسی مسلمان کے ہاتھوں نہ ہوا ہو، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پہلی بات یہی کہی کہ یہ پتہ لگاؤ کون قاتل ہے؟ انھوں نے تحقیقات کے بعد عرض کیا کہ مغیرہ کا غلام، فرمایا: وہی مستری؟ کہا: ہاں۔ اس پر بس اتنا کہا "قاتله الله لقد أمرت به معروفا" (خدا غارت کرے، میں نے تو اسے اچھی بات کا حکم دیا تھا) اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ:

"الحمد لله الذی لم یجعل میتتی بید رجل یدعی الإسلام."

(اللہ کا شکر ہے کہ میری موت کسی مدعی اسلام کے ہاتھوں سے

نہیں ہوئی)۔

اسی مرض وفات میں کچھ نصیحتیں فرمائیں، جن کے ایمان کا اعتبار نہیں لیکن وہ ہم زبان، ہم جماعت ہیں اور حج میں بھی شریک ہیں ان کے قتل سے منع فرمایا، ایک مسلمان نوجوان نے آکر تسلی کی باتیں کہنی شروع کیں اور کہا کہ آپ کو تو اسلام میں سبقت حاصل ہوئی، آپ امام عادل رہے، پھر شہادت سے بھی سرفراز ہو رہے ہیں، سب سن کر اتنا فرمایا:

"وددت أن ذلك كفافا لا عليّ ولا لي."

(مجھے پسند ہوگا کہ بات برابر سرابر ہو جائے)۔

ادھر آپ کی نظر ان کے ازار پر پڑی کہ زمین سے چھو رہا ہے، فرمایا: لڑکے کو بلاؤ تو، اور اس کو نصیحت کی:

"يا ابن أخي! ارفع ثوبك فإنه أنقى لثوبك وأتقى لربك."

(اے برادرزادے! ازار کو اوپر کرو، یہ تمہارے لباس کی پاکی اور تمہارے لیے پاس ولحاظ کی بات ہے)۔

ادھر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ذاتی مالیات کا حساب کرنے کو کہا تا کہ قرض وغیرہ ہو تو اس کی ادائیگی فوراً کر دی جائے، اور ادائیگی قرض کے لیے قرض لینے کے لیے افراد خانہ یعنی آل عمر ورنہ خاندان (بنو عدی) ورنہ آخری صورت میں قبیلہ یعنی قریش کو اجازت دی، قرض کی یہ رقم ۸۶ ہزار بن رہی تھی جسے جلد از جلد بیت المال میں جمع کرنے کو کہا۔

اس کے بعد صاحبزادہ گرامی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہونے کو کہا، اور یہ کہا کہ یہ کہنا کہ:

"عمر سلام عرض کر رہا ہے، امیر المومنین نہ کہنا کہ میں اب

امیر المومنین نہیں رہا، اور عرض کرنا کہ عمر بن الخطاب اپنے دونوں
بزرگوں کے پاس رہنا چاہتا ہے۔"

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کمال ایثار وتواضع ملاحظہ ہو، خوشی خوشی اجازت دی بس اتنا کہا کہ:

"لقد أريده لنفسي ولأوثرن به اليوم على نفسي."
(میں اپنے لیے یہ جگہ چاہتی تھی، البتہ اب ایثار سے کام لوں گی)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے واپس آکر ابا جان کو یہ خوشخبری سنائی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں سنت نبوی کا احترام اس قدر تھا کہ لیٹے لیٹے خوشخبری سننا پسند نہ فرمایا اور سہارا لے کر بیٹھ گئے اور الحمدللہ کہا، مزید یہ فرمایا:

"ما كان شيء أهم إلي من ذلك."
(اس وقت اس سے زیادہ مہتم بالشان کوئی دوسری بات میرے لیے نہیں تھی)۔

احتیاط اور ورع اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ خیال کہ مروت میں اجازت نہ ہو، اس لیے فرمایا کہ:

"روح پرواز کر جانے کے بعد تدفین سے پہلے میرا (ام المومنین کو) سلام کہنا پھر اجازت طلب کرنا، اجازت ملنے پر وہاں دفن کرنا، نہیں تو مسلمانوں کے عام مقبرے (جنت البقیع) میں تدفین عمل میں لانا۔(۱)

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا، اور اجازت ملنے پر روضۂ اقدس میں آسودۂ خاک ہوئے اور وصیت کے مطابق حضرت صہیب رومی سے نماز جنازہ پڑھوائی۔

---

(۱) ملاحظہ ہو، صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب قتل عمر بن الخطاب برِوایت حضرت عمرو بن میمون۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر خشیت بہت طاری رہتی تھی، انتقال کے قریب جب وہ زخموں سے چور تھے اور علاج سے مایوسی تھی تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کرب محسوس کر کے تسلی کے کلمات کہے، جیسا کہ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا:

"لقد صحبت رسول الله صلى الله عليه وسلم فأحسنت صحبته ثم فارقت وهو عنك راض ثم صحبت أبا بكر فأحسنت صحبته ثم فارقت وهو عنك راض، ثم صحبت صحبتهم فأحسنت صحبتهم، ولئن فارقتهم لتفارقنهم وهم عنك راضون."

(آپ نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اچھی طرح صحبت و رفاقت اٹھائی، پر آپ جدا ہوئے اور وہ آپ سے خوش تھے، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی صحبت اٹھائی اور اچھی طرح اٹھائی، پھر آپ جدا ہوئے اور وہ آپ سے خوش تھے)۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو بات کہ وہ ان کے تعلق مع اللہ، اور اس کے ساتھ حقوق العباد اور حقوق الرعیۃ کے خیال اور اس سلسلہ میں جوابدہی اور آخرت کی فکر اور رجاء و خشیت کو جمع کرنے کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے، اور ان کے اس مقام بلند کو واضح کرتی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد پوری امت میں ان کا نظر آتا ہے، انھوں نے جواب دیا۔

"أما ما ذكرت من صحبة رسول الله صلى الله عليه وسلم ورضاه، فإنما ذاك منّ من الله جل ذكره منّ به عليّ، وأما ما ذكرت من صحبة أبي بكر ورضاه فإنما ذاك منّ من الله جل ذكره منّ به عليّ، وأما ما ترى بي

من جزعي فهو من أجلك و من أجل أصحابك."(١)

(جہاں تک تم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت اور آپ کی خوشنودی کا ذکر کیا تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے احسان ہے جو اس نے مجھ پر کیا، اور جہاں تک تم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صحبت و رفاقت کا ذکر کیا تو یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا مجھ پر احسان ہے جو اس نے مجھ پر کیا، اور جہاں تک تم مجھ پر خشیت اور خوف کا حال دیکھ رہے ہو تو یہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی وجہ سے ہے)۔

شانِ محدثیت وفاروقیت

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو نور نبوت اور علم نبوت کا جو حصہ ملا تھا اس نے ان کو شان محدثیت عطا کر دی تھی، بس یہ کہ وحی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا اور جب تک وحی کا سلسلہ جاری تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی وحی اترتی تھی اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق لوگ مستفید ہوتے تھے، لیکن جو باطنی صفائی اور قلب و نفس کی پاکیزگی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ملی تھی اس نے آپ کو معصوم تو نہیں بنادیا تھا البتہ نائب المعصوم ضرور کر دیا تھا، شیطان آپ سے بھاگتا تھا اور کشف صادق و فراست صادقہ کی جو دولت آپ کو عطا ہوئی تھی اس نے آپ کو محدث ملہم بنادیا تھا، جس کی وضاحت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پوری طرح کر دیتی ہے جو صحیح بخاری میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لقد كان فيمن كان قبلكم من بني إسرائيل رجال يكلمون من غير أن يكونوا أنبياء، فإن يكن من أمتي منهم أحد فعمر."(٢)

(١) کتاب فضائل الصحابة باب مناقب عمر بن الخطابؓ رقم الحدیث/٣٦٩٢۔ (٢) رقم الحدیث:٣٦٨٩

اور ایک جگہ محدثون کا لفظ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"لقد كان فيما قبلكم من الأمم محدثون، فإن يك في أمتي أحد فإنه عمر. (۱)

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لو كان بعدى نبياً لكان عمر بن الخطاب."(۲)

یہ روایات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقامات سلوک کو واضح کرتی ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کو بعض مقامات سے بشارت دی تھی جیسے مقام صدیقیت، مقام محدثیت، مقام شہید اور حواری ورفیق وغیرہ، حدیث نبوی سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام بالکل واضح ہوجاتا ہے اور تصوف واحسان میں ان کا پایہ ایک عظیم مربی بلکہ اتالیق امت کا ہے، ایک طرف ان سے کھلی کرامتیں صادر ہوئیں، ان کے فرمودات کی وحی سے مطابقت ہوئی اور دوسری طرف تربیت مریدین میں ان کی امتیازی شان ظاہر ہوئی، حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بڑی بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے کہ:

"وقد أظهر عمر بن الخطاب رضى الله عنه كل ذلك قولا و فعلا وبلغ إلى أعلى درجات هذا الفن وإنه لأعلم الأمة بعلم الإحسان، قام بتربية أمة محمد صلى الله عليه وسلم بعده، صحابةً كانوا أو تابعين، وأفاد الناس كلهم، الغائبين والحاضرين، فإنه أرشد الحاضرين خطاباً، و قام بتربية الغائبين كتاباً."(۳)

---

(۱) صحیح بخاری ومسلم عن أبی ہریرۃ وعائشہ رضی اللہ عنہما۔
(۲) سنن ترمذی ومسند احمد۔
(۳) ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۹/۴

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے (دین وشریعت کی) ہر بات کو کہہ کر اور عمل کر کے واضح کر دیا اور وہ اس فن احسان وسلوک کے اعلیٰ مقامات کو طے کرتے گئے، اور علم معرفت و احسان میں امت کے سب سے بڑے عالم و عارف ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اتالیق تھے، صحابہ ہوں یا تابعین سب کی تربیت فرمائی، اور (اس وقت) امت کے موجود افراد اور (بعد کے) غیر موجود افراد کو (ظاہری و باطنی) فائدہ پہنچایا، جو مود تھے ان کو بالمشافہ اور جو موجود نہیں تھے ان کو تحریر و پیغام کے ذریعہ دینی و ایمانی نفع پہنچایا)۔

اقوال وملفوظات

امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کلام میں ''اللہ اکبر'' زیادہ ہوتا تھا۔(۱)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا کرتے کہ:

"اللهم إني أستغفرك لظلمي و كفري." ان سے عرض کیا گیا کہ "هـذا الظلم فما بال الكفر؟" کہ ظلم کی حد تک تو بات ٹھیک تھی لیکن کفر کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آیت ﴿إِنَّ الإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ تلاوت کی۔''(۲)

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"لا حظ في الإسلام لمن ترك الصلوٰة."

(تارک صلوٰۃ کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں)۔(۳)

---

(۱) ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۴/۱۹ بحوالہ الریاض النضرۃ

(۲) ایضاً ۴/۱۸۔ (۳) ایضاً ۴/۱۸

بیت اللہ کی حاضری کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ملفوظ ہے:

”من أتی هذا البیت لا یرید إلا إیاه فطاف به طوافاً، خرج من ذنوبه كیوم ولدته أمه.“

(جو بیت اللہ میں صرف اسی کے ارادہ سے حاضری دے، پھر طواف کرے، وہ ایسا پاک ہوجاتا ہے جیسے ابھی اس کو اس کی ماں نے جنا ہے)۔(۱)

اور مکہ معظمہ کی حرمت کا ایسا پاس ولحاظ تھا کہ فرماتے:

”لأن أذنب سبعین ذنبا بركبة أحب إلی من أن أذنب ذنبا واحدا بمكة.“

(مجھے یہ گوارہ نہیں کہ مکہ میں ایک بھی لغزش ہو، خواہ رکبہ میں ستر لغزشیں ہوجائیں)۔(۲)

اور فرماتے تھے کہ ”دعا آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتی ہے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے۔“(۳)

اپنے ایک خطبہ میں انھوں نے فرمایا:

”تم میں جو طمع، خواہش نفس اور غصہ پر عمل سے محفوظ رہا وہ فلاح پاگیا۔“(۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے کہ:

”لو أن رجلا صام النهار، لا یفطر، وقام اللیل وتصدق

---

(۱) ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۴/۲۰

(۲) ایضا ۴/۲۰

(۳) ایضا ۴/۲۰

(۴) ایضا ۴/۲۱

وجاهد ولم يحب في الله ويبغض فيه، ما نفعه ذلك شيئا."(۱)

(ایک شخص دن کو روزہ رکھے اور مسلسل رکھے، رات کو نوافل پڑھے، صدقہ و خیرات کرے، جہاد کرے، مگر اللہ کی رضا کے لیے نیکوں سے محبت نہ کرے اور اللہ کی رضا کے لیے بروں سے نفرت نہ کرے تو اس کے یہ سب اعمال خیر اس کو کچھ فائدہ نہیں دیں گے)۔

اور فرماتے تھے کہ:

"رحم الله امرءا أهدى إلى أخيه عيوبه." (۲)

(اللہ اس شخص پر رحم فرمائے جو اپنے بھائی کو اس کی کمزوریوں سے باخبر کرے)۔

اور فرماتے تھے کہ:

''توبہ کرنے والوں کے ہم مجلس ہو، ان کے دل بڑے نرم ہوتے ہیں۔''(۳)

توبۃ النصوح کی تعریف اس طرح کرتے تھے کہ:

''توبۃ النصوح یہ ہے کہ بندہ برے کام سے توبہ کرنے کے بعد پھر کبھی اس کی طرف نہ جائے۔''(۴)

اور حضرت احنف بن قیس سے سوال کیا کہ بتاؤ لوگوں میں سب سے بڑا جاہل کون ہے؟ انھوں نے کہا جو اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے لیے بیچ دے۔ اس پر

---

(۱) ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۲۶/۴

(۲) ایضا ۲۷/۴

(۳) ایضا ۲۸/۴

(۴) ایضا ۲۸/۴

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

”میں تمہیں اس سے بھی بڑا جاہل نہ بتاؤں؟ یہ وہ ہے جو اپنی آخرت کو دوسرے کی دنیا کے لیے بیچ دے)۔(۱)

(۱) ازالۃ الخفاء از شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ۴/۲۸

باب ہشتم

سرگروہ اہل احسان واستقامت

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ

خاندان وقبیلہ

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نجیب الطرفین قریشی ہیں، قصی تک ان کا دادیہالی ونانیہالی خاندان اس طرح ہے:

دادیہالی: عثمان بن عفان بن ابی العاص بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔

نانیہالی: عثمان بن اروی بنت کریز بن ربیعہ بن حبیب بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔

فطرتِ سلیم

جب اسلام آیا بھی نہیں تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فطرت بڑی سلیم و مستقیم تھی، جاہلیت کی باتوں سے دور رہنے والے تھے، چنانچہ بے حیائی کے کاموں اور باتوں سے وہ بہت دور رہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رہنمائی سے ایمان لائے، اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ بن الجراح

رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے ایک دن قبل ایمان لائے۔

ہجرت میں وہ سب سے سبقت لے گئے، اپنی اہلیہ معظمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حبشہ ہجرت کی، اس وقت کفار و مشرکین مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کو بڑی ایذائیں پہنچا رہے تھے، دوسری بار مدینہ منورہ کی ہجرت کی۔

جہاد فرض ہونے کے بعد کبھی جہاد ترک نہیں کیا، صرف غزوہ بدر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کی وجہ سے جسمانی طور پر شرکت نہ کر سکے، البتہ روحانی طور پر اہل ایمان کے شریک حال رہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو شرکاء بدر کے برابر قرار دیا، فرمایا: "إن لك أجر رجل ممن شهد بدراً وسهمه." (کہ تمہارے لیے بھی شہداء بدر کے برابر اجر اور حصہ ہے)۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کے حسن سلوک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت خوش تھے، حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے نکاح کر دیا، اور جب ان کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری کئی لڑکیاں ہوتیں تو ایک کے بعد ایک کو عثمان کی زوجیت میں دے دیتا، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر میری چالیس لڑکیاں ہوتیں تو میں ایک کے بعد ایک کو عثمان کی زوجیت میں دے دیتا، یہاں تک کہ ان میں سے ایک بھی باقی نہ رہتی۔(۲)

واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس بات کا بہت زیادہ ملال تھا کہ

(۱) صحیح البخاری، رقم: ۴۰۶۶۔ (۲) ازالۃ الخفاء ۴/ ۲۵۷

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاجزادیوں کا انتقال ان کی زوجیت میں ہوا، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بڑی دلجوئی فرمائی اور اپنے خصوصی تعلق اور اعتماد کا اظہار فرما کر ان کو تسلی دی۔

خصوصی دعا اور جنت میں رفاقت کی بشارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مختلف موقعوں پر بڑی دعائیں دیتے، ایک بار خطبہ کے دوران دعا دی: "اللهم ارض عن عثمان بن عفان." (کہ بار الٰہا عثمان بن عفان کی سے راضی ہوجا)۔(۱)

اور ایک موقع پر یہ دعا دی:

"غفر الله لك يا عثمان ما قدّمت وما أخّرت وما أسررت وما أعلنت وما أخفيت وما أبديت وما هو كائن إلى يوم القيامة."(۲)

(اے عثمان! اللہ تمہاری خطاؤں کو معاف کرے جو پہلے ہوئی ہوں یا بعد میں، چھپ کر ہوئی ہوں یا کھل کر، رازداری میں ہوئی ہوں یا علانیہ، اور ان کو بھی جو قیامت تک صادر ہونے والی ہوں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو جنت میں مرافقت کی بشارت بھی دی، حاکم نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إنه ليس من نبي إلا وله رفيق من أمته معه في الجنة وإن عثمان رفيقي ومعي في الجنة."(۳)

(کہ ہر نبی کے ساتھ اس کی امت کا ایک رفیق جنت میں اس کے ساتھ ہوگا، اور عثمان میرے رفیق ہوں گے اور جنت میں

---

(۱) ازالۃ الخفاء ۴/۲۶۳۔ (۲) ایضاً۔ (۳) مستدرک ۳/۱۰۴۔

میرے ساتھ ہوں گے)۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نبی کے رفیق کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رفیق سے مراد وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیرت و عمل میں مشابہ ترین ہو، اس کے اعمال و اخلاق نبی کے اعمال و اخلاق سے مشابہ ہوں)۔(۱)

مقام و مرتبہ

سیدنا حضرت عثمان بن عفان اموی قرشی رضی اللہ عنہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد، جماعت صحابہ میں فضیلت و برتری میں تیسرے صحابی اور تیسرے خلیفۂ راشد، عظیم مہاجر اور مخیرّ غنی اور اسلامی حدود سلطنت کو وسعت و استحکام بخشنے والے امیر المؤمنین جن کا عہد خلافت نیابت نبوت میں سب سے طویل اور بعض حیثیتوں سے بڑا تابناک رہا، عفت وحیا کا یہ عالم تھا کہ ملائکہ بھی اس میں آپ کا خیال کرتے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی کپڑوں کو دراز کر لیتے، اور دوسرے صحابہ بھی لیٹے ہوتے تو ان کے لحاظ میں بیٹھ جاتے، جب جب اسلام اور مسلمانوں کی نصرت و حمایت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مالی ضرورت ہوئی تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے زیادہ سے زیادہ تعاون دیا، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نصرت و اعانت کی ترغیب دے رہے تھے تو یہی حضرت عثمان بن عفان اموی رضی اللہ عنہ نے مع پورے ساز و سامان کیساتھ ساڑھے نوسو اونٹوں سے مدد بہم پہنچائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت سنی اور مکرر سنی کہ:

"ما علیٰ عثمان ما عَمِلَ بعدَ هذه." (۲)

---

(۱) ازالۃ الخفاء ۴/۲۷۲۔

(۲) جامع الترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۵/ ۶۲۵

(عثمان (رضی اللہ عنہ) اپنے اس عمل اور اس مالی قربانی کے بعد
جو بھی کریں اس سے ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا)۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، پچاس گھوڑے بھی پیش کیے، اور ایک ہزار اشرفیاں مزید خدمت اقدس میں پیش کیں۔

مسند احمد کی روایت ہے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان اشرفیوں کو اپنی گود میں الٹ پلٹ رہے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا:

"ماضرّ عثمان ما عمل بعد اليوم" (۱)

(یعنی آج کے دن کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) جو کچھ بھی کریں
اس سے ان کو کوئی ضرر اور نقصان نہیں پہنچے گا)۔

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کی حیثیت سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ میں تھے، تو اپنے ایک ہاتھ کو ان کے ایک ہاتھ کا قائم مقام بنا کے بیعت لی، اس طرح اس غائبانہ بیعت کا نام ہی بیعت عثمانی پڑ گیا۔

بشارتِ شہادت در بشارتِ خلافت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کی بشارت کے ساتھ ساتھ شہادت کی بھی بشارت دی، ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: یا عثمان إنه لعل الله
يُقَمِّصُكَ قَميصاً فان أرادوكَ علىٰ خلعه فلا تخلعهُ لهم."(۲)

---

(۱) جامع الترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۵/۶۲۶۔
(۲) ایضاً ۵/۶۲۸

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک خاص قمیص پہنائے گا، تو اگر لوگ اس قمیص کو تم سے اتروانا چاہیں تو ان کے کہنے سے تم اس کو نہ اتارنا)۔

ایفائے عہد

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وصیت کو جان سے عزیز رکھا، اور واقعتاً اسی میں ان کا المناک واقعۂ شہادت پیش آیا، اور جس دن ان کے گھر کا ظالموں نے محاصرہ کیا تھا اور وہ شہید کئے گئے اسی روز حضرت ابوسہلہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی تھی کہ:

"انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قد عہد إلیّ عہداً فأنا صابرٌ علیہ." (۱)

(کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ایک عہد لیا تھا میں صبر کے ساتھ اسی پر قائم ہوں)۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی بھی پیشین گوئی فرمائی تھی:

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہ قال ذکر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فتنةً فقال یقتل ھذا فیھا مظلوماً لعثمان رضی اللّٰہ عنہ."(۲)

(حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک دن اپنے خطاب میں) ایک عظیم فتنہ

---

(۱) سنن ترمذی، باب فی مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۶۳۱/۵۔

(۲) ایضاً ۶۷۱/۵۔

کا ذکر فرمایا اور عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بندہ اس فتنہ میں مظلومیت کے ساتھ شہید ہوگا)۔

اس طرح شہید مظلوم کی تعبیر سب سے زیادہ کسی پر صادق آتی ہے تو وہ یہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہیں، جن کی مظلومانہ شہادت کی پیشین گوئی زبان نبوت نے کی تھی۔

ذوق عبادت اور زہد وقناعت

عبادت کا بڑا اہتمام کرتے، راتوں کو جاگتے، نوافل پڑھتے، باوضو رہتے، وضو کا بڑا اہتمام کرتے، روزانہ غسل کرتے لیکن پانی کے اسراف سے پرہیز کرتے، کثرت سے روزہ رکھتے۔

حاجت مندوں کی اعانت کے موقع پر خوب اعانت کرتے، غلاموں کو آزاد کرتے، خوب صلہ رحمی کرتے، اللہ کا بڑا خوف رکھتے تھے، خاص طور پر قبر کو یاد کر کے بہت روتے، لوگوں کو خوب اچھا کھلاتے پلاتے اور خود تیل اور سرکہ پر قناعت کرتے، کپڑے بھی کم قیمت کے پہنتے، انکساری بھی بہت تھی، چادر کو تکیہ بنا کر زمین پر لیٹ جاتے، کوئی آتا تو اس کے لیے بیٹھ جاتے، پھر کوئی آتا تو اس کے لیے بھی بیٹھ جاتے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"ولقد قتلوه وإنه لمن أوصلهم للرحم وأتقاهم لربه."(۱)
(لوگوں نے ایسے شخص کو شہید کرڈالا جو سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کے ڈرنے والا تھا)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔

دوسروں کی راحت کا اتنا خیال فرماتے کہ رات میں اٹھتے تو گھر کے کسی فرد یا خادم کو نہ اٹھاتے، خود ہی اپنا کام کر لیتے۔(۲)

---

(۱) ازالۃ الخفاء ۴/۲۶۶۔ (۲) ایضا ۴/۲۶۹۔

خلافت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ منتخب ہوئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ نام اپنی جانشینی کے لئے دیئے تھے کہ آپسی مشورہ سے ان میں سے کوئی ایک طے کرلیا جائے، اس طرح انہوں نے ان دونوں طریقوں پر عمل کیا، کہ خلیفہ کا تعین بھی کر دیا اور اپنے بعد والوں کے لئے بھی چھوڑ دیا، چنانچہ انہوں نے جن دو ناموں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اولیت دی تھی، اس اعتبار سے چھ رکنی کمیٹی کا جو حضرت عمرؓ نے مسئلہ استخلاف کے لئے بنائی تھی، ان دو ناموں پر اتفاق ہوگیا تھا، اور دونوں بزرگوں سے جب الگ لگ گفتگو ہوئی، تو ارباب حل وعقد اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ہی بیعت کرلیں، درحقیقت اس میں بھی حکمت خداوندی اور تقدیر ربانی کی کارفرمائی تھی، اور اس سے زیادہ بہتر بندوں کی عمروں اور احوال کو کون جاننے والا ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوگئے، اور ہاتف غیبی یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے بعد بھی رہنا ہے وہ بعد میں خلیفہ ہونگیں، سب سے پہلے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جو ثالث بنائے گئے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کی، اور پھر بیعت عامہ ہوئی، خلافت عثمانی کا فیصلہ تو ذی الحجہ ۲۳ھ کی آخری تاریخ کو ہوگیا تھا، یکم محرم الحرام ۲۴ھ کا آفتاب طلوع ہوا تو وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ساتھ طلوع ہوا تھا۔

خلافت کا اعلان ہوجانے کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے متعلق فرمایا:

"استخلفنا خير من بقي ولم نأله."(۱)

(ہم نے اس شخص کو خلیفہ بنایا ہے جو اب زندہ لوگوں میں سب سے بہتر ہے اور ہم نے اس میں تقصیر نہیں کی)۔

---

(۱) طبقات ابن سعد (۳/۶۳)، تاریخ دمشق لابن عساکر (۲۰۸)

بعض روایتوں میں الفاظ یوں ہیں:

"امّرنا خیر من بقیو لم نأل" (۱)

(روئے زمین پر بہترین شخص ہمارے امیر بنے ہیں)۔

طبری کے حوالہ سے مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ میں آپ کے پہلے خطبہ کی نصائح اس طرح لکھی ہیں:

"اے لوگو! تم سب دارِ مسافرت میں ہو، عمر کا جو حصہ باقی ہے بس اس کو پورا کرنے والے ہو اس لئے تم زیادہ سے زیادہ جو نیکی کر سکتے ہو اپنے مقررہ وقت سے پہلے اسے کر گزرو، بس یہ سمجھو کہ موت اب آئی یا جب آئی، بہر حال اسے آنا ضرور ہے۔

خوب سن لو! کہ دنیا کا تار و پور (تانا بانا) ہی مکر اور فریب سے تیار ہوا ہے، اس لئے دیکھو کہیں تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکہ نہ دے جائے، اور اللہ سے تم کو غافل نہ کر دے۔

لوگو! جو لوگ گزر گئے ہیں، ان سے عبرت حاصل کرو، اور ہاں سعی اور جد و جہد کرو، غفلت نہ برتو کیوں کہ تم سے غفلت نہ برتی جائیگی، کہاں ہیں وہ ارباب دنیا جنہوں نے دنیا کو آخرت پر ترجیح دی ہے، اسے آباد رکھا، اور اس سے ایک مدت تک بہرہ اندوز ہوئے، کیا دنیا نے ان کو اپنے اندر سے باہر نہ نکال پھینکا، تم دنیا کو اسی مقام پر رکھو، جس پر خدا نے اسے رکھا ہے، اور آخرت کی طلب کرو، اللہ نے دنیا کی جو چیز خیر ہے اس کی مثال اس طرح بیان کی ہے:

﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ﴾ الخ.

---

(۱) فضائل الصحابة لأحمد بن حنبل، فضائل عثمان بن عفانؓ، الحديث:۷٤٧، و تاريخ الخلفاء للسيوطي:١/١٢٢، وأخرجهٗ ابن سعد و الحاكم.

(اے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ لوگوں کو بتا دیجئے کہ دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی جیسی ہے جسے ہم آسمان سے نازل کرتے ہیں)۔"

خدمات اور کارنامے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"خلافت عثمانی کا ایک نہایت اہم کارنامہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں جن عظیم الشان فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نہ صرف یہ کہ ان فتوحات کو جاری رکھا، بلکہ ان میں توسیع کی جو فتوحات نامکمل رہ گئی تھیں انہیں مکمل کیا، جہاں کوئی بغاوت ہوئی اس کا فوراً تدارک کر کے، حکومت میں استحکام پیدا کیا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہمیشہ بحری جنگ کے خلاف رہے، چنانچہ عرفجہ بن ہرثمہ الازدی رضی اللہ عنہ نے ان کی لاعلمی میں عمان کی بحری جنگ کی، ان کو خبر ہوئی تو سخت ناراض ہوئے، اور عرفجہ کو سرزنش کی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہلے خلیفہ ہیں جنہوں نے سمندر میں لڑائی کا آغاز کیا، اور اسے کامیاب کر کے رہے۔

چنانچہ اسکندریہ کی دوبارہ فتح، کہ جو رومیوں کے زیر قبضہ آ گیا تھا، لیبیا اور ٹونس کی فتح، اندلس پر حملہ، جزیرہ قبرص کی فتح، جزیرہ رودس کی فتح، جزیرہ صقلیہ پر حملہ، رومیوں کے عظیم بحری حملہ کی ناکامی اور پسپائی، عراق وایران کی فتوحات، خراسان کی فتح، سیستان اور کابل کی فتح، آذر بائیجان اور آرمینیا پر فوج کشی،

ہندوستان کی طرف رخ، چنانچہ پہلا اسلامی قافلہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں بھروچ کے کنارے آیا۔"(۱)

واقعہ شہادت

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت نبوی معجزات میں سے ہے، اور جیسا کہ مولانا محمد منظور نعمانی علیہ الرحمہ نے حدیثی اشارات اور تاریخی حقائق کی روشنی میں تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نور قلب یعنی ربانی فراست سے اور بعض عینی اشارات سے یہ یقین ہوگیا تھا، کہ باغیوں بلوائیوں کا یہ فتنہ میری شہادت کا تکوینی انتظام ہے، جسکی پیشین گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر فرمائی تھی۔(۲)

شہادت کے روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خواب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی فرمائی اور حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کی بھی ایک ساتھ زیارت کی، اور انہیں افطار کی دعوت ملی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مسلم بن سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

"إن عثمان اعتق عشرين مملوكاً ودعا بسراويل فَشدّها عليه ولم يلبسها في جاهلية ولا في الإسلام وقال إني رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم البارحة في المنام و رأيت أبا بكر وعمر، وإنهم قالوا لي: اِصبر فإنك تفطر عندنا القابلة ثم دعا بمصحف فنشره بين يديه فقُتل وهو بين يديه."(۳)

---

(۱) عثمان ذوالنورین ؓ ص/۱۰۰

(۲) معارف الحدیث ۳۴۵/۸

(۳) مسند احمد، باب فی مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۷۲/۱

(کہ جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کئے گئے اس دن انہوں نے بیس غلام آزاد کئے اور سراویل (پاجامہ منگوایا اور پہنا) اور اس کو بہت مضبوط باندھا، اور اس سے پہلے نہ کبھی زمانۂ جاہلیت میں (یعنی اسلام لانے سے پہلے) پہنا تھا اور نہ اسلام لانے کے بعد کبھی پہنا تھا اور فرمایا کہ میں نے گذشتہ رات خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اور آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کو بھی، ان حضرات نے مجھ سے فرمایا کہ: عثمان! صبر پر قائم رہو، تم کل ہمارے پاس روزہ افطار کروگے اس کے بعد آپ نے مصحف (قرآن مجید) منگوایا اور اس کو سامنے رکھ کر کھولا اور تلاوت شروع کر دی، پھر آپ اسی حال میں شہید کئے گئے کہ مصحف آپ کے سامنے تھا)۔(۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت ایک منصوبہ بند سازش کا پیش خیمہ تھا، جس میں یہود اور منافقین پورے طور سے شریک تھے اور الزامات واتہامات کے راستہ نیک لوگوں اور صحابہ کو بھی ورغلانے کی کوشش کی گئی تھی، لیکن یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت میں یا قتل کی سازش میں ان نیک لوگوں اور صحابہ میں سے کسی صحابی کی شرکت نہیں تھی، جب کہ شریروں اور بلوائیوں نے یہ صورت اختیار کی تھی کہ انہی میں سے لوگ نمایاں نظر آئیں، چنانچہ اس تعلق سے کچھ غلط فہمی بھی پھیلی، لیکن حقیقت کی تہ میں جا کر ایک بڑے فتنہ کو سدباب کرنے کا کام حضرت علی مرتضٰی نے زمام خلافت کے سنبھالنے کے بعد یہ کیا، کہ فتنہ کے سارے پہلوؤں پر غور کر کے قصاص جاری نہیں کیا، اس لئے وہ لوگ اس میں آجاتے جو بے گناہ تھے اور جو مجرم تھے وہ صاف نکل جاتے، اور "الصحابة كلهم عدول" کی حیثیت ختم ہوجاتی،

---

(۱) ترجمہ از معارف الحدیث جلد ہشتم۔

ڈاکٹر جمیل عبداللہ مصری نے اپنی کتاب "أثر أهل الكتاب" میں تحقیق پیش کی ہے کہ:

''خلیفۂ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں امت جس ابتلاء کا شکار ہوئی، وہ فتنے اور سازشیں تھیں، جن کا منصوبہ بنانے میں یہود و نصاریٰ اور اسلامی سلطنت کے سب ہی دشمن شریک تھے۔''

اور مشہور مؤرخ علامہ حافظ تقی الدین سبکی مرحوم ۷۵۶ھ نے کہا:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امام برحق تھے، اور مظلوم شہید تھے، ان کے خون سے اللہ تعالیٰ نے صحابہ کو محفوظ رکھا، ان کے قتل کا ذمہ دار شیطان خبیث ہے، اس کا کوئی ثبوت ہم کو نہیں ملتا کہ صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی ان کے قتل کئے جانے کو پسند کیا ہو بلکہ جو بات پایۂ ثبوت تک پہنچی ہے وہ یہی کہ ہر ایک نے اس کو ناپسند کیا۔''(۱)

استاذ عباس محمود عقاد نے اس حادثہ سے بھی نتائج اخذ کئے ہیں اور لکھا ہے کہ:

''حق پر ایمان لانے والے جن کا ایمان پختہ نہیں ان کو دکھا دیا گیا کہ وہ ایسے ولی امر (حاکم اعلیٰ) کا محاسبہ کر سکتے تھے، جس کے حدود و سلطنت چین کی سرحدوں سے لے کر بحر ظلمات تک پھیلے ہوئے تھے۔''

''اس حادثہ میں یہ سبق ہے کہ ایمان صادق جب اپنا جلوہ دکھاتا ہے، تو ایک نوے سالہ بوڑھا شخص جس کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا اور گھر میں محصور کر دیا گیا ہے، وہ تنہا اور بے یار و مددگار رہتا ہے، لیکن اپنے لئے کسی کی جان کو خطرہ میں نہیں ڈالتا، حالانکہ اگر وہ

---

(۱) المرتضیٰ از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص/۲۲۳

چاہتا تو اس کے ہزاروں جاں نثار اس جگہ جہاں پانی کا ایک قطرہ ملنا دشوار ہو گیا تھا خون کی ندی بہا سکتے تھے۔"(۱)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے حدود سلطنت جیسا کہ عباس محمود عقاد نے تحریر کیا ہے، چین کی سرحدوں سے لے کر بحر ظلمات تک پھیلے ہوئے تھے، اس میں یقیناً ان کی بالغ نظری، حکمت عملی، دور بینی اور دین کے فدائیوں اور اپنے عزیزوں دوستوں اور اقارب کو اہلیت اور استحقاق رکھنے والے افراد کو ساتھ لے کر ذمہ داریاں دینے اور ان کی خدمات لینے کو خصوصی دخل رہا، استاذ کرد علی کی بات سے بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے، "الادارۃ الاسلامیہ" ص/۱۰۳ میں وہ لکھتے ہیں:

"کیا سیاسی حکمت عملی کا تقاضہ یہ نہیں تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی قومی اور قبائلی حمایت و تعلق پر اعتماد کریں کیوں کہ ان لوگوں کا ان کو کلی اعتماد حاصل تھا، اور دوسروں کی بہ نسبت ان میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور حکومت کو کامیاب بنانے اور ان کے مقاصد کی تکمیل کا زیادہ جذبہ ہونا فطری امر ہے۔"

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ان کی حمایت میں اعلیٰ ترین کردار نظر آتا ہے، جب جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مخالفت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت کا نعرہ بلند کرتے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے دام فریب میں ذرا بھی نہ آتے اور ان کو چلتا کر دیتے۔

المرتضیٰ کے مصنف لکھتے ہیں:

"حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدافعت اور باغیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے اجازت طلب کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا میں خدا کا

---

(۱) المرتضیٰ از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص/۲۶۶

واسطہ اس شخص کو دیتا ہوں جو اللہ کو مانتا اور اس کو حق سمجھتا اور اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ میرا اس پر کوئی حق بھی ہے ایک پچھنے کے لگانے بھر بھی میری خاطر خون نہ بہائے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوبارہ اجازت طلب کی اور انہوں نے دوبارہ یہی جواب دیا، پھر وہ (حضرت علی رضی اللہ عنہ) مسجد میں آئے، اذان ہوئی، لوگوں نے کہا: ابا الحسن! آگے بڑھئے اور نماز پڑھایئے! حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا، امام جب کہ خانہ قید ہے میں نماز نہیں پڑھاؤں گا، لیکن میں تنہا اپنی نماز پڑھوں گا، چنانچہ تنہا نماز پڑھ کر اپنے گھر واپس گئے۔" (۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ناکہ بندی اور بھی سخت ہوگئی، اور ان کے لئے باہر سے کسی قسم کا رابطہ رکھنے کا موقع نہیں دیا گیا، ان کے پاس جو پانی تھا وہ ختم ہوگیا، مسلمانوں سے انہوں نے پانی طلب کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ خود اپنی سواری پر گئے، اور پانی کا ایک مشکیزہ لے کر اندر داخل ہوئے، بڑی مشقت سے وہاں پہونچ سکے، باغیوں نے انہیں برا اور سخت وست کہا، اور ان کی سواری کے جانور کو بھگا دیا، یہ بات جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تین مشکیزے پانی سے بھرے ہوئے بھیجے، بنو ہاشم اور بنو امیہ کے متعدد موالی اس کو پہونچانے میں زخمی ہوئے، ورنہ وہ پہونچ ہی نہیں سکتے تھے۔ (۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کیلئے صحابہ کی ایک جماعت سینہ سپر تھی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچ گئے، محاصرہ جو آخر ذیقعدہ سے شروع ہوا تھا، ۱۸ر ذی الحجہ بروز جمعہ تک ختم نہیں ہوا تھا، حضرت

(۱) بحوالہ عثمان بن عفان ذوالنورینؓ مصنفہ صادق عرجون ص/ ۲۱۸-۲۱۹
(۲) المرتضیٰ ص/ ۲۲۱

عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام حامیوں اور مدافعین سے کہا کہ تلوار میان میں کر لیں، اور غلاموں سے کہا جو اپنی تلوار میان میں کرے گا وہ آزاد ہے، لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر تیروں سے وار کیا جس سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ جو اس وقت ان کے دروازہ پر تھے خون سے رنگین ہو گئے، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلام قنبر رضی اللہ عنہ زخمی ہوئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے "حسبی اللہ ونعم الوکیل" وردِ زبان تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نائلہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں "جس روز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا گیا اس دن وہ روزے سے تھے۔"

مولانا محمد منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

جمعہ کو آپ نے روزہ رکھا، مختلف انواع کے اعمال صالحہ کا خاص طور سے اہتمام فرمایا، بیس غلام اس دن آزاد کئے، آپ نے پائجامہ منگوایا، جو اس سے پہلے کبھی آپ نے نہیں پہنا تھا، عرب میں عام طور سے تہبند پہننے کا رواج تھا، آپ بھی ہمیشہ تہبند ہی پہنتے تھے، لیکن چونکہ آپ پر شرم وحیا کا غلبہ تھا، اس لئے آپ نے اس دن بجائے تہبند کے پائجامہ منگوا کے پہنا، اور اس کو بہت مضبوط باندھا، تاکہ شہادت اور موت کے بعد بھی جسم کا وہ حصہ نہ کھلے، جس کا کھلنا شرم وحیا کے خلاف ہے، پھر آپ نے قرآن شریف منگوایا اور اس کی تلاوت شروع فرمادی، اسی حال میں بدبخت ظالم باغیوں نے آپ کو شہید کیا، روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کے وقت سورۂ بقرہ کا وہ حصہ تلاوت فرما رہے تھے جہاں پاروں کی تقسیم کے لحاظ سے پہلا پارہ "الٓمٓ" ختم ہوتا ہے، آپ کے خون کے قطرے اس آیت پر گرے: ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ (تمہاری طرف سے اللہ ان

ظالموں سے انتقام لینے کے لئے کافی ہے وہ سب کچھ جاننے والا اور سننے والا ہے)۔(۱)

بعض اعتراضات اور ان کا جواب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت بارہ سال رہی، جس کے شروع کے چھ سال بڑے امن وسکون کے گزارے، یہاں تک کہ لوگ انھیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے زیادہ پسند کرتے تھے، جس کی بڑی وجہ ان کی زیادہ سے زیادہ عوامی طور پر حسن سلوک، نرمی اور عزیمت کے بجائے لوگوں کو رخصت پر عمل کی آزادی دینا تھی، اس لیے کہ ان لوگوں کی تعداد اب کم ہوتی جارہی تھی جو دین پر عزیمت اور سختی کو اختیار کریں اور ان لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی جو دین پر عمل کرنے والے تھے مگر دین کے لیے اپنے کو کھپانے والے نہیں تھے اور دنیوی حاجات و ضروریات اور تقاضوں کو زیادہ پیش نظر رکھتے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان طبائع کا خاص خیال رکھا، اور بعد والوں کے لیے ایک بہترین نمونہ اس کا بھی پیش کیا کہ خود تو عزیمت کو اختیار کیا جائے اور دوسروں کو رخصت پر چلایا جائے، ان میں جو عزیمت کو اختیار کرنا چاہیں ان کی قدر اور حوصلہ افزائی کی جائے، ایک حاکم کو اپنے امور حکومت میں اور ایک مربی و مرشد کو اپنے حلقہ ارادت و استرشاد میں طبائع اور جسمانی ساخت کو دیکھ کر کسی بات کا مکلف بنانے میں یہ دیکھنا پڑتا ہے۔

لیکن جس طرز عمل سے فتنہ پیدا ہوا وہ ان کی خلافت کے دور آخر کے چھ سالوں میں اعزہ واقارب کے ساتھ زیادہ حسن سلوک کے نتیجہ میں ہوا جو انھوں نے گرچہ اپنے ہی اختیاری مال سے کیا تھا جس کو ان کے پیش رو خلیفہ حضرت ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہما نے اپنے لیے اختیار نہیں کیا تھا اور اسے بھی بیت المال کی نذر کردیا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو لے کر اپنی ذات پر استعمال کے لیے صلہ رحمی کا

---

(۱) معارف الحدیث ۸/ ۳۴۵-۳۴۶

اجر وثواب اور نظام حکومت و امارت کو مضبوط کرنے کے لیے عمال کو دے کر کہ وہ دوسری طرف نگاہیں نہ اٹھائیں مستغنی کرنے کا کام کیا، لیکن حضرات شیخین کے طرز عمل کے نتیجہ میں جوان کا اجتہادی عمل تھا، لوگوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ مال بھی عوام کا ہے، اوراس میں تصرف بے جا کیا گیا ہے اور لوگوں کو ان حضرات سے حسد ہو گیا جن کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بڑی فراخ دلی سے زر کثیر عطا کیا تھا، یہیں سے لوگوں کی نگاہیں بدل گئیں اور وہ محبت باقی نہ رہی جو پہلے چھ سالوں میں آپ سے تھی۔

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ ہیں:

"ولی عثمان فعمل ست سنين لا ينقم عليه الناس شيئا وإنه لأحب إليهم من عمر، لان عمر كان شديدا عليهم فلما وليهم عثمان لان لهم ووصلهم، ثم إنه توانى فى أمرهم واستعمل أقرباءه وأهل بيته فى الست الأواخر، وكتب لمروان بخمس مصر أو بخمس إفريقية وآثر أقرباءه بالمال وتأول فى ذلك الصلة التى أمر الله بها، واتخذ الأموال واستسلف من بيت المال، وقال إن أبابكر وعمر تركا من ذلك ما هو لهما وإنى آخذه فقسمته فى أقربائى، فأنكر الناس عليه ذلك."(۱)

(حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو شروع کے چھ سال تک کسی کام پر لوگوں نے تنقید نہیں کی اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبوب بن کر رہے، اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے رعب وجلال کی وجہ سے لوگوں پر ہیبت طاری رہتی تھی، لیکن جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو ان کی نرم دلی

---

(۱) تاریخ الاسلام ذہبی حصہ خلافت سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ۔

اور صلہ رحمی کے سبب لوگ ان سے بہت مانوس ہو گئے، پھر اگلے چھ سالوں میں انھوں نے اپنے اعزہ اور اہل خاندان کو عہدے تفویض کیے، انھوں نے مروان کے لیے مصر یا افریقہ کا خمس مقرر کیا اور مال کی تقسیم میں انھوں نے اقرباء کو ترجیح دی اور تاویل یہ پیش کی کہ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، انھوں نے بیت المال سے اپنا حق وصول کیا اور اس سے دستبردار نہیں ہوئے، اور کہا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما نے اپنا حق چھوڑ دیا تھا لیکن میں لیتا ہوں اور اپنے اقرباء میں تقسیم کر دیتا ہوں، اسی بات پر لوگوں نے ان پر تنقید کی۔

امام ذہبی سورش کے دوسرے اسباب میں عزل ونصب کو بھی بیان کرتے ہیں اور رقم طراز ہیں:

"ومما نقموا عليه أنه عزل عمر بن سعد عن حمص، وكان صالحا زاهدا وجمع الشام لمعاوية، ونزع عمرو بن العاص عن مصر، وأمّر ابن أبى سرح عليها، ونزع أباموسى الأشعرى عن البصرة وأمّر عليها عبد الله بن عامر ونزع المغيرة بن شعبة عن الكوفة، وأمّر عليها سعيد بن العاص."(۱)

(بغاوت کے اسباب میں یہ بھی ہے کہ انھوں نے عمر بن سعد کو حمص سے ہٹایا جبکہ وہ ایک صالح زاہد والی تھے، اور شام حضرت معاویہ کو دے دیا، اور حضرت عمر بن العاص (فاتح مصر) کو مصر سے واپس بلالیا اور حضرت ابن ابی السرح کو والی بنا دیا، بصرہ

(۱) الخلفاء الراشدون للذہبی ص/۱۵۹

سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو معزول کیا اور حضرت عبداللہ بن عامر کو حاکم بنادیا، حضرت مغیرہ بن شعبہ کو کوفہ سے ہٹایا اور وہاں حضرت سعید بن العاص کو حاکم بنایا)۔

جہاں تک بنوامیہ کے افراد کے ساتھ داد و دہش کا معاملہ ہے، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو حنین کے موقع پر بڑا حصہ دیا تھا، جس کا انصار و مہاجرین کو محسوس ہونا فطری بات تھی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کے ساتھ دوسری طرف حسن سلوک اور اخلاق برت کر اور اظہار تعلق کر کے اس احساس کو دور کر دیا تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہل بیت اور خاندان کے لوگوں کو قربانیوں میں آگے رکھا اور انعامات اور داد و دہش کے موقع پر پیچھے رکھا، یہاں تک کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ان کے اظہار ضرورت پر بھی تسبیحات کی تلقین فرما کر واپس کر دیا اور ان پر یہ معجزہ نبوی ظاہر ہوا کہ وہی تسبیحات ان کے لیے ایسی معین و موافق ہوئیں جن سے وہ دوسرے معاونوں سے بے نیاز ہو گئیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور دین سے جو انتہائی درجہ کی محبت تھی اس کے باعث جب تک وہ اپنے ہر اقدام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ اور کلام سے کوئی دلیل حاصل نہ کر لیتے تب تک وہ ایسا کوئی اقدام نہ کرتے، بنوامیہ کے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کے لیے ان کے پاس دو طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ و کلام سے دلیل تھی، ایک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قبل از نبوت سے ایک نمایاں اور امتیازی وصف صلہ رحمی تھی، یہ وہ بڑی نیکی ہے جو اعزہ و اقارب کے ساتھ حسن سلوک کے ذریعہ ہی حاصل کی جاسکتی ہے اور اس کے طریقے الگ الگ ہیں، وقت پر جو طریقہ مناسب ہوگا وہ اختیار کیا جائے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوامیہ کے لوگوں کے ساتھ جو داد و دہش کا معاملہ کیا تھا اور اس کے ذریعہ انھیں دین سے قریب کیا اور ان کی صلاحیتوں سے

فائدہ اٹھایا اور پھر بعد میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور جود و دہش کی وہ اپنے اس حق سے کی جس میں وہ خود مختار تھے، اور وہ مدان کی مداختیاری تھی، لیکن عام لوگوں کے دلوں میں بنوامیہ سے حسد پیدا ہو گیا اور ان لوگوں نے اس کو عدل کے خلاف طریقہ بتا کر بعض صحابہ کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے گفتگو پر آمادہ کیا۔

کیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یہ نہ چاہتے کہ کس حسن سلوک سے ان سے خاندانی نسبت رکھنے والے اللہ کے قریب ہو جائیں اور جو دین داری کے اس معیار پر نہیں ہے جس معیار پر ہونا چاہیے وہ اس پر اتر آئیں، اسی لیے بعض لوگوں کے اعتراضات کا جواب اپنے اس جذبہ کو بتا کر صاف صاف دے دیا کہ:

"لو أن بيدى مفاتيح الجنة لأعطيتها بنى أمية حتى يدخلوها."(۱)

(اگر میرے ہاتھ میں جنت کی کنجیاں آجائیں تو وہ بھی بنوامیہ کو دے دیتا یہاں تک کہ وہ اس میں داخل ہو جائیں)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوامیہ کے افراد کو جو ایمان لے آئے تھے، دنیا سے خوب نوازا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بھی اور پھر اللہ ان کو اقتدار دیا، اور ان کے دور اقتدار میں کیسی کیسی فتوحات ہوئیں، جہاں خیر کے چشمے جاری ہوئے، علم کے سوتے پھوٹے اور ان کی دنیا کے ذریعہ یہ خیر ان کے حصہ میں آیا، یہ اللہ کا معاملہ ہے جس کو جس طریقے سے چاہے نوازے۔

امام زہری نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بنوامیہ کو ترجیح دینے کے عمل کو بغاوت کا اصل سبب قرار دیا ہے، امام ذہبی ولاۃ و امراء (گورنروں اور حاکموں) کے

---

(۱) الخلفاء الراشدون للذہبی ص/۱۶۰

نصب وعزل کو دوسرا بڑا سبب قرار دیا ہے، اور یہ دونوں چیزیں اس وقت آخری حد تک پہنچ گئیں، جب اہل مصر نے حضرت محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کو مصر کا حاکم بنائے جانے پر اصرار کیا اور اس وقت کے حاکم مصر کو معزول کرانے پر شدید دباؤ ڈالا، اور تمام حالات کا جائزہ لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ لے بھی لیا اور بظاہر شورش دب گئی، لیکن وقائع تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے میر منشی مروان بن حکم اس فیصلہ کے نفاذ میں حائل ہو گئے اور ان کی جانب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دوسرا خط اہل مصر کو روانہ کیا گیا جو اس تازہ فیصلہ کے موافق نہ تھا، اس سے اہل مصر چراغ پا ہو گئے اور چاہا کہ مروان کو انھیں حوالہ کر دیا جائے تا کہ وہ لوگ ہی پورا انتقام لے لیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس پر متاثر نہ ہوئے، اس لیے کہ یہ موقع ایسا ہوتا ہے کہ لوگ زیادہ پر اتارو ہو جاتے ہیں، اور وہ شخص جس کا جرم کم ہوتا ہے وہ بدترین مجرم کے طور پر پیش ہوتا ہے، اس لیے انھوں نے اپنے طرز عمل کے مطابق اس میں عجلت پسندی کو طریقہ نبوی اور حرمت مسلم کی تعظیم کے خلاف سمجھا، لیکن افواہوں اور بدگمانیوں کا بازار ایسا گرم ہو چکا تھا کہ بدطینتوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی محاصرہ کر لیا، اور بعض اچھے لوگوں نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے تیز گفتگو ان حالات سے متاثر ہو کر کی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تذکیر وتادیب سے وہ پیچھے ہٹ گئے، مگر بدمعاشوں نے اسی بیچ اپنی بھڑاس نکال کر وہ ناپاک جرم سفاکی کیا جس پر خون کے آنسو انسانیت ہمیشہ بہاتی رہے گی۔

جہاں تک بعض جلیل القدر والیوں حاکموں سے ان کا منصب لینے کی بات جن میں بعض بڑے فاتحین بھی تھے، تو یہ اقدام حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عہد خلافت میں کئی کے سلسلہ میں اٹھا چکے تھے اور اس سے انھوں نے بڑی تربیت باطنی اور اصلاح عقائد وافکار کا کام لیا تھا اور کوئی انتشار نہیں ہوا تھا، بات یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اولوالعزم اور جلیل القدر لوگوں کی اکثریت تھی، جو ڈھیرے

دھیرے اٹھتے چلے گئے اور روم و ایران کے مفتوح ہونے کے ساتھ ان علاقوں کی بڑی تعداد جو کمزور ایمان والی تھی شامل ہوئی، جن کی وجہ سے رائی کو پہاڑ بنانے کا کام افواہوں اور بدگمانیوں کے ذریعہ ہوتا رہا۔

اسی طرح بعض ایسے عمال کا تقرر جو لوگوں کی نگاہ میں اس منصب کے لائق نہیں تھے تو جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس کا صحیح ثبوت لوگوں نے فراہم کر دیا تو اگر تعزیر وغیرہ کی ضرورت محسوس کی تو اس کے ساتھ اس کو اس منصب سے علاحدہ کیا، ورنہ جو شکل مناسب سمجھی وہ شکل اختیار کر کے اقدام کیا۔

مشورے لیے، مشورے سنے اور جو مختلف رائیں مختلف احوال میں سامنے آئیں ان سب کو سامنے رکھ کر اقدام کرتے اور دعووں سے دور رہتے اور یہ فرماتے کہ میں انسان ہی ہوں۔

سبھی صحابہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بڑے ہی خیر خواہ اور دین وامت اور انسانیت کے خیر خواہ تھے اور اس کے لیے جو مناسب رائے جس کے ذہن میں آتی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو پیش بھی کرتا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جس میں زیادہ خیر سمجھتے اس کو اختیار کرتے اور باقی صحابہ رضی اللہ عنہم اس پر عمل کرتے اور جب صورت حال نہایت سنگین ہوگئی تو بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ نے بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سامنے صورت حال رکھی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنا وہ موقف جو انھوں نے کتاب وسنت اور اپنے پیش رو خلفاء کے طریقہ کار خلافت سے اخذ کیا تھا، اس کو سامنے رکھا اور صحابہ بھی مطمئن ہوگئے۔

وہ وقت بڑی آزمائش کا تھا جب ان کے ہواخواہوں نے ان کے تئیں اظہار عقیدت ومحبت کرتے ہوئے ان کے سایہ تلے جینے کی خواہش ظاہر کی، اہل مصر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو، اہل بصرہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اور اہل کوفہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو چاہ رہے تھے، سب سے پہلے مصریوں کو حضرت علی رضی

اللہ عنہ نے لاجواب اور چلتا کیا اور کہا:

"لقد علم الصالحون أنكم ملعونون فارجعوا لا صحبكم الله." (۱)

(امت کے برگزیدہ لوگ جانتے ہیں کہ تم سب ملعون ہو، یہاں سے دفع ہو جاؤ، اللہ تمہیں غارت کرے)۔

چنانچہ وہ سب چلتے بنے، یہی روش حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے اپنے ساتھ عقیدت رکھنے والوں کے ساتھ اختیار کی اور کسی کو رکنے نہ دیا۔

دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جن کا شام گرویدہ تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حالات کو ناسازگار ہوتا دیکھ کر شام کو پایہ تخت بنانے کی پیش کش کی کہ یہاں کے لوگوں سے خطرہ نہیں، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جذبہ فدائیت کہاں اس پیش کش کو صواب و صاد کر سکتی تھی، صاف کہہ دیا کہ:

"أنا لا أبيع جوار رسول الله صلى الله عليه وسلم بشئ وإن كان فيه قطع خيط عنقي." (۲)

(میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار کو کسی قیمت پر نہیں بیچوں گا، خواہ اس کے لیے میری شہ رگ کاٹ دی جائے)۔

اور صرف یہی نہیں دوسری پیش کش کو بھی ان کے جذبہ فدائیت نے نامنظور کر دیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا: "فأبعث إليك جندا." (تو میں آپ کی مدد کے لیے لشکر روانہ کروں گا) اور تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"أنا أقتر على جيران رسول الله صلى الله عليه وسلم

---

(۱) الخلفاء الراشدون للذہبی ص/۱۶۳۔

(۲) الکامل لابن اثیر، ذکر مسیر من سار إلی حصر عثمان رضی اللہ عنہ۔

الأرزاق بحند تساكنهم."

تب حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ اظہار مایوسی کیے بغیر نہ رہ سکے اور کہا: "یاأمیر المؤمنین! واللہ لتغتالن ولتغزین." (اے امیر المومنین! بخدا آپ سے جنگ کی جائے گی اور آپ کی جان محفوظ نہ رہ سکے گی)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ جواب دے کر اپنے نفس مطمئنہ کا حال بیان کردیا کہ "حسبی اللّٰہ ونعم الوکیل." (۱)

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس طرز عمل سے وہ فکر ونظریہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے جس میں کمال ایمان کے لیے اس درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جذبہ فدائیت ومحبت کو کہا گیا ہے جو ماں باپ، اولاد، مال ومتاع، سارے ہی افراد اور ساری ہی دل لگی اشیاء سے یہاں تک کہ اپنی جان ونفس سے بھی زیادہ ہو۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے اس محبت خالص وفدائیت تمام اور عشق صادق کے امتحان کا پہلا مرحلہ اس وقت آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت اور اہل اسلام کی سعادت کے کام کے لیے مکہ قریش کے پاس پہنچے تھے اور اس لیے عمرہ وطواف نہیں کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی اسی لیے تشریف آوری ہے اور وہ اپنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مقدم کریں، چنانچہ وہ بغیر اس کے واپس ہوئے، وہاں بیعت رضوان ہوچکی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ شرف بخشا تھا کہ اپنے ایک ہاتھ کو ان کا ہاتھ قرار دے کر بیعت میں داخل کیا۔

اب یہ دوسرا امتحان تھا، پہلے امتحان میں تو صرف شہرت ہوئی تھی کہ حضرت عثمان شہید کردیے گئے اور یہاں یہ بات حقیقت بن کر سامنے تھے کہ ان کو بلوائی شہید کرہی دیں گے۔

---

(۱) الخلفاء الراشدون للذہبی ص/۱۶۱ والکامل لابن اثیر۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کمال ایمان و احسان عہد نبوت میں ہی حاصل کرلیا تھا اور پھر اپنے پیش رو خلفاء کے ساتھ تعاون اور اپنے عہد خلافت میں مزاج شریعت اور سنت کا نہایت باریک بینی کے ساتھ خیال کرتے ہوئے درجات ایمانی اور مقامات احسانی طے کرنے والوں کے لیے وہ عملی نمونہ بھی چھوڑ گئے، جس کے بغیر انسان وہ اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرسکتا جو "اللهم ألحقني بالرفيق الأعلى." میں مضمر ہے۔

قصاص حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

محدث ناقد محقق العصر حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رقم طراز ہیں:

''ابن جریر طبری نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ قاتلان عثمان میں سے کوئی شخص بھی قتل ہونے سے بچ نہ سکا۔''

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مسند آرائے خلافت ہوئے، تو آپ نے سب سے پہلا جو کام کیا وہ اسی واقعہ کی تحقیق تھی، لیکن دقت یہ تھی کہ نہ اولیاء مقتول میں سے کسی نے اس وقت دربار خلافت میں استغاثہ دائر کیا، اور نہ قاتلین میں سے کوئی موجود تھا، نہ قتل کی عینی شہادت کسی کے خلاف فراہم ہوسکی، اب کارروائی کی جاتی تو کس کے خلاف کی جاتی، علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ:

"علي رضي الله عليه كان معذوراً في ترك قتلة عثمان رضي الله عنه لأن شروط الاستيفاء لم توجد." (۱)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ قاتلین عثمان کو قتل نہ کرنے، پر معذور تھے، کیونکہ قصاص لینے کے لیے جو شرائط ضروری ہیں وہ موجود ہی نہ تھیں)۔

ظاہر ہے کہ جب اصل قاتلوں کا پتہ ہی نہ چل سکے تو پھر قصاص کس سے

(۱) منہاج السنۃ ۳/۲۲۹۔

لیا جائے۔(۱)

مولانا نعمانی علیہ الرحمہ ایک بڑے مغالطہ کا جس میں صحابہ کرامؓ پر آنچ آ رہی تھی ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عمرو بن الحمق رضی اللہ عنہ تو بالاتفاق صحابی ہیں، اور محقق محدثین کی تصریح کے مطابق کسی صحابی رسول کی شرکت قتل عثمان میں ثابت نہیں، اسی طرح محمد بن ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی صحیح یہی ہے کہ وہ قتل کے ارتکاب میں شریک نہ تھے۔''

اور وہ یہ بھی تحقیق پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے دوسرے لوگوں کو آپ پر دست درازی سے روکنے کی کوشش کی، اور ان کے خلاف تہمت قتل کو سبائی سازش قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''(ناصبی) حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کو قتل حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ میں شریک بنانے کے درپے ہیں، صرف اس لیے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لے پالک تھے(۲) اور شیعہ بھی ان کو اپنا ہیرو مانتے ہیں، اور ان پر قتل عثمان رضی اللہ عنہ کی غلط تہمت جوڑتے ہیں۔(۳)

حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں ایک بات قدرے مشترک نظر آتی ہے، وہ یہ کہ ان کے نزدیک ایک متنفس کی قیمت بھی پوری مملکت سے کم نہیں تھی، وہ کسی کے دباؤ میں آ کر چاہے وہ جتنی بڑی طاقت و جمعیت ہو کسی کی جان سے کھیلنے پر تیار نہیں تھے کہ یہ صرف ایک جان کا زیاں نہیں ہے،

---

(۱) حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ ص/ ۴۹

(۲) یعنی ان کی والدہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں آ گئی تھیں، اور یہ کم سن تھے۔

(۳) حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ ص/ ۴۸ مکتبہ اہل سنت کراچی۔

بلکہ ایک غلط نمونہ پیش کرنا اور سنت سیئہ کی بناڈالنا، اور اس شخص کو جو تہمت والزام سے درحقیقت بری رہے ہمیشہ ہمیش کے لیے موردالزام ٹھہرادینا، اور اس کی شخصیت کو داغدار کردینا ہے۔

اس سلسلہ میں علامہ محدث مولانا محمد عبدالرشید نعمانی (کراچوی متوفی ۱۴۲۰ھ/۱۹۹۹ء) کی تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جس میں ان دونوں کے احترام انسانیت اور مزاج نبوت ومزاج شریعت کے پاسبان ہونے کا پتہ چلتا ہے، اور ان کی خلافت برحق ہونے کا واضح اشارہ ملتا ہے، کہ کس اعلیٰ درجہ کا ان میں تحمل تھا، اور یہ بات بھی قدرے مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں نے اپنے باغیوں سے انتقام لینے میں تعجیل سے کام نہیں لیا، بلکہ معافی کو مقدم رکھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خون بہانے کی اجازت ہی نہ دی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ ہونے کی صورت میں اس بعد بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

مولانا عبدالرشید نعمانی (کراچوی) تحریر فرماتے ہیں:

''تاریخ اسلام کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے محاصرین کے پیہم اصرار کے باوجود ان کے اس مطالبہ کو یکسر رد کردیا کہ مروان کو ان کے سپرد کیا جائے، وہ کہتے تھے کہ ایک طرف آپ نے محمد بن ابی بکر کو مصر کی گورنری کا پروانہ دے کر ہمارے ساتھ مدینہ سے روانہ کیا تھا، دوسری طرف راہ میں آپ کا غلام ملا جو بیت المال کے اونٹ پر سوار تھا، اسی کی تلاشی لینے پر اس کے پاس سے آپ کا یہ فرمان ملا کہ جب یہ وفد مصر پہنچے تو وفد کے تمام اراکین کو بشمول محمد بن ابی بکر تہ تیغ کردیا جائے، اس فرمان پر آپ کی مہر بھی ہے، مہر آپ کے میر منشی

مروان کے پاس تھی، ہمیں آپ کی صفائی قبول ہے، آپ فرماتے ہیں، غلام میرا ہے، اونٹ بیت المال کا ہے، اس فرمان پر مہر بھی میری ہے، مگر مجھے اس امر کی کوئی اطلاع نہیں، نہ میں نے یہ فرمان لکھا نہ اس پر مہر کی، تو اب ظاہر ہے یہ حرکت آپ کے کاتب السر (پرائیویٹ سکریٹری) مروان کی ہے، لہٰذا اسے ہمارے سپرد کیجیے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو یقین تھا کہ جیسے ہی مروان کو ان لوگوں کے سپرد کیا گیا، یہ اس کی صورت دیکھتے ہی اشتعال میں آکر اس کا سر قلم کردیں گے، چونکہ مروان کے خلاف اس سلسلہ میں کوئی شرعی شہادت موجود نہ تھی، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو نظر انداز کردیا، آخر محاصرہ نے طول کھینچا، اور جو ہونا تھا ہو کر رہا۔

غور فرمایئے! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک متنفس کی جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کردی، اور محاصرین کا غلط مطالبہ منظور نہ کیا، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کیسے سیکڑوں ہزاروں کو بغیر کسی شرعی ثبوت کے طالبین قصاص کی شمشیر انتقام کے نیچے دے دیتے؟ ہاں! خون عثمان کا مطالبہ کرنے والے اگر قاتلوں کو نام بنام متعین کرکے ان کے خلاف قتل کی شرعی شہادت فراہم کردیتے تو بلاشبہ ان کا موقف صحیح ہوتا۔

مگر محاصرین عثمان کی طرح محاربین علی نے بھی امیر المومنین کی ایک نہ سنی، البتہ حضرت طلحۃ الخیر اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما کی یہ غایت اخلاص کی بات ہے کہ عین میدان جنگ میں جس لمحے بھی ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، انھوں نے اپنے اپنے

گھوڑوں کی باگیں پھیر دیں، اور میدان مصاف سے ہٹ گئے۔
صدیقین کا یہی مقام ہوتا ہے، حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا بھی ساری عمر اپنی اس غلطی پر پچھتاتی رہیں، لیکن آج کل کے ناصبی اس بارے میں خود حضرت امیر المومنین کے تخطیہ کے در پے ہیں، جنگ جمل پر ہی غور کیجیے کہ کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جنگ ختم ہو جانے کے بعد ان لوگوں میں سے کسی فرد کے خلاف بھی جو آپ کے مقابلہ میں شمشیر و سنان لے کر اترے تھے کبھی کوئی باز پرس کی؟ وجہ یہی کہ باغی سے بغاوت فرو ہو جانے کے بعد اثنائے بغاوت میں جو کچھ قصور بر بناء بغاوت سرزد ہو، اس کی باز پرس نہیں ہوا کرتی، جیسے کہ مرتد سے اثناء ارتداد میں ارتداد کی بنا پر جو جرم سرزد ہو، دوبارہ اسلام لانے کے بعد پھر اس جرم پر سزا نہیں ملے گی۔"(۱)

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس دور کے لیے روک رکھا تھا جس دور کو ان کی ضرورت تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ان مسائل کا خاص طور پر زیادہ علم اور اس میں تمام پہلوؤں کی رعایت کے ساتھ فیصلہ لینے کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیت عطا فرمائی تھی، اور صرف یہی نہیں جس شخصیت کی جس دور کو ضرورت تھی وہ شخصیت اس دور کو عطا ہوگئی، اور صرف یہی حکمت نہیں بلکہ ایک حکمت یہ بھی نظر آتی ہے کہ تفصیلی طور پر جو مسائل تا قیام قیامت پیش آنے تھے اجمالی طور پر وہ اس تیس سالہ عہد میں سامنے لے آئے گئے، جو حضرات خلفاء راشدین کے فیصلوں اور اقدام اور ان کے فتاویٰ وقضایا کی روشنی میں حل ہوئے، حضرت مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان چاروں ادوار کے حالات وواقعات اور اس میں اس کے مطابق شخصیت کی ضرورت

(۱) حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ ص/۸۰-۸۱ مکتبہ اہل سنت کراچی

اور اس کے کردار پر اچھی روشنی ڈالی ہے، وہ ترتیب خلافت کی حکمت و مصلحت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں باہمی فضیلت اسی ترتیب سے ہے، جس ترتیب سے یہ حضرات خلافت نبوی کے منصب پر سرفراز ہوئے، اسی طرح ان حضرات کے اعمال کا بھی حال ہے کہ افضل کے حصہ میں حق تعالیٰ کی جانب سے افضل عمل عطا ہوا، اب اس مقدمہ کی روشنی میں مسئلہ قتال پر نظر ڈالئے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ قتال اہل ردّت کے امام ہیں، چنانچہ مرتدین کی سرکوبی آپ ہی کے حصہ میں آئی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قیصر و کسریٰ کا تاج وتخت الٹا ہے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کے باجگزاروں کو زیر کیا ہے، ان دونوں حضرات کے حصہ میں مجوس و اہل کتاب کا قتال آیا ہے، فاروق اعظم رضی اللہ عنہ قتال اہل کتاب و مجوس کے امام ہیں، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حصہ میں قتال بغاۃ آیا ہے، اور وہ قتال اہل قبلہ کے امام ہیں، چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

''اور آیت شریفہ: ﴿وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ﴾ اور وہ لوگ کہ جب ان کے خلاف بغاوت ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ پر منطبق ہے، کیونکہ ان کے ایام خلافت میں جو خاص بات کہ واقع ہوئی اور جس کی انجام دہی میں آپ منفرد ہیں وہ قتال بغاۃ ہی ہے۔''(۱)

---

(۱) ازالۃ الخفاء ۱/۲۳۱ بحوالہ حضرت علیؓ اور قصاص عثمانؓ ص/۹۷ مکتبہ اہل سنت کراچی

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی صفات وخصوصیات

ذوالنورین سیدنا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی صفات وخصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو سب میں ان کو ممتاز کرنے والی صفت وخصوصیت ''حیاء'' ہے۔

شرم وحیا

حیا اور مروت انسان کے اعمال میں حسن پیدا کردیتی ہے، یہ اسلام کے شعبوں میں ایک اہم شعبہ ہے، سبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے حیادار تھے اور بامروت تھے، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں یہ وصف زیادہ بڑھا ہوا تھا، یہ وصف ان کے سبھی اقدامات اور فیصلوں میں جلوہ گر نظر آتا ہے، اسی لیے ان کو دوسروں کا بھی بڑا پاس ولحاظ رہتا تھا، یہ لحاظ انھیں اپنے والدین کے سلسلہ میں اور اپنے محسنوں کے سلسلہ میں اور اعزہ واقارب کے سلسلہ میں اور سزا نافذ کرنے، ذمہ داریاں سپرد کرنے اور تمام معاملات میں بڑھا ہوا تھا، جو لوگ اس لحاظ کو زیادہ سمجھتے وہ اس پر ناگواری ظاہر کرتے، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو کرتے تھے وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اور دین میں اس کی اہمیت وضرورت کو پیش نظر رکھ کر کرتے تھے، اس لیے وہ دوسروں کی ملامت کی پرواہ نہ کرتے، وہ سخت چیز کے معاملہ میں آسان کو اختیار کرتے اور لوگوں کو خیر سے محرومی سے بچانے کے لیے ان کے حسب طاقت ذمہ داریاں دیتے اور جو جتنا بوجھ اٹھا سکتا اس سے اسی قدر کام لینا پسند کرتے، حالانکہ لوگوں کو طمع ہوتی کہ وہ بڑی ذمہ داریاں اٹھائیں، وہ لحاظ میں کچھ ذمہ داریاں دے دیتے، عقل جس چیز کو مناسب نہیں سمجھتی ان کی فطرت اس کو قبول کرنے میں مانع ہوتی اور جو کام سب کے سامنے کیا جانا اچھا نہ سمجھا جاتا وہ اسے تنہا کرنا بھی اچھا نہ سمجھتے، وہ تو حیادار تھے ہی، خلوت میں بھی حیادار تھے اور یہ وصف ان کا اتنا بڑھا ہوا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا لحاظ رہتا تھا، حضرت ابوبکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما کو لحاظ رہتا تھا، فرشتوں

کو بھی اس کا لحاظ رہتا تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان کا تو فرشتے بھی لحاظ رکھتے ہیں۔

صلہ رحمی اور حسن سلوک

دوسرا بڑا وصف صلہ رحمی ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تقرب الی اللہ کے سارے ہی کام انجام دیتے، مگر ان کاموں میں جو خدمت خلق سے متعلق ہیں، ان میں انھوں نے صلہ رحمی کو خصوصی اہمیت دی تھی اور وہ اپنے والد اور والدہ کی نسبت کا اس میں بڑا خیال رکھتے، انتظامی ذمہ داریاں دینے اور دوسری طرح سے حسن سلوک کرنے اور خیال رکھنے میں بھی وہ دوسروں کی بہ نسبت زیادہ آگے نظر آتے ہیں، البتہ اگر کسی کی دینی معاملہ میں کوتاہی پائی تو اس کو تنبیہ فرمائی اور اگر کسی ایسی غلطی کا مرتکب پایا جس پر حد جاری ہوسکتی تھی تو وہ بھی کیا، مگر اس کا خیال رکھا کہ جوش میں لوگ زیادتی نہ کر جائیں اور جرم سے زیادہ جرم ثابت نہ کر دیا جائے، لوگ آپ پر اقرباء پروری کی بات کہتے جبکہ آپ صلہ رحمی کرنے والے تھے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کی شہادت پر جو بات کہی وہ آپ کے اس دینی وصف کو خوب واضح کرتی ہے کہ عثمان تو بڑی صلہ رحمی کرنے والے تھے، ان کے ساتھ لوگوں نے ایسا کیا۔

صلہ رحمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اہم سنت ہے اور ایسی سنت ہے جس پر اللہ تعالیٰ بڑا نوازتا ہے اور خوب نوازنے کا وعدہ فرمایا ہے، اس کے ساتھ جو برکتیں جڑی ہوئی ہیں وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خوب حاصل ہوئیں، عمر میں برکت ہوئی، رزق میں برکت ہوئی، فتوحات دور دور تک ہوئیں، چاروں خلفاء میں مدت خلافت ان ہی کی زیادہ رہی۔

کثرت تلاوت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایک اہم وصف تلاوت قرآن کریم کا غیر معمولی

اہتمام بھی ہے، قرآن مجید سے تعلق اور اس کی تلاوت کا اہتمام سبھی صحابہ کو تھا، مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس میں اپنی امتیازی حیثیت کے ساتھ سامنے آئے، انھیں قرآن مجید سے بڑا شغف تھا، اس کی خوب تلاوت کرتے تھے، اللہ نے ان سے قرآن مجید کی خوب خدمت بھی لی، انھوں نے ایک نسخہ پر لوگوں کو جمع کیا اور وہ نسخہ ہر طرف عام کر دیا، آج وہی نسخہ پڑھا اور سنا جاتا ہے، اس طرح سبھی کے قرآن مجید سننے اور پڑھنے کا ثواب ان کو ملتا رہے گا، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ عجیب معاملہ ہوا، اور بڑا ہی قابل رشک معاملہ ہوا کہ جب انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا تو اس وقت وہ قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول تھے اور مصحف شریف سامنے تھا، چونکہ انھیں شہید کیا گیا اس لیے ان کے خون کے قطرے اس مصحف شریف پر پڑے، یہ مصحف شریف آج بھی محفوظ ہے اور ان کی شہادت اور قرآن مجید سے ان کے شغف اور تلاوت کلام پاک کے ان کے عمل کی گواہی دے رہا ہے اور دیتا رہے گا۔

عشق ووفا کی اعلیٰ مثال اور بیعت الرضوان

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو عشق و محبت کا جو درجہ حاصل تھا اس کو اس واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے جو مکہ پہنچ کر طواف نہ کرنے کا ہے، اس لیے آپ اہل مکہ کے لیے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر و ترجمان تھے اور اہل مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب کو اس کی اجازت نہ دی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر طواف کرنے پر راضی نہ ہوئے، حالانکہ طواف کے بغیر اہل مکہ نہیں رہ سکتے تھے، جیسے مچھلی پانی کے بغیر نہیں رہ سکتی، اندر سے ایسی طلب اور پیاس ہوتی تھی جو برداشت سے باہر ہوتی، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور عشق و وفا کو غالب رکھنا معمولی واقعہ نہیں ہے، اہل ایمان و یقین کے لیے سلوک و احسان اور عشق و محبت کے

بڑے عقدے حل ہوتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس واقعہ کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ روانہ ہوئے، مکہ پہنچ کر وہ ابوسفیان اور قریش کے سربرآوردہ اشخاص کے پاس گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ پیغام ان کو پہنچایا، جب وہ اپنی بات کہہ چکے تو انھوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر تم طواف کرنا چاہتے ہو تو طواف کرلو، انھوں نے جواب دیا کہ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کریں گے، میں اس وقت تک طواف نہیں کرسکتا۔''(۱)

''جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ واپس آئے تو مسلمانوں نے کہا، ابوعبداللہ! تم تو بڑے مزے میں رہے، تم نے تو طواف کر کے اپنے دل کا ارمان نکال لیا ہوگا، کہنے لگے، تم لوگوں نے بڑی بدگمانی سے کام لیا، قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر مجھے ایک سال بھی وہاں ٹھہرنا پڑتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوتے تب بھی میں اس وقت تک طواف نہ کرتا، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم طواف نہ کرلیتے، مجھے تو قریش نے طواف کی دعوت بھی دی تھی، لیکن میں نے انکار کردیا۔''(۲)

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عمل اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسا پسند آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے داہنے ہاتھ کو حضرت عثمان

---

(۱) نبی رحمت، باب صلح حدیبیہ بحوالہ سیرت ابن ہشام۔
(۲) نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم، بحوالہ زادالمعاد۔

رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر اس وقت غائبانہ بیعت لی، جب موجود سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے درخت کے نیچے بیعت لی تھی، اور یہ بیعت ایسی مشہور ہوئی کہ غائبانہ بیعت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نام سے ہی منسوب ہوگئی۔

اس تاریخی بیعت کا پس منظر بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے متعلق ہے کہ اس خلاف واقعہ بات کہ شہرت ہوگئی تھی کہ وہ مکہ میں شہید کر دیئے گئے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ لکھتے ہیں:

''اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کر دیئے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بیعت کی دعوت دی، تمام لوگ جوش و وارفتگی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں طرف جمع ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت ایک درخت کے نیچے تشریف رکھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بیعت کی کہ کوئی راہ فرار اختیار نہ کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنا دست مبارک تھاما اور فرمایا، یہ عثمان کی طرف سے ہے، یہ وہی بیعت رضوان تھی جو حدیبیہ میں ببول کے درخت کے نیچے انجام پائی اور اس کا ذکر قرآن مجید کی حسب ذیل آیات میں کیا گیا:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيْباً﴾.

(اللہ ایمان والوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے تو اس نے ان کے دلوں کو پرکھ لیا پھر ان

پر سکون اتارا اور قریب ہی ایک فتح انعام میں دی)۔(۱)

یہ تھا عشق وفا کی اعلیٰ مثال پیش کرنے اور جذبات کی قربانی دینے کا جو اللہ کی طرف سے عطا ہوا۔

ملفوظاتِ گرامی

١ – "من علامات العارف أن يكون قلبه مع الخوف والرجاء، ولسانه مع الحمد والثناء، وعيناه مع الحياء والبكاء، وإرادته مع الترك والرضاء."(٢)

(عارف کی علامت ہے کہ اس کے دل میں خشیت الٰہی کے ساتھ اللہ کی رحمت کی امید ہو، اس کی زبان اللہ کی حمد وثنا میں مشغول ہو، اس کی آنکھیں حیاء اور رونے کی عادی ہوں، اور وہ اپنی خواہش کو اللہ کی رضا کی خاطر ترک کردے)۔

٢ – "من علامات المتقي أن يرى الناس قد نجوا ويرى نفسه قد هلك."(٣)

(متقی کی علامت یہ ہے کہ دوسروں کو نجات یافتہ تصور کرے لیکن خود کو ہلاکت کے قریب تصور کرے)۔

٣ – "همّ الدنيا ظلمةٌ، وهمّ الآخرة نورٌ." (٤)

(دنیا کی فکر تاریکی ہے، اور آخرت کی فکر روشنی ہے)۔

٤ – "العبودية محافظة الحدود، والوفاء بالعهود، والرضا بالموجود، والصبر عن المفقود." (٥)

---

(۱) نبی رحمت، باب صلح حدیبیہ۔
(۲) ازالۃ الخفاء ۴/۲۷۵۔
(۳-۴-۵) ایضاً ۴/۲۷۶۔

(حدود اللہ کی حفاظت کرنا، اور عہدوں کو پورا کرنا، اور موجود پر راضی رہنا، گمشدہ پر صبر کرنا ہی عبودیت ہے)۔

۵- "من كانت الدنيا سجنه فالقبر راحته." (۱)

(جس شخص کے لیے دنیا قید خانہ ہوتی ہے تو قبر اس کے لیے راحت کی جگہ ہوتی ہے)۔

(۱) ازالۃ الخفاء ۴/۲۷۶۔

باب نہم

سرگروہ اہل ایمان وتوکل

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

مقام ومرتبہ

سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے برادر عم زاد، داماد اور خلیفہ رابع سیدنا حضرت علی بن ابی طالب اسد اللہ الجبار رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زیر تربیت اور زیر کفالت پرورش پائی، اوران کا پورا بچپن اور پوری جوانی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر سایہ گزری، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحۂ عظیم پیش آیا تو آپ کی عمر ۳۳ سال تھی، آپ گوکہ عمر میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ثلاثہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق، حضرت سیدنا عمر الفاروق، حضرت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہم سے بہت چھوٹے تھے، لیکن منقبت اور فضیلت اور رفاقت ومحبت اور سلوک وبرتاؤ میں ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام اور تبلیغ دین کا آغاز کیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان چار میں سے ایک تھے، جنہوں نے اسلام سب سے پہلے قبول

کیا، جن میں ایک نمایاں نام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی ہے، اور یہ بات طے نہ ہوسکی کہ ان چاروں میں اولیت وسبقت کسے حاصل رہی، باقی دو میں ایک ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور آپ کے مولیٰ حضرت زید بن حارثہ ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے اعتبار سے ذات نبوی سے وہ خصوصیت حاصل تھی، جس خصوصیت میں دوسرا کوئی اس وقت ان کا شریک وسہیم نہیں تھا، اور ان چاروں سے ان کی اس خصوصیت وتعلق کی بناء پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی تعلق ومحبت تھی، اس تعلق میں پھر کبھی کمی نہیں آئی، بلکہ یہ تعلق ان حضرات کے کمالات و امتیازات وخصوصیات اور ہر موقع پر دین کی نصرت وحمایت اور تقویت پہنچانے سے مسلسل بڑھتا ہی گیا، یہاں تک کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی مدینہ منورہ ہجرت کا فیصلہ کیا، تو اس موقع پر بھی یہ تعلق ظاہر ہوا، اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو رفاقت وصحبت کے لئے منتخب فرمایا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس سفر ہجرت میں کچھ وقت ایک غار میں گزارنے کے تعلق سے انہیں ''ثانی اثنین'' کے خطاب سے نوازا اور فرمایا: ﴿ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ﴾ اس میں یہ لطیف اشارہ بھی ہے کہ امت کی قیادت وامامت اور خلافت نبوت کی ذمہ داری سنبھالنے میں ترجیح انہی کو حاصل ہوگی، ادھر اپنی نیابت کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نہایت لائق اعتبار برادر اعز واحب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا، اور اپنے بستر پر انہیں چھوڑ کر سفر ہجرت پر تشریف لے گئے، مدینہ منورہ کے قیام اور غزوات کے موقعوں پر بھی بار بار آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تعلق ان دونوں شخصوں سے ظاہر ہوتا رہا، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خصوصیت سے انہیں اپنی نیابت وخلافت سپرد کرتے، اور یہ ایسی ذمہ داری ہے جو اسی کو دی جاتی ہے جس کے بارے میں ذرہ برابر یہ خطرہ نہیں ہوتا، کہ وہ کہیں سے اس میں کمزوری دکھائے گا، اور حالات نے بھی اس کی گواہی دی کہ یہ دونوں بزرگ اس میں کھرے اترے، خلفائے اربعہ میں حضرت عمر

فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کے بھی نام روشن ہیں، جنہوں نے مکہ اور مدینہ دونوں جگہ دشمنوں کے بیچ جس اظہار حق اور جرأت ایمانی کا مظاہرہ کیا اور دین کو جو تقویت سامان اپنی اپنی وسعت وظرف اور صلاحیت واستعداد سے پہنچایا، اس نے ان کے مقام ومرتبہ کو خاصا بلند کیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان چاروں جانشینوں کے ساتھ جو خصوصیت وامتیاز کا معاملہ رکھا، اس میں ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ دینی تعلق واخوت کے ساتھ مصاہرت کا تعلق بھی قائم کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک ایک صاحبزادی کو زوجیت میں لیا، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دامادی کا شرف عطا کیا، اور ان چاروں کی فضیلت ومنقبت ایک ساتھ اور مستقل الگ الگ بھی ظاہر فرمائی، اور ہر معاملہ میں خصوصیت کا معاملہ رکھا۔

خواص اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے، اسی لئے ان چاروں پر انہوں نے کسی اور کو فضیلت نہیں دی، چنانچہ خلافت نبوت کے لئے جب جب خلیفہ کا امیر المومنین کے طور انتخاب ہوا، تو اسی ترتیب سے نام پیش ہوئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے بعد خلیفہ کے لئے چھ نام دئے تو ان میں بالترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام مقدم رکھے، اور پھر باقی عشرۂ مبشرہ کے نام تھے جو اس وقت حیات تھے، (۱) اور جو حیات نہیں تھے، جیسے حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ، تو ان کے نام کی اہمیت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ خلافت کے لئے لے کر پہلے ہی ظاہر کر چکے تھے۔

محدث جلیل مولانا محمد منظور نعمانیؒ اپنی مشہور ومقبول عام کتاب معارف الحدیث ۸/ ۴۰۷ میں خلفائے اربعہ کی فضیلت پر اہل حق کا اجماع نقل کرتے ہوئے

---

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زید کا نام نہیں لیا جس کی ظاہری وجہ قرابت قریبی سمجھی جاتی ہے کہ اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بڑے محتاط رہا کرتے تھے

لکھتے ہیں کہ:

''اہل حق کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ یہ چاروں حضرات تمام امت میں افضل ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس بارے میں واضح ہیں، جو کوئی بدعقیدہ شخص کسی دوسرے کو ان چاروں سے افضل جانے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تردید اور مخالفت کا مرتکب ہوا۔''

تنہا ان حضرات خلفاء اربعہ کو امت اصحاب اربعہ (حق چار یار) کے لقب سے یاد کرتی ہے، ان کے کمالات و امتیازات و خصوصیات کی بناء پر دوسروں پر ترجیح وفضیلت دینا اور ان کی عظمت کو تسلیم کرنا بھی کافی نہیں، دل سے محبت کرنا بھی ضروری ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اپنے ایمان کی خیر منانی چاہئے، اس لئے کہ حدیث میں صاف صاف آیا ہے بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، مسند عبد بن حمید ۱/۴۲۶ میں منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا يجتمع حبُّ هؤلاء الأربعة إلا في قلب مؤمن: أبى بكر وعمر وعثمان وعلي (رضى الله عنهم)."

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان چاروں ابوبکر وعمر وعثمان وعلی (رضی اللہ عنہم) کی محبت مومن کے ہی دل میں جمع ہوسکتی ہے)۔

مناظر اسلام مولانا محمد منظور نعمانیؒ اس حدیث کی بنا پر اہل سنت والجماعت کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اہل سنت والجماعت کا حال یہی ہے کہ وہ ان چاروں حضرات سے محبت کو گویا جزوِ ایمان یقین کرتے ہیں، اور جو بدنصیب ان

میں کسی ایک سے بھی بغض رکھے اس کو فاسد العقیدہ اور حقیقی ایمان سے محروم جانتے ہیں۔"(۱)

ترتیب خلافت میں حکمت خداوندی کی کارفرمائی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلافت کے لئے پہلے مرحلہ میں منتخب نہ ہونا اللہ کی بہت سی مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی تھا، نہ کہ ان کے کمالات میں کسی نقص یا اہلیت واستحقاق میں کسی کمی یا کمزوری کا نتیجہ، ایک بڑی مصلحت وحکمت ربانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسلامی تاریخ کے ذی بصیرت مؤرخ اور عظیم سیرت نگار نبوی اور اپنے عہد کے شہرۂ آفاق مفکر اسلامی وداعی الی اللہ مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ رقمطراز ہیں کہ:

"ہمارے نزدیک نہ یہ اتفاقی واقعہ تھا نہ کسی سازش اور منصوبہ بندی کا نتیجہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مسند خلافت پر آپ کے خاندان کے کسی فرد کے بجائے (جو بلاشبہ اعلیٰ انسانی اوصاف وکمالات کا حامل تھا) قریش کی ایک دوسری شاخ (بنو تمیم) کا ایک فرد (ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) مسلمانوں کے عام انتخاب وپسندیدگی کے مطابق متمکن ہوا، جو بنی ہاشم اور بنی عبد المطلب میں سے نہ تھا، تاکہ پہلے ہی مرحلہ میں یہ بات ذہنوں میں راسخ اور عالم آشکارا ہو جائے کہ اسلام کوئی وراثتی نظام اور خاندانی مسئلہ نہیں ہے، اس میں خلافت وامارت کا انحصار قابلیت، خدمات اور عام مسلمانوں کی عام پسندیدگی اور فیصلہ پر ہے۔"(۲)

---

(۱) معارف الحدیث ۸/۷-۴۰۶۔ (۲) دین اسلام اور اولین مسلمانوں کی دو متضاد تصویریں - عقائد اہل سنت وعقائد فرقہ اثنا عشریہ کا تقابلی مطالعہ ص ۴۲/۴۷

اسی طرح یہ ایک تقدیری بات تھی اور اللہ کے یہاں اسی طرح یہ نظام طے تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر دین کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور وحی کا سلسلہ بند ہو جانے سے اب اس کی تدوین اور تنفیذ کا مسئلہ تھا، اور اسی کو رہتی دنیا تک کے لئے نمونہ بننا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس شخصیت کو وہ زمانہ دیا جس زمانہ کو ویسی شخصیت درکار تھی، دین میں پہلا درجہ ایمان وعقائد کا اور پھر عبادت کا ہے، پھر حقوق العباد، اخلاق و معاشرت اور معاملات کا مرحلہ ہے، انفرادی اجتماعی، عائلی خاندانی بشری حقوق ومعاملات اور اس کے لئے انتظامی جزئیات اور اس میں شریعت کی رہنمائی، جس کے لئے پوری شریعت کے تعلیم وتعلم کی ضرورت پڑتی ہے، اور دعوت و تبلیغ کا کام ہے، اور پھر ان تمام کاموں کو آخرت کی جواب دہی، اللہ کے حضور حاضری اور اس جذبہ واحساس کے خیال کے ساتھ کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کے زبان و ہاتھ کی تکلیف واذیت سے دوسرے محفوظ رہیں، انجام دینا ہے اور یہی ایمان واسلام اور احسان کی تقسیم ہے، اور یہی مقاصد بعثت کے درجات ہیں، تلاوت کتاب الٰہی، تعلیم کتاب وحکمت، ودعوت وتبلیغ اور آخری لیکن بڑا اہم مقصد تزکیۃ النفوس ہے، جسے حدیث کی اصطلاح میں احسان اور زہد واستغناء سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ ایمان و عقائد کی سب سے بڑی خدمت اور عبادات کے تعلق سے صحیح نقطۂ نظر پیش کرنے اور تلاوت کے تعلق سے دیکھا جائے تو قرآن مجید کی تدوین وحفاظت کا سب سے بڑا اور نازک ترین کام خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ذریعہ انجام پایا، پھر حضرت عمرؓ کے دور میں کتاب الٰہی کی تعلیمات کو ایک ایک کر کے پورے طور سے اور بڑی دقت نظری اور باریک بینی سے جس طرح نافذ کیا گیا، اور ان دونوں عہد کے کاموں کی تکمیل حضرت عثمانؓ کے ذریعہ ہوئی، اور ان تینوں کو مکمل تعاون حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف سے ملا، اب درجۂ احسان اور تزکیہ کا جو کام اجتماعی شکل میں اور ہمیشہ کے لئے نمونہ کے طور پر پیش کرنے کا باقی تھا یہ سعادت حضرت علی کرم اللہ

وجہہ کے لئے مقدر تھی، اور یہ سعادت اس لیے بھی ان کے حصہ میں تھی کہ آغاز نبوت و رسالت کے وقت آپ پختگی کی عمر کو نہیں پہنچے تھے، جس عمر کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پہنچے ہوئے تھے، اور ان کے قریبی عمر کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پہنچے ہوئے تھے، اور بعض وہ صلاحیتیں اور امتیازی خصوصیتیں جو ان حضرات کو انفرادی طور پر الگ الگ حاصل تھیں، ان سب امور خیر سے بھی آپ کو منتفع ہونے کا پورا موقع ملا، اور جب سب سے سنگین حالات اور مشکل دور میں قیادت و امامت اور رہبری کا موقع ملا، اور منصب خلافت نبوت کی تکمیل کی سعادت آپ کے حصہ میں آئی، تو پھر آپ نے ایک طرف پورے صبر وتحمل کے ساتھ اور دوسری طرف پوری جرأت وشجاعت کے ساتھ اور ایک طرف پوری دینی بصیرت وفراست اور زہد واتقاء کے ساتھ اور دوسری طرف فتن وملاحم پر پوری نظر اور امامت وخلافت کی پاسداری اور استحکام مملکت کے جذبہ کے ساتھ وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ اگر ذرا غفلت یا عجلت اور لوگوں کے جذبات وانفعالات سے متاثر ہوکر اقدام کیا جاتا، اور ظاہر احکام شریعت پر غور وفکر کئے بغیر حالات کے مطالعہ اور واقعات کے پس منظر اور باطنی علل و اسباب اور عواقب کو سامنے رکھے بغیر کوئی قدم اٹھایا جاتا تو پھر امت کا شیرازہ بکھر جاتا، اور دین وشریعت اور حدیث وسنت نبوی کے صحیح مزاج ومذاق سے نہ صرف واقفیت کا بعد والوں کے لئے دروازہ بند ہوجاتا بلکہ وہ سب راستے مسدود ہوجاتے جن سے مدینۃ العلم اور علاقۂ دین میں آدمی داخل ہوتا، اسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی سمجھ میں آجاتے ہیں، جن میں آپ کو حکمت کا دروازہ اور مدینۃ العلم کا مدخل قرار دیا گیا، الفاظ حدیث اس طرح ہیں:

"عن علیؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أنا دار الحکمۃ وعلیؓ بابھا۔"(۱)

---

(۱) رواہ الترمذی۔

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "کہ میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔"

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

"أنا مدينة العلم و عليٌّ بابها." (۱)

(کہ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں)۔

خلافت حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ اور بعض شبہات کا ازالہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے سانحہ عظیم کے بعد سے ہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد کی بات چلائی گئی، مگر چونکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشا معلوم تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ زیادہ مستحق ہیں اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو نماز میں آگے بڑھایا، اور حج میں اپنا نائب بنا کر امیر بنانے سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ ان کے استحقاق کو بخوبی سمجھتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انصار و مہاجر صحابہ رضی اللہ عنہم نے بیعت کی، ان کا اور ان کے بعد کے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پورے خلوص و ایثار و وفا کے ساتھ تعاون دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد ان کی شخصیت سب میں سب سے محترم اور مستحق خلافت تھی اور امت نے ان ہی کو چوتھا خلیفہ اور ان کے دور کو خلافت راشدہ و خلافت نبوت کا آخری دور قرار دیا، جو گزشتہ ادوار خلافت نبوت سے متصل اور غیر منقطع ہے، مشہور محقق عالم علامہ خالد محمودان کے اسباب استحقاق خلافت نبوت پر گفتگو کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

۱- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انتخاب خلیفہ کے جو چھ رکنی کمیٹی بنائی تھی، ان

---

(۱) معارف الحدیث ۸/ ۳۷۵-۳۷۶

کی بات ان دو ناموں پر ختم ہوئی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ چن لیا جائے، وہ دو کون تھے؟ ۱- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ،۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہو چکے ہیں، سو اس وقت پوری امت میں سب سے زیادہ خلافت کے لائق حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے پوچھا تھا، اگر ہم آپ کو خلیفہ نہ بنائیں تو آپ کی رائے میں کسے خلیفہ ہونا چاہیے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: علی رضی اللہ عنہ کو۔

۲- حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بالمقابل کسی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا، نہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے، نہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے، نہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے، یہ حضرات قصاص عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے اٹھے تھے، یہ اپنے لیے کسی متبادل خلافت کے داعی نہیں تھے، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی پرانی پوزیشن (حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مقرر کردہ گورنر شام) پر کھڑے تھے اور کہتے تھے: جو لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے باغی رہے ہیں، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوجوں سے نکل جائیں تو میں پہلا شخص ہوں گا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرے گا، سو حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے دور میں تن تنہا منصب خلافت پر تھے، جب کوئی دوسرا اپنے لیے مدعی خلافت نہیں ہوا، تو آپ ہی احق بالخلافہ ہوئے تھے۔

۳- ۴۰ھ میں آپ میں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ میں جنگ بندی کا معاہدہ ہوا، مہادنۃ اس وقت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ ایک آزاد حکمراں کی حیثیت میں تھے، اب ان دونوں بزرگوں میں احق بالخلافہ کون ہے؟ اس کے لیے ان امور کو پیش نظر رکھیے:

(الف) حضرت علی رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے ہیں اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے نہیں۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مہاجرین کو "أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ"

(یہی لوگ (مہاجرین) ہی سچائی اختیار کرنے والے ہیں) کی سند دی ہے، اور دوسری جگہ امت کو حکم دیا ہے کہ "وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ" (تم صادقین کے ساتھ ہو جاؤ)۔(۱)

(ج) ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اسی آیت سے استدلال کیا، تفسیر مواہب الرحمٰن میں ہے:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے زمانہ خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ میں اسی سے احتجاج کیا کہ اے لوگو! بحکم آیت کریمہ تم حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے اصحاب کے ساتھ ہو جاؤ۔"(۲)

۴۔قرآن کریم میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خلافت کا وعدہ اس آیت میں کیا گیا:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ" (۳)

(اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو تم ایمان لائے اور اچھے کام کیے کہ ان کو زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا)۔

یہ وعدہ ان صحابہ سے ہے جو اس وقت ایمان لا چکے تھے، "آمَنُوْا" صیغہ ماضی ہے، ان کے لیے خلافت موعود ہو گئی تھی، یہی خلافت راشدہ ہے جس کا اللہ نے صحابہ کو وعدہ دیا تھا، حضرت علی رضی اللہ عنہ ان میں سے ہیں جو اس وقت ایمان لا چکے تھے اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اس وقت تک صف اول میں نہ آئے تھے، یہ وعدہ خلافت کے بارے میں ہے، البتہ جنت کا وعدہ سب سے ہے: "وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" (۴)

---

(۱) سورۂ توبہ/۱۱۶۔ (۲) تفسیر مواہب الرحمٰن پارہ/۱۱، ص/۵۷۔
(۳) سورۂ نور/۵۵۔ (۴) سورۂ حدید/۱۰۔

۵-قرآن کریم میں "وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ" (۱) میں مہاجرین اور انصار کے سابقین اولین فی الاسلام کو مقتدا قرار دیا گیا ہے، کیونکہ جو ان کے بعد آئے ان سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہوا، ظاہر ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی اور کو مقتدا نہیں ٹھہرائیں گے، یہی حضرات ہیں جن کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سابقین اولین میں سے تھے، وہ بعد میں آنے والوں کے بھی پیشوا ہوں گے نہ کہ مقتدی۔

۶-حضرت علی رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے پہلے اسلام کی راہ میں قتال کر چکے تھے، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے کچھ پہلے ایمان لائے تھے، ان دونوں میں احق بالخلافہ کون ہیں؟ اس کے لیے قرآن کریم کی یہ اصولی ہدایت پیش نظر رہنی چاہیے کہ سابقین کی برابری کوئی نہیں کرسکتا:

"لَا يَسْتَوِىْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ، اُولٰئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوْا، وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" (۲)

(تم میں کوئی ان لوگوں کے برابر نہیں ہوسکتا جنھوں نے فتح مکہ سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا، وہ لوگ مقام و مرتبہ میں ان لوگوں سے بلند ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا، البتہ اول و آخر تمام اہل ایمان سے اللہ کا اچھا وعدہ ہے)۔

۷-حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کو پہلے تینوں خلفاء کی خلافت سے متصل رکھا ہے، بلافصل، آپ نے اپنی خلافت کو ان ہی کی خلافت پر مبنی قرار دیا، آپ نے فرمایا:

"میری بیعت زیادہ تر ان ہی لوگوں نے کی ہے جنھوں نے

---

(۱) سورۂ توبہ/۱۱۰۔ (۲) سورۂ حدید/۱۰۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بیعت کی تھی۔"

ظاہر ہے کہ یہ تسلسل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وقت صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے تھے، اس دور میں کوئی اوران خلفائے ثلاثہ سے متصل نہیں ہوا، نہ ان کا چوتھا ہونے کا کوئی دعویدار تھا۔

سو آپ کی خلافت من بیت الخلافہ متفق علیہ تھی۔(۱)

امتیازات وخصوصیات

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افراد اہل بیت نبوی اور جماعت صحابہ بالخصوص خلفائے راشدین وعشرۂ مبشرہ میں جو امتیازات وخصوصیات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل ہوئیں، ان کا ذکر کیا جاتا ہے، حضرت شعبہ حضرت سلمہ بن کہیل رضی اللہ عنہ سے اور حضرت ابوالطفیل تابعی سے اور وہ حضرت ابوشریحہ حذیفہ بن اسید الغفاری رضی اللہ عنہ صحابی یا حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت (۲) کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مَنْ كُنْتُ مَوْلاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ."

(میں جس کا محبوب اور دوست ہوں تو علی بھی اس کے محبوب اور دوست ہیں)۔

امام ترمذی نے یہ روایت اپنی سنن میں کتاب المناقب میں ذکر کر کے اس کی تحسین وتصحیح فرمائی ہے اور کہا ہے: "هذا حديث حسن صحيح" مسند احمد میں یہ حدیث بروایت حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، اور یہ دعائیہ جملہ بھی مذکور ہے:

---

(۱) حق چاریار، جلد ۸/ ۲۷، شمارہ/ ۹، ص/ ۴۸-۴۹، ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ/ ستمبر ۲۰۱۴ء۔

(۲) اس حدیث کے رواۃ میں راوی حضرت شعبہ کو صحابی کے نام میں شبہ ہوا تھا اس لیے "اَوْ" کی تعبیر استعمال کی جس کا ترجمہ اردو میں "یا" سے کیا جاتا ہے۔

"اللّٰھم والِ من والاہ ، وعادِ من عاداہ."

(کہ اے اللہ جو علی (رضی اللہ عنہ) سے دوستی ومحبت رکھے تو اسے دوست فرما، اور جو ان سے دشمنی رکھے تو بھی اس کے ساتھ دشمنی کا معاملہ فرما)۔

اس کے بعد مسند احمد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تہنیت پیش کرنے کا ذکر ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

" فلقیہ عمر بعد ذلك فقال لہٗ ھنیئاً یا ابن أبی طالب! أصبحت وأمسیت مولیٰ کلّ مؤمن ومؤمنة."

(اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے ملاقات کی تو ان سے فرمایا: اے علی بن ابی طالب! آپ کو مبارک ہو کہ اب آپ ہر مومن مرد وعورت کے دوست بن گئے ہیں)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تہنیت بڑی اہمیت کی حامل ہے، کہ صحابہ کرام کی بڑی تعداد کی موجودگی میں اور اس وقت جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے مناسک سے فارغ ہو کر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے، اور جحفہ میں دو تین میل کے فاصلہ پر واقع مقام خُم میں ایک تالاب (غدیر) کے پاس قیام فرما کر خطبہ دیا جس میں کچھ اہم ترین باتیں، وصیتیں اور ارشادات بیان فرمائے کہ اب بظاہر دنیا میں زیادہ دن رہنا نہیں ہے، اور وقت موعود قریب ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت سے جو تعلق رہا ہے اس کا تقاضہ ہے، کہ اہل ایمان اپنی جان ومال، ماں باپ، اہل وعیال اور سبھی سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت وتعلق رکھیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی۔

مسند احمد کی روایت میں پس منظر کا اجمالاً یوں ذکر ہے کہ:

"......أنّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمّا نزل بغدیر

ثُمَّ أخذَ بيد علي فقال: ألستم تعلمون أنا أولىٰ لكلّ مؤمنٍ منْ نفسهِ ؟ قالوا بلى! قال: اللهم منْ كنتُ مولاه فعليٌّ مولاهُ." الخ.

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غدیر خم میں نزول فرما ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ تم لوگ یقین رکھتے ہو کہ میں ہر ایمان والے کے لیے اس کی جان سے زیادہ قریب وعزیز ہوں، سب نے کہا: بیشک، (اس کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: میں جس کو محبوب ہوں علی بھی اس کے محبوب ہوں)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر عام حاضرین اور رفقائے سفر سے کہ جن کا بظاہر ایک وقت میں کسی ایک مقام پر جمع ہونا آسان نہ تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے سانحۂ عظیم کے قرب کو محسوس کرتے ہوئے کچھ اہم باتوں کی طرف توجہ دلانی ضروری سمجھی کہ بہت سے امکانات حسنہ اور توقعات کے ساتھ آپؐ کے سامنے یقینی طور پر خدشات اور خطرات بھی رہے ہوں گے، اور جو چیزیں دین وایمان کے تعلق سے بڑے خطرات کو دعوت دینے والی بنا کرتی ہیں، ان توجہ طلب باتوں میں اہم ترین بات اللہ اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق کا کم ہونا ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف متعدد موقعوں پر توجہ دلائی، اور اس اہم موقع پر جب کہ حج کے سفر سے سب کی واپسی ہو رہی تھی، زیادہ دن گزرے نہ تھے، ذوالحجہ کی ۱۸ر تاریخ تھی، اور چونکہ محبوب کے محبوب سے محبت محبت کو جلا بخشتی ہے، اور گھر کے افراد سے خاص طور پر محبت کرنا صاحب بیت سے ہی محبت ہوتی ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق، اسلام میں سبقت،

تربیت و پرورش، کفالت، اخوت، اور پھر بڑے ہی محسن چچا کی نسبت کہ چچا کے ایمان نہ لانے کے صدمہ کو ان کی اولاد سے تعلق اور حسن برتاؤ سے ہلکا کرتے، اس پر مستزاد دامادی کا رشتہ اور ان چہیتی بیٹی کی نسبت سے جنہوں نے مکی زندگی میں قریش مکہ کی طرف سے اذیتیں اور زیادتیاں اپنے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سہتے دیکھا تھا، اور بعض اوقات خود انہیں اذیت دور کرنے کے لئے جرأت سے کام لینا پڑا تھا، اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ احساس کہ یہ وفات کا صدمہ مزید برداشت کریں گے، مزید یہ کہ گھر کے مرد ہی باہر کے لوگوں سے معاملات کرتے ہیں اور محبت و تعلق کا سامنا بھی انہی کو کرنا ہوتا ہے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ تو ۸/اور ۷/رسال کے تھے، یہی حضرت علی کرم اللہ وجہہ دیکھا جائے تو گھر کے صحیح اور مکمل نمائندے تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خصوصیت و امتیاز آپ کے ساتھ برتاؤ اور ان سے تعلق و محبت رکھنے کا اشارہ دیا، کہ دراصل یہ تعلق و محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ہوگا، اور اس میں ایک حکمت اور نظر آتی ہے کہ ایسی صورتحال میں گھر کے افراد میں کوئی شخص نمایاں حیثیت سے سامنے ہو اور وہ اس مقتدا اور مطاع شخصیت سے اسوہ و کردار میں قریب ہو تو لوگ اس سے تعلق کا اظہار کر کے اپنا غم ہلکا کر لیتے ہیں، ورنہ یہ انسانی کمزوری ہے کہ وہ پھر یا تو اس کا مجسمہ و تمثال بنا کر عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں، یا تو قبر کو سجدہ گاہ بنا کر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس حکیمانہ انداز سے ان مشکلات کا بہترین حل نکال لیا، اور امت کو بڑے فتنہ سے بچا لیا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ اور برتاؤ اس کے عین مطابق رہا، اور دو دہائی یا ربع صدی کے گزرنے پر حالات نے نیا رخ لیا تو اس وقت عجمی نژاد لوگوں کی کثرت ہو چلی تھی، جن کی طبیعت اسلام کی روح و مزاج سے ہم آہنگ اور موافق نہیں تھی، اور ان کا زور اتنا بڑھ گیا تھا کہ بقیہ اصحاب الرسول یا تو گوشہ نشین ہو گئے تھے یا پھر اپنے اپنے لحاظ سے فتنوں کے مقابلہ کے لیے

کھڑے ہوگئے تھے، جس میں کچھ ٹکراؤ کی صورت تاریخ اسلام کے مؤرخین نے سپرد قلم کی، لیکن صحیح بحث وتحقیق کے بغیر رطب ویابس سے تاریخ کو بھر دیا، اسی کو بار بار دہرایا جاتا رہا جبکہ تاریخ کی تدوین کا کام کرنے والوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس میں احتیاط سے کام لیتے اور قرآن مجید کے فیصلہ کو نظرانداز نہ کرتے، اور اللہ رب العالمین کی تعریف وتوصیف کو بالاتر رکھتے کہ ﴿رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾(۱) اور ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ (۲) سے ان کے مزاج، افتادِطبع، اخلاق، برتاؤ، دین کی خاطر نرمی وگرمی اور اللہ کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کو واضح کردیا گیا ہے، اور اس سے بڑھ کر کوئی اور تصویر کشی نہیں ہوسکتی، اور جو اس کے خلاف کرے گا وہ خلاف واقعہ بات بیان کرنے کا مرتکب ہوگا، اور جو مشاجرات اور اختلاف نظر آئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کی نیتیں پاک وصاف اور دین کے مفاد کو اپنی اپنی نگاہ میں ترجیح دینی والی تھیں، اسی لیے ان سب کو اللہ کی رضا حاصل ہوئی رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ انھیں بعض وہ خصوصیات حاصل ہیں جن میں دوسرا ان کا شریک نہیں، سماک بن حرب حضرت عکرمہ مولیٰ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"لعلی أربع خصال لیست لأحد غیره: هو أول عربی و عجمی صلی مع رسول الله صلی الله علیه وسلم، وهو الذی کان لواء ه معه فی کل زحف، وهو الذی صبر معه یوم فر عنه غیره، هو الذی غسله وأدخله فی قبره." (۳)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ کی چار ایسی خصوصیات ہیں جو ان کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہیں، وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے سب

---

(۱) سورۂ فتح /۲۹۔ (۲) سورۂ مائدہ/۵۴۔ (۳) الاستیعاب لابن عبدالبر ۳/۱۹۷

سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، ان کا جھنڈا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا تھا، اور اس موقع پر جب لوگ کنارے ہو گئے حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ جمے رہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غسل جنازہ دینے اور قبر شریف میں اتارنے کی سعادت حاصل ہوئی)۔

ابن اسحاق علیہ الرحمہ کہتے ہیں:

"أول من آمن بالله وبرسوله محمد صلى الله عليه وسلم من الرجال علي بن أبي طالب، وهو قول ابن شهاب إلا أنه قال: من الرجال بعد خديجة وهو قول الجميع في خديجة." (۱)

(ابن شہاب زہری علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق پہلے شخص علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے، حضرت خدیجہ کو چھوڑ کر کہ ان کے متعلق سب کا اتفاق ہے کہ وہ سب سے پہلے ایمان لائی ہیں)۔

حافظ ابن عبد البر الاندلسی نے صحابہ میں حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ، حضرت مقدادؓ، حضرت خبابؓ، حضرت جابرؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت زید بن الارقم رضی اللہ عنہ سے حضرت علی بن ابی طالب کی اسلام لانے میں اولیت اور فضیلت ذکر کی ہے۔ (۲)

---

(۱) الاستیعاب لابن عبد البر ۳/ ۱۹۷

(۲) حافظ ابن عبد البر الاندلسی (م ۴۶۳ھ) نے مختلف روایات کو جمع کر کے جن میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے میں اولیت و فضیلت کا ذکر ہے، یہ تطبیق دی ہے کہ در حقیقت سب سے پہلے اسلام حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی لائی ہیں، اور مردوں میں حضرت علی بن ابی طالب کو یہ شرف ملا، جہاں تک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق ہے تو وہ تیسرے ہیں لیکن اسلام کے اظہار و اعلان میں پہلے ہیں، کہتے ہیں: "والصحيح في أمر أبي بكر أنه أول من أظهر إسلامه" -

حضرت سلمان فارسی کی روایت سے یہ خصوصیت بھی ذکر کی ہے کہ یہی چیز انھیں حوض کوثر پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سب سے پہلے لے جانے والی بنے گی، ارشاد ہے:

"عن سلمان الفارسي قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أولكم وروداً على الحوض أولكم إسلاماً: علي بن أبي طالب رضي الله عنه." (۱)

(حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حوض کوثر پر سب سے پہلے آنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہوں گے)۔

جہاں تک نماز کا تعلق ہے، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت دوشنبہ کو ملی اور منگل کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز ادا کی، حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نماز ادا کی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلسل رفاقت وصحبت تھی اور وہ ساتھ ساتھ چلتے، اور جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انجام دیتے وہ انجام دیتے، عفیف کندی سے عن أبيه عن جده (کہ وہ اپنے والد سے اور وہ

= انھوں نے محمد بن کعب قرظی کی روایت بھی اس سلسلہ میں نقل کی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ اسلام پہلے کس نے قبول کیا، علیؓ نے یا ابوبکرؓ نے؟ جواباً کہا: سبحان الله! علی أولهما اسلاما وإنما شبه على الناس لأن عليا أخفى اسلامه من أبي طالب، وأسلم أبوبكر فاظهر اسلامه، ولا شك أن عليا عندنا أولهما اسلاما. (استیعاب لابن عبدالبر ۳/۱۹۹)

(۱) الاستیعاب لابن عبدالبر ۳/۱۹۸

اپنے والد سے روایت کرتے ہیں) روایت ہے:

"كنت امرءاً تاجرا فقدمت الحج فأتيت العباس بن عبد المطلب لابتاع منه بعض التجارة وكان امرءا تاجرا فوالله إني لعنده بمنى إذا خرج رجل من خبء قريب منه، فنظر إلى الشمس فلما رآها قد مالت قام يصلي، قال: ثم خرجت امرأة من ذلك الخبء الذي خرج منه ذلك الرجل، فقامت خلفه تصلي، ثم خرج غلام قد راهق الحلم من ذلك الخبء، فقام معهما يصلي، فقلت لعباس: من هذا يا عباس؟ قال: هذا محمد بن عبد الله بن عبد المطلب، ابن أخي، قلت من هذه المرأة؟ قال: هذه امرأته خديجة بن خويلد، قلت: من هذا الفتى؟ قال: علي بن أبي طالب ابن عمه، قلت ما هذا الذي يصنع؟ قال: يصلي، وهو يزعم أنه نبي ولم يتبعه فيما ادعى إلا امرأته، وابن عمه هذا الغلام، وهو يزعم أنه سيفتح عليه كنوز كسرىٰ وقيصر، وكان عفيف يقول قد أسلم بعد ذلك وحسن إسلامه: لو كان الله رزقني الاسلام يومئذ فأكون ثانيا مع علي" (١)

(میں کاروباری شخص تھا، حج کے لیے حاضر ہوا، وہاں عباس بن عبدالمطلب سے کچھ سامان تجارت بھی خریدنا تھا، وہ بھی تجارت کرتے تھے، بخدا میں ان کے پاس منیٰ میں تھا، اتنے میں ان کے قریب کے خیمہ میں سے ایک شخص ظاہر ہوئے اور سورج کو

(١) الاستیعاب لابن عبدالبر ۳/۲۰۱

دیکھنے لگے، جب دیکھا کہ غروب ہوگیا ہے، تو نماز کے لیے کھڑے ہوگئے، کہتے ہیں کہ پھر اسی خیمہ سے ایک خاتون نکلیں اوران کے پیچھے نماز کے لیے کھڑی ہوگئیں، پھر ایک لڑکا نکلا وہ بھی نماز کے لیے کھڑا ہوگیا، میں نے عباس سے کہا کہ یہ کون ہیں؟ عباس نے کہا یہ میرے بھتیجے محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، میں نے کہا یہ خاتون کون تھیں؟ انھوں نے کہا یہ ان کی بیوی ہیں خدیجہ بنت خویلد، میں نے کہا یہ لڑکا کون ہے؟ انھوں نے کہا ان کا چچازاد بھائی علی بن ابی طالب ہے، میں نے کہا یہ کر کیا رہے ہیں، انھوں نے کہا نماز پڑھ رہے ہیں، اور وہ اپنے کو نبی کہتے ہیں، اوران کی اس بات میں ان کی یہ خاتون اوران کے یہ بھائی یقین رکھتے ہیں، اور وہ یہ بھی کہتے ہیں قیصر وکسریٰ کے خزانے جلد ہی وہ فتح کرلیں گے، حضرت عفیف جو بعد میں مسلمان ہوگئے، کہا کرتے تھے کاش میں اسی وقت مشرف بہ اسلام ہوجاتا تو علی کے بعد دوسرا نمبر میرا ہوتا)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ تبوک میں انھیں ساتھ نہ لے جاکر اپنا قائم مقام بنادیا تھا، اوراہل بیت پرنگراں مقرر کیا تھا، اور پھر یہ بات ان کو مخاطب کرکے فرمائی: "أنت بمنزلة هارون من موسىٰ إلا أنه نبي ولا نبي بعدي" اس حدیث کوامام مسلمؒ نے صحیح میں، امام ترمذیؒ نے سنن میں، امام ابن ماجہ، امام احمد، امام طبرانی رحمہم اللہ نے ذکر کیا، حافظ ابن عبدالبر استیعاب میں لکھتے ہیں کہ متعدد صحابہ وصحابیات سے یہ روایت مروی ہے اور کہا ہے کہ "هو من أثبت الآثار وأصحها."(۱)

---

(۱) استیعاب ۲۰۲/۳

اسی طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے مواخات فرمائی، علامہ ابن عبدالبر اندلسی (۴۶۳ھ) کہتے ہیں:

"آخی رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم بين المهاجرين بمكة ثم آخى بين المهاجرين و الأنصار بالمدينة و قال في كل واحدة منهما لعليّ: "أنت أخي في الدنيا والآخرة" وآخى بينه و بين نفسه."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں باہم مہاجرین کے مابین مواخات کرائی پھر مدینہ منورہ میں مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات کرائی، اور دونوں موقعوں پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم دنیا وآخرت میں میرے بھائی ہو، اور اپنے اور ان کے مابین مواخات فرمائی)۔

اور ایک خصوصیت یہ بھی عطا ہوئی کہ خیبر جب فتح نہیں ہو رہا تھا اور مشکل پیش آ رہی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لأعطين الراية غدا رجلا يحب اللّٰه و رسوله، ويحبه اللّٰه ورسوله، ليس بفرار، يفتح اللّٰه على يديه."(۲)

(میں کل اس شخص کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اور اس کے رسول کو اس سے محبت ہے، بھاگنے والا نہیں ہے، اللہ اس کے ذریعہ فتح عطا فرمائے گا)۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو آشوب چشم تھا، لیکن ان ہی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور ان کی دونوں آنکھوں میں دم کیا اور جھنڈا عنایت فرمایا اور اللہ نے فتح سے کامران کیا، جبکہ یہ ایسا موقع تھا کہ ہر ایک کی تمنا اور خواہش یہ تھی کہ کل اس کام کے

(۱) الاستیعاب ۳/۲۰۲-۲۰۳

(۲) بخاری ومسلم وترمذی وابن ماجہ ومسند احمد وبیہقی۔

لیے جسے دعوت دی جائے اس جگہ پردہ ہو۔(۱)

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عنفوان شباب میں ان کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا، انھوں نے اس جلیل القدر کام ومنصب کے لیے اپنی عدم اہلیت کا ذکر کیا تو سینہ پر ہاتھ رکھ کر دعا دی: "اللّٰھم اھد قلبه و سدّد لسانه" (۲) (کہ ان کے دل کو ہدایت والا بنا اور ان کی زبان کو درست رکھ)، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد دو لوگوں کے درمیان فیصلہ میں مجھے پریشانی نہیں ہوئی۔

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب آیت کریمہ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾ (۳) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ البتول، ان کے شوہر حضرت علی، دونوں صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ایک چادر میں ڈھانپ کر یہ دعا کی کہ:

" اللّٰھم إن ھولاء أھل بیتی فأذھب عنھم الرجس وطهّرھم تطھیراً. "(۴)

(کہ بارالٰہا! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے رجس کو دور فرما اور ان کی مکمل تطہیر وتزکیہ فرمایا)۔

یہ ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی روایت ہے اور حافظ ابن عبد البر اندلسیؒ نے حضرت ام سلمہؓ کے ہی گھر کا یہ واقعہ قرار دیا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے محبت وتعلق نفاق سے براءت اور کمالِ ایمان کی علامت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو تعلق تھا وہ شروع

---

(۱) ملاحظہ ہوں کتب حدیث وسیر۔ (۲) ابن ماجہ۔
(۳) سورۂ احزاب/۳۳ (۴) استیعاب ۳/۲۰۳ و ترمذی، کتاب التفسیر، رقم/۳۲۰۵۔

سے تھا اور آخر تک رہا، جس میں خاندانی قربت، اسلام میں اولیت اور دین کی خاطر ہر موقع پر بڑی سی بڑی قربانی دینے کو تیار رہنا، منشاء نبوی کا پورا پورا خیال اور سمع وطاعت کا آخری درجہ میں سلوک و برتاؤ، دنیا سے بے رغبتی اور جرأت وشجاعت ایسی خصوصیات تھیں کہ جس کی وجہ سے ان کو حیدر، ذوالفقار، المرتضیٰ، اسد اللہ جیسے القاب سے نوازا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے محبین و متعلقین کے لیے چاہا کہ وہ آپ کے بعد حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے خصوصی تعلق رکھیں، اور یہ بات یوں ہی نہیں ہے بلکہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین کے اٹھ جانے کے بعد ان کے اہل تعلق ومحبت کے ساتھ اچھے برتاؤ اور حسن تعلق کو بڑی نیکی بتایا تھا اور دوسری احادیث میں کمال ایمان کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ والدین، اولاد، مال ومتاع اور سبھی محبت وتعلق والی چیزوں سے کہیں زیادہ محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات عالی صفات سے ہو، اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت پر شفقت اور امت کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہوئے اپنی اصحاب ومعاونین اور رفقاء دین ودعوت وہجرت وجہاد کے لیے خاص طور پر اور عمومی طور پر سارے اصحاب کے ساتھ محبت وتعلق کا امت کو اشارہ دیا، اور سبھی صحابہ کو خصوصیت کے ساتھ مہاجرین و انصار اور ان میں بھی سابقین اولین اور بالاخص اہل بیت کرام اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ وہ جو آپ کی گود میں پلے بڑھے اور ہر خوشی وغم اور تکلیف و راحت میں شریک رہے قابل ذکر ہیں، اگر غور وفکر سے کام لیا جائے تو متعدد نوعیتوں اور مختلف حیثیتوں سے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو اس میں نمایاں مقام حاصل ہے، اور اس کا اظہار بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اس طرح فرمایا، جب ایک سریہ (لشکر) کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی سرکردگی (امارت) میں بھیجا تھا اور ان کا ایک فیصلہ بعض لوگوں کو اپنی طبیعت کے موافق نہ لگا اور سفر سے واپسی پر ان میں سے چار لوگوں نے یکے بعد دیگرے آنحضورؐ کے سامنے یہ

بات رکھی، تو ہر ایک سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمایا اور چہرۂ مبارک پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے، اور دوبار (مکرر) یہ بات فرمائی کہ:

"ما تريدون من علي؟ ما تريدون من علي؟ إن علياً مني وأنا منه وهو ولي كل مؤمن من بعدي."

(کہ علی تو مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں اور وہ تو میرے بعد ہر مومن کے ولی (محبوب) ہوں گے)۔(۱)

اس خصوصی تعلق کا اظہار خود حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سے بھی بذات خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بروایت حضرت براء بن عازب منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "أنت مني وأنا منك."(۲) (تم مجھ سے ہو، اور میں تم سے ہوں)۔

حضرت حبشی بن جنادہ سے بھی ایسا ہی مضمون منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "علی منی و أنا من علی."(۳) (علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں)۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو لشکر بھیجے تھے، ایک پر امیر حضرت علی بن ابی طالب کو بنایا اور دوسرے پر امیر حضرت خالد بن ولید کو بنایا، جب مقابلہ کا وقت آیا تو حضرت علی امیر ہوئے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قلعہ فتح کرلیا، آگے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک مسئلہ کو لے کر میری حاضری ہوئی (ان کا اشارہ اس خط کی طرف تھا جو دوسرے لشکر کے امیر نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا تھا اور حضرت علیؓ کے متعلق ایک شکایت کی تھی) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہوگیا، پھر فرمایا:

(۱) سنن ترمذی کتاب المناقب باب مناقب علی بن ابی طالب، حدیث/۳۷۱۲، بروایت حضرت عمران بن حصینؓ
(۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔

"مـا تـری فـی رجـل یـحـب اللّٰہ ورسـولـہ ویحبـہ اللّٰہ ورسولہ؟"

(تم ایسے شخص کے بارے میں کیا چاہتے ہو، جس کو اللہ اور اس کا رسول محبوب ہے اور وہ اللہ اور اس کے رسول کو محبوب اور پیارا ہے)۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، میں نے عرض کیا:

"أعـوذ بـاللّٰہ مـن غـضـب اللّٰہ وغضب رسولہ وإنما أنا رسول."

(اللہ کے غضب سے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے غضب سے اللہ کی پناہ، اور میں تو بس قاصد ہوں (یعنی بس اطاعت امیر میں اس غلطی کا مرتکب ہوا)۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کی اس معذرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلم نے خاموشی اختیار فرمالی۔(۱)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جو محبت تھی اس کا طرح طرح سے اظہار ہوتا تھا۔

چنانچہ اس کے نتیجہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زیادہ غیبوبیت بھی برداشت نہ تھی، یہ اس انسانی نفسیات اور بشری جذبات واحساسات اور اس افتاد طبع کا بھی نتیجہ تھا جو شفقت ومحبت کا مادہ زیادہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جن سے خونی تعلق ہوتا ہے ان پر اس کا زیادہ اظہار ہوتا ہے، جبکہ ایمانی تعلق مستزاد ہو، اور دوسری قربتیں اور اضافہ کا باعث ہو رہی ہوں، ام شراحیل کہتی ہیں مجھ سے ام عطیہؓ (صحابیہ) نے بیان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر روانہ فرمایا، اس لشکر

---

(۱) بحوالہ سابق سنن ترمذی۔

میں حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے، ام عطیہ کہتی ہیں:

"فسمعت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو رافع یدیہ یقول: اللّٰھم لا تُمِتْنِیْ حتّٰی تُرِیَنِّیْ عَلِیّاً."(۱)

(کہ اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک تو مجھے علی کو دکھا نہ دے)۔

اس طبعی محبت کا اظہار ایک دوسرے انداز سے بھی ہوا، امام ابوعیسیٰ الترمذی صاحب السنن کے استاذ نصر بن علی جہضمی خانوادہ نبوت کے ایک فرد علی بن جعفر الصادق الہاشمی سے ان کی خاندانی سند سے روایت کرتے ہیں کہ علی بن جعفر الصادق کہتے ہیں، مجھ سے میرے بھائی موسیٰ بن جعفر بن محمد (الباقر) نے اپنے والد جعفر (الصادق) بن محمد (الباقر) سے انھوں نے اپنے والد محمد (الباقر) بن علی (زین العابدین) سے انھوں نے اپنے والد علی بن الحسین سے انھوں نے اپنے والد (حضرت حسین رضی اللہ عنہ نواسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سے انھوں نے اپنے والد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ:

"ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم أخذ بید حسنٍ و حسینٍ فقال: من أحبنی و أحب ھذین وأباھما وأمھما کان معی فی درجتی یوم القیامۃ."(۲)

(کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حضرت حسین کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا، پھر فرمایا: جو شخص مجھ اور ان دونوں سے اور ان دونوں کے ماں باپ سے محبت رکھے گا وہ ایک مقام پر جنت میں میرے ساتھ ہوگا)۔

امام ترمذی نے یہ حدیث اسی سند سے روایت کی ہے اور تحسین فرمائی ہے

---

(۱) سنن ترمذی مناقب۔ (۲) بحوالہ سابق سنن ترمذی۔

اس لیے کہ سبھی رواۃ ثقہ عادل ہیں اور اللہ کے نزدیک ان کے مقام محبوبیت کو ایک انوکھے انداز سے یوں بیان فرمایا: بروایت سدی (اسماعیل بن عبدالرحمٰن) جو کہ تابعی اور ثقہ راوی ہیں، حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ہے کہ:

"كان عند النبي صلى الله عليه وسلم طير فقال اللهم ائتني بأحب خلقك إليك يأكل معي هذا الطير فجاء علي فأكل معه."(۱)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا کھانے کے لیے لائی گئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی، اے اللہ! اپنے پسندیدہ شخص کو بھیج دے جو میرے ساتھ شریک طعام ہو، اتنے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور شریک طعام ہوئے)۔

اور بروایت حضرت بریدہ (صحابی) مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إن الله أمرني بحب أربعة وأخبرني أنه يحبهم قيل: يا رسول الله! سمهم لنا، قال: علي منهم، يقول ذلك ثلاثا، وأبو ذر والمقداد وسلمان، أمرني بحبهم وأخبرني أنه يحبهم" (۲)

(اللہ نے مجھے چار شخصوں سے محبت کی تاکید فرمائی ہے، اور بتایا ہے کہ اللہ ان چاروں سے محبت کرتا ہے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ! ان کے نام بتا دیجیے، فرمایا: علی، ان میں سے ایک ہیں، یہ بات تین بار دوہرائی (پھر فرمایا) ابوذر اور مقداد اور سلمان (فارسی) ہیں، اللہ نے مجھے ان چاروں سے محبت کی تاکید فرمائی

---

(۱) بحوالہ سابق سنن ترمذی۔ (۲) ایضا۔

اور بتایا کہ اللہ کو ان چاروں سے محبت ہے)۔

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صاف الفاظ میں منافقین کی شناخت کا طریقہ منقول ہے جو خاص طور پر انصار صحابہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد رائج ہوگیا تھا، وہ کہتے ہیں:

"إنا كنا لنعرف المنافقين نحن معشر الأنصار ببغضهم علي بن أبي طالب."(۱)

(کہ ہم انصار لوگ منافقین کی شناخت ان کے علی بن ابی طالب سے بغض کرنے سے کرلیا کرتے تھے)۔

اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واضح اور صریح طریقہ سے مومن اور منافق کا فرق اس طرح بتایا جاچکا تھا کہ مساور حمیری اپنی والدہ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"دخلت على أم سلمة فسمعتها تقول: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لايحب عليا منافق ولا يبغضه مؤمن."(۲)

(کہ علی سے منافق کو محبت نہیں ہوتی اور نہ ہی مومن شخص علی سے بغض رکھ سکے گا)۔

صرف یہی چند روایتیں مناقب علی بن ابی طالب کی نہیں ہیں، سبھی کتب حدیث سے ان کا انتخاب کیا جائے تو پوری ایک مستقل جلد ناکافی ہوگی، لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ حضرت علیؓ سے محبت کا اظہار کافی ہے، ان ساری محبتوں کا اعتبار شریعت اور کتاب وسنت پر عمل کے ساتھ وزن دار ہوتا ہے، اور محبت میں غلو کہ صحابی کو نبی کا مرادف قرار دیا جائے یا نبی کو الوہیت کا مقام دیا جائے ہلاکت کا باعث عمل ہوتا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تعلق سے اس غلو سے روک دیا تھا، فرمایا:

(۱) بحوالہ سابق سنن ترمذی۔ (۲) ایضا۔

"لا تطرونی کما اطرت النصاری عیسیٰ بن مریم، إنما أنا عبده ورسوله."(۱)

(کہ تم لوگ مجھے ایسا نہ بڑھانا چڑھانا جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو بڑھایا چڑھایا، میں تو بس اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں)۔

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بھی ان کے تعلق سے صراحت فرمائی تھی کہ ان کے سلسلہ میں دو طبقے ہلاک ہوں گے، ایک طبقہ محبت و تعظیم میں غلو سے کام لے کر، دوسرا طبقہ بے تعلقی کے اظہار اور حق تلفی کی وجہ سے، اس لیے اس تعلق سے سبھی کو خیریت منانی چاہیے اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا حضرات صحابہ وخلفاء راشدین کے ساتھ طرز عمل اور ان کی خدمات کا اعتراف

سیدنا حضرت علی مرتضیٰ بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا اپنے پیش روخلفاء، اعیان صحابہ کے ساتھ جو احترام اور اعتراف کا معاملہ رہا اس کی چند مثالیں نذر قارئین کی جاتی ہیں:

صحیح بخاری ومسلم میں بروایت ابن ابی ملیکہ (تابعی) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد کا واقعہ منقول ہے، وہ کہتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے سنا وہ بیان کرتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو (وفات کے بعد غسل دینے کے لیے) تخت پر رکھا گیا تو لوگ ان کے اردگرد کھڑے تھے اور ان کے لیے دعائیں اور اللہ سے رحمت کی استدعا کر رہے تھے اور میں بھی ان لوگوں میں کھڑا تھا، قبل اس کے کہ ان کو تخت سے اٹھایا جائے اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی آدمی میرا کندھا پکڑے کھڑا ہے (میں نے

(۱) بحوالہ سابق سنن ترمذی۔

دیکھا کہ) وہ حضرت علی بن ابی طالبؓ ہیں، وہ حضرت عمرؓ کے لیے رحمت کی دعائیں کرر ہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تم نے اپنے بعد کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑا کہ مجھے جس کی خواہش ہو کہ میں اس شخص کے سے عمل لے کر اللہ کے حضور میں حاضر ہوں، اور خدا کی قسم! میں یہی گمان کرتا تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں (پیش رو) ساتھیوں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کے ساتھ کردے گا، میں (اس لیے یہ سمجھتا تھا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت موقعوں پر سنتا تھا کہ آپ فرماتے تھے (فلاں کام کے لیے) میں گیا اور ابوبکر وعمر بھی گئے اور (مسجد میں یا فلاں مکان میں) میں داخل ہوا اور میرے ساتھ ابوبکر وعمر بھی داخل ہوئے اور میں نکلا اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی نکلے۔(۱)

اسی کی ہم معنی روایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حافظ ابن حجر شارح صحیح بخاری نے (فتح الباری ۱۴/۳۷۴) لکھا ہے کہ ابن ابی شیبہ اور مسدد نے جعفر صادق کے طریق سے انھوں نے اپنے والد محمد (الباقر) سے اس قسم کا کلام روایت کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے، اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے لیے اچھا شاہد ہے کیونکہ خود آل علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما کے اس مقام ومرتبہ کے اعتراف میں ذرا بھی پس وپیش نہیں تھا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ان حضرات کا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں محبت وقرب کا معیار اللہ تعالیٰ کی مشیت ووجاہت کے اعتبار سے ہوا کرتا تھا۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الخلفاء الراشدون'' میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ان کے موقف کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ انھوں نے یہ بات صاف کردی تھی کہ ہم لوگ (یعنی صحابہ) جب ان کی امامت دینی پر راضی رہے تو ان کی امامت دنیوی کو کیوں نہ قبول کرتے، اس لیے کہ امامت دینی امامت دنیوی

---

(۱) ترجمہ معارف الحدیث ۸/۳۲۱

سے بڑھ کر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ان حضرات کے ساتھ جذبہ تعاون وہمدردی و خیر خواہی اس قدر واضح وصریح تھا کہ اس کو انصاف پسند شیعہ مؤرخین بھی نظر انداز نہیں کر سکے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اس تعلق سے چند مثالیں پیش کی ہیں اور لکھا ہے کہ:

> ''نہج البلاغہ کا انگریزی ترجمہ جسے عالمی شعبۂ مسلم انجمن نے طبع کیا ہے، اس کے مترجم عسکری جعفری نے اپنے مقدمہ میں اس کا ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کیا کرتے تھے، اور انھیں قبول بھی کرتے تھے، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سلطنت روما سے جنگ کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے لی تو انھوں نے کہا کہ آپ یہیں موجود رہیں اور کسی اور تجربہ کار جنرل کو کمانڈر بنا کر بھیجیں، اسی طرح فارس سے جنگ کے موقع پر حضرت علیؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو میدان جنگ پر جانے سے منع کیا، حضرت علیؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جو صلاح دی تھی اس کی تصدیق ''نہج البلاغہ'' میں شامل ہے اور حضرت علیؓ کے خطبہ نمبر ۱۴۷ اور ۱۴۹ سے بھی ہوتی ہے۔''(۱)

مولانا ندوی علیہ الرحمہ آگے لکھتے ہیں:

> ''سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خلفائے ثلاثہ بالخصوص شیخین کو اپنا پورا تعاون دیا، بہت نازک موقعوں پر ان کے صائب مشورے بڑے مفید اور قیمتی ثابت ہوئے، ان حضرات نے بھی آپ کے علم

---

(۱) دو متضاد تصویریں ص/۴۶

وفہم اور اصابت رائے کا بلند الفاظ میں اعتراف کیا ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر آپ نے اپنے جذبات وتأثرات کا جس طرح اظہار کیا، اس سے ان مخلصانہ تعلقات کا پورا اظہار ہوتا ہے، یہ دونوں خطبے جن میں ان کا اسلوب بیان، ان کی زبان، ان کے ادبی و بلاغتی خصوصیات پوری طرح نمایاں ہیں، کتب تاریخ میں دیکھے جاسکتے ہیں، یہاں طوالت کے خوف سے ان کو نقل نہیں کیا جاتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے محاصرہ کے دوران پانی روک دیا گیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو پانی کی تین مشکیں بھیج دیں، ان کے لیے جانے کے سلسلہ میں بنی ہاشم کے کئی تعلق والے زخمی ہوئے، حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے کہا کہ اپنی تلواریں لے کر حضرت عثمانؓ کے دروازہ پر کھڑے ہوجاؤ اور کسی کو ان تک پہنچنے نہ دو۔

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر باغیوں نے نرغہ کیا اور ان کے مکان کا محاصرہ کرلیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام قنبر کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت پر مامور کیا، اس مدافعت میں حضرت حسینؓ بھی زخمی ہوئے، سارا بدن خون سے رنگین ہوگیا، قنبر کے سر پر چوٹیں آئیں، لیکن باغی اس دروازہ سے داخل نہ ہوسکے، جہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا پہرہ تھا وہ دوسری دیوار پھاند کر اندر پہنچ گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بحالت تلاوت شہید کردیا۔"(۱)

---

(۱) دو متضاد تصویریں ص/۴۸

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ جو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سیرت کے مؤلف بھی ہیں اور ''المرتضیٰ'' کے نام سے ان کی یہ کتاب بین الاقوامی شہرت کی حامل بنی اور عرب وعجم کے مطبعات نے اسے اس کے شایان شان کیا اور شیخ الازہر اور شیخ جادالحق علی جادالحق اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی اور دوسرے علماء نے اس کو بڑا کارنامہ قرار دیا، وہ ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو تاریخ کے ملبہ میں دب کر صحیح طور سے سامنے نہ آسکی کہ انھوں نے اپنی رضا ورغبت سے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کو دوسری بیویوں کی موجودگی میں اس سن وسال میں حضرت عمرؓ کے عقد میں دیا اور اپنے تین صاحبزادوں (جو کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں، دوسری بیویوں سے تھے، اس لیے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا تو حضرت ابوبکرؓ کے ہی دور خلافت کے ابتدائی زمانہ میں انتقال ہوگیا تھا اور ان کے ہوتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے دوسرا نکاح جائز نہیں تھا کیوں کہ وہ بضعۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھیں) کے نام ابوبکر، عمر، عثمان رکھے۔''(۱)

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سلسلہ میں بھی حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کے بڑے بلند کلمات مستند کتابوں میں موجود ہیں، اور دونوں میں وہ قرابت کا رشتہ بھی تھا جو تعلق میں اور اضافہ کا باعث ہوتا ہے، دونوں کی حرم (بیویاں) حقیقی بہنیں تھیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں تھی، اس طرح حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کی حضرت سیدہ فاطمہ زہرا سے اولاد کے وہ خالو تھے۔

ابن عساکر اور ابن مردویہ نے بروایت ثابت بن عبید نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں مدینہ جانے والا ہوں، وہاں لوگ

---

(۱) غالی شیعوں نے ان تمام باتوں اور حقائق کو تقیہ پر محمول کرتے ہوئے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مجبور محض ثابت کرنے کی بلاوجہ کی کوشش کی ہے، نواب محسن الملک نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''آیات بینات'' میں، اور امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی نے اپنے رسائل میں، اور استاذ حسین موسوی نے اپنی کتاب ''للہ ثم للتاریخ'' میں شیعوں کے افتراءات واتہامات کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔

مجھ سے حضرت عثمانؓ کے بارے میں سوالات کریں گے تو (مجھے بتلا دیجیے) میں کیا جواب دوں؟ تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ان سے (صاف صاف) کہہ دینا کہ:

"إِنَّ عُثْمَانَ كَانَ مِنَ ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾."

(بلاشبہ عثمانؓ اللہ کے ان بندوں میں سے تھے (جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے): وہ بندے جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے پھر انھوں نے تقویٰ اور کامل ایمان والی زندگی گزاری پھر تقوی اور احسان کا مقام ان کو حاصل ہوا اور اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں سے محبت و پیار فرماتا ہے جو مقام احسان پر فائز ہوں)۔(۱)

حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے جن حالات میں جس اعتراف حقیقت، شہادت حق اور اظہار صداقت میں جرأت ایمانی سے کام لیا ہے اس میں انھوں نے اس بات کی ذرا پرواہ نہیں کی کہ یہ لوگ جو ان کی محبت کا دم بھر رہے ہیں اور وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ناپسند کرتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی ان کا مخالف اور ناپسند کرنے والا بتاتے ہیں، اس رویہ سے حضرت علیؓ کے بھی مخالف ہو جائیں، اور اہل عراق بھی دوری بنالیں، یہ ان کی حق گوئی اور لومۃ لائم کی پرواہ نہ کرنے کی اعلیٰ مثال اور ان دونوں بزرگوں کے مابین گہرے ایمانی تعلق کی بات ہے۔

صحابہ کرامؓ کا سلوک و برتاؤ اور رفقاء کی شہادت واعتراف

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا معاملہ بڑا ہی

(۱) یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمانؓ کو مقام احسان پر فائز بتایا ہے، بقول مولانا محمد منظور نعمانی یہاں جو احسان کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ ایک خاص دینی اصطلاح ہے اور ایمان وایقان کا اعلیٰ درجہ ہے۔
ملاحظہ ہو معارف الحدیث ۸/۳۵۶-۳۵۷

ہمدردانہ، خیر خواہانہ، مخلصانہ، دوستانہ تھا، اسی طرح اپنے پیش رو خلفائے ثلاثہ کے ساتھ بھی انھوں نے بڑے مخلصانہ تعاون کا معاملہ رکھا اور مفید مشوروں سے نوازنے میں کبھی پہلوتہی نہیں کی، صحابہ کرام اور خلفائے ثلاثہ اور امیر المؤمنین حضرت معاویہؓ کا تعلق بھی مخلصانہ رہا، اور ظاہری صورت حال پر اس کا وہ اثر دکھائی نہ دیتا نظر آئے تو اس میں اس وقت کے حالات، منافقین کی کثرت، علاقائی عصبیت خاص طور سے شام وعراق کا مزاجی وجغرافیائی فرق، ملکی مصلحت، عوام کو بکھرنے سے بچانے کی تدبیروں کے اثرات کارفرما دکھائی دیں گے۔

حضرت حسن بصری گو صحابی نہیں ہیں لیکن صحابہ کی بڑی جماعت کو دیکھے ہوئے اور ان کا عطر کشید کیے ہوئے تابعی جلیل ہیں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقام کو صحابہ کے درمیان اور صحابہ کی نگاہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام دیکھا تھا، کہتے ہیں:

”كان عليّ والله سهما صائبا من مرامى الله على عدوه وربانى هذه الأمة وذا فضلها وذا سابقتها وذا قرابتها من رسول الله صلى الله عليه وسلم، لم يكن بالنومة عن أمر الله ولا بالملومة فى دين الله ولا بالسروقة لمال الله، أعطى القرآن عزائمه، ففاز منه برياض مونقة، ذلك علي بن أبى طالب رضى الله عنه.“(۱)

(واللہ! علی بن ابی طالب اللہ کی تیروں میں سے ایک تیر بہدف تھے، جس سے دشمن بچ کر نہیں جا سکتا تھا، اور وہ ربانی الامت تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت اور سبقت فی الاسلام رکھتے تھے، اور افضل صحابی تھے، اللہ کے حکم کی بجا آوری

(۱) استیعاب ۳/۲۱۰

میں کبھی غفلت وسستی سے کام نہیں لیا، اور دین کے معاملہ میں
ملامت کی پرواہ نہیں کی اور نہ کبھی اللہ کے مال میں حق تلفی کی،
قرآن کی عزیمت پر انھوں نے عمل کیا اور اس کے حسین غنچوں
سے بہرہ مند ہوئے، یہی صفات ہیں علی بن ابی طالب رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کی)۔

امیر المؤمنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان بن حرب اموی رضی اللہ عنہ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی یاد آئی، اس موقع پر موجود حضرت ضرار بن ضمرہ الصدائی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وصف بیان کرنے کو کہا، انھوں نے آداب محفل کو ملحوظ رکھتے ہوئے اجازت طلب کی، ادھر سے دوبارہ ارشاد ہوا کہ توصیف کی جائے، انھوں نے اس طرح آغاز کیا اور کہا:

"أما إذ لا بد من وصفه فكان والله بعيد المدى، شديد القوى، يقول فصلا ويحكم عدلا، يتفجر العلم من جوانبه، تنطق الحكمة من نواحيه، ويتوحش من الدنيا وزهرتها، ويستأنس بالليل ووحشته، وكان غزير العبرة، طويل الفكرة، يعجبه من اللباس ما قصر، ومن الطعام ما خشن، وكان فينا كأحدنا، يجيبنا إذا سألناه، وينبئنا إذا استنبأناه، ونحن والله -مع تقريبه إيانا وقربه منا- لا نكاد يكلمه هيبة له، يعظم أهل الدين، ويقرب المساكين، لا يطمع القوى فى باطله، ولا ييئس الضعيف من عدله وأشهد أنه لقد رأيته فى بعض مواقفه، وقد أرخى الليل سدوله وغارت نجومه، قابضا على لحيته، يتململ تململ السليم، ويبكى البكاء

الـحزين ويقول: يا دنيا غُرّى غيرى، ألى تعرضت أم إلىّ تشوقت! هيهات هيهات! قد باينتك ثلاثا لا رجعة فيها، فعمرك قصير، وخطرك كبير، آه! من قلة الزاد وبعد السفر ووحشة الطريق، فبكى معاوية وقال: رحم الله أباالحسن كان والله كذلك، فكيف حزنك عليه ياضرار؟ حزن من ذبح ولدها وهو فى حجرها."(١)

(ان کی توصیف بیان کرنا ضروری ہے تو سنیے!

''ان کی نظر انتہائی دوررس تھی، ان کے قویٰ انتہائی مضبوط تھے، بات دوٹوک اور صاف صاف کہتے، اور فیصلے پورے عدل وانصاف کے ساتھ کرتے، ان کی شخصیت سے علم کے چشمے ابلتے تھے، دنیا اور دنیا کی دل آویزیوں سے متوحش رہتے، رات اور اس کی تاریکی سے دل لگاتے تھے، خدا گواہ ہے کہ (راتوں کو عبادت میں) ان کے آنسو تھمتے نہ تھے، دیر دیر تک فکرمند اور سوچتے رہتے، اپنے کف دست کو الٹتے پلٹتے اور اپنے آپ باتیں کرتے، موٹا جھوٹا پہنتے، روکھا سوکھا کھاتے، بخدا بالکل اپنے ہی ساتھیوں اور بے تکلف لوگوں کی طرح رہتے، جب کچھ پوچھا جاتا جواب دیتے، جب ان کے پاس جاتے تو خود بڑھ کر بات شروع کرتے، جب بلاتے تو حسب وعدہ آجاتے، لیکن ہم لوگوں کو (باوجود اس قربت اور رفاقت اور ان کی سادگی کے ان کا رعب ایسا تھا کہ) ان کے سامنے بولنے کی ہمت نہ ہوتی، اور نہ کوئی گفتگو چھیڑتے، اگر وہ مسکراتے تو آپ کے دندان ایسے نظر

(۱) استیعاب ۳/۲۰۹ لابن عبدالبر الاندلسی

آتے جیسے سفید موتیوں کی لڑی ہو، دین داروں کی توقیر کرتے، مساکین سے محبت کرتے، کسی طاقتور انسان کی یہ جرأت نہ تھی کہ ان سے باطل کی تائید میں توقع رکھتا اور کوئی کمزور ان کے عدل وانصاف سے مایوس نہ ہوتا۔

اور میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان کی راتوں کے چند مناظر دیکھے ہیں کہ رات نے اپنی سیاہ چادر پھیلا دی ہے، تارے ڈوبنے لگے ہیں اور علی محراب مسجد میں اپنی داڑھی ہاتھ سے پکڑے درد بھرے شخص کی طرح رو رہے ہیں، اور اس طرح تڑپ رہے ہیں، جیسے کوئی ایسا شخص تڑپے جس کو کسی زہریلے سانپ بچھو نے ڈس لیا ہو، مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کی آواز اب بھی سنائی دے رہی ہے، اور وہ کہہ رہے ہیں:

''اے دنیا کیا تو مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہے یا مجھ سے کوئی امید رکھتی ہے؟ مجھ سے کچھ امید نہ رکھ، میرے علاوہ کسی اور کو فریب دے، میں تو تجھے تین طلاقیں دے چکا ہوں، جس کے بعد تیری طرف رجعت کی گنجائش ہی نہیں، تیری عمر کوتاہ، تیری دی ہوئی کامرانی حقیر، تیرے خطرات بھیانک اور بڑے، آہ! زادراہ کتنا کم ہے، سفر کتنا طویل ہے، اور راستہ کتنا سنسان ہے۔''

راوی کہتے ہیں: یہ سن کر معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے، اور اس کے قطرے ان کی داڑھی پر گرنے لگے، اپنی آستین سے وہ آنسو پونچھتے اور رونے سے آواز حلق میں گھٹنے لگی، پھر معاویہ رضی اللہ نے کہا:

''اللہ ابوالحسن پر رحم فرمائے، واقعی ان کا یہی حال تھا، ضرار! تم اپنا

حال کہو، ان کی جدائی سے کیا محسوس کرتے ہو؟ کہا: مجھے ایسا غم ہے جیسا اس عورت کو ہوگا جس کا بچہ اس کی گود میں ذبح کر دیا گیا ہو، اور نہ اس کے آنسو تھمتے ہوں اور نہ غم ہلکا ہوتا ہو)۔

امیر المؤمنین حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے تعلق کا یہ حال تھا کہ وہ فرمائش کرکے ان کے اوصاف کو سنتے اور یہی نہیں بلکہ سن کر رو پڑتے اور دعائے رحمت کرتے اور خود زبانی اعتراف بھی کرتے بلکہ شہادت دیتے، اور کہتے کہ بخدا وہ ایسے ہی تھے، اور ان کی زندگی میں ان سے استفادہ بھی کرتے، اور جو نت نئے مسائل اور قضایا سامنے آتے انھیں نوٹ کرلیا کرتے کہ ان کے متعلق حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیں گے، چنانچہ جب انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کی خبر پہنچی تو انھوں نے فرمایا: "ذهب الفقه والعلم بموت ابن أبي طالب" (ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی موت سے علم وفقہ رخصت ہوا) ان کے بھائی عتبہ بن ابی سفیان اموی بیٹھے ہوئے تھے کہنے لگے آپ کی زبان سے اہل شام کے سننے سے باہر کی یہ بات ہے جو آپ نے کہی، ان کی یہ بات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو ناگوار گزری، فرمایا: "دعني عنك." (۱)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جنہیں جماعت صحابہ میں ترجمان القرآن، حکیم الامت، حبر الامت جیسے خطابات سے نوازا گیا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب اہم مشورے کرتے تھے وہ انھیں اکابر صحابہ پر فوقیت دیتے اور ان کی رائے کو اکثر و بیشتر قبول کرتے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے علم وفضل کے بڑے مداح تھے، ضحاک بن مزاحم حضرت عبداللہ بن عباس کا قول نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"واللہ لقد أعطي علي بن أبي طالب تسعة اعشار العلم

---

(۱) استیعاب ۳/۲۰۹ لابن عبدالبر الاندلسی

وأيم الله لقد شارككم في العشر العاشر."

(کہ بخدا علی بن ابی طالب کو علم کے دس حصوں میں نو حصے عطا کیے گئے ہیں اور بخدا ان کے ساتھ علم میں تم لوگوں کی شرکت دسویں حصہ میں ہے)۔(۱)

اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ جو کہ خود علم فرائض کے ماہر صحابہ میں شمار کیے جاتے تھے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرماتے:

"ليس أحدمنهم أقوى قولا في الفرائض من علي"

(فرائض (میراث) کے سلسلہ میں سب سے مضبوط بات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہی ہوا کرتی تھی)۔(۲)

شریح بن ہانی کہتے ہیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسح علی الخفین کے تعلق سے دریافت کیا گیا، انھوں نے فرمایا: علی کے پاس جاؤ ان سے پوچھو۔(۳)

صوم عاشوراء سے متعلق کچھ بات تھی حضرت عائشہ ام المومنین ؓ نے لوگوں سے کہا: صوم عاشوراء کا فتویٰ تم لوگوں کو کس نے دیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: علی رضی اللہ عنہ نے، حضرت عائشہ ؓ نے فرمایا: ارے وہ تو لوگوں میں سنت کے سب سے بڑے عالم ہیں۔(۴)

امیر المومنین حضرت عمر بن الخطاب (فاروق اعظم) رضی اللہ عنہ کا حال حضرت علی رضی اللہ عنہ سے متعلق حضرت سعید بن مسیب جیسے جلیل القدر تابعی اس طرح بیان کرتے ہیں:

"كان عمر يتعوذ بالله من معضلة ليس لها أبو الحسن، وقال في المجنونة التي أمر برجمها وفي التي وضعت

---

(۱) استیعاب ۳/۲۰۷ لابن عبد البر الاندلسی

(۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔

لستة أشهر، فأراد عمر رجمها، فقال له علي: إن الله تعالىٰ يقول: ﴿وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلاَثُونَ شَهْراً﴾ (۱) وقال له: ان الله تعالى رفع القلم عن المجنون، فكان عمر يقول لولا عليّ لهلك عمر."(۲)

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہر ایسے مسئلہ میں اللہ کی پناہ کے طالب ہوتے جس کے حل کے لیے ابوالحسن یعنی علی بن ابی طالب کو نہ پاتے ہوں، ایک مجنونہ (پاگل عورت) کے رجم کا حکم صادر فرما دیا اور اس ماں کے لیے جو بچہ جن چکی تھی چھ ماہ کی مدت مقرر فرمائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک کے لیے رائے دی کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ ہے، اور ایک کے لیے رائے دی کہ مجنون مرفوع القلم ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمانے لگے کہ اگر علی نہ ہوتے تو عمر تباہ ہو جاتا)۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علم وفضل کے بڑے قدردان تھے، مسائل وقضایا میں ان کی طرف رجوع کرتے اور دوسروں کو بھی رجوع کرنے کو کہتے ہیں، حضرت علیؓ کا یہ وصف اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ یہ محاورہ بن گیا تھا: "قضية ولا أبا حسن لها". (اہم مسئلہ درپیش ہے لیکن ابوالحسن (علی) موجود نہیں)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اعتدال وانصاف

"واقضاهم عليّ" یہ وہ ارشاد نبوی ہے جس کی پورے دور خلافت راشدہ (عہد صدیقی، عہد فاروقی، عہد عثمانی بشمول عہد مرتضوی) میں کارفرمائی کھلے طور پر نظر آتی ہے اور کوئی بھی انصاف پسند مؤرخ اس بات کو نظرانداز نہیں کرتا ہے، اگر اپنے پیش رو خلفاء کے سلسلہ میں وہ ذرا بھی کچھ دل میں کسک اور کھٹک محسوس کرتے تو اس

(۱) الاحقاف:۱۵ (۲) استیعاب ۳/۲۰۶ لابن عبدالبر الاندلسی

کمال جذبہ خیر خواہی اور کمال ہوش وخرد اور پوری دقت نظر وحقیقت پسندی سے جس طرح انھوں نے تعاون دیا اس کیفیت کے ساتھ تعاون نہ دے پاتے اور جب اقتدار نہیں ملا تو ان کے سامنے صرف استحکام حکومت واقتدار ہوتا تو پھر وہ اس سلوک و برتاؤ سے ہرگز کام نہیں لیتے جو انھوں نے اندرونی شورشوں کے موقع پر لیا جبکہ انھیں غلبہ حاصل ہو چکا تھا، اور حق کا دامن ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے چھوٹنے نہ پایا، اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی بھی پوری ہوگی کہ "رحم الله عليا، اللهم ادر الحق معه حيث دار" أو كما قال. (۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے روز اول سے پوری حقیقت پسندی، اعتدال و انصاف اور حرمت دین و ایمان، احترام انسانیت، اکرام مسلم اور فیصلہ میں عجلت سے کام نہ لے کر ہوش وخرد کو ساتھ رکھ کر معاملہ کیا اور شریعت کی مکمل پاسداری کی کہ انھوں نے روز اول سے مزاج نبوی و اخلاق نبوی اور وحی کے نزول کے مواقع ومناسبات کا نہ صرف مشاہدہ کیا تھا بلکہ پوری گہرائی سے مطالعہ بھی کیا تھا اور آنے والے فتن ومحن اور ابتلاءات کا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے علم بھی حاصل کیا تھا، یہ سب باتیں ان کے برابر پیش نظر رہتیں اور صرف جذبات اور عاطفہ سے اور آیات واحادیث کے موقع بے موقع لوگوں کے پیش کر دینے سے وہ محض تأثر سے کام نہ لیتے، بلکہ حالات کی نزاکت، اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل اور عواقب پر نگاہ جمائے رہتے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ اپنے رسالہ "فضل أهل البيت وحقوقهم" ص/۲۹ میں لکھتے ہیں:

"وقد ثبت عن أمير المؤمنين عليّ رضي الله عنه من وجوه أنه لما قاتل أهل الجمل لم يسب لهم ذرية، ولم يغنم لهم مالا ولا أجهز على جريح، ولا اتبع مدبرا، ولا

(۱) سنن الترمذی، کتاب المناقب، رقم/۳۷۱۴

قتل أسيرا، وأنه صلى على قتلى الطائفتين بالجمل وصفين، وقال: "إخواننا بغوا علينا" وأخبر أنهم ليسوا بكفار ولا منافقين واتبع فيما قاله كتاب الله وسنة نبيه صلى الله عليه وسلم فإن الله سماهم إخوة، وجعلهم مؤمنين في الإقتتال والبغي كما ذكر في قوله: ﴿وَإِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا﴾.

وثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم في الصحاح أنه قال: وتمرق مارقة على حين فرقة من المسلمين، تقتلهم أولى الطائفتين بالحق.(١)

وهذه المارقة هم أهل حروراء الذين قتلهم أمير المؤمنين علي بن أبي طالب رضي الله عنه وأصحابه لما مرقوا من الإسلام وخرجوا عليه فكفروه وكفروا سائر المسلمين واستحلوا دماء هم وأموالهم.

وقد ثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم من طرق متواترة أنه وصفهم وأمر بقتالهم، فقال: "يحقر أحدكم صلاته مع صلاتهم وصيامه مع صيامهم وقرآنه مع قرآنهم يقرؤن القرآن لا يجاوز حناجرهم، يمرقون من الإسلام كما يمرق السهم من الرمية، لو يعلم الذين يقتلونهم ما لهم على لسان محمد صلى الله عليه وسلم لنكلوا عن العمل."

فقتلهم علي رضي الله عنه وأصحابه، وسر أمير المؤمنين بقتلهم سرورا شديدا وسجد لله شكرا، لما

(١) أخرجه مسلم و أبو داؤد عن أبي سعيد

ظهر فيهم علامتهم وهو المخدج اليد الذى على يده مثل البضعة من اللحم، عليها شعرات، فاتفق جميع الصحابة على استحلال قتالهم ندم كثير منهم كابن عمر وغيره على ألا يكونوا شهدوا قتالهم مع أمير المؤمنين بخلاف ما جرى فى وقعة الجمل و صفين، فإن أمير المؤمنين كان متوجعا لذلك القتال، متشكيا مما جرى، يتراجع هو وابنه الحسن القول فيه، ويذكر له الحسن أن رأيه ألا يفعله."

(امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ اہل جمل سے قتال میں مخالفین کی اولاد کو قیدی نہیں بنایا اور نہ ان کے مال کو غنیمت قرار دیا، اور نہ زخمی کو قتل کیا اور نہ بھاگنے والے کا تعاقب کیا اور نہ کسی قیدی کی جان لی، دونوں گروہوں کے مقتولین کی جمل کے ہوں یا صفین کے، نماز جنازہ پڑھی اور فرمایا: یہ ہمارے اپنے ہی تھے جو باغی ہوگئے، اور واضح کیا یہ حضرات کافر ومنافق نہیں تھے، اور اس سلسلہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول کا جو فیصلہ ہے اس کے مطابق فیصلہ کیا، انھوں نے ان سب کو اپنا بھائی کہا، اس لیے کہ اللہ نے ان سب کو بھائی کہا تھا، اور حالت جنگ و بغاوت میں بھی ان کو مومن کہا، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں برسرپیکار ہوجائیں تو ان میں صلح کرادو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحاح میں ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا ایک فرقہ دین سے خارج ہوگا، ان کا خاتمہ

وہ لوگ کریں گے جو حق پر ہوں گے۔

اور یہ خارجی اہل حروراء ہیں جن کا خاتمہ امیر المومنین علی بن ابی طالب نے کیا، جب وہ لوگ اسلام کے دائرہ سے باہر نکل گئے اور خروج کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی اور ان کے ساتھ سبھی مسلمانوں کو کافر ٹھہرایا اور ان کے خون اور مال کو حلال ٹھہرایا۔

طرق متواترہ سے یہ بھی ثابت ہے، آپ نے ان کی علامات بھی بیان کیں اور ان سے جنگ کرنے کو کہا، چنانچہ فرمایا کہ تم ان کی نماز، روزہ اور قرآن کو دیکھ کر اپنے نماز، روزہ اور قرآن کو حقیر سمجھو گے، وہ قرآن پڑھیں گے لیکن وہ ان کی حلق سے نیچے نہیں اترے گا، اسلام سے نکلیں گے جیسے تیر کمان سے نکلتا ہے، ان کا خاتمہ کرنے والوں کو وہ معلوم ہو جاتا کہ زبان نبوت نے اس پر کیا خوشخبری رکھی ہے تو یہ اقدام کرنے والے ان لوگوں کا عبرتناک انجام کرتے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے ان کا خاتمہ کیا، اور اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بڑی خوشی ہوئی، اور انھوں نے خوشی سے سجدہ شکر ادا کیا، جب انھوں نے وہ علامات دیکھیں جو ان میں ظاہر ہوئیں: "وهو المخدج اليد الذی علی یده مثل البضعة من اللحم" (وہ ہے ہاتھ پر گوشت کا ابھرنے ہونے کی طرح کا نشان)، اس پر صحابہ بھی ان سے قتال پر راضی ہوئے، اور جو شریک جنگ نہ ہوئے تھے وہ نادم ہوئے، جیسے حضرت عبداللہ بن عمر وغیرہ کہ انھوں نے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہیں کی۔

اس کے برخلاف جنگ جمل اور جنگ صفین کے کہ ان سے
امیر المومنین کو تکلیف تھی، اور جو کچھ پیش آیا، اس سے وہ شاکی تھے،
اور وہ اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مراجعت
کرتے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی رائے جنگ کی نہ تھی)۔

حلیۃ الاولیاء کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے، ہوا یہ کہ عظیم تر اسلامی حکومت کے سربراہ امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب ایک دن بطور فریق عدالت میں حاضر ہوئے، اور گواہ پیش نہ کرنے کی صورت میں ان کے خلاف قاضی نے فیصلہ سنا دیا اور انھوں نے بخوشی اس فیصلہ کو منظور کیا، جس کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ:

''ایک دن امیر المؤمنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی زرہ گم ہوگئی، آپ نے وہ زرہ ایک یہودی کے پاس دیکھی اور اس یہودی سے کہا کہ یہ میری زرہ ہے، فلاں دن گم ہوگئی تھی جبکہ یہودی نے مسلمانوں کے خلیفہ امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کا دعویٰ درست ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اس کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی، چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور وہ یہودی دونوں فیصلہ کے لیے قاضی شریح کی عدالت میں پہنچے، سیدنا علیؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہودی کے پاس زرہ میری ہے جو فلاں دن گم ہوگئی تھی، قاضی نے یہودی سے پوچھا، آپ کو کچھ کہنا ہے؟ یہودی نے کہا: میری زرہ میرے قبضہ میں ہے اور میری ملکیت ہے، قاضی شریح نے زرہ دیکھی اور یوں گویا ہوئے، اللہ کی قسم اے امیر المومنین! آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے، یہ زرہ آپ ہی کی ہے لیکن قانونی تقاضوں کو پورا کرنا آپ پر واجب ہے، قانون

کے مطابق آپ گواہ پیش کریں، سیدنا علیؓ نے بطور گواہ اپنے غلام قنبر کو پیش کیا، پھر آپ نے اپنے دونوں بیٹوں حضرت حسن و حضرت حسین کو عدالت میں پیش کیا، انھوں نے بھی آپ کے حق میں گواہی دی، قاضی شریح نے کہا میں آپ کے غلام کی گواہی تو قبول کرتا ہوں مگر ایک گواہ مزید درکار ہے، کیونکہ آپ کے حق میں آپ کے بیٹوں کی گواہی نا قابل قبول ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے "إن الحسن والحسين سيدا شباب أهل الجنة" (حسن و حسین نوجوانان جنت کے سردار ہیں) قاضی شریح نے کہا اللہ کی قسم یہ بالکل حق ہے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تو پھر آپ ان کی گواہی قبول نہیں کرتے؟ قاضی شریح رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ دونوں آپ کے بیٹے ہیں اور باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی قبول نہیں، یہ کہہ کر قاضی شریح نے امیر المومنین سیدنا علیؓ کے خلاف یہودی کے حق میں فیصلہ سنادیا اور زرہ یہودی کے حوالہ کردی۔"

واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلامی عدالت کا وہ تاریخ ساز فیصلہ تھا جس کا تصور بھی انسانی دنیا کو نہ رہا ہوگا، حضرت علیؓ کے خلاف ظاہری طور پر فیصلہ ہوگیا اور وہ مقدمہ ہار گئے، لیکن اسلام کی باطنی طور پر فتح ہوگئی، اور یہاں تک وہ یہودی جس نے یہ زرہ غصب کی تھی اور ظاہری طور پر اپنے حق میں فیصلہ کرالیا تھا خود اسلام لے آیا، اسے تعجب ہوا کہ مسلمانوں کا حکمراں مجھے اپنے قاضی کی عدالت میں لایا اور قاضی نے اس کے خلاف میرے حق میں فیصلہ صادر فرمادیا اور امیر المومنین نے اسی کا فیصلہ بلاچوں و

چرا قبول بھی کرلیا، واللہ یہ تو پیغمبرانہ عدل ہے، پھر یہودی نے امیر المومنین کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہنے لگا: اے امیر المومنین! آپ کا دعویٰ بالکل سچ ہے، یہ زرہ یقیناً آپ ہی کی ہے، فلاں دن یہ آپ کے اونٹ سے گر گئی تھی تو میں نے اسے اٹھالیا، بالآخر وہ یہودی اس عادلانہ فیصلہ سے متاثر ہوکر اسلام لے آیا۔

جہاد فی سبیل اللہ اور سلوک راہِ نبوت

جہاد فی سبیل اللہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے کارنامے بڑے روشن ہیں جو عہد نبوت اور عہد خلافت نبوت میں ظاہر ہوتے رہے، انھیں جو عہد ملا اس میں جہاد کی ایک دوسری صورت درپیش تھی، اس صورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

> ''جس طرح اللہ کی راہ میں جہاد، بت پرستوں اور اہل کتاب سے معرکہ آرائی باغی مرتد افراد سے قتال ضروری تھا، اسی طرح خواہ یہ بات دل کو کتنی ہی بری لگے، مگر امر واقعہ ہے کہ خود اہل قبلہ کے درمیان آپس میں اختلاف ہونا اور خود مسلمانوں کی صف میں رخنہ پڑ جانا اور امام وقت کے ساتھ بغاوت کا ابھرنا قدرتی بات ہے، لہٰذا ان حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے خیر القرون کا ایک اسوہ درکار تھا، اور ایسے امام وقت کا اسوہ جس کی اقتداء کی جاسکے اور جس کو نمونہ بنایا جاسکے۔''(۱)

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ جو ایک بڑے تابعی بزرگ ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چار قسم کی تلواریں عطا کی تھیں: ایک تلوار وہ تھی، جس سے آپ صلی اللہ

---

(۱) المرتضیٰ ص/۲۶۷-۲۶۸ (جدید ایڈیشن)

علیہ وسلم نے خود صنم پرستوں سے مقابلہ کیا۔ دوسری تلوار وہ تھی جس سے حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مرتد قبیلہ سے جنگ کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تقاتلونهم أو يسلمون" (۱)۔ اور ایک تلوار وہ تھی جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجوسیوں اور اہل کتاب سے معرکہ سر کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله" (۲)۔ اور ایک تلوار وہ تھی جس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صف شکن، قاطع بیعت اور حدود سے تجاوز کرنے والوں سے قتال کیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"فقاتلوا التي تبغي حتى تفيء إلى أمر الله" (۳)

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"ما قاتل أحد علياً إلا و علي أولى بالحق منه، ولو لا ما سار عليّ فيهم ما علم أحد كيف السيرة في المسلمين." (۴)

(حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جس نے بھی جنگ کی، اس میں حق پر وہی تھے، اور اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان سے اس طرح کا معاملہ نہ کرتے تو کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں جب اختلاف ہو تو کیا طرز عمل اختیار کیا جائے)۔

مشہور محقق ڈاکٹر حمید اللہ (پیرس) کی تحقیق ہے کہ:

"برسہا برس کی تحقیق اور ذرا سی بھی متعصبانہ سوچ کے بغیر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شہادت عثمان رضی اللہ عنہ اور جانشینی کی جنگیں یہودی سازش کا نتیجہ تھیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت

---

(۱) سورۂ فتح/ ۱۶۔ (۲) سورۂ توبہ/ ۲۹۔

(۳) سورۂ حجرات/ ۹ بحوالہ المبسوط للامام السرخسی ۱۰/ ۲

(۴) مناقب الامام الاعظمؒ از صدر الائمہ موفق بن احمد اعلی ۲/ ۳۸

عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تمام نیک نیتی سے لڑے اور ان کی قطعی کوئی ذاتی خواہشات نہ تھیں۔(۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے باطنی پہلو کی بلندی کو ان کا یہ اقدام بھی ظاہر کرتا ہے جو بلاذری علیہ الرحمہ کی ''انساب'' کے حوالہ سے ڈاکٹر حمید اللہ نے بیان کیا ہے کہ:

''جونہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، حضرت عباس رضی اللہ عنہ تیزی سے اپنے بھتیجے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے اور کہا: اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو، میں تمہارے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتا ہوں اور دوسرے لوگ ہماری تقلید کریں گے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ ایسے کاموں کے لیے مسلمانوں سے مشورہ ضروری ہے اور مزید یہ کہا کہ ہمارے حقوق اور حق کو کون نظر انداز کر سکتا ہے۔''(۲)

اللہ نے خلفائے اربعہ کی جو ترتیب مقرر اور مقدر فرمائی، اس نکتہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ڈاکٹر حمید اللہ قمطراز ہیں:

''آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح تربیت یافتہ چاروں خلفائے راشدین میں سے حضرت علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ سب سے کم عمر تھے، اگر وہ شروع میں ہی پہلے خلیفہ منتخب کر لیے جاتے تو ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے استفادہ سے محروم رہ جاتے، کیونکہ وہ اپنی اپنی خلافت شروع ہونے سے پہلے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ہی وفات پا چکے ہوتے، اور یہ رب تعالیٰ جل شانہ ہی کی طرف

---

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی اور جانشینی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ص/۱۷۱، ط/ملی پبلیکیشنز نئی دہلی ۲۵۔

(۲) ایضاً ص/۱۹۱

سے ہوا ہے، ہم نے ان سب کی قابلیتوں اور صلاحیتوں سے فائدہ حاصل کیا ہے۔"(۱)

اور ایک اہم سبب وحکمت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انسانی معاملات اپنے ہاتھوں میں رکھے، چاہے وہ دنیاوی وزمانی تھے یا دینی وروحانی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم بقاء کی جانب تشریف لے جانے کے بعد مسلمان قومیت نے انھیں دو حصوں میں تقسیم کردیا: ۱-بیرونی حصہ۔۲-اندرونی حصہ۔

بیرونی حصہ میں نہ صرف سیاست بلکہ بیرونی دینی عبادات و اعمال نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو بھی شامل کیا گیا، اندرونی حصہ میں تمام روحانی معاملات کو جمع کردیا گیا، جنھیں ہم عام طور پر تصوف کے نام کے تحت لاتے ہیں۔

نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ان دونوں حصوں کے لیے الگ الگ جانشین ہیں اور دونوں طبقوں کو ہی خلیفہ کہا جاسکتا ہے۔"(۲)

ڈاکٹر حمید اللہ نے بیرونی حصہ اور اندرونی حصہ کی جو تقسیم کی ہے، اس میں اندرونی خلفاء کے کاموں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ منصب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور کئی دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو بیک وقت حاصل تھا۔

ان اندرونی خلفاء نے اخلاقیات کی ترویج کے علاوہ سچی اسلامی یکجہتی، انسانی بھائی چارہ، تحمل، برداشت کے فروغ اور صدقات و

---

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی اور جانشینی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ص/۱۹۹۔ (۲) ایضاً ص/۲۰۰

خیرات کی کثرت کو اپنی تعلیمات کا محور بنایا، انھوں نے مہم جوؤں کی خواہشات کو دبانے اور بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کو بالکل ابتداء میں ہی ختم کرنے میں بہت مفید خدمات انجام دیں، سیاسی قیادتوں نے بھی ان روحانی خلفاء سے نیازمندی میں کبھی اپنی توہین نہیں سمجھی، بلکہ اکثر وہ انھیں اپنے سے برتر ہی تصور کرتے تھے۔"(۱)

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"آپ (یعنی علی رضی اللہ عنہ) کے زہد اور جفاکشی اور تنگی معیشت کے عجیب عجیب حالات ہیں، جن کو دیکھ کر رونا آتا ہے، اور دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے، آپ سے کرامات وخوارق عادات کا بھی ظہور ہوا ہے، معارف توحید کے بیان میں آپ ممتاز رتبہ رکھتے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ صحابہ کرامؓ کے طبقے میں ان معارف کا بیان سب سے پہلے آپ ہی نے کیا، لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے جو کچھ بیان فرمایا، بعد میں جاہل صوفیوں نے ان باتوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

تصوف میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے، یوں تو تزکیۂ باطن تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حاصل تھا، رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت قرآن مجید میں "وَيُزَكِّيهِمْ" ارشاد ہوئی ہے، مگر پھر بھی اپنی اپنی استعداد کے موافق باہم فرق مراتب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ اس صفت میں ایسی فوقیت رکھتے تھے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کا ہم رتبہ قرار دیا جاتا تھا۔"(۲)

---

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمرانی اور جانشینی از ڈاکٹر محمد حمید اللہ ص/۲۳

(۲) سیرت خلفائے راشدین ص/۲۰۰-۲۰۱ مطبوعہ مکتبہ فاروقیہ لکھنؤ

زہد واستغنا

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی سب سے نمایاں صفت دنیا سے بے رغبتی، زہد واستغنا کو قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اور وہ بات جو ان کی علامت اور پہچان بن گئی تھی، وہ ان کی دنیا سے ایسی حالت میں بے رغبتی و بے نیازی تھی جب کہ عیش و آرام کے تمام اسباب ان کے قدموں پر تھے، اور حکومت کے پورے اختیارات اور فراغت و دولت کے سارے وسائل واسباب آپ کو حاصل تھے، لوگوں کی طرف سے تعظیم وتکریم میں کمی نہ تھی، کوئی ان پر نقد نہیں کرسکتا تھا، اور نہ محاسبہ کرسکتا تھا۔

یحییٰ بن عین علی بن جعد سے روایت کرتے ہیں، اور وہ حسن بن صالح سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی مجلس میں ایک بار زہاد (دنیا سے بے رغبتی میں ممتاز افراد) کا ذکر چھڑا تو حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کہا کہ دنیا میں سب سے زیادہ زاہد علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت ابوعبیدہ عنترہ کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ انھوں نے کہا: ''میں خورنق میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، وہ ایک چادر اوڑھے سردی سے کانپ رہے تھے، میں نے کہا: امیر المومنین! اللہ نے آپ کو اور آپ کے افراد خاندان کے لیے اس مال میں حصہ رکھا ہے، اور آپ سردی سے کانپ رہے ہیں؟ فرمایا: ''میں تمہارے مال سے کچھ نہیں لیتا، میری یہی چادر ہے، جس میں اپنے گھر سے لے کر نکلا تھا'' ایک روایت میں ہے کہ

فرمایا: ''یہی چادر ہے جس کو میں مدینہ سے لے کر نکلا تھا۔''(۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی شہادت اس گروہ کے ذریعہ ہوئی جو زبان سے ایمان کے دعویدار تھے لیکن ان کے دل مومن نہیں تھے، ان کا شعور مومن نہیں تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت سبائیوں کے ذریعہ ہوئی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت خارجیوں کے ذریعہ، بات یہ ہوئی کہ:

ابن ملجم (خارجی) کوفہ پہنچ گیا، اور اپنے ساتھیوں (خوارج) سے بھی اپنے ارادہ کا اظہار نہیں کیا، شب جمعہ ۱۷ ررمضان کو اس دروازہ کے چھجے کے نیچے آ کر بیٹھ گیا جس سے حضرت علیؓ نماز کے لیے نکلا کرتے تھے، جس وقت آپ فجر کی نماز کے لیے نکلے اور لوگوں کو بیدار کر رہے تھے، نماز نماز کہہ رہے تھے اور لوگ نیند سے بیدار ہو کر نماز کے لیے اٹھ رہے تھے کہ ابن ملجم نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سر کے اگلے حصہ پر وار کیا، سر کے خون سے ریش مبارک رنگین ہوگئی، ابن ملجم کہتا ہے کہ

> ''میں نے ان پر ایسا وار کیا ہے کہ اگر پورے شہر والوں پر یہ وار پڑتا تو سب کے سب مر جاتے واللہ میں نے اپنی تلوار کو ایک مہینہ تک زہر میں بجھایا، ایک ہزار میں یہ تلوار لی تھی، اور ایک ہزار خرچ کر کے اس کو زہر آلود کیا۔''

جمعہ کے روز شہادت ہوئی، سحر کا وقت تھا، رمضان کے سترہ روزے ہو چکے تھے، ۶۳ سال عمر تھی، چار سال نو ماہ مدت خلافت رہی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور وہی آپ کے جانشین ہوئے اور ان کی چھ سالہ مدت خلافت پر خلافت راشدہ نیابت نبوت کا دور پورا ہوا۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ۸/۳-۵، حلیۃ الاولیاء ۱/۸۲ بحوالہ المرتضی ص/۳۰۲-۳۰۳

باب دہم

خاندان نبوت کے چشم و چراغ

اور

باغِ نبوت کے دو پھول

سیدنا حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما

خانوادۂ نبوت کے یہ وہ دو چشم و چراغ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے امت کی رہنمائی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ تابناک نمونے پیش کرائے جن کی روشنی میں ہر دور میں کام لیا جاتا رہے گا، ان میں ایک اگر صلح تمام تھے تو دوسرے سیف حق تھے، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو ان دونوں سے اپنے اپنے وقت کی ضرورت اور امت و انسانیت کی مصلحت کے تحت الگ الگ نوعیت کے کام لینے تھے اس لیے ان کے مزاج کی تشکیل اسی اعتبار سے ہوئی اور ان کی زندگیوں میں یہ مزاج برابر ظاہر ہوتا رہا اور صرف یہی نہیں کہ ان ہی تک یہ بات محدود رہی ان کی نسل میں بھی برابر یہ وصف منتقل ہوتا رہا اور اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت و مفاد کے خاطر وہ لوگ بھی اپنی قربانیاں اور خدمات پیش کرتے رہے اور اسلام کا پیغام عام کرنے کے لیے وہ لوگ ایک جگہ قرار

سے بیٹھے نہیں بلکہ ہجرت کی اپنی آبائی سنت کو بھی زندہ کرتے رہے، یہاں تک کہ یہ دین ان کے اشاعت اسلام کے جذبہ اور اخلاق ومروت سے ایک طرف افریقی ممالک اور مغرب اقصیٰ تک پہنچا دوسری طرف ہندوسند اور دوسرے خطوں میں اس کی آواز بلند ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا بقید حیات رہیں جنہیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا، اور کوئی بھائی بہن نہیں تھا کہ جن سے وہ اپنا غم ہلکا کرتیں، چند ہی مہینے میں وہ بھی وفات پاگئیں، ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا تعلق تھا، جس کی مختلف وجوہات ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ عفت وطہارت کے ساتھ جس میں ان کی بہنیں بھی کم نہیں تھیں غیر معمولی جرأت وبہادری کا وصف بھی رکھتی تھیں، جس کے لیے وہ واقعہ کافی ہے کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کی حالت میں ابوجہل کی پارٹی نے اس طرح پریشانی میں ڈالا کہ اونٹ کی اوجھڑی جو خاصی وزنی بھی ہوتی ہے وہ آپ کی پیٹھ پر رکھ دی کہ سجدہ سے اٹھ نہ سکیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے وہ اوجھڑی ہٹائی اور انھیں سخت سست کہا، اسی طرح اور بہنوں کے مقابلہ میں انھیں اپنے والد رسول خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گزاری کی سعادت زیادہ ملی کہ ان کی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہی گھر میں اور زیر کفالت رہے برادر عم زادہ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کی اور ایک بار جب ان کو فراخی کے حالات پیدا ہونے کے نتیجہ میں اپنی تنگی کو دور کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام یا باندی کے ذریعہ مدد کے بجائے ان کو تسبیحات کی تعلیم فرمائی وہ راضی برضا چلی گئیں اور یہ چیز ان کے لیے کافی ہوئی، پھر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیش آنے والے سانحہ سے قبل از وقت اطلاع دی تو وہ برداشت نہ کرسکیں لیکن اللہ کی مرضی جان

کر ہمت سے کام لیا اور اپنے کو قابو میں رکھا، یہ وہ لحہ تھا کہ سکنڈوں میں انھوں نے وہ مدارج طے کر لیے کہ انھیں جنت میں تمام عورتوں کی سیادت عطا کر دی گئی اور اس کی بھی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دی، صحیح مسلم میں یہ روایت موجود ہے۔

اور ایک اہم بات ان کی محبوبیت کی یہ بھی ہے جو ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان فرمائی کہ:

"مـا رأيـت أشبـه كـلامـا و حديثا من فاطمة برسول الله صلـى الله عليه وسلم و كانت إذا دخلت عليه رحّب بها وقام إليها فأخذ بيدها فقبّلها و أجلسها في مجلسه."(۱)

(میں نے لب ولہجہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ کسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہ نہیں دیکھا، جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی ترحیب کرتے، ان کی طرف بڑھتے، ان کے ہاتھ کو بوسہ لیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے)۔

ان ہی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں سے بہت زیادہ تعلق تھا، جس کا اظہار مختلف موقعوں اور حالتوں میں ہو جایا کرتا تھا، کبھی انھیں چمٹا لیتے، کبھی معانقہ فرماتے، کبھی سینہ سے لگاتے اور اگر وہ پیٹھ پر چڑھ جاتے تو ان کی اس ادا سے آپ خوش ہوتے اور ان کو پیٹھ سے اتارتے نہیں، کبھی وہ کاندھے پر ہوتے کبھی کسی پہلو پر کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قریب کرتے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الـجـامع الصحیح میں ان کے متعلق جو فضائل ذکر کیے ہیں ان میں چند یہ ہیں:

---

(۱) مستدرک حاکم۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"عانق النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحسن."

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن رضی اللہ عنہ سے معانقہ فرمایا)۔

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی المنبر والحسن بن علی إلی جنبه وهو یقبل ینظر علی الناس مرة أخری ویقول: إنّ ابنی هذا سید ولعل اللہ أن یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین."

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ آپ کے پہلو میں تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی نگاہ مجھ پر ڈالتے اور کبھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ پر ڈالتے اور فرماتے: "میرا یہ بیٹا سردار ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا)۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"إن النبی صلی اللہ علیه وسلم کان یأخذه یعنی الحسین والحسن ویقول: اللهم إنی أحبهما فأحبهما."

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو اپنے قریب کرتے اور فرماتے: "اے اللہ! مجھے ان دونوں سے محبت ہے تو بھی محبت فرما)۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"أتی عبید اللہ بن زیاد برأس الحسین فی طست فجعل

ينكت وقال في حسنه شيئا فقال أنس: كان أشبههم برسول الله صلى الله عليه وسلم وكان مخضوبا بالوسمة."

(عبیداللہ بن زیاد کے پاس حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا، ابن زیاد کچوکے لگا رہا تھا اور کچھ نازیبا الفاظ بھی ان کے حسن و جمال پر کہے تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے زیادہ مشابہ تھے اور بالوں میں خضاب لگاتے تھے)۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"رأيت النبي صلى الله عليه وسلم والحسن بن علي على عاتقه يقول اللهم إني أحبه فأحبه."

حضرت عقبہ بن الحارث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"رأيت أبا بكر وحمل الحسن وهو يقول بأنه شبيه بالنبي صلى الله عليه وسلم و ليس شبيها بعليّ وعليّ يضحك."

(میں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو دیکھا، وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اٹھائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں، علی رضی اللہ عنہ کے مشابہ نہیں ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہنس رہے تھے)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ارقبوا محمدا صلى الله عليه وسلم في أهل بيته."

(اہل بیت کے معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رکھو)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر فرمایا:

"أهل العراق يسألون عن قتل الذباب وقد قتلوا ابن بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وقال النبى صلى الله عليه وسلم: هما ريحانتاى فى الدنيا."

(عراقی لوگ مکھی کے قتل کا مسئلہ دریافت کرتے ہیں، جبکہ انھوں نے نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شہید کر ڈالا ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ دنیا میں یہ دونوں میرے خوشبودار پھول ہیں)۔(۱)

---

(۱) بحوالہ صحیح بخاری۔

ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
سیدنا حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ

نام ونسب

الامام السید ابو محمد الحسن بن علی بن ابی طالب بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم وسید شباب اہل الجنۃ الہاشمی رضی اللہ عنہ۔

خانۂ نبوت میں ولادت

شعبان یا رمضان ۳ھ کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور ان کے نانا سید المرسلین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو نواسہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے، فرمایا:

"أرونی ابنی، ما سمیتموہ؟"

(مجھے میرا بیٹا دکھاؤ، تم لوگوں نے اس کا نام کیا رکھا ہے؟)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حرب رکھا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بل ھو حسن." (بلکہ اس کا نام حسن ہے)(۱)، اور اسی وقت ان کے کان میں اذان دی۔(۲)

اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بچہ کے بالوں کے بقدر چاندی مساکین و

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/ ۲۴۷ (۲) ایضاً/ ۲۴۸

فقراء میں خیرات کرنے کو فرمایا اور انھوں نے ایسا ہی کیا۔(۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیقہ کیا اور ایک دنبہ ذبح فرمایا، علامہ ابن عبدالبر اندلسی مالکی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں:

"ولـدته أمه فاطمة بنت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فـى الـنـصف مـن شهر رمضان، سنة ثلاث من الهجرة، هـذا أصـح مـا قيل فى ذلك إن شاء اللّٰه، عقّ عنه رسول اللّٰه صـلى اللّٰه عليه وسلم يوم سابعه بكبش وحلّق رأسه وأمر أن يتصدق بزنة شعر فضة." (۲)

(وہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بطن سے نصف رمضان المبارک ۳ھ کو پیدا ہوئے، تاریخ ولادت میں جو باتیں کہی گئی ہیں، انشاء اللہ ان میں یہ بات زیادہ صحیح ثابت ہوگی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتویں دن ان کا عقیقہ فرمایا اور ایک دنبہ ذبح فرمایا، سر کے بال منڈوائے اور ان کے بالوں کے برابر چاندی صدقہ کرنے کا حکم فرمایا)۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے نانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی مشابہت تھی، ظاہری مشابہت کا اثر مزاج وطبیعت پر بھی پڑا اور اس میں بھی آپ اپنے نانا حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب تر اور مشابہ ترین تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ میں خوشبو محسوس فرماتے تھے، اس لیے آپ کو قریب کرتے، سونگھتے، چمٹاتے، اپنے اوپر بٹھاتے۔

علامہ ابن عبدالبر اندلسی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۸-۲۴۹۔ (۲) استیعاب ۱/۴۳۶

"وإنه ريحانتي من الدنيا."

(اور یہ بچہ دنیا میں میرا خوشبودار پھول ہے)۔(۱)

اور جب ان کے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی پیدا ہو گئے تو جو شفقت بڑے بھائی کے ساتھ تھی وہ ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ بھی ہونے لگی اور دونوں کے ساتھ برتاؤ میں مساوات کا معاملہ فرمانے لگے اور پھر ان دونوں کے بارے میں ایک ساتھ فرمایا:

"هما ريحانتاي من الدنيا."

(یہ دونوں دنیا میں میرے خوشبودار پھول ہیں)۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"دخلت على رسول الله صلى الله عليه وسلم والحسن والحسين يلعبان على صدره، فقلت يا رسول الله! أتحبهما؟ قال: كيف لا أحبهما وهما ريحانتاي من الدنيا."(۲)

(میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک پر کھیل رہے ہیں، میں کہا یا رسول اللہ! کیا آپ ان دونوں سے محبت فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بھلا میں ان سے محبت کیوں نہ کروں، یہ تو دنیا میں میرے خوشبودار پھول ہیں)۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد "هما ريحانتاي من الدنيا" مروی ہے اور اس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے

---

(۱) استیعاب ۱/۴۳۷ (۲) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۸۰

امام ترمذی سے نقل کیا ہے، ''ریحان'' کے معنی ابن اثیر رحمۃ اللہ علیہ نے رزق وراحت کے تحریر فرمائے ہیں۔

سایہ نبوت میں تعلیم وتربیت

حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب بڑے ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم وتربیت کا خود خیال فرمایا اور اپنی نگرانی میں رکھا، حضرت ابوالحوراء کہتے ہیں:

> ''میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا باتیں یاد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: مجھے یاد آتا ہے کہ میں نے صدقہ کے کھجوروں میں ایک کھجور اٹھایا اور اپنے منھ میں ڈال لیا تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منھ سے نکلوا کر کھجوروں میں شامل فرمادیا، عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! اس بچہ سے متعلق کھجور کی تو آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں تھی، فرمایا:''إنا آل محمد لا تحل لنا الصدقة.'' (ہم آل محمدؐ کے لیے صدقہ حلال نہیں ہے)۔''(۱)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے نانا سید ولد آدم وخیر الخلائق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم بھی سناتے تھے جو آپ کو دی تھی، فرمایا تھا:

> ''دع ما يريبك إلى ما لا يريبك، فإن الصدق طمانينة والكذب ريبة.'' (۲)
>
> (مشکوک چیزوں سے دور رہو اور اطمینان والی چیزوں کو اختیار کرو، سچائی میں اطمینان وسکون ہے اور جھوٹ میں بے اطمینانی ہے)۔

اور فرماتے ہیں کہ ہم کو اس دعا کی تعلیم دیا کرتے تھے:

> ''اللهم اهدنا فيمن هديت، وعافنا فيمن عافيت، وتولنا

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۶ (۲) ایضا

فیمن تولیت، و بارك لنا فیما أعطیت، وقنا شر ما
قضیت، فإنك تقضی ولا یقضی علیك، فإنه لا یذل من
والیت ولا یعز من عادیت، تبارکت ربنا وتعالیت،
نستغفرك اللهم ونتوب إلیك."(۱)

(بار الٰہا! ہمیں ہدایت وعافیت عطا فرما اور اپنی ولایت میں رکھ اور جو عطا کر اس میں برکت دے اور شر سے ہماری حفاظت فرما، فیصلہ تو کرتا ہے، تیرے خلاف فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، جسے تو دوست بنا لے اسے کوئی رسوا نہیں کر سکتا، جسے تو دور کر دے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا، تیری ذات بلند و بالا اور برکت والی ہے، ہم تجھ سے توبہ واستغفار کرتے ہیں)۔

حضرت ابوالحوراء کہتے ہیں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ کلمات دعا تعلیم فرمائے، میں قنوت میں ان کلمات سے دعا مانگتا ہوں، سنن ترمذی کی روایت میں قنوت وتر کی وضاحت ہے۔

تعلیم وتربیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نرمی کو ملحوظ رکھا اور شفقت و محبت کے ذریعہ تربیت فرمائی اور یہ شفقت اس درجہ تھی کہ ان کی شعور کی عمر نہیں تھی اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نماز کی حالت میں آجاتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ڈانٹ ڈپٹ نہ فرماتے اور وہ رکوع کی حالت میں ہوتے تو اقدام مبارک کے درمیان فاصلہ بڑھا دیتے کہ وہ نکلنا چاہ رہے ہیں تو ٹھیک سے نکل جائیں، وہ ایک طرف سے آ کر اندر سے دوسری طرف سے نکل جاتے اور سجدہ کی حالت ہوتی تو پیٹھ پر سوار ہو جاتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہ کہتے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے صرف

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۶

دوسال ہی بڑے تھے، اپنا مشاہدہ بیان کرتے ہیں:

"رأيت الحسن يأتي النبي صلى الله عليه وسلم وهو ساجد يركب على ظهره ويأتي وهو راكع فيفرج له بين رجليه حتى يخرج من الجانب الآخر."(۱)

(میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کی نماز کے دوران آتے اور آپ سجدہ میں ہوتے تو آپ کی پیٹھ پر سوار ہوجاتے اور اگر رکوع میں ہوتے تو دونوں پیروں کا فاصلہ بڑھادیتے، یہاں تک کہ وہ دوسری طرف سے نکل جاتے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اظہار تعلق ومحبت فرماتے، سختی نہ کرتے اوران کو قریب کرتے، پیار کرتے، حضرت انس رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے برتاؤ کوان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"وكان يشمهما ويضمهما إليه."(۲)

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں کوسونگھتے اور چمٹاتے تھے)۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"ان النبي صلى الله عليه وسلم أبصر الحسن والحسين فقال: اللهم إني أحبهما فأحبهما" (۳)

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو دیکھا تو فرمایا: اے اللہ! مجھے یہ دونوں محبوب ہیں، تو بھی ان کو محبوب بنالے)۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۹ (۲) ایضا ۳/۲۵۲ (۳) ایضا

مسند احمد میں مذکور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے مشاہدہ کی روایت کو امام ذہبی نے ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يمص لسانه أو شفته يعني الحسن، وإنه لن يعذب لسان أو شفتان مصهما رسول الله صلى الله عليه وسلم." (۱)

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی زبان یا ہونٹوں کو چوم رہے تھے اور جس زبان یا ہونٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چوما ہو، اس کو عذاب نہیں ہوسکتا)۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ نماز میں سجدہ میں بھی ان کی وجہ سے زیادہ رک جاتے اور سجدہ سے اٹھنے میں ان کی رعایت فرماتے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں:

"كنا مع النبي صلى الله عليه وسلم في صلاة العشاء، فكان إذا سجد ركب الحسن والحسن على ظهره، فإذا رفع رأسه رفعهما رفعا رفيقا، ثم إذا سجد عادا، فلما صلى قلت: ألا أذهب بهما إلى أمهما؟ قال: فبرقت برقة، فلم يزالا في ضوئها حتى دخلا على أمهما."(۲)

(ہم لوگ عشاء کی نماز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھے، جب آپ سجدہ میں گئے تو حسن وحسین رضی اللہ عنہما آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر سوار ہوگئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر اٹھایا تو ان دونوں کو آہستہ سے اتار دیا، پھر جب سجدہ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۵۹ (۲) ایضا ۳/۲۵۶

میں گئے تو دونوں پھر بیٹھ گئے، جب نماز پوری کر لی تو میں نے عرض کیا کہ کیا میں ان دونوں کو ان کی والدہ کے پاس پہنچا دوں؟ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پھر ایک بجلی چمکی اور وہ دونوں اس کی روشنی میں اپنی ماں کے پاس پہنچ گئے)۔

حضرت شداد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو حامل حسناً وحسيناً، فتقدم فوضعه، ثم كبر في الصلاة، فسجد سجدة أطالها، فرفعت رأسي، فإذا الصبي على ظهره، فرجعت في سجودي، فلما قضى صلاته، قالوا يا رسول الله! إنك أطلت، قال: إن ابني ارتحلني، فكرهت أن أعجله، حتى يقضي حاجته."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے، آپ حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو لیے ہوئے تھے، جب نماز کے لیے آگے بڑھے تو ان کو اتار دیا، پھر نماز کی تکبیر کہی، اور جب سجدہ میں گئے تو بہت لمبا سجدہ کیا، میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ ایک بچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر بیٹھا ہوا، میں پھر اپنے سجدہ میں چلا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز مکمل فرما چکے تو لوگوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے بہت لمبا سجدہ کیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا بیٹا مجھ پر سوار ہو گیا تھا تو مجھے اچھا نہ لگا کہ جلدی اٹھ جاؤں، یہاں تک کہ وہ اس کا جی بھر جائے)۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۵۷

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں:

"خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم حامل الحسن على عاتقه فقال رجل: يا غلام! نعم المركب ركبت. فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ونعم الراكب هو."(١)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے کندھے پر بٹھائے ہوئے باہر تشریف لائے، ایک شخص نے کہا: کیا ہی اچھی سواری پر تم سوار ہو۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور یہ سوار بھی تو بہترین سوار ہے)۔

چونکہ حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی عمر میں زیادہ تفاوت نہیں تھا، ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی، اس لیے ایک دوسرے سے پیش قدمی بھی ہو جاتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ناحیہ سے بھی تربیت فرماتے اور جس کا حق پہلے ہوتا اس کا حق پہلے دیتے، مسند ابوداؤد طیالسی کی روایت امام ذہبی نے نقل کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"زارنا رسول الله صلى الله عليه وسلم، فبات عندنا، والحسن والحسين نائمان، فاستسقى الحسن، فقام رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى قربة وسقاه، فتناول الحسين يشرب، فمنعه وبدأ بالحسن، فقالت فاطمة: يارسول الله كأنه أحبهما إليك، فقال: لا، ولكن هذا استسقى أولا، ثم قال: وإني وإياك وهذين يوم القيامة في مكان واحد، وأحسبه قال: وعليا."(٢)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں تشریف لائے اور

---

(١) سیر اعلام النبلاء ٣/٢٥٧ (٢) ایضا ٣/٢٥٨

ہمارے ساتھ رات گزاری، حسن اور حسین سو رہے تھے، اتنے میں حسن کو پیاس لگی اور پانی طلب کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مشکیزہ سے پانی لائے، حسین بھی پینے کے لیے بڑھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں تربیۃً روک دیا، اور حسن کو پہلے پینے کو دیا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! شاید حسن آپ کو زیادہ محبوب ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ حسن نے پانی پہلے مانگا تھا، پھر فرمایا: قیامت کے دن میں اور تم اور یہ دونوں ایک ہی جگہ پر ہوں گے، راوی کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ آپؐ نے فرمایا: اور علی بھی)۔

حافظ ابن القیم الجوزیہ نے ''الوابل الصیب'' میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے وہ کلمات تعوذ و رقیہ بھی نقل کیے ہیں، جن کے التزام میں جسمانی و روحانی حفاظت کا بڑا سامان ہے، وہ بیس آیتیں ہیں: سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵، سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۵۴ تا ۵۶، سورۂ صافات کی ابتدائی دس آیتیں، سورۂ رحمٰن کی آیت نمبر ۳۳ تا ۳۵ اور سورۂ حشر کی آخری تین آیتیں۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"أنا ضامن لمن قرأ هذه عشرين الآية أن يعصمه الله تعالىٰ من كل شيطان ظالم ومن كل شيطان مريد ومن كل سبع ضار ومن كل لص عاد."(۱)

(میں اس شخص کے لیے ضمانت لیتا ہوں جو مندرجہ ذیل بیس آیتیں پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ ہر ظالم و سرکش شیطان سے اور ہر خونی درندے سے اور ہر چور اُچکے سے اس کی حفاظت فرمائے گا)۔

---

(۱) الوابل الصيب من الكلم الطيب، باب الحرز المنيع للإمام ابن القيم الجوزية.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما پر خود بھی پڑھ کر دم فرمایا کرتے تھے۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ:

"کان رسول الله صلى الله عليه وسلم يُعوّذ الحسن والحسين عليهما السلام يقول: أعيذ كما بكلمات الله التامة من كل شيطان وهامة ومن كل عين لامة، ويقول: هكذا كان أبي إبراهيم يعوذ ابنيه إسماعيل وإسحاق صلى الله عليهم أجمعين."(۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے لیے تعویذی کلمات اس طرح ادا فرماتے کہ میں تم دونوں کی اللہ کے کامل کلمات کے ذریعہ ہر شیطان و بدشگون اور ہر نظر بد سے پناہ چاہتا ہوں، اور فرماتے کہ اسی طرح میرے باپ حضرت ابراہیم اپنے دونوں بیٹوں حضرت اسماعیل واسحاق علیہم الصلوٰۃ والسلام اجمعین کے لیے پناہ طلب کرتے تھے)۔

خلفائے راشدین کا تعلق

سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کم سن تھے، بعد میں ان کو ایک دوسرے عظیم سانحہ سے بھی دوچار ہونا پڑا، وہ یہ کہ ان کی والدہ سیدۃ نساء العالمین حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا نے بھی چند مہینوں کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ سرپرست موجود تھے، انھوں نے ان کو علوم نبوت سے مالا مال کیا، دوسری طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

(۱) تاریخ دمشق الکبیر ۶/ ۳۶۷ ابن عساکر

اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی پوری توجہ ان کو حاصل رہی، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک موقع پر کہ حضرت علی موجود تھے فرمایا کہ کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں، علی رضی اللہ عنہ کے مشابہ نہیں ہیں" بأنه شبيه بالنبي صلى الله عليه وسلم و ليس شبيها بعلي." (۱)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب وظیفے مقرر کیے تو اہل بدر کا وظیفہ امتیازی رکھا اور حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا وظیفہ اہل بدر کے بقدر رکھا، جبکہ ان دونوں کی ولادت واقعہ بدر کے بعد ہوئی، واقدی کی روایت ہے:

"إن عمر لمّا دوّن الديوان ألحق الحسن و الحسين بفريضة أبيهما، لقرابتهما من رسول الله صلى الله عليه وسلم، فرض لكل منهما خمسة آلاف درهم."(۲)

(جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وظیفہ داران کی فہرست جاری فرمائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کے لحاظ میں حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما کا وظیفہ بھی ان کے والد کے وظیفہ کے ساتھ علاحدہ متعین فرمایا، اور ان دونوں میں ہر ایک کے لیے پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا)۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنی عمر کے اس مرحلہ کو پہنچ چکے تھے کہ دین کی نصرت کے لیے جو اقدام کرنا چاہیں کریں لیکن ان کو ان سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا جن میں فتنے سر اٹھا رہے تھے اور مسلمانوں کی صفوں کو کمزور کرنے کی پوری پلاننگ کر لی گئی تھی، جو بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت اور ان کے محاصرہ اور پھر ان کی مظلومانہ شہادت سے اسلام کے خلاف سازش رچی گئی، ایسی صورت میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جو کیا وہ دین کی

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۴۹/۳ (۲) ایضا ۲۵۹/۳

نصرت میں اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنے کا عمل تھا۔

حضرت رجاء رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہتے ہیں:

''حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نصرت بہت آگے بڑھنے والے تھے اور ان کا بڑا دفاع کرنے والے تھے۔''(۱)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا حسن سلوک اور عقیدت واحترام

گو مؤرخین نے حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور ان کے صاحبزادوں حضرات حسن وحسین رضی اللہ عنہما کے حریف کے طور پر پیش کیا ہے جو کہ درست نہیں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو مجبوری تھی وہ علاقائی مجبوری تھی کہ اہل شام رومی سلطنت کے تابع رہے تھے اور اہل عراق ایرانی سلطنت کے تابع رہے تھے اور مزاج بھی دونوں کا الگ اور عادات واطوار مختلف تھے اور دونوں کی مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں قومیں اپنے کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتی آئی تھیں، جب یہ دونوں علاقے مفتوح ہوگئے تو اہل شام کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا اقتدار ملا اور اہل عراق کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کا، اہل عراق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دم بھرتے رہے اور اہل شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت سے منافقین کو یہ موقع ملا کہ ان دونوں قوموں کے درمیان اور دوری پیدا کریں، اہل شام کے مطالبات کو یکسر نظر انداز کرنا گویا ان کو روم کی طرف واپس بھیجنا تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس مجبوری کو سمجھتے تھے، اس لیے انھوں نے اس سیاسی مصلحت کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مشکلات تھیں وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ لے کر امت کی شبیہ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جس کی تلافی کا پھر کوئی سامان نہ تھا، ایسی صورت حال میں جو ٹکراؤ کی صورت

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۶۰

پیش آئی، اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا، دونوں بزرگ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے تئیں پوری طرح مخلص تھے، لیکن اپنی مجبوریوں کے تحت ان کو اپنی اپنی جگہ جو اقدامات کرنے پڑے اس میں انھوں نے اجتہاد سے کام لیا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مصالحت کے ذریعہ اس مشکل کو بھی دور کردیا جس سے امت دوچار تھی۔

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے تئیں مخلص نہ سمجھتے تو وہ کسی بھی صوت میں نظام حکومت وخلافت کی باگ ڈور ان کے حوالہ نہ کرتے اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی میں انھوں نے اللہ کی رضا سمجھی اور اسی پر ان کا دل ہمیشہ مطمئن رہا اور اسی میں ان کے لیے ان کے نانا سیدالاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کا ایما تھا اور وہ واضح بشارت تھی جو اللہ نے ان کے ذریعہ پوری کردکھائی۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دل میں خانوادہ نبوت کا جواحترام وعقیدت تھی اس کا کسی نہ کسی طرح اظہار ہوجایا کرتا تھا، جیسے وہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کی خدمت میں نذرانے پیش فرماتے اور وہ دونوں جوایسے نذرانے اور ہدایا وتحائف قبول کرنے میں محتاط تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے نانا کی نسبت سے ذرا بھی دنیوی فائدہ اٹھائیں لیکن حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے نذرانوں کو ان کے اس تعلق کی وجہ سے جوان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہایت مخلصانہ تھا قبول فرمایا کرتے تھے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں ان کے فرزند یزید کو ان اقدار و روایات کا لحاظ کم تھا جو بنوہاشم کے افراد حضرت عباس وعلی رضی اللہ عنہما اور خود سرکار دوعالم حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے دادا ابوسفیان اور والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ خاص طور پر فتح مکہ کے موقع پر اور حنین کے مال غنیمت کی تقسیم پر روا رکھا تھا، اس کے نتیجہ میں یزید نے ایک بار حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فخر بالآباء کیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو ناپسند کیا اور

اس پر یزید کی سرزنش کی۔

امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فاخر يزيد بن معاوية الحسن بن علي رضي الله عنهما فقال له أبوه: فاخرت الحسن؟ قال: نعم، قال: لعلك تظن أن أمك مثل أمه، أو جدك كجده، فأما أبوك وأبوه فقد تحاكما إلى الله فحكم لأبيك على أبيه."(۱)

(یزید بن معاویہ نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے اظہار فخر کیا تو یزید کے والد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید سے کہا: تم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اظہار فخر کیا ہے؟ اس نے کہا ہاں، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم سمجھتے ہو گے کہ تمہاری ماں ان کی ماں جیسی ہے یا تمہارے نانا ان کے نانا جیسے ہیں، ہاں تمہارے باپ اور ان کے باپ کا جہاں تک معاملہ ہے تو ان دونوں نے اپنا قضیہ اللہ کے یہاں رکھا تو اللہ نے حالات تمہارے باپ کے حق میں کر دیئے)۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت

امیر المومنین حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے بعد خلیفہ منتخب ہوئے اور ارباب حل وعقد نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، پھر اور لوگوں نے بیعت کی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ان کو خلیفہ نامزد نہیں کیا تھا، باوجود لوگوں کی خواہش کے اس معاملہ کو انھوں نے اپنے بعد والوں پر چھوڑ دیا تھا، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۶۰ وابن عساکر ۴/۲۱۶

”جب ابن ملجم کے ہاتھوں سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ مجروح ہوگئے اور وفات کا وقت قریب تھا، تو لوگوں نے عرض کیا: امیر المومنین! کسی کو خلیفہ نامزد کردیجیے، فرمایا: نہیں، میں یہ کام تم پر چھوڑتا ہوں، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوڑا تھا (یعنی خلیفہ نامزد کیے بغیر دنیا سے تشریف لے گئے) اگر اللہ تمہارے لیے بہتری کا ارادہ فرمائے گا تو تم میں سے جو مناسب ترین فرد ہوگا، اس پر تم کو جمع کردے گا، جیسا کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب میں بہتر مرد (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) پر جمع کردیا تھا۔

لیکن لوگوں نے اسی روز جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا تھا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلی، یہ جمعہ کا روز رمضان المبارک کی ۱۷ تاریخ اور ۴۰ھ تھا۔“(۱)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو خلافت کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد جن حالات کا سب سے پہلے سامنا ہوا وہ اس آگ کو بجھانے کا تھا جو اہل عراق اور اہل شام کے درمیان بھڑک رہی تھی اور اہل عراق کا آپ پر روز بروز یہ اصرار بڑھتا گیا کہ آپ اہل شام سے قتال کریں، جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے درمیان خوں ریزی کو طبعاً ناپسند کرتے تھے اور انھوں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی اس وقت یہ درخواست کرڈالی تھی جب وہ اہل شام کے خلاف جنگ پر آمادہ تھے اور تیاریاں کرکے مدینہ سے نکل رہے تھے کہ آپ ایسا نہ کریں۔

مؤرخ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”جس وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اہل شام سے جنگ کا

---

(۱) المرتضیٰ از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی بحوالہ ابن کثیر ۱۴/۸

ارادہ کیا اور اس کے لیے تیاریاں مکمل کر کے مدینہ سے نکل رہے
تھے کہ اپنے حامیوں اور انصار کے ساتھ حریف اور برسر مقابلہ
لشکر سے جنگ کریں تو اس وقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ
سامنے آئے اور عرض کیا: "یـا أبـت د ع هـذا" (اے اباجان!
آپ ایسا نہ کیجیے) کیونکہ اس راہ میں مسلمانوں کا بڑا خون بہے گا
اور ان کے درمیان اختلافات اور صف آرائی کا غیر مختتم سلسلہ
شروع ہو جائے گا۔"(۱)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب ان سنگین حالات میں جس میں آمنے سامنے آجانے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں رہ گیا تھا، مسلمانوں کے خون بہانے سے بچنے کے لیے جنگی اقدام سے روکنے کی اپنے آہنی عزم رکھنے والے والد سے جرأت کرنے جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو اس کے اعلیٰ درجہ جہاد و عزیمت کے ساتھ انجام دینے کا حوصلہ اور اہل حق کو ان کا حق دلانے کی ذمہ داری اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے عہدہ برآ ہونا ضروری سمجھتے تھے، اور اس شبہ کی حالت میں چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے کہ حق کے متعلق لوگ ہمیشہ اشتباہ میں پڑے رہیں، ان حالات میں اسلام کی جو تعلیمات اور شریعت کا جو تقاضہ ہے اس کی تنفیذ ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے اس حکمت کے تحت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل نہیں کیا اور اس کے نتیجہ میں داخلی یورشوں کی وجہ سے جو مسائل اور حالات سامنے آئے، اس میں شریعت و سنت کا جو حکم و منشا تھا اس کو انھوں نے نافذ کر کے اس دین کی تنفیذ کا کام مکمل کیا جو باعتبار نزول حجۃ الوداع میں مکمل ہو گیا تھا اور یہ آیت نازل ہوئی تھی: ﴿ٱلۡيَوۡمَ أَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِينَكُمۡ وَأَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ ٱلۡإِسۡلَٰمَ دِينٗا﴾.

حضرت حسن رضی اللہ عنہ اب جنگی صورت حال کو کسی بھی صورت میں باقی

---

(۱) البدایہ والنہایہ ۷/۲۲۹-۲۳۰

رکھنے کے حق میں نہیں تھے اور وہ حکمت و مصلحت بھی اب باقی نہیں رہ گئی تھی جس نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اس کے لیے مجبور کر رکھا تھا اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کی تکمیل انھیں اتحاد و اتفاق کی فضا قائم کرنے اور ملت اسلامیہ کو دو دھڑوں میں تقسیم ہونے سے بچانے کا جذبہ بے قرار کیے ہوئے تھا، گو حالات فوری طور پر اس کے نہیں بن سکے، لیکن جیسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق تیس سال پورے ہونے کو آئے، حالات نے اسی جانب کروٹ لی اور امت مجتمع ہوگئی، گو خلافت راشدہ کا دور بھی اس کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

مؤرخ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں ربیع الاول ۴۱ھ میں دست بردار ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے اس دن تک تیس سال پورے ہوتے ہیں۔''(۱)

حافظ مغلطائی نے بھی حضرت حسن بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت راشدہ کا جز قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بايعه ثمانون ألفا فمكث ستة أشهر، ثم سلّم الأمر لمعاوية، وذلك تمام الأربعين، قال صلى الله عليه وسلم: الخلافة بعدي ثلاثون سنة ثم تصير ملكا عضوضا."(۲)

(۸۰ ہزار لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر

---

(۱) البدایہ والنہایہ ۱۶/۸

(۲) الإشارة إلى سيرة المصطفى للحافظ مغلطائي ص/۴۷۸ دارالقلم دمشق

بیعت کی، آپ چھ ماہ تک خلیفہ رہے، پھر خلافت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کردی، اس طرح چالیس سال پورے ہوگئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی پھر بادشاہت آجائے گی)۔

امام سیوطی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"قال الإمام أحمد: حدثنا بهز، حدثنا حماد بن سلمة، حدثنا سعيد بن جمهان عن سفينة، قال: سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: الخلافة ثلاثون عاما ثم يكون بعد ذلك ملك، أخرجه أصحاب السنن وصححه ابن حبان وغيره، قال العلماء: لم يكن في الثلاثين بعده صلى الله عليه وسلم إلا الخلفاء الأربعة وأيام الحسن."(۱)

(امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت سفینہ کی روایت نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ خلافت تیس سال ہوگی، پھر بادشاہت آئے گی۔ علماء کہتے ہیں: یہ زمانہ خلفائے اربعہ اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا ہے)۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت چھ ماہ رہی، یہ اس صورت میں ہے جب ان کا تسلیم امر خلافت ماہ ربیع الاول ۴۱ھ مانا جائے اور اگر ماہ جمادی الاولیٰ کو اختیار کیا جائے جیسا کہ بعض مؤرخین کا خیال ہے تو سات ماہ سے زائد مدت خلافت ہوئی۔

---

(۱) تاریخ الخلفاء للسیوطی ص/۹

عظیم اور لازوال کارنامہ

سب کے کارنامے اپنی جگہ ہیں، لیکن ریحانۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا کارنامہ نبوی معجزہ کے طور پر ظاہر ہوا، جب انھوں نے امت کو متحد کرنے کے لیے مصالحت کا تہیہ کرلیا اور موت پر بیعت لینے والے اور لڑائی پر پورے طور پر آمادہ لشکر کو ٹھہر جانے کا حکم صادر فرمایا جو اس وقت ان لوگوں کے لیے زہر کا پیالہ پینے کے مترادف تھا، لیکن یہ بڑا ہی مبارک قدم تھا، جو حضرت حسن رضی اللہ عنہ اٹھایا اور امت اسلامیہ جو دو گروہوں میں بٹ گئی تھی اس کو ایک جھنڈے کے نیچے متحد کردیا، حافظ مغلطائی نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں گنایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں اس واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے یہ حدیث صحیح بخاری کے حوالہ سے ذکر کی ہے کہ:

”وقال للحسن: إن ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين، فسلّم الأمر لمعاوية.“(۱)

(آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عنقریب اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔ چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ کو خلافت سپرد کردی)۔

چنانچہ اس واقعہ کی وجہ سے پوری ملت اسلامیہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور اس سال کو عام الجماعت کا نام دیا گیا اور ایک امیر کے تحت اجتماع کی وجہ سے بعض جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے جنھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بھی بیعت

---

(۱) رواه البخاري بحواله الإشارة إلى سيرة المصطفى للحافظ مغلطائي ص/٤٧٨

کی تھی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت امارت کر لینے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت امارت کر لی۔

مصالحت میں فریقین کا کردار اور خلیفۃ المسلمین حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا فکر و مزاج

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر یہ بشارت دی تھی کہ اللہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جب سے یہ بات زبان نبوت سے سنی تھی اسی وقت سے اتحاد و اتفاق کی ہر بات ان کے لیے زیادہ مانوس اور پسندیدہ ہوتی رہی تھی، اسی لیے انھوں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی قتال اہل شام سے روکنے کی کوشش کی تھی اور جب ان کے لیے خود فیصلہ لینے کا وقت آیا تو ذرا بھی تاخیر گوارہ نہ کی اور ایسے وقت قدم اٹھایا جب ان کے لشکر کی قیادت رئیس الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کر رہے تھے، جن کو فتح مکہ کے موقع پر ان کے والد حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا جھنڈا دے دیا گیا تھا اور دوسری طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے جن کے والد قریش مکہ کے سرداروں میں رہے تھے اور خود ان کو قیادت کی وہ اعلیٰ صلاحیت حاصل تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انھیں دیکھتے تو فرماتے کہ یہ کسریٰ العرب ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ذہن میں یہ بات بار بار آتی تھی کہ جب اللہ نے ان کے خاندان میں نبوت رکھ دی اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں مبعوث فرمایا، اس لیے اس خاندان کو سیاست و حکومت راس نہیں آئے گی، اس کو کار نبوت راس آئے گی اور وہ دعوت و اصلاح، تعلیم و تبلیغ کا وسیع میدان اور عظیم کام ہے، جس کے ذریعہ سارے انسانوں کے دلوں پر حکومت کی

جاسکتی ہے اور اس کے لیے سب سے کارگر صفت رحمت اور اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، چنانچہ اس موقع کا ان کو انتظار تھا، جیسے ہی ان کو یہ موقع ملا، انھوں نے اقدام کرنے میں دیر نہ کی۔

مصالحت میں فریقین کا کردار

اس بات میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ تسلیم امر خلافت لشکروں کے آمنے سامنے آنے پر ہوا یا مراسلت ہی اس کے لیے کافی ہوگئی تھی، محدثین اس بات کے قائل ہیں کہ مراسلت ہی کافی ہوگئی تھی اور اس میں سب کا اتفاق ہے کہ مقابلہ کی نوبت نہیں آئی، البتہ اہل شام اور اہل عراق عدم مصالحت کی صورت میں آمنے سامنے آسکتے تھے جس سے مسلمانوں کو بھاری جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑتا اور طاقت کمزور ہوتی، اس کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دینی وملی مصلحت کے خلاف سمجھا اور ایک جھنڈے تلے ملت اسلامیہ کے رہنے کو ترجیح دی، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ ابن ابی خیثمہ کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"فکره الحسن القتال وبایع معاویة علی أن یجعل العهد للحسن من بعده، فکان أصحاب الحسن یقولون له: یا عارالمومنین، فیقول: العار خیر من النار."(۱)

(چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے قتال کو گوارہ نہ کیا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے اس شرط پر بیعت کرلی کہ ولی عہد حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی کو نامزد کریں، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لوگ جب ان کو "یا عارالمومنین" کہہ کر پکارتے تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ جواب دیتے کہ "عار، نار سے بہتر ہے")۔

علامہ ابن بطال شارح صحیح بخاری نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ

(۱) فتح الباری شرح بخاری ۱۳/۶۵ (دارالمعرفۃ، بیروت)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود بھی یہی چاہا تھا کہ اب خلافت دو نظاموں کے تحت نہ چلے کہ شام والوں کا خلیفہ دوسرا ہو اور عراق والے دوسرا خلیفہ منتخب کریں، اس لیے جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دو نمائندے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجے، امام بخاری نے ان دونوں نمائندوں حضرت عبداللہ بن عامر، اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہما کی یہ بات نقل کی ہے کہ ان دونوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "نلقاہ فنقول لہ الصلح" (ہم ان سے ملیں گے اور مصالحت کی بات کریں گے)۔(۱)

چنانچہ ان دونوں کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ نصیحتیں فرمائیں، ان دونوں بزرگوں نے اسی کے مطابق بات رکھی اور معاملہ کیا اور مصالحت ہوگئی۔

ابن بطال کی تحقیق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

"هذا يدل على أن معاوية كان هو الراغب في الصلح وأنه عرض على الحسن المال ورغبه فيه، وحثه على رفع السيف وذكره ما وعده به جده صلى الله عليه وسلم من سيادته في الإصلاح به."(۲)

(اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ہی صلح کی طرف رغبت دلائی اور اس مقصد کے لیے مال ومتاع کی پیشکش کی اور جنگ سے باز رہنے پر آمادہ کیا اور ان کے نانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ذریعہ صلح کے ذریعہ ان

---

(۱) حضرت عبداللہ بن عامر اور حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ بن حبیب رضی اللہ عنہما دونوں صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کی خدمات لیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان کی صلاحیتوں سے اسلام اور مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا اور ان کے ذریعہ فتوحات بھی ہوئیں۔ (ملاحظہ ہو: الاستیعاب)

(۲) فتح الباری ۱۳/ ۸۱ مطبوعہ دارالسلام ریاض

کی سیادت کی جو بشارت دی تھی اس کا بھی تذکرہ کیا)۔

جہاں تک مال و متاع پر قناعت کر لینے کی بات کا تعلق ہے تو درحقیقت حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کو بھی تفرقہ سے بچنے کے لیے اختیار کیا، علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی رائے یہی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"وأراد الحسن بذلك كله على من لا يرضيه إلا المال."(۱)

(حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مال و متاع ان لوگوں کی خاطر قبول کیا جن کو صرف اسی کے ذریعہ راضی کیا جا سکتا تھا)۔

اس لیے کہ یہ ایک بڑی جماعت تھی جس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر موت کی بیعت لی تھی، یہ چالیس ہزار مرد مجاہد تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت قیس بن عبادہ انصاری خزرجی رضی اللہ عنہ کو مقدمۃ الجیش پر رکھا تھا، جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور انھوں نے صلح کو ترجیح دے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حق میں دستبرداری کا فیصلہ لیا تو اس کی اطلاع حضرت قیس رضی اللہ عنہ کو دی، حالانکہ وہ پرعزم و حوصلہ مند لشکریوں کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر سے جنگ کی ٹھانے ہوئے تھے، لیکن حضرت امیر المومنین کے فیصلہ کے بعد واپسی اختیار کر لی۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے دست برداری کا اصل سبب دنیا پر آخرت کو ترجیح اور حصول رضائے الٰہی کو قرار دیا، حافظ ابن حجرؒ نے ان کا یہ جملہ نقل کیا ہے کہ:

"يا معاوية إني اخترت ما عند الله فإن يكن هذا الأمر لك فلا ينبغي لي أن أنازعك فيه وإن يكن لي فقد تركته لك."(۲)

---

(۱) فتح الباری ۸۱/۱۳ مطبوعہ دار السلام ریاض (۲) ایضا ۷۹/۱۳

(اے معاویہ! میں نے اس کو اختیار کیا جو اللہ کے یہاں پاس ہے، اگر خلافت آپ کا حق ہے تو اس کے لیے آپ سے نزاع کرنا مناسب نہیں اور اگر میرا حق ہے تو میں آپ کی خاطر اپنے حق سے بھی دستبردار ہوں)۔

عام الجماعۃ

بالآخر حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت امارت کر کے حجت تمام کردی اور دنیا کو دکھلا دیا کہ اللہ کے نام پر کس طرح اختلافات دور کیے جا سکتے ہیں، اسی کے باعث یہ سال امت کے لیے عام الجماعۃ قرار پایا، علامہ ابن بطال رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"سلّم الحسن لمعاوية الأمر وبايعه على إقامة كتاب الله وسنة نبيه ودخل معاوية الكوفة وبايعه الناس، فسميت سنة الجماعة لاجتماع الناس وانقطاع الحرب، وبايع معاوية كل من كان معتزلا للقتال، كابن عمر و سعد بن أبي وقاص ومحمد بن مسلمة، وأجاز معاوية الحسن بثلاث مائة ألف وألف ثوب وثلاثين عبدا ومائة جمل وانصرف إلى المدينة، وولى معاوية الكوفة المغيرة بن شعبة والبصرة عبد الله بن عامر ورجع إلى دمشق."(۱)

(حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو خلافت سپرد کردی اور اقامت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر

---

(۱) فتح الباری ۱۳/۸۰ مطبوعہ دار السلام ریاض

بیعت کرلی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کوفہ پہنچے تو وہاں لوگوں نے بیعت عام کی، اس لیے اس سال کو عام الجماعت کہا گیا، لوگوں کے متحد ہونے اور جنگ بند ہونے کی وجہ سے، اور ہر اس شخص نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے بیعت کرلی جو کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھا، جیسے حضرت ابن عمر، سعد بن ابی وقاص اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تین لاکھ کی رقم، ہزار کپڑے، تیس غلام اور سو اونٹ پیش کیے اور مدینہ واپس ہوگئے، اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو کوفہ کا اور حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بصرہ کا گورنر مقرر کیا اور دمشق کے لیے روانہ ہوگئے)۔

فریقین کے لیے بشارت

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی سیادت کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کھلی بشارت ہے، جو امت کو خون خرابہ سے بچانے اور اسلام کی تصویر خراب نہ ہونے دینے کے لیے تھی، وہیں دونوں گروہوں کے اہل اسلام ہونے کی بشارت بھی ہے، اس لیے کہ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں فریقوں کے متعلق یہ گواہی دی ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی اس منقبت کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”وفی هذه القصة من الفوائد : علم من أعلام النبوة ومنقبة الحسن بن علی رضی الله عنهما، فإنه ترك الملك لا لقلة ولا لذلة ولا لعلة بل لرغبة فيما عند الله

لـمـا رآه مـن حـقـن دمـاء الـمسـلمين فراعى أمر الدين ومصلحة الأمة.

ومـنهـا ردّ الـخـوارج الـذيـن يـكفرون عليا ومن معه ومـعـاوية ومـن معه، بشهادة النبى صلى اللّٰه عليه وسلم للطائفتين بأنهم من المسلمين."(۱)

(اس واقعہ میں کھلے فوائداور نبوت کی بڑی نشانی ہےاور حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی منقبت بھی ہے کہ انھوں نے مال و متاع اور افراد کی یا عزت کی کمی یا اور کسی کمزوری کے باعث حکوت نہیں چھوڑی بلکہ اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے یہ قربانی دی کہ ان کو مسلمانوں کے خون خرابہ کا خوب اندازہ تھا، لہٰذا امر دین اور امت کی خیر خواہی اسی فیصلہ میں تھی۔

اور اس میں خوارج کا رد بھی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کو کافر گردانتے ہیں، اس لیے کہ اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فریقین کے مسلمان ہونے کی گواہی دی ہے)۔

ظاہری سیادت وحکومت کی قربانی اور باطنی سیادت کی بشارت

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے اس عظیم اور لازوال کارنامے اور ناقابل فراموش قربانی سے علم وحکمت کے جو باب وا ہوئے ہیں اس کی روشنی میں انسان ہر دور اور ہر مقام اور اپنی زندگی کے ہر موڑ پر وہ رہنمائی حاصل کرسکتا ہے جس کا ہر انسان کو اپنی زندگی میں کسی نہ کسی موقع پر ضرورت پڑ جاتی ہے اور قرآن مجید کا یہ فرمان اس کو ندا لگاتا ہے کہ:﴿ما عندكم ينفد و ما عند اللّٰه باق﴾.

(۱) فتح الباری ۸۴/۱۳ مطبوعہ دار السلام ریاض

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کا عملی اسوہ اس کو آسان بنادیتا ہے کہ انھوں نے اللہ کی خاطر دنیا کی سب سے عظیم چیز سلطنت وحکومت کو جو انھیں حاصل ہوگئی تھی، بڑی آسانی سے چھوڑ دی، جس کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو پسند فرماتے ہوئے جنت میں نوجوانوں کے سردار ہونے کی بشارت دی تھی، جنت کے اس عظیم صلہ اور اجر کے ساتھ دنیا میں بھی الجزاء من جنس العمل کے تحت بدلہ ظاہر ہوگا کہ جب دنیا میں ظلم وجور بہت بڑھ جائے گا تو قیامت کے قریب ظہور مہدی ہوگا، جن کو اللہ تعالیٰ ظاہری وباطنی اقتدار عطا کرے گا، دنیا کی حکومت بھی ان کو ملے گی اور ہدایت بھی ان سے پھیلے گی اور وہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ہی کی نسل میں ہوں گے۔

حیا ومروّت

ورع واحتیاط، حیا وعف کا وصف بہت بڑھا ہوا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے نواسے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت ابوجعفر محمد باقر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"كان الحسن والحسين رضي الله عنهما لا يريان أمهات المؤمنين، فقال ابن عباس رضي الله عنه : إن رؤيتهن حلال لهما."(۱)

(حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما امہات المومنین رضی اللہ عنہن کی طرف نظر نہ اٹھاتے تھے، تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان دونوں کے لیے امہات المومنین کو دیکھنا جائز ہے)۔

امام ذہبی رحمہ اللہ کہتے ہیں: "الحل متيقن." (اس کی حلت یقینی ہے)۔

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۶۵/۳

اقوال وملفوظات

حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت حسن و حسین رضی اللہ عنہما حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحفوں اور ہدایا کو قبول کیا کرتے تھے۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بارے میں شیعوں کے مبالغہ کو بہت ناپسند کرتے تھے، عمرو بن الاصم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"میں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ شیعوں نے یہ عقیدہ بنا رکھا ہے کہ روز قیامت سے پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ مبعوث ہوں گے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا یہ جھوٹ بولتے ہیں، انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کوئی تعلق نہیں، ہمارے علم میں اگر یہ بات ہوتی کہ وہ مبعوث ہوں گے تو ہم ان کی ازواج کا ان کے بعد نکاح نہ ہونے دیتے اور نہ ہی ہم ان کے مال کو تقسیم کرتے۔"(۱)

آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إن الحلم زينة والوقار مروءة والعجلة سفه والسفه ضعف ومجالسة أهل الدناءة شين ومحافظة الفراق ريبة."(۲)

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"الفقر أحب إليّ من الغنى والسقم أحب إليّ من الصحة."

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۶۳/۳ (۲) ایضا

(غریبی مجھے امیری سے زیادہ محبوب ہے، بیماری مجھے تندرستی سے زیادہ عزیز ہے)۔

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

"رحم الله أبا ذر، أما أنا فأقول : من اتكل على حسن اختيار الله له لم يتمن شيئا، وهذا حد الوقوف على الرضى بما تصرف به القضاء."(١)

(اللہ تعالیٰ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ پر رحم فرمائے، میں تو کہتا ہوں کہ جس نے اللہ کے حسن اختیار پر توکل کیا وہ کسی چیز کی تمنا نہیں رکھتا، اور یہی رضا بالقضا کی انتہا ہے)۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دو طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑا، ایک ان کے اقدام کی ستائش کرتا اور ایک عار دلاتا۔

فضیل بن مرزوق رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مالک بن ضمرہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا:

"السلام عليك يا مسخم وجوه المؤمنين، فقال: لا تقل هذا، وذكر كلاما يعتذر به رضى الله عنه، وقال له آخر: يا مذل المؤمنين فقال: لا، ولكن كرهت أن أقتلكم على الملك."(٢)

وصیت

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وصایا میں ایک اہم وصیت ان کے انتقال کے وقت کی ہے جو انھوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کی، جس کو علامہ بن عبدالبر اندلسی نے استیعاب میں اور ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے:

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۶۲ (۲) ایضا ۳/۲۷۲

"وروينا من وجوه أن الحسن بن علی لما حضرته الوفاة قال للحسين أخيه : يا أخی! إن أبانا رحمه اللّٰه تعالی لما قبض رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم استشرف لهذا الأمر، ورجا أن يكون صاحبه، فصرفه اللّٰه عنه وليها أبوبكر، فلما حضرت أبا بكر الوفاة تشوف لها أيضا، فصرفت عنه إلی عمر، فلما احتضر عمر جعلها شوریٰ بين ستة هو أحدهم، فلم يشك أنها تعدوه، فصرفت عنه إلی عثمان، فلما هلك عثمان بويع، ثم نوزع حتی جرّد السيف وطلبها، فما صفا له شیء منها، وإنی واللّٰه ما أری أن يجمع اللّٰه فينا أهل البيت النبوة والخلافة، فلا أعرفن ما استخفك سفهاء أهل الكوفة فأخرجوك، وقد كنت طلبت إلی عائشة إذا مت أن تأذن لی فأدفن فی بيتها مع رسول اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم، فقالت نعم، وإنی لا أدری لعل ذلك كان منها حياء، فإذا ما متّ فاطلب ذلك إليها، فإن طابت نفسها فادفنی فی بيتها وما أظن القوم إلا سيمنعوك إذا أردت ذلك، فإن فعلوا فلا تراجعهم فی ذلك، فادفنی فی بقيع الغرقد."(۱)

(کئی سندوں سے ہم نے روایت کیا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی جب وفات کا وقت آیا تو انھوں نے اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے بھائی! جب اللہ کے

(۱) الاستیعاب ۱/۴۴۱-۴۴۲، سیر اعلام النبلاء ۳/۲۷۸

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کی نظریں اس چیز (خلافت) پر تھیں اور ان کو امید تھی کہ وہی خلیفہ ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے دور رکھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خلافت مل گئی، جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تب بھی ان کی نگاہیں اسی پر تھیں، لیکن خلافت ان کو نہ مل کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مل گئی، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو انھوں نے خلافت کو چھ لوگوں کی شوریٰ کے درمیان طے کردیا، والد ماجد بھی ان چھ میں ایک تھے، ان کو اس بات میں شک نہیں تھا کہ وہ ان ہی کے پاس آکر رہے گی لیکن ان کو نہ مل کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مل گئی، جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید ہوگئے تو والد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی گئی، پھر معاملہ متنازع ہوگیا یہاں تک انھوں نے تلوار نکال لی اور وہ خلافت کے خواہشمند رہے مگر یہ انھیں کچھ بھی راس نہیں آئی، بخدا میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم اہل بیت میں نبوت وخلافت دونوں کو اکٹھا نہیں کرے گا، مجھے یہ اطلاع نہ ملے کہ کوفہ کے احمقوں نے تم کو بے وقوف سمجھا اور تم کو بلاکر وہاں سے نکال دیا۔

اور میں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے درخواست کی تھی کہ جب میری وفات ہوجائے تو مجھے اپنے حجرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت دے دیں، انھوں نے اجازت دے دی تھی، اب پتہ نہیں، ہوسکتا ہے کہ انھوں نے شرما حضوری میں حامی بھر لی ہو، تو جب

میری وفات ہوجائے تو دوبارہ ان سے اجازت لے لینا، اگر ان کو مناسب لگے تو میری تدفین وہیں کرنا، میرا خیال ہے کہ جب تم ایسا کرنا چاہو گے تو لوگ تمہیں باز رکھنے کی کوشش کریں گے، اگر لوگ ایسا کریں تو اس سلسلہ میں ان کے ان سے رجوع کیے بغیر جنت البقیع میں ہی مجھے دفن کر دینا)۔

سانحۂ وفات اور روضۂ اقدس میں تدفین نہ ہونے کے اسباب

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ اپنے نانا سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب مدفون ہوں، جس طرح حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اجازت چاہی تھی اور اجازت ملنے پر اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو تاکید کی تھی کہ وفات کے بعد دوبارہ اجازت لے لیں کہ کہیں مروت میں تو اجازت نہیں دے دی ہے، یہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی کیا اور اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وفات کے بعد پھر جا کر اجازت لیں، چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بخوشی اجازت دی، علامہ ابن عبد البر اندلسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فلما مات الحسن أتى الحسين عائشة، فطلب ذلك إليها، فقالت نعم و كرامة."

(تو جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئے اور دوبارہ اجازت چاہی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بصد احترام اجازت ہے)۔

لیکن مروان بن حکم کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے تکذیب کی اور کہا کہ ہم ہرگز حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں ان کی تدفین نہیں ہونے دیں گے، کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لوگوں نے حجرۂ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دفن نہیں ہونے دیا تھا۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو مروان کی یہ بات بڑی ناگوار گزری اور انھوں نے اور ان کے ساتھیوں نے ہتھیار بھی اٹھالیے اور ادھر مروان نے روضۂ نبوی میں تدفین سے روکنے کے لیے ہتھیار اٹھالیے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے مروان کی اس حرکت کی مذمت کی اور کہا:

"واللّٰہ ما ھو إلا ظلم، تمنع الحسن أن یدفن مع أبیه،
واللّٰہ إنه لابن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم."(۱)
(واللہ! یہ تو کھلا ہوا ظلم ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس دفن ہونے سے روکا جائے، بخدا وہ فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں)۔

لیکن چونکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امت میں اختلاف ونزاع کی باتوں سے شروع سے بڑی وحشت تھی اور امت کے اتحاد واتفاق کے لیے وہ اپنی اہم سے اہم متاع اور بڑی سے بڑی خواہش کو قربان کرسکتے تھے، جس کی وہ ایک نظیر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر کے پیش بھی کر چکے تھے اور اس معاملہ میں بھی وہ اس کا اشارہ دے چکے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے باوجود اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری طرفداری کے ان کی اس منشا کو بھی اہل بیت کو یاد دلایا، چنانچہ وہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان سے گفتگو کی اور اس حکمت ومصلحت کے تحت جنت البقیع میں تدفین کو ترجیح دی، علامہ ابن عبدالبر اندلسی رحمہ اللہ رقم طراز ہیں:

---

(۱) الاستیعاب ۱/۴۴۰

"ثـم انـطـلق إلى الحسين فكلمه و ناشده اللّٰه، وقال له :
أليـس قـد قال أخوك : إن خفت أن يكون قتال فردّوني
إلـى مـقبرة المسلمين، فلم يزل به حتى فعل وحمله إلى
البقيع."(١)

(پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور ان کو اللہ کا واسطہ دے کر بات کی، اور کہا کہ کیا تمہارے بھائی نے یہ نہیں کہا تھا کہ اگر نزاع کا خوف ہو تو مجھے مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کرنا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی بات پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی راضی ہو گئے اور جنت البقیع میں دفن کیا)۔

چنانچہ جنت البقیع میں اپنی والدہ سیدۃ نساء العالمین حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پہلو میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ان کی تدفین کرائی، حضرت سعید ابن العاص رضی اللہ عنہ اس وقت امیر مدینہ تھے، ان کو نماز جنازہ پڑھانے کو کہا اور فرمایا کہ یہ سنت ہے، بنو امیہ نے جنازہ میں شرکت سے گریز کیا، جس کی ظاہری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بنو امیہ کے خلاف اس وقت جو لوگوں میں غم و غصہ تھا، کہیں اس کا اثر ظاہر نہ ہو جاتا اور ایسے وقت جب اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، امت کے افتراق کی نحوست ظاہر ہوتی، پھر بھی حضرت سعید بن العاص اور خالد بن الولید رضی اللہ عنہما نے شرکت کی سعادت حاصل کی، علامہ ابن عبدالبر اندلسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فـلـم يشهـده يـومـئذ من بني أمية إلا سعيد بن العاص
و كـان يـومئذ أميرا على المدينة فقدمه الحسين للصلاة
عـليـه وقـال هي السنة، وخالد بن الوليد بن عقبة، ناشد

(١) الاستيعاب ۱/۴۴۲

بنی أمية أن يخلوه يشاهد الجنازة، فتركوه، فشهد دفنه في المقبرة، ودفن إلى جنب أمه فاطمة رضي الله عنها وعن بنيها أجمعين."(۱)

(بنوامیہ میں صرف حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے اور وہ اس وقت امیر مدینہ تھے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ کے لیے ان کو آگے بڑھایا اور کہا کہ یہ سنت ہے، اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوئے، انھوں نے بنوامیہ سے التجا کی کہ وہ جنازہ میں شرکت سے نہ روکیں، تو انھوں نے جنازہ میں شرکت کی، اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین آپ کی ماں حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے پہلو میں عمل میں آئی)۔

خلاصہ یہ کہ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہوا، حضرت سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی خواہش وتمنا ان کے اپنے نانا سے انتہائی درجہ تعلق کی بات تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کوشش اور اپنے بھائی کی وصیت کو پورا کرنے کا عزم اور ان کے دین سے تعلق اور اپنے بھائی سے محبت کی کھلی دلیل ہے، وہیں جب اس کا دوسرا پہلو ان کے سامنے اختلافات کا آیا تو انھوں نے فیصلہ تبدیل کردیا اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو بسر وچشم قبول کرلیا۔

البتہ بنوامیہ نے جو کیا، یہ ان کا اپنا فعل ہے، انھوں نے وہ کیا جو ان کی اپنی سطح اور سوچ تھی، جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بات بیچ میں لانے کا تعلق ہے تو اس میں اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر نکتہ چینی کرنے والوں کو مزید موقع نہ مل جائے کہ وہ کہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی خامیوں

---

(۱) الاستیعاب ۱/۴۴۲

کی وجہ سے یہ مقام نہ ملا، سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے معاملہ کے تمام گوشوں پر غور کر کے جو فیصلہ لیا وہ بالکل اسی فیصلہ کی طرح ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انتخاب خلیفہ کے سلسلہ میں سیدنا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فیصلہ لیا تھا اور معاملہ کے تمام پہلوؤں اور گوشوں اور حالات پر نظر رکھتے ہوئے وہ پورا حق بجانب تھا۔

سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر شریف ۴۶؍سال ہوئی اور چونکہ ان کو زہر دیا گیا تھا اس لیے ان کو شہادت کا مقام ملا اور اس میں بھی ان کو اپنے نانا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا شرف حاصل ہوا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

ریحانۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ
(شہید کربلا)

نام ونسب

"الحسين الشهيد هو الإمام الشريف الكامل، سبط رسول الله صلى الله عليه وسلم وريحانتي من الدنيا ومحبوبه، أبو عبد الله الحسين بن أمير المؤمنين أبي الحسن علي بن أبي طالب بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصي القرشي الهاشمي، حدث عن جده وأبويه وصهره عمر وطائفة." (۱)

(حضرت حسین شہید امام شریف کامل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبط وریحان اور محبوب ابوعبداللہ حسین بن امیر المومنین علی بن ابی طالب ہاشمی قرشی ہیں، اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی اور والدین ماجدین سے اور بہنوئی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اور بھی دیگر حضرات سے)۔

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۸۰/۳

ولادت باسعادت

۵رشعبان المعظم ۴ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام رکھا اور عقیقہ کیا، حضرت عکرمہ تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ:

"لما ولدت فاطمة حسنا اتت النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فسماه حسنا، فلما ولدت الآخر سماه حسینا، وقال هذا أحسن من هذا فشق له من اسمه."(۱)

(جب سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت حسن کو جنا تو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام حسن رکھا، پھر جب حضرت حسین کی پیدائش ہوئی تو ان کا حسین رکھا اور فرمایا یہ ان سے احسن ہیں، پھر ان ہی کے نام سے مشتق ان کا نام رکھا)۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ تعالیٰ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن وحسین رضی اللہ عنہما کی طرف سے عقیقہ کیا، ایک ایک دنبہ ذبح کر کے۔(۲)

امام جعفر صادق رحمہ اللہ اپنے والد امام باقر رحمہ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ:

"وزنت فاطمة شعر حسن و حسین وأم كلثوم فتصدقت بزنته فضة."(۳)

(حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حسن وحسین اور ام کلثوم رضی

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۸

(۲) صاحب بذل المجہود مولانا خلیل احمد سہارنپوری کہتے ہیں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے دوسرے طریق سے حضرت ابن عباس کبشین کبشین کی روایت بھی پیش کی ہے۔(بذل المجہود ۹/۶۱۳ تحقیق د/تقی الدین ندوی)

(۳) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۴۹

اللہ عنہم کے بالوں کو وزن کر کے اس کے بقدر چاندی صدقہ کی)۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما پانچویں شعبان ۴ھ کو پیدا ہوئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہد چٹایا اور ان کے دہن مبارک کو اپنی زبان بابرکت سے تر کیا اور دعائیں دیں۔(۱)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی روایت علامہ ابن عبدالبر اندلسی نے نقل کی ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: "أرونی ابنی" (مجھے میرے بیٹے کو دکھاؤ)، فرمایا: "ماسمیتموہ؟" (اس کا نام کیا تجویز کیا؟)، حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: "حرب" فرمایا: "بل ھو حسن" (نہیں، اس کا نام حسن ہے)۔

بعد میں جب حسین (رضی اللہ عنہ) پیدا ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أرونی ابنی ما سمیتموہ؟" (مجھے میرا بیٹا دکھاؤ، تم لوگوں نے کیا نام رکھا؟)، میں نے عرض کیا کہ "حرب" رکھا ہے، فرمایا: "بل ھو حسین" (نہیں وہ تو حسین ہے)۔

پھر جب تیسرا بیٹا پیدا ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا: "أرونی ابنی ما سمیتموہ؟" (مجھے میرے فرزند کو دکھاؤ، کیا نام رکھا ہے؟) میں نے عرض کیا: "حرب" فرمایا: "بل ھو محسن" (نہیں وہ تو محسن ہے)۔(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتہائی تعلق

علامہ ابن عبدالبر اندلسی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ معاویہ بن ابی مزرّد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے (حضرت) ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو فرماتے ہوئے سنا، وہ کہہ رہے تھے:

---

(۱) المرتضی ص/۳۴۷

(۲) الاستیعاب ۱/۴۳۶

"بصرت عيناى هاتان، وسمعت أذناى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو آخذ بكفي حسين وقدماه على قدم رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو يقول: ترق عين بقة، قال: فرقي الغلام حتى وضع قدميه على صدر رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم قال له رسول الله صلى الله عليه وسلم: افتح فاك، ثم قبله، ثم قال: اللهم أحبه، فإني أحبه."(۱)

میری ان آنکھوں نے دیکھا اور میرے ان کانوں نے سنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسین رضی اللہ عنہ کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اور ان کے پاؤں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں پر تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے: ننھے پیارے مٹک مٹک کر چڑھو، راوی کہتے ہیں، بچہ چڑھتا رہا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک پر اپنے دونوں پاؤں رکھ دیئے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اپنا منہ کھولو، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بوسہ دیا، پھر فرمایا: اے اللہ اس سے محبت فرمایا، کیونکہ میں بھی اس سے محبت کرتا ہوں)۔

مشابہت

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دونوں صاحبزادوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی اپنے نانا جان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت تھی، حضرت حسن کی سر سے کمر تک زیادہ مشابہت تھی اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی کمر

---

(۱) الاستیعاب ۱/۴۴۶

سے قدم مبارک تک زیادہ مشابہت تھی، حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے والد ہیں، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مشابہت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"الحسين أشبه رسول الله صلى الله عليه وسلم من صدره إلى قدميه." (۱)

(حسین رضی اللہ عنہ سر سے پیر تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بالکل مشابہ تھے)۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی گفتگو سے جو انھوں نے کوفہ کے گورنر عبید اللہ بن زیاد سے اس وقت تک کی جب حضرت حسین کی شہادت کے بعد ان کا سر تن سے جدا کر کے اس کے پاس لایا گیا اور اس نے بدسلوکی شروع کی تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: ''یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشابہ ہیں۔'' حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

"شهدت ابن زياد حيث أتي برأس الحسين، فجعل ينكت بقضيب معه، فقلت: أما إنه كان أشبههما بالنبي صلى الله عليه وسلم."(۲)

(میں ابن زیاد کے پاس موجود تھا، جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا سر مبارک لایا گیا، وہ ایک لکڑی سے انھیں کچوکے لگانے لگا، تو میں نے کہا کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ مشابہ تھے)۔

دربار نبوت میں پرورش

جس طرح حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۸۰ (۲) ایضا ۳/۲۸۱

وسلم کی کفالت ونگہداشت میں ہوئی تھی، ان کے دونوں فرزندوں حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی تربیت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، جس کا ایک واقعہ گذشتہ صفحات میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں گزر چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رات گزاری اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما سو رہے تھے، اتنے میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پانی مانگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اٹھ کر پانی لائے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی پانی مانگا اور پہلے پینا چاہا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دیا (اس لیے کہ انھوں نے پہلے طلب کیا تھا)، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ آپ حسین کے مقابلہ میں حسن کو زیادہ چاہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ ایسا نہیں ہے بلکہ حسن نے پہلے پانی طلب کیا تھا۔(۱)

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات بھی نقل کرتے ہیں جس نے ان کی شخصیت کی تشکیل میں گہرا اثر ڈالا کہ فضول کام اور بات سے احتراز اچھا مسلمان بنانے میں معاون ہے، علامہ ابن عبدالبر اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

> ”روی الحسین بن علی عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قولہ: ”من حسن إسلام المرء ترکہ ما لا یعنیہ.“(۲)
>
> (حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ لایعنی باتوں کو چھوڑ دینا آدمی کے اسلام کے حسن اور خوبی کی دلیل ہے)۔

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/ ۲۵۸

(۲) استیعاب ۱/ ۴۴۶

اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے تھے اور اسی کے ذریعہ تربیت وتعلیم دیتے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت میں شفقت وتعلیم دیتے، اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت میں شفقت اور پیار محبت کا پہلو غالب رہنا چاہیے، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کی تربیت میں یہ پہلو غالب رکھا۔

سنت کا پاس ولحاظ

جذبات پر سنت کا پاس ولحاظ زیادہ اہم اور زیادہ اجر وثواب کا باعث ہوتا ہے اور یہ ہر فرد بشر کے لیے آسان نہیں، خواص امت اور مقربین بارگاہ ایزدی کا ہی کام ہے، حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ کا اس میں حال بڑا قابل رشک نظر آتا ہے کہ ان کے بڑے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی تدفین امویوں نے باوجود صاحب بیت حضرت عائشہ ام المؤمنین کی اجازت کے نہ ہونے دی تھی اور نزاع واختلاف سے بچنے کے لیے بقیع کو اختیار کیا تھا، جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے قبر کھودنے کی تیاری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اجازت کے بعد کرلی تھی، لیکن پھر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کی تذکیر کے بعد کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے بھی کہا تاھ کہ جھگڑے کا خطرہ ہو اور لوگ رکاوٹ ڈالیں تو بقیع میں دفن کرنا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس عہد کو پورا کیا، اور بقیع کے لیے اور نماز جنازہ کے لیے خود بڑھنے کا نہ صرف حق رکھتے تھے بلکہ ان حالات میں اس کی اور زیادہ ضرورت سمجھتے ہوں گے، مگر چونکہ سنت یہ ہے کہ امیر اگر موجود ہے تو وہ پڑھائے گا، امیر مدینہ حضرت سعید بن العاص اموی رضی اللہ عنہ موجود تھے، عین نماز جنازہ کے وقت حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان سے نماز جنازہ کی امامت کے لیے آگے بڑھنے کو کہا، امام سفیان ثوری حضرت سالم بن ابی حفصہ سے حضرت ابوحازم کا مشاہدہ بیان کرتے ہیں کہ وہ فرماتے ہیں:

"إنـي لشـاهـد يـوم مـات الحسن فرأيت الحسين يقول لسـعيد بن العاص ويطعن فى عنقه: تقدم فلولا أنها سنة مـاقـدمـت يـعـنـي فـي الصلاة، فقال أبوهريرة: سمعت رسـول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من أحبهما فقد أحبني، ومن أبغضهما فقد أبغضني."(١)

(میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کے دن موجود تھا، میں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو دیکھا، وہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ سے (نماز جنازہ کی امامت کے لیے) فرما رہے تھے: آگے بڑھیے! اگر یہ عمل سنت نہ ہوتا تو میں آگے نہ بڑھاتا، یعنی نماز کی امامت میں، اس پر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان دونوں (حسن وحسین رضی اللہ عنہما) سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، اور جس نے ان سے بغض کیا اس نے مجھ سے بغض کیا)۔

اسی طرح ان دونوں بھائیوں کا معاملہ اپنے بعض شدید مخالفین کے ساتھ بڑے تحمل کا ہونا اور بحیثیت امیر کے اگر وہ نماز کی امامت کے لیے آگے بڑھتے تو آپ دونوں اقتداء کرتے اور نماز نہ دوہراتے، اس لیے کہ امیر اگر موجود ہے تو امامت کے لیے باوجود اپنی کمزوریوں کے زیادہ مستحق ہوتا ہے، اور یہ سنت ہے، سنت کے اس احترام میں نماز کا یہ لوگ اعادہ نہ کرتے، امام ذہبی سیر اعلام النبلاء میں مروان بن الحکم اموی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

(۱) شعیب الارناؤط کہتے ہیں: "إسناده حسن" وهو في المسند ٢/٥٣١، وسنن البيهقي ٤/٢٨-٢٩، وصححه الحاكم ٣/١٧١، وأورده الهيثمي في المجمع ٣/٣١، وقال: رواه الطبراني في الكبير والبزار /٨١٤، ورجاله موثقون، تحقيق و تخريج سير اعلام النبلاء ٣/٢٧٧.

”جعفر بن محمد اپنے والد (امام محمد الباقر) کا قول نقل کرتے ہیں کہ حسن و حسین مروان کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے اور نماز کا اعادہ نہیں کرتے تھے۔“(۱)

محبوبیت و مقبولیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جس سے جو تعلق تھا وہ اسی لحاظ سے تھا جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے اللہ کے تعلق کا علم تھا، ازواج مطہرات امہات المؤمنین میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جو مقام اور اللہ کے یہاں ان کا جو درجہ معلوم ہوگیا تھا، جس کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اظہار بھی فرمایا تھا، تعلق قلبی بھی اس اعتبار سے اوروں سے زیادہ رہا، اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی جو فضیلت اور اللہ کے یہاں ان کا جو رتبہ معلوم تھا، اس لیے بہ نسبت دوسروں سے ان سے تعلق زیادہ تھا، اور اپنے اصحاب اور خلفاء میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اللہ سے جو تعلق اور اللہ کے یہاں ان کا جو رتبہ آپ کے علم میں تھا، اسی اعتبار سے ان سے آپ کو سب سے زیادہ تعلق تھا اور پھر اسی طرح درجہ بہ درجہ، چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جس سے جو تعلق رکھتے تھے وہ اس کے اللہ کے تعلق کے لحاظ سے اور اللہ کے لیے تعلق رکھتے تھے، اور اسی اعتبار سے کمی وزیادتی ہوئی، اور وحی کے ذریعہ اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کی اطلاع اور طرز عمل کے ذریعہ آپ کو اس کی خبر ہوجایا کرتی تھی، چنانچہ امام ذہبی رحمہ اللہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے متعلق لکھتے ہیں کہ امام شعبی رحمہ اللہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”یا حذیفة، جاء نی جبرئیل، فبشرنی أن الحسن والحسین سیدا شباب أهل الجنة.“(۲)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۷۷۔ (۲) ایضا ۳/۲۵۵

(اے حذیفہ! میرے پاس جبرئیل آئے، انھوں نے مجھے بشارت سنائی کہ حسن وحسین (رضی اللہ عنہما) نوجوانان اہل جنت کے سردار ہیں)۔

جنت میں ان دونوں کو جو ظاہری سیادت حاصل ہوگی، دنیا میں اس کا اثر یہ ظاہر ہوکر رہا کہ ان دونوں کو یہاں باطنی سیادت حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے اپنے اپنے وقت میں جو کام لیا، اس میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔

ان دونوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا محبت وتعلق کا جو معاملہ رہا، اس میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کوئی ایک زیادہ محبوب رسول تھا، بعض لوگوں کا یہ خیال کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو ہی بہت پیار کرتے تھے لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے محبت زیادہ تھی، یا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے زیادہ محبت تھی، درست نہیں، اس لیے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال کی اس وقت نفی فرمادی جب رسول اللہ صل اللہ علیہ وسلم کے ایک طرز عمل سے جو تربیتی تھا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو یہ اشتباہ ہوا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان میں سے کسی ایک زیادہ محبت تو نہیں اور عرض کیا کہ "كـأنـه أحبهمـا إليك." (لگتا ہے حسن آپ کو زیادہ محبوب ہیں)، اس کا امکان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہتے اور کچھ نہ فرماتے لیکن یہ نبی کی شان نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلاف واقعہ بات کی اسی وقت نفی فرمائی اور جس طرز عمل کے باعث اشتباہ ہوا اس کی وضاحت فرمائی، فرمایا:

"لا ولـكـن هـذا استسقى أولا." (نہیں بلکہ اس نے پہلے پانی طلب کیا تھا (اسی لیے حسن کو اولیت دی)۔

اور پھر جنت میں دونوں کے اپنے ساتھ ایک مقام پر ہونے کی بات ارشاد فرمائی، اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے کہا:

"إنی وإیاك وهذين يوم القيامة فی مكان واحد."(۱)
(کہ میں اورتم اور یہ دونوں روز قیامت ایک جگہ پر ہوں گے)۔

فصاحت وبلاغت

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ بڑے ہی فصیح و بلیغ تھے اور یہ فصاحت و بلاغت صرف زبان کی نہیں تھی بلکہ اس کا انھیں علم اور گہری واقفیت تھی جس کے باعث لوگ ان کی طرف رجوع کرتے اور علمی وادبی استفادہ کرتے، مولانا نعمان الدین ندوی (ابن مولانا برہان الدین سنبھلی) مدیر "الصحوة الاسلامية" حیدرآباد، رقمطراز ہیں:

"إن الكثير من الناس يعرفون عن إقدام الحسين وبسالته وشجاعته وصموده لمقاومة ما يراه باطلا، ولكن لا يعرف إلا القليل أن الحسين رضی الله عنه كان حاذقا للغة العربية، عليما بأسرارها، مقتدرا على فهم غرائبها، وكان الناس يقصدونه ليسألوه عما يصعب عليهم فهمه من كلمات اللغة وتراكيبها."(۲)
(لوگوں کی بڑی تعداد حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو ان کے باطل کے خلاف برسرپیکار ہونے، حق پر جمنے اور اس کے لیے اقدام کرنے اور ان کی شجاعت و بہادری سے پہچانتے اور جانتے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کے علم و واقفیت میں یہ بات ہوگی کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ عربی زبان کے بڑے ماہر اور نکتہ داں

(۱) سیر اعلام النبلاء ۲۵۸/۳ بحوالہ مسند طیالسی۔
(۲) مجلہ الصحوۃ الاسلامیہ (رجب ۱۴۳۴ھ)

تھے اور اس کے غریب الفاظ کے فہم میں بڑا ملکہ وقدرت رکھتے تھے، لوگ اس میں استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور زبان کے کلمات وتراکیب کی مشکلات کا حل چاہتے)۔

بڑوں کا پاس ولحاظ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے عمر میں صرف ایک سال چھوٹے تھے لیکن اس چھوٹائی بڑائی کا بھی وہ اس درجہ پاس ولحاظ رکھتے کہ اپنے مزاج وطبیعت اور جذبات کے خلاف بھی ان کی طرف سے بات آتی اور معاملہ ترجیح کا ہوتا تو وہ آپ کی اطاعت کرتے، اس کی سب سے بڑی مثال اس وقت سامنے آئی جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تسلیم خلافت کا مسئلہ تھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا رجحان حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے رجحان سے ہٹ کر تھا، لیکن اس مسئلہ میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پیروی کی۔

امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"بلغنا أن الحسين لم يعجبه ما عمل أخوه الحسن من تسليم الخلافة إلى معاوية، بل كان رأيه القتال، ولكنه كظم وأطاع أخاه وبايع، وكان يقبل جوائز معاوية، ومعاوية يرى له ويحترمه ويجله."(١)

(ہمیں یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے تسلیم خلافت پر اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے عمل سے مطمئن نہیں تھے، بلکہ ان کی رائے

---

(١) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۹۱

مقابلہ کی تھی، مگر انھوں نے نہایت صبر سے کام لیا اور اپنے بھائی کی اطاعت کی اور (حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ) سے بیعت کرلی، اور وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے تحفوں کو قبول فرمایا کرتے تھے، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی ان کا خیال رکھتے اور احترام کرتے اور عزت دیتے تھے)۔

عبادت میں مشقت ومجاہدہ

حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ دونوں ہی اپنی عظیم ترین خاندانی نسبت کا دنیوی اور راحت وعیش کا فائدہ اٹھانے سے پوری طرح گریز کرتے، جس کے متعدد واقعات تاریخ کے ذخیرہ میں موجود ہیں، خوب عبادت کرتے، روتے گڑگڑاتے، اور لوگوں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے خوب خرچ کرتے، اور خود بقدر کفاف لیتے اور مشقت سے گزارا کرتے، جس کی انھوں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم پائی تھی اور اپنی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا حال دیکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کے کام کاج میں معاون دینے کے بجائے چند تسبیحات کی تعلیم دی تھی، جو تسبیحات فاطمہ کے نام سے معروف ہیں، حج کے موسم میں آپ حج کے بڑے شائق ہوتے اور پا پیادہ حج کے لیے مناسک ادا کرتے، امام ذہبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"مصعب زبیری سے روایت ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ۲۵/حج پاپیادہ کیے۔"(۱)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ بہت عبادت گزار تھے، نماز روزہ اور حج کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔(۲)

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/ ۲۸۷

(۲) المرتضیٰ/ ۳۴۸

تواضع

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما انتہائی متواضع تھے، ایک مرتبہ گھوڑے پر سوار گزر رہے تھے، غرباء کی ایک جماعت نظر آئی، جو زمین میں بیٹھی روٹی کے ٹکڑے کھارہی تھی، آپ نے ان کو سلام کیا، ان لوگوں نے کہا: "ھلم یا ابن رسول اللّٰہ!" اے فرزند رسول! ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایئے، آپ گھوڑے سے اتر کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے، اور کھانے میں شریک ہوئے، آپ نے اس موقع پر یہ آیت پڑھی: "إن اللّٰہ لا یحب المستکبرین" یعنی اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ جب ان لوگوں کی روٹی کے ٹکڑوں پر شرکت فرما چکے اور فارغ ہوئے تو آپ نے فرمایا: بھائیو! آپ نے مجھے دعوت دی، میں نے قبول کیا، اب آپ سب میری دعوت قبول کیجیے، ان لوگوں نے بھی دعوت قبول کی اور آپ کے ساتھ آپ کے مکان پر آئے، جب سب آکر بیٹھے تو آپ نے فرمایا: رباب! لانا جو بھی میں نے بچا ہوا محفوظ رکھا ہے۔(۱)

صحابہ کرامؓ کے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مقام

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اللہ نے جو عظیم انسانی کمالات اور عظیم موروثی صفات و خصوصیات، دین کو تقویت پہنچانے کا حوصلہ، اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ اور عبادت کا شوق، عزیمت پر عمل، اتباع سنت میں پیش قدمی اور علم وادب میں رسوخ اور تواضع میں امتیاز عطا فرمایا تھا، اس لیے ایک صحابی جلیل حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کی شہادت واعتراف پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ عیزار بن حریث کہتے ہیں:

"بینا عمرو بن العاص فی ظل الکعبة إذا رأی الحسین

---

(۱) المرتضی ص/ ۳۴۸، بحوالہ الجوہرہ ص/ ۲۱۳-۲۱۴

فقال هذا أحب أهل الأرض إلى أهل السماء
اليوم."(۱)

(حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کعبہ کے پاس تھے، اتنے میں ان کی نگاہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر پڑی تو فرمایا: آج کے دن آسمان والوں کے نزدیک دنیا والوں میں سب سے زیادہ محبوب یہی ہیں)۔

جگر گوشۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی سیرت و سنن کے بڑے عالم اور متبع کہے جاتے ہیں، جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے عراق نکلنے کا ارادہ کیا تو اس خطرہ کے پیش نظر کہیں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو غلط لوگوں سے سابقہ نہ پڑے اور ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جائے، اس اقدام سے روکنا چاہا تھا، لیکن وہ کیسے رک سکتے تھے کہ اس کے ذریعہ اللہ کو ان کے رتبہ کو بہت بلند کرنا تھا، مگر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے جو بات کہی اس سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بڑے مقام رفیع کا پتہ چلتا ہے، فرمایا:

"لا تخرج، فإن رسول الله صلى الله عليه وسلم خيّر بين الدنيا والآخرة، فاختار الآخرة وإنك بضعة منه ولا تنالها، ثم اعتنقه و بكى، وودعه."(۲)

(مدینہ سے مت جایئے! چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کے انتخاب کا اختیار دیا گیا تھا، تو آپ

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۸۵
(۲) سیر اعلام النبلاء ۳/۲۹۶

صلی اللہ علیہ وسلم نے آخرت کو اختیار فرمایا تھا، اور آپ بھی ان کے دل کا ٹکڑا ہیں، اس لیے یہ آپ کو بھی حاصل نہیں ہوگی، پھر ان سے معانقہ کیا اور رو پڑے اور رخصت فرمایا)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی والدہ سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہ کے تعلق سے یہ بات فرمائی تھی جو ان ہی کی نسبت سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق خود ان سے کہی، اور چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار دیئے جانے پر کہ وہ نبی و رسول کے ساتھ بادشاہ ہونا پسند کریں گے یا بندہ بن کر رہنا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ملوکیت پر عبدیت کو ترجیح دی تھی، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اسی کی طرف اشارہ کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ کہ آپ نے آخرت کے انعام کو اختیار فرما کر تواصی بالحق وتواصی بالصبر کے ساتھ تذکیر فرمائی، چنانچہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اپنے اقدام کے ذریعہ حق کو واضح کرنے اور اسلام کے شورائی نظام کی روح کی حفاظت کا کام کیا، جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو بحیثیت اپنی اولاد کے قربانی کے لیے پیش کرنا

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ ارزق بن قیس کی روایت نقل کرتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أسقف نجران والعاقب، فعرض علیهما الإسلام، فقالا: كنا مسلمين قبلك، قال: كذبتما، إنه منع الإسلام منكما ثلاث، قولكما: اتخذ الله ولداً، وأكلكما الخنزير، وسجودكما للصنم، قالا: فمن أبو عيسى؟ فما عرف

حتى أنزل الله عليه: "إن مثل عيسى عند الله كمثل آدم" إلى قوله: "إن هذا لهو القصص الحق"(١) فدعاهما إلى الملاعنة، وأخذ بيد فاطمة والحسن والحسين، وقال هؤلاء بنيّ، قال: فخلا أحدهما بالآخر، فقال لا تلاعنه، فإن كان نبيا، فلا بقية، فقالا: لا حاجة لنا في الإسلام، ولا في ملاعنتك، فهل من ثالثة؟ قال: نعم، فأقرّا بها ورجعا."(٢)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نجران اور عاقب کے بڑے پادری حاضر ہوئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں قبیلوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی، وہ بولے کہ ہم لوگ آپ سے پہلے سے مسلمان ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم جھوٹ بولتے ہو، تین باتوں کی وجہ سے تم اسلام سے خارج ہو، ایک تو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہو، اور خنزیر کھاتے ہو اور بتوں کی پرستش کرتے ہو، وہ بولے: تو عیسیٰ کے باپ کون ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہ کہہ سکے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے "إن مثل عيسىٰ عند الله كمثل آدم" آیت نازل فرمائی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی اور حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حضرت حسین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا یہ میرے بیٹے ہیں، تو ان لوگوں نے علاحدہ جا کر ایک دوسرے سے کہا کہ ان سے مباہلہ نہ کرو، اگر نبی ہیں تو

---

(١) آل عمران/٥٩-٦٣
(٢) سیر اعلام النبلاء ٢٨٦/٣

پھر بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں، بالآخران لوگوں نے رسول پاک صلی
اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں نہ اسلام کی ضرورت ہے نہ مباہلہ کی،
کیا تیسری کوئی صورت ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
ہاں! انھوں نے جزیہ دینے کا اقرار کرلیا اور واپس ہوگئے)۔

اور حضرت معمر حضرت قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ اہل نجران سے مباہلہ کریں تو حسن وحسین رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تم ہمارے پیچھے ہولو، چنانچہ جب اللہ کے دشمنوں نے یہ منظر دیکھا تو وہیں سے واپس ہوگئے۔(۱)

مولانا شبیر احمد عثانی اسی سلسلہ میں آیت کریمہ:﴿فمن حاجك فيه من بعد ما جاء ك من العلم فقل تعالوا ندع أبناء نا وأبناء كم ونساء نا ونساء كم وأنفسنا وأنفسكم ثم نبتهل فنجعل لعنة الله على الكاذبين، إن هذا لهو القصص الحق وما من إله إلا الله﴾ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرات حسن وحسین وفاطمہ وعلی
رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر باہر تشریف لارہے تھے، نورانی
صورتیں دیکھ کران کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک
چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا
سکتی ہے، ان سے مباہلہ کرکے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی
زمین پر باقی نہ رہے گا، آخر انھوں نے مقابلہ ترک کرکے
سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کرکے واپس چلے گئے، حدیث
میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مباہلہ
کرتے تو وادی آگ بن کران پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا

---

(۱) سیر اعلام النبلاء ۳/ ۲۸۷

بالکل استیصال کر دیتا، ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔"(۱)

آیت تطہیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل

آیت تطہیر ﴿إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا﴾ (۲) کہ اللہ چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو! اور ستھرا کر دے تم کو ایک ستھرائی سے، کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ کہ ازواج مطہرات (امہات المومنین) سے خطاب ہے، "کُم" کی ضمیر اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل اور دعا سے اس میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہم کو ایک چادر میں لے کر دعا فرمائی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی، مولانا شبیر احمد عثانی ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے اس آیت کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

"یہاں تطہیر سے مراد تہذیب نفس، تصفیہ قلب اور تزکیہ باطن کا وہ اعلیٰ مرتبہ ہے جو کمل اولیاء کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے حصول کے بعد وہ انبیاء کی طرح معصوم نہیں بن جاتے، ہاں محفوظ کہلاتے ہیں، چنانچہ لفظ "يريد الله ليذهب عنكم الرجس" فرمایا اور "أراد" نہ فرمانا خود اس کی دلیل ہے کہ اہل بیت کے لیے عصمت ثابت نہیں۔

نظم قرآن میں تدبر کرنے والے کو ایک لحہ کے لیے اس میں شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ یہاں اہل بیت کے مدلول میں ازواج

---

(۱) تفسیر عثانی۔

(۲) سورۂ احزاب/۳۳

مطہرات یقیناً داخل ہیں کیونکہ آیت ہذا سے پہلے اور پیچھے پورے رکوع میں تمام تر خطابات ان ہی سے ہوئے ہیں، اور "بیوت" کی نسبت بھی پہلے "وقرن في بیوتکن" میں اور آگے "واذکرن ما یتلی في بیوتکن" میں ان کی طرف کی گئی ہے، اس کے علاوہ قرآن میں یہ لفظ عموماً اسی سیاق میں مستعمل ہوا ہے......۔

بہرحال اہل بیت میں اس جگہ ازواج مطہرات کا داخل ہونا یقینی ہے، بلکہ آیت کا خطاب اولاً ان ہی سے ہے، لیکن چونکہ اولاد و داماد بھی بجائے خود اہل بیت میں شامل ہیں، بلکہ بعض حیثیات سے وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں جیسا کہ مسند احمد کی ایک روایت میں "أحق" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمہ، علی، حسن وحسین رضی اللہ عنہم کو ایک چادر میں لے کر "اللھم ھؤلاء أھل بیتي" وغیرہ فرمانا یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے قریب گزرتے ہوئے "الصلوة أھل البیت، یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس" سے خطاب کرنا، اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ گو آیت کا نزول بظاہر ازواج کے حق میں ہوا اور ان ہی سے تخاطب ہو رہا ہے مگر یہ حضرات بھی بطریق اولیٰ اس لقب کے مستحق اور فضیلت تطہیر کے اہل ہیں، باقی ازواج مطہرات چونکہ خطاب قرآنی کی اولین مخاطب تھیں، اس لیے ان کی نسبت اس قسم کے اظہار اور تصریح کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔"(۱)

(۱) ترجمہ شیخ الہند فوائد عثمانی مطبوعہ مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف المدینۃ المنورہ۔

مولانا کی اس بات کی تائید ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان چاروں افراد خانہ کے ایک چادر میں لے کر اس تعلق سے اظہار کی ہے، اور جب ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے متعلق عرض کیا تو فرمایا تم تو اپنی جگہ (اس مقام) پر ہو۔

حادثہ کربلا

اور شہادت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ

حوادث و سانحات کی تاریخ میں حادثہ کربلا کو جو اہمیت دی گئی وہ دوسرے حوادث اور سانحوں کو نہ مل سکی، اس کی متعدد وجوہات اور مختلف اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ کوئی اور سانحہ اور حادثہ ایسا نہ تھا جس کو لے کر ماتم کا ایسا سلسلہ قائم کر دیا جاتا جو ختم ہونے کا نام نہ لے، واقعات اور حوادث بار بار پیش آئے، لیکن ان کا اثر وقتی اور ان کا سوگ چند دن کے سوا نہ رہا، اسلام نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مزاج بنایا تھا کہ وہ ایک اثر جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے لے کر فوراً سنبھل جاتے اور جس مقصد اور کام کے لیے اللہ نے ان کو کھڑا کیا تھا اس میں مشغول ہو جاتے، اس مقصد کو حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے رستم کے سامنے اس کے دربار میں پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا تھا کہ:

"اللّٰه ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة الناس إلى عبادة اللّٰه وحده، ومن ضيق الدنيا إلى سعتها، ومن جور الأديان إلى عدل الإسلام."(١)

(اللہ نے ہمیں اس لیے برپا کیا ہے کہ ہم جسے وہ چاہے اس کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی بندگی کا راستہ

---

(١) البداية و النهاية، غزوة القادسية: ٧/٤٦

دکھائیں، اور دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف نکالیں، اور
مذاہب کے ظلم و جور سے نکال کر اسلام کے سایہ عدل کی طرف
رہنمائی کریں)۔

مکہ مکرمہ میں جب دعوت اسلام کا آغاز ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جن سخت ترین اور صبر آزما حالات سے سابقہ پڑا، وہ سخت سے سخت حادثوں پر بھاری تھے، حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ شہادت، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی دیا جانا، حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کو قاتلانہ اذیتیں دینا اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن مبارک پر اوجھڑی ڈال دینا جبکہ وہ سجدہ کی حالت میں تھے اور شیاطین انس و جن کا اس بات پر اجتماع اور سازش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی شہید کر دیا جائے اور اس سے قبل طائف میں سرداران ثقیف کا شہر کے اوباشوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دینا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لہولہان کر دینا، پھر واقعہ ہجرت اور سراقہ بن مالک بن جعشم کا تعاقب کرنا اور اس کا زمین میں دھنس کر بے بس ہو جانا اور اپنی دشمنی سے باز آنا، مدینہ طیبہ میں انصار کی جانب سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زوردار، فدائیانہ اور عاشقانہ استقبال و ترحیب اور یہود مدینہ اور منافقین کی جانب سے مسلسل اور پے در پے ایسی سازشیں اور نقصان پہنچانے کے ایسے حربے کہ جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جائیں، مشرکین مکہ کو ان کے ذریعہ ہی حوصلہ ملا اور پھر بدر و احد، خندق و خیبر، حنین و تبوک کے غزوات پیش آئے، اور بدر میں مسلمانوں کو ان کی قربانیوں کا صلہ ملا، مگر احد میں مسلمانوں کے وہ جیالے شہید ہو گئے، جن کا داغ مفارقت مٹائے نہ مٹا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا گیا اس کا تأثر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ رہا اور جب سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل کو ایمان نے اپنی طرف کھینچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سعادت و شرف سے محروم کرنا نہ چاہا اور قبول

فرما کر اپنے سامنے آنے سے گریز کرنے کا اشارہ فرمایا کہ دل آزاری کا اندیشہ تھا، اسی طرح حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز بھائی تھے اور سیرت و اخلاق اور حلیہ میں آپ سے بہت مشابہ تھے، اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی شہادت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے محبوب غلام رہے تھے کہ لوگ متبنیٰ سمجھتے تھے، یہ سب سانحے اور حوادث ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے سخت تھے، لیکن اللہ کی مرضی کے آگے تسلیم و رضا نے ان کو برداشت کرنا نہایت آسان کر دیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ عظیم بھی پیش آیا اور اس سے بڑھ کر کوئی سانحہ نہیں ہو سکتا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وقتی طور پر ہل گئے، لیکن عزم صدیقی کے ساتھ فوراً سنبھل گئے اور نبوی مشن اور اسلامی تعلیم کو آگے بڑھانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے تیار ہو گئے اور نبوت کے بعد خلافت کے سایہ میں زندگی وقف کرنے کا عہد کیا، پھر معرکے ہوئے، فتوحات ہوئیں، روم و ایران (قیصر و کسریٰ) کے علم اسلام اور مسلمانوں کے آگے سرنگوں ہو گئے، مگر پھر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ نے مسلمانوں کو لرزا دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سرپرستی ملی، اسلام بڑھتا گیا اور پھیلتا گیا، لیکن یہود و منافقین اسلام کو کمزور کرنے کی سازشیں کرتے رہے، بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت اور ان کی سب پر فضیلت کا حربہ اختیار کر کے فرقہ بندی کا بیج بویا اور ایک پورا فلسفہ بنا کر اسلام میں بدعات کو جنم دیا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کیا اور پھر ان کو بڑی بے دردی، بے رحمی سے شہید کر دیا، یہ اتنا عظیم حادثہ تھا کہ مسلمانوں کے سرکردہ حضرات اور افق اسلام کے تابناک ستارے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے آمنے سامنے آ گئے، ان میں بعض شہید بھی ہو گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاملات حل کرنے میں جو دقتیں پیش آ رہی تھیں ان کو ان کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھ سکتا تھا، وہ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں

لینا چاہتے تھے، جس سے کوئی بے قصور داغدار ہو جائے اور جس کا قصور کم ہو وہ زیادہ قصور والوں کی فہرست میں آجائے، بالآخر حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی شہید کر دیئے گئے، ان کے جانشین سیدنا حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کو امت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کرنے کا طریقہ الہام ہوا، ان کے متعلق ان کے نانا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی بھی تھی اور اس کا ان کو انتظار بھی تھا، وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد میں اس کے متمنی تھے لیکن اللہ نے ان کے حصہ میں یہ سعادت رکھی تھی جوان کو حاصل ہوئی اور پھر اس وقت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بہ اتفاق امیر وخلیفہ منتخب ہو گئے، جب حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے ان سے مصالحت کر کے خود اس منصب سے دست برداری کا اعلان فرمادیا، اس سال کو عام الجماعۃ کا نام دیا گیا اور اس کے سارے اختلافات ختم اور دل کی کدورتیں زائل ہو گئیں، لیکن حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے سانحہ وفات سے جو زہر خورانی سے پیش آیا تھا، پھر امت کو ایسا زخم دیا جس کا مرہم اور مداوا نہیں تھا، لیکن اسلامی مہمات میں صحابہ وتابعین اپنے جوہر دکھاتے رہے، یہاں تک کہ قسطنطنیہ کی طرف رخ کرنے کا وقت آیا، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اس کے لیے نکلے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی نکلے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی نمائندگی ان کے فرزند یزید نے کی، سب نے مل کر اسلام کو تقویت پہنچائی، لیکن کچھ زمانہ گزرنے پر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی جانب سے ولی عہدی پر یزید کو نامزد کرنے کی بات سامنے آئی تو بعض صحابہ نے جن میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ پیش پیش تھے اس کو اسلامی طریقہ کے مطابق نہ سمجھ کر بیعت سے انکار کیا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کچھ ایسی مصلحتیں تھیں جن کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ شام اور عراق کی کشمکش پرانی چلی آرہی تھی، اہل شام کو جن سے ہمدردی ہوتی، اہل عراق ان سے دوری بنا لیتے تھے، یہی حال اہل شام کا تھا، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا دارالخلافہ دمشق شام تھا، اور اہل عراق حضرت حسین

رضی اللہ عنہ سے اپنی ہمدردی جتاتے تھے، اہل عراق نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو پے در پے خطوط لکھ کر عراق بلانا چاہا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ ان کے بلانے پر پہنچ گئے تو یہی لوگ جو دعوت دینے میں پیش پیش تھے پیچھے ہو گئے اور عراق میں نائبین یزید کو خیال آیا کہ یہ مقابلہ پر آئے ہیں، بالآخر کربلا کا معرکہ ہوا اور خانوادہ نبوت کے افراد کو غیر ارادی جنگ میں داخل کر کے ان کے خون سے اہل عراق نے اپنے مقاصد کو ہوا دینا چاہا، یہ ایسا جرم تھا جس کی پاداش میں حکومت یزید کو اور بھی جرم کرنے پڑے اور ظلم کے نتیجہ میں پھر یہ حکومت زوال کا شکار ہو کر اختتام پذیر ہو گئی اور اہل عراق نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اپنا ہیرو بنا کر رفض وشیعیت کا مذہب اختیار کر لیا اور کربلا سے اپنی ذہنی فکری اور مذہبی وابستگی قائم کر لی، اسی طرح وہ سازش جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں نومسلم یہودی (منافق) ابن سبا نے رچی تھی اور اس کو فلسفیانہ رنگ بھرا تھا، اس واقعہ سے وہ کامیاب ہو گئی اور ماتم کو سالانہ تہوار کی شکل میں پیش کر کے اس میں جذبات کو شامل کیا گیا اور ایسی ایسی باتیں اختراع کی گئیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، گویا قرآن مجید کی اس آیت ﴿اليوم أكملت لكم دينكم و أتممت عليكم نعمتي و رضيت لكم الإسلام دينا﴾ کا عملی طور پر انکار کر دیا گیا۔

اہل عراق کی بے وفائی

حادثہ کربلا کی جزئیات میں جانے کا یہ موقع نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے ہی ان کے قاتل ثابت ہوئے، بخاری شریف کی روایت ہے:

"أهل العراق يسئلون عن قتل الذباب وقد قتلوا ابن بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم وقد قال النبي صلى الله

علیه و سلم: هما ریحانتای فی الدنیا."(۱)

(عراقی لوگ مکھیوں کے قتل کا مسئلہ دریافت کرتے ہیں حالانکہ وہ نواسہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دونوں دنیا میں میرے خوشبودار پھول ہیں)۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا واقعہ شہادت عاشورہ محرم الحرم ۶۱ھ کو پیش آیا اور ان کے ساتھ خانوادۂ نبوت کے متعدد افراد جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی بچے بھی اور بچیاں بھی شہید ہوئے، یہ ایک حادثہ تھا، اس کو کسی انتقام اور بدلے سے نہیں جوڑا جا سکتا، البتہ جن لوگوں نے کربلا میں کرب و بلاء اور ظلم و ستم کے پہاڑ اہل بیت نبوت پر توڑے، وہ ضرور کینہ پرور اور انسان نما وحشی تھے، جو اس جرم کے مرتکب ہوئے، ان کا حشر بعد میں بہت خراب ہوا اور ان میں سے ہر ایک کو دنیا میں ہی سزا مل کر رہی۔

جہاں تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کا تعلق ہے بلاشبہ وہ اس لیے ضروری تھا کہ ایک منکر کو معروف نہ سمجھا جائے اور "کلمة حق عند سلطان جائر" کی عملی شکل بھی سامنے آ جائے اور اسلام کے شورائی نظام پر موروثی نظام کو ترجیح نہ حاصل ہو جائے، اگر حضرت حسین رضی اللہ عنہ یہ اقدام نہ کرتے جو یزید کی بیعت نہ لینے کا تھا تو اس کو ایک صحابی کا عمل سمجھ کر کہ انھوں نے ولی عہد بنایا، اس کو اسلام کا طریقہ سمجھا جاتا، زبان نبوت سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے لیے جو فضاء و مناقب کے الفاظ نکلے ہیں، یزید کے لیے اس کے عہد کے اکابر کے بھی نہیں نکلے، البتہ دنیوی سمجھ اور دبدبہ قائم کرنے کی صلاحیت سے کسی کو انکار نہیں اور ملکی مصلحت کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وجہ انتخاب یہی رہی ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا جس قوم سے سابقہ پڑا اور جو ظاہر میں

---

(۱) صحیح بخاری، باب مناقب الحسن والحسین رضی اللہ عنہما

ان کی دلدادہ تھی، ان کی اکثریت ان خصوصیات سے عاری تھی جو وفاداری، صدق و امانت، راست گوئی اور دینی مقاصد کو دنیوی مصالح و ذاتی مفادات پر ترجیح کی ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی ان کی طبائع اور کمزوریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"یہ بات پیش نظر رہے کہ عراق کی اس مسلم آبادی میں جس سے حضرت مسلم اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو سابقہ پڑا، بڑی تعداد جدید الاسلام لوگوں، آزاد کردہ غلاموں (موالی) اور مشرقی عرب کے قبائل کے ان افراد کی تھی، جن پر پورے طور پر اسلامی رنگ نہیں چڑھا تھا، نیز طویل مدت تک مطلق العنان اور عیش پسند ساسانی سلطنت کے زیر سایہ رہنے سے عراق کی آبادی میں طاقت و دولت پرستی، ابن الوقتی اور موقع پرستی کی صفات قومی و انفرادی کردار کے طور پر پیدا ہو گئی تھیں، ان خصوصیات کا ظہور اس وقت پورے طور پر ہوا جب ایک طرف عقیدہ و اصول و اخلاق تھے، دوسری طرف جاہ و منصب اور وقتی منافع۔" (۱)

حادثہ جانکاہ

"......کربلا کا دل دوز واقعہ اہل کوفہ کی دروغ گوئی کا نتیجہ نظر آتا ہے، انھوں نے پہلے حضرت مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کو بلا کر بے یار و مددگار چھوڑا تھا، پھر وہی تاریخ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوہرائی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قیام مکہ معظمہ میں تھا جہاں سے وہ کوفہ کے لیے روانہ ہوئے، صحابہ کرام میں خاص طور پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، حضرت

---

(۱) المرتضٰی ص/۳۶۶

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ، حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے خصوصیت سے روکا، تابعین میں سید التابعین حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے بھی لجاجت سے سفر نہ کرنے کی بات عرض کی، راستہ میں فرزدق شاعر ملا، اس نے کہا کہ اے فرزند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے (اہل کوفہ) کے دل آپ کے ساتھ ہیں اور تلواریں آپ کے خلاف......"(۱)

'فرزدق شاعر کی بات بعینہٖ صحیح ثابت ہوئی، کربلا پہنچ کر اپنے لوگوں کی تلاش ہوئی تو جواب ملا کہ سر برآوردہ قسم کے لوگ سب آپ کے خلاف جتھہ بنائے ہوئے ہیں، انھیں رشوتیں مل چکی ہیں اور ان کی خواہشات پوری کی گئی ہیں، وہ سب کے سب آپ کے خلاف برسرپیکار ہیں، رہے عوام تو ان کے دل آپ کی جانب مائل ہیں، مگر ان کی تلواریں کل آپ ہی کے خلاف اٹھیں گی۔"(۲)

یوم عاشوراء

یوم عاشوراء کا بابرکت دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا دن ہے، جمعہ کی موافقت نے برکتوں میں اور اضافہ کیا، مظلومانہ شہادت نے آپ کے مرتبہ کو اور بلند کیا، پانی روکا گیا لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ پانی اس مقدار میں تھا کہ فرمایا: پانی لو، اپنے گھوڑوں کو پلاؤ اور دشمنوں کے گھوڑوں کو بھی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے ظہر کی نماز ادا کی، شمر نے آپ کے رفقاء پر جن میں اکثر و بیشتر شہید ہو گئے، انھیں خطاب کر کے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے

(۱) المرتضی ص/۳۶۸ (۲) ایضا ص/۳۷۰

دعادی "جزاكم الله أحسن جزاء المتقين" حضرت حسین رضی اللہ عنہ پر زرعہ تمیمی اور سنان نخعی نے وار کیا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہادت کے اس رتبہ پر پہنچایا، جس کے متمنی جلیل القدر صحابہ رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس کی دعا مانگتے تھے اور اس جہاد میں یہ شہادت حاصل ہوئی، جس کو حدیث میں افضل الجہاد کہا گیا ہے یعنی "كلمة حق عند سلطان جائر" یزید نے گرچہ خود تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس کے کارندوں اور نمائندوں نے خود ان کو شہید کیا، لیکن اس کو بھی ان کے قتل میں برابر کا شریک نہ سمجھنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یزید نے ان کے قاتلوں کو معاف کر دیا اور ان کو معزول تک نہیں کیا، اور گویا صرف ظاہری طور پر سرزنش کر کے رہ گیا، اگر اس کے دل میں ذرہ برابر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت ہوتی، کچھ بھی نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کا لحاظ ہوتا تو وہ ضرور ان کو سزا دیتا یا کم از کم اس کو نواسۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کا ذمہ دار ہونے پر ہمیشہ کی رسوائی کا خیال ہونا چاہیے تھا، اس لحاظ سے قاتلوں کو ایسی سخت سزا دینی چاہیے تھی، جس سے کہ یہ بدنامی کا داغ اسی وقت دھل جاتا، اس طرح اس کا مقصد بھی پورا ہوتا اور لوگوں کی ملامت سے بھی بچ جاتا، ابن زیاد نے شہادت کے بعد جو بدسلوکی کی اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی یاد تازہ کر دی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ فائز بمرام ہوئے کہ ؎

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

یزید کا کردار

جہاں تک خلافت اموی کے تخت نشین یزید بن معاویہ بن ابی سفیان کا تعلق ہے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

"یزید کی سیرت و کردار کے بارے میں سب سے معتبر شہادت

ان کے بیٹے معاویہ بن یزید کی ہو سکتی ہے، اس کا شاہد ان کا وہ خط ہے جو انھوں نے اپنی جانشینی سے دست بردار ہونے کے موقع پر دیا، مؤرخ لکھتا ہے:

''انھوں نے اپنے والد اور ان کی خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے ناروا سلوک و عمل، خود اپنے اوپر زیادتی اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت عظمیٰ کے بارے میں نااہلی، ظلم و زیادتی، جرأت علی اللہ کے اقدامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کی حرمت کی پامالی کا تذکرہ کیا، پھر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بہت دیر تک روتے رہے۔''(۱)

''واقعہ کربلا کے علاوہ واقعہ حرہ جو خاص مدینہ منورہ سے تعلق رکھتا ہے اور جس میں بلد رسول اور دارالہجرہ کی سخت بے حرمتی اور وہاں کے سکان کرام کی سخت بے عزتی ہوئی، کچھ کم قابل مذمت اقدام نہیں ہے۔''(۲)

شہادتِ حسین رضی اللہ عنہ کے پیچھے عیسائی دماغ کے اثرات

مؤرخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ نے حادثہ کربلا کے پس منظر کا پوری مؤرخانہ بصیرت کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے جو تحلیل و تجزیہ پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

''صورت یہ ہے کہ اسلام سے پہلے شام کا پورا علاقہ رومی امپائر کے زیر نگیں تھا اور اس کے حکام شام میں تھے، خود شام کے

---

(۱) ملاحظہ ہو تاریخ الخمیس الجزء الثانی تالیف الشیخ حسین بن محمد بن الحسن الدیار بکری ص/۳۳۶

(۲) ملاحظہ ہو کتب تاریخ اور مزید تفصیل و تحقیق کے لیے کتاب ''یزید کی شخصیت'' از حضرت مولانا محمد عبدالرشید نعمانی، اور حادثہ کربلا کا پس منظر از مولانا ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی۔

غساسنہ (شاہان غسان) رومی شہنشاہیت کی نمائندگی کرتے تھے اور چونکہ شام اور بیت المقدس کا سارا علاقہ عیسائیوں کے لیے مقدس تھا، اس لیے یورپ کی تمام مسیحی طاقتیں وہاں نظر جمائے رکھتی تھیں اور وہ مسیحیوں کا دینی اور قومی ہی مرکز نہ تھا بلکہ ان کی سیاست وحکومت اور تہذیب وتمدن کا بھی مشرقی گہوارہ تھا۔

خلافت راشدہ میں جب شام کا علاقہ فتح ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں کا انتظام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کیا جو اسلام کی سیاسی دوراندیشی سے رومی اور مسیحی سیاست کی کاٹ کر سکتے تھے، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومیوں کا پورا مقابلہ کیا، عہد فاروقی میں ان سے بحری جنگ کی اجازت طلب کی اور عہد عثمانی میں قبرص وغیرہ پر چڑھائی کر کے بار بار فتح حاصل کی اور پھر جب شام پر ان کا اقتدار و قبضہ ہوا تو رومی ممالک پر مسلسل حملے کیے اور قسطنطنیہ تک ان کی فوجی طاقت کو سخت دھکا پہنچایا اور شام کی نصرانی تہذیب کو اسلامی ثقافت سے بدل دیا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رومیوں کے معاملہ میں نہایت سخت تھے اور پوری طاقت سے ان کی حرکت کا مقابلہ کرتے رہے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اندرونی مشاجرات میں تھے، شاہ روم نے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو بڑی تشویش ہوئی اور آپ نے نہایت سخت جواب دیا اور لکھا کہ اگر تو ہمارے آپس کے مشاجرات سے فائدہ اٹھا کر ہمارے

ملک پر حملہ آور ہوگا تو میں اور علی دونوں ساتھ مل کر تیرا مقابلہ کریں گے اور میں آگے آگے ہوں گا۔

مگر افسوس کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھ بند ہوتے ہی شام کی طرف سے ہرقلیت اور رومی طرز سیاست اسلام پر حملہ آور ہوئی اور ان اغلیمہ کے اثر و اقتدار کے دوش پر اسے پروان چڑھنے کا زریں موقع ہاتھ آ گیا جو بنوامیہ کی نئی حکومت کے قیام و بقا کے لیے یزید، مروان، عبیداللہ بن زیاد، عمر بن سعد کی طرح مسیحی سیاست دانوں کو بھی کام میں لائے، جس کا نہایت مکروہ ظہور واقعہ کربلا کی شکل میں ہوا اور مسیحیت نے وہ کام کیا کہ آج تک اسلامی دنیا دست و گریباں نظر آرہی ہے، بنوامیہ کا مستقر شام کا شہر دمشق تھا جو پہلے سے شامی بازنطینی تہذیب وفکر کا مرکز اور مسیحیت کا گہوارہ تھا اور یہاں رومی طرز حکومت کی حکمرانی تھی، ہنگامی ضرورت کی وجہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں دیواج خراج میں کام کرنے کے لیے بعض نصرانی منصرموں اور کاتبوں کی خدمات حاصل کیں، چنانچہ شہر حمص کے خراج کی وصولی کے لیے ابن اثال نصرانی کو رکھا، نیز سرجون بن منصور رومی مسیحی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دیوان خراج کا کاتب تھا، یہ شخص حضرت معاویہ، یزید، معاویہ بن یزید، مروان بن حکم اور عبدالملک بن مروان کے زمانہ تک شام کے دیوان خراج کا منتظم اعلیٰ رہا (بحوالہ کتاب الوزراء جہشیاری) اور اس کے ماتحت نصرانی عملہ کی ایک بڑی جماعت تھی، اس لیے اس کا اثر ورسوخ بڑھا اور یزید کا مشیر بھی بن گیا اور اپنے عمال و امراء

کے عزل ونصب میں اس سے مشورہ کرنے لگا، یہ قدیم رومی حکومت کا زمانہ دیکھنے والا کاتب اپنے مذہب پر قائم تھا اور بظاہر مسلمان حکومت کا ملازم بن کر بباطن روم کی مسیحی حکومت کا طرف دار تھا اور ان رومی ممالک پر اسلامی فتوحات سے راضی نہ تھا، ایسا آدمی کب صحیح مشورہ دے سکتا تھا اور اسلامی معاملات خصوصاً مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگی میں امن وصلح کی بات کیسے گوارہ کر سکتا تھا، وہ تو ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی قدیم رومی پالیسی کا آدمی تھا، چنانچہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لیے ایسے مواقع کو غنیمت سمجھا، جس میں ایک طرف عرب کی سب سے بڑی طاقت بنوامیہ ہو اور دوسری طرف خاندان رسالت اور اس کے طرفدار دینی جذبہ کے ساتھ ہوں اور جب یزید نے اس سے مشورہ کیا تو اس نے ایسا مشورہ دیا جو اس کی مسیحی پالیسی کے عین مطابق تھا اور جس کی ایک بے دین نصرانی سے توقع تھی، علامہ اقبال جہشیاری کی مشہور ومعتبر کتاب ''الوزراء والکتاب'' میں ہے:

"ولما اتصل بيزيد مسير الحسين رضى الله عنه إلى الكوفة شاور سرجون بن منصور فيمن يولى العراق."(۱)

(اور جب حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ پہنچ جانے کی خبر یزید کے پاس پہنچی تو اس نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ کیا کہ کس شخص کو عراق کا گورنر بنائے)۔

(۱) کتاب الوزراء والکتاب ص/۳۱ ط:مصر

اس تصریح کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حادثہ کربلا میں یزید نے کس فکر و ذہن کے مشورہ پر عمل کیا اور اسے کس نے ایسے آدمی کو عراق کی گورنری کا مشورہ دیا جو پہلے ہی سے عصبیت و طرفداری میں مشہور تھا اور اس معاملہ میں کسی شخصیت یا جماعت یا دیانت کی پرواہ نہیں کرتا تھا، اگر نصرانیت کی یہ چال کامیاب نہ ہو گئی ہوتی تو شاید یہ سانحہ پیش نہ آتا اور آج تک عیسائی مصنفین اور مسیحی مؤرخین حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کو غلط کار وخطا کار ثابت کر کے یرموکی حکومت اور اس کے عمال کو نہ سراہتے، جس نے سرجون بن منصور نصرانی اور اس جیسے دوسرے اپنے عیسائی اہل کاروں کے مشورہ سے یہ کام کیا، مغربی محققوں کی بے لاگ تحقیق اسی نصرانی مشورہ کی تصحیح وتصدیق کے لیے ہے جو اسلام میں ہمیشہ کے لیے افتراق و انشقاق پیدا کرنے کی غرض سے دیا گیا تھا۔"(۱)

سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام خلافت راشدہ کی روح کی حفاظت کے لیے تھا

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سابق قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار و ناظم اسلامی فقہ اکیڈمی انڈیا لکھتے ہیں:

"تاریخ کا جائزہ ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام کا نصب العین "خلافت عادلیہ صحیحہ" کا قیام تھا، یزید کا فسق خلافت نبوت کو خلافت قیصر و کسریٰ

---

(۱) حضرت علی و حسین رضی اللہ عنہما از قاضی اطہر مبارک پوری تلخیص حضرت سید نفیس الحسینی لاہوری ص/۱۷۴-۱۷۸، مطبوعہ سید احمد شہید اکیڈمی لاہور۔

سے بدل رہا تھا، یہ فسق گھر کی چہار دیواری میں محدود نہ رہا تھا، بلکہ عوام الناس کے سامنے کھل چکا تھا، اس وقت امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے اجتہاد نے اس طرف رہنمائی کی کہ اس ''امام جائر'' کے سامنے حق کا اظہار ضروری ہے اور انھوں نے اس راہ میں اپنی جان دے دی۔

حاصل یہ ہے کہ حضرت امام کے خروج کی بنیاد یزید کا فسق و فجور تھا، ان کی تحریک کی بنیاد خلافت عادلہ کا قیام تھا، وہ خدانخواستہ ایک غیر اسلامی چیز یعنی نسلی فضیلت کی بنیاد پر خلافت کے مدعی نہ تھے، جب عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا یہ مسلک سامنے آگیا کہ وہ یزید کے فسق کے باوجود اس کے خلاف خروج کے قائل نہ تھے، محض اس لیے کہ فتنہ و فساد کا خطرہ تھا، عام صحابہ اپنے اس اجتہاد کی بنیاد پر حضرت امام کا ساتھ تو نہ دے سکے لیکن امام حسین کو غیر اسلامی تحریک کا داعی اور گنہگار بھی نہ کہا اور عام صحابہ کو حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے بھی مورد الزام قرار نہیں دیا، اس لیے کہ وہ بھی اپنے اجتہاد پر عامل تھے، لیکن اپنی دعوت کی حقانیت پر اور اپنی تحریک کی سچائی پر انھیں صحابہ کو گواہ بناتے تھے جو عملاً ان کے اس اقدام میں شریک نہیں تھے۔

خلاصہ یہی ہوا کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ اپنے اجتہاد پر عمل پیرا ہو کر یزیدیوں سے نبرد آزما ہوئے اور عام صحابہ نے فتنہ وفساد کا خیال کرتے ہوئے اس میں نجات سمجھی کہ یزید کی ہدایت کے لیے دعا کی جائے اور اس سے نجات اور راحت کی دعا کی جائے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ سمجھ رہے تھے کہ عام صحابہ بھی

یزید کے فسق سے واقف ہیں اور وہ بھی خلافت عادلہ کے قیام کو ضروری سمجھتے ہیں، لیکن بنوامیہ کی طاقت اور عصبیت کی بنا پر کسی نئی تحریک کا بارآور ہونا مشکل ہے اور پھر مسلمانوں کے مابین قتل وخون کا اندیشہ ہے، اس لیے وہ اس طرح کی تحریک اٹھانے کے لیے تیار نہیں، اسی لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے انھیں مدد نہ کرنے پر مورد الزام بھی نہیں سمجھا اور دوسری طرف انھیں اپنی دعوت پر گواہ بناتے رہے، یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اس اقدام یا کوفہ کی طرف جانے سے روکا تھا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ یزید کے کردار میں کوئی ایسی خامی نہ تھی جس کی وجہ سے اس کے خلاف خروج ناجائز ہو بلکہ اس کی وجہ یہی تھی کہ صحابہ یہ سمجھ رہے تھے کہ حالات ایسے نہیں ہیں جس میں یہ تحریک کامیاب ہوسکے۔"(۱)

مولانا قاضی مجاہد الاسلام علیہ الرحمہ نے اس نقطہ نظر کی تردید بھی کی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے باغی کی سزا قتل ہے، اس لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا قتل جائز تھا، وہ علامہ ابن خلدون کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

"ابن خلدون لکھتا ہے کہ ابن عربی کا یہ خیال غلط ہے، اس لیے کہ باغی کا قتل جائز اس وقت ہے جب امام عادل ہو، یہاں تو مسئلہ کی صورت ہی دوسری ہے، ایک طرف یزید ہے، جس کا فسق وفجور روز روشن کی طرح واضح ہوچکا تھا، یہ اہل آراء تھے جو اپنی شہوات اور خواہش نفس کے مطابق حکومت چلا رہے تھے،

---

(۱) بحوالہ برہان دہلی (دسمبر ۱۹۵۹ء)

دوسری طرف حضرت حسین رضی اللہ عنہ تھے جو مجسمہ عدالت و تقویٰ اور سراپا شرافت و دیانت تھے، پس حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام خروج کی حیثیت امام عادل کے خلاف بغاوت کی نہیں بلکہ امام جائر و فاسق کے مقابلہ میں حق و صداقت کے علم برداروں کے خروج کی ہے، یہ حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت نہیں تھی بلکہ امام جائر کے سامنے کلمہ حق کا اظہار تھا اور قتل کا قانون اس بغاوت وعہد شکنی کے لیے جو امام عادل کے مقابلہ میں اختیار کی جاتی ہے نہ کہ اس شخص کے لیے جو کھڑا ہوا ہو ہرقلیت و کسرویت، جاہلی عصبیت اور فسق و فجور کو مٹا کر حق و عدالت کی بنیاد پر حکومت قائم کرنے کے لیے، پس ایسے شخص کے قتل کو کیسے جائز کہا جا سکتا ہے۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ:

"وهو غلط حملته عليه الغفلة عن اشتراط الإمام العادل ومن أعدل من الحسين في زمانه في إمامته وعدالته في قتال أهل الآراء." (۱)

(ابن عربی کی یہ رائے غلط ہے اور انھوں نے یہ غلط رائے اس لیے قائم کی کہ وہ امام عادل کی شرط سے غافل ہو گئے اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر عادل کون ہو سکتا ان کے زمانہ میں امامت و عدالت کے اعتبار سے اہل آراء کے قتال کے سلسلہ میں)۔

علامہ ابن خلدون نے اپنے شہرہ آفاق مقدمہ تاریخ میں جو ان کی

(۱) مقدمہ ابن خلدون ص/۱۸۰

تاریخی معلومات اور تحقیقات کا نچوڑ ہے، اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے کہ تمام صحابہ شمع ہدایت تھے، ان کی عدالت، ان کا تقویٰ اور ان کا اخلاق محتاج بحث ونظر نہیں، وہ اس سب سے بالاتر ہیں کہ ان کے بارے میں نفسانیت کا وہم بھی کیا جائے، اس لیے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا یزید کو ولی عہد بنانا بھی دینی مصلحت سے تھا، وہ لکھتے ہیں:

"فإياك أن تظن بمعاوية رضي الله عنه أن علم ذلك من يزيد فإنه أعدل من ذلك وأفضل." (۱)

(ہرگز ہرگز تم حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ گمان مت کرنا کہ وہ یزید کے فسق سے واقف تھے اور انھوں نے اس کو پھر بھی ولی عہد بنادیا، وہ اس سے بالاتر اور بلند ہیں)۔

اور اگلے جملے میں ابن خلدون نے اس کا بھی اعتراف کرلیا ہے کہ یزید کی طرف جو موسیقی اور گانے بجانے کے شوق کی نسبت کی جاتی ہے وہ صحیح ہے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی حیات ہی میں پیدا ہوچکی تھی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اس کی اس حرکت پر ملامت بھی کرتے تھے۔" (۲)

---

(۱) مقدمہ ص/۱۷۶

(۲) بحوالہ برہان دہلی (دسمبر ۱۹۵۹ء)

خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم، بسم الله الرحمن الرحيم ﴿والشمس تجري لمستقر لها ذلك تقدير العزيز العليم﴾ (یٰسٓ: ۳۸)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر کی طرف (اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طلوع اور غروب کی جو جگہ متعین کی ہے) بے اختیارانہ بڑھتا اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے اور یہ اس مالک کا مقدر کیا ہوا اور بنایا ہوا نظام وحساب اور اس کا قانون ہے جو العزیز بھی ہے العلیم بھی، غالب بھی ہے اور علم والا بھی، نظام بنانے والا اور حساب مقرر کرنے والا بھی، اگر کوئی صرف غالب ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا نظام و حساب حکمت پر مبنی ہو، وہ محض اپنی قوت سے کام لیتا ہے، لیکن اس کی ساری کاروائی اور کارفرمائی ضروری نہیں کہ حکمت پر مبنی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکم دینے والا علیم ہو لیکن غالب نہ ہو تو سارا کام پورا ہونا مشکل ہے۔

اس آیت مبارکہ میں نظام شمسی کا ذکر کیا گیا ہے کہ آفتاب اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ایک خاص جگہ سے چلتا ہے اور ایک جگہ پہنچتا ہے اور وہ اپنا پورا سفر اللہ کی

قدرت اوراس کے علم کے مطابق طے کرتا ہے۔

اس آیت کی روشنی اور رہنمائی میں جس میں نظام شمسی کا ذکر ہے، آفتاب رسالت، آفتاب دین حق، آفتاب دین و دعوت کے نظام شمسی کے انضباط اور اپنے مقاصد کی تکمیل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے، ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں اتفاقات کوئی چیز نہیں ہیں، وہ سب اللہ کے منشا اور اس کے حکم کے مطابق اور اس کی حکمت کے عین موافق گردش کرتے ہیں اور اس کے تابع ہوکر ان کا نظام چلتا ہے۔

آپ اس نظام نیابت کو دیکھیں جو "خلافت راشدہ" کے لقب سے مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے سفر کرنے کے بعد جو شخصیتیں مسند خلافت پر آئیں اور پھر جس ترتیب کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئیں اور اللہ تعالیٰ نے فرائض خلافت ادا کرنے کا جو موقع ان کو عطا فرمایا، یہ بالکل "ذلك تقدير العزيز العليم" کا مظہر ہے، اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ترتیب اور ایسے نظام کے ساتھ چلایا کہ وہ اس کی رحمت واسعہ، اس کی حکمت بالغہ اور اس کی قوت قاہرہ کی ایک مثال ہے۔

دنیا کے مذاہب وادیان اور اقوام و ملل اور فلسفہ تاریخ پر نظر رکھنے والے مفکرین اگر کہیں جمع ہوں اور ان کو اس کا پورا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے تاریخی تجربہ اور مذاہب وادیان اور اقوام و ملل کے اسباب زوال وارتقاء کے مطالعہ کی مدد سے اس سے بہتر ترتیب قائم کریں تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں اور تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے ایک طالب علم اور خاص طور پر ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے فرد کی حیثیت سے پورے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر ترتیب سوچ نہیں سکتے اور اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ کوئی عہد گزر گیا یا ملوک و سلاطین کا کوئی سلسلہ مکمل و مختتم ہو چکا ہے، کوئی سلسلہ حکومت یا شاہی خاندان اپنی مدت ختم کر چکا ہے، بعد میں فلسفہ تاریخ پر نظر رکھنے والے جو لوگ آئے اور انھوں نے ان کی ترتیب پر، اس ترتیب کے نتائج پر اور پھر ملک و معاشرہ پر پڑنے والے اس کے

اثرات پر غور کیا تو ان کو کہیں نہ کہیں یہ کہنے کا موقع ضرور مل گیا کہ اگر ایسا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، فلاں کے بعد اگر فلاں آیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا، اگر وہ پہلے نمبر پر ہوتا تو زیادہ مفید ثابت ہوتا، اگر وہ دوسرے نمبر پر آیا ہوتا تو زیادہ بہتر ثابت ہوتا اور پھر جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا کہ ایک حرف ''کاش'' ایسا ہے کہ مجھے سو جگہ لکھنا پڑا ہے ؎

یک حرف کاش کیست کہ صد جا نوشتہ ایم

وہ بھی سو جگہ لکھنے پر مجبور ہوتا کہ کاش ایسا ہوتا، کاش ویسا ہوتا، میں پھر دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کی دوسری قوموں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات مغربی اقوام کے بہترین مفکرین، تاریخ داں اور فلاسفہ اور بڑے بڑے مبصرین جمع ہو کر اسلام کے عہد اول کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے ذہن و دماغ سے اور اپنے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں اس دین کی حفاظت کرنے والوں اور اس کو دنیا میں پھیلانے والوں کا ایک چارٹ تیار کریں اور ایک نقشہ بنائیں کہ کس کو کس کے بعد آنا چاہیے تھا تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس سے بہتر چارٹ نہیں بنا سکتے۔

مذہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کے لیے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے (میں ریڑھ کی ہڈی نہیں کہوں گا، اس کے لیے یہ روح کا درجہ رکھتی ہے) وہ اس دین کی حفاظت کا کام ہے، اس کو لانے والا، اور اس کا حامل اول اس کو جس طرح لایا ہے اور اس میں جس چیز کا جو مقام ہے اور جس چیز کا جو درجہ ہے اور اس کی جو ترتیب ہے اس کے مطابق اس کا جانشین اس کو قائم رکھے اور اس میں ذرا بھی تبدیلی کا روادار نہ ہو، یہ سب سے ضروری اور اہم کام ہوتا ہے، مذاہب کی تقدیر کا اس پر انحصار ہوتا ہے کہ پیغمبر کے بعد (اس دین کے اولین لانے والے کے بعد) کون اس کی جگہ لیتا ہے کہ دین اپنی اصلی حالت اور صحیح ترتیب پر اور اس کی تعلیمات اپنی اہمیت کے مطابق اپنے مقام پر قائم و باقی رہیں۔

ایمان کامل کے بعد، معرفت الٰہی کے بعد اور توحید خالص کے بعد دنیا میں جو بہترین اوصاف ہو سکتے ہیں اور نفسیات انسانی کے ماہرین اور مراتب کمال کے نبض شناسوں جو اعلیٰ ترین اوصاف تجویز کیے ہیں وہ سارے اوصاف، وہ سارے کمالات ایک طرف رکھے جائیں، ان میں سب سے زیادہ کسی مذہب کی بقاء کے لیے (میں ارتقاء کے لیے نہیں کہتا، ارتقاء تو بعد کی چیز ہے) جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے جذبہ حفاظت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بارے میں شدید غیرت، میں تقویٰ کا ذکر یہاں نہیں کرتا، خلفاء اربعہ بلا کسی استثناء کے تقویٰ کے ایسے اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہیں، جس کا تصور بھی بڑے بڑے مفکروں اور تقویٰ شناسوں کے لیے مشکل ہے، میں ان کے علم اور ان کی ذہانت کا بھی ذکر نہیں کرتا، میں ان کی انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبہ اور ان کی نیک نفسی، خدا ترسی اور انسان دوستی کا بھی ذکر نہیں کرتا، پہلی چیز اور پہلی شرط جو ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر کی پہلی جگہ لینے والا اور اس کی نیابت اولیٰ کا فرض انجام دینے والا، اس دین وشریعت کے معاملہ میں اتنا غیور ہو کہ اس سے بڑھ کر غیور، اس سے بڑھ کر ذکی الحس، اس سے بڑھ کر خوددار و حساس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

دوسری صفات بعد کی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر ان سب کا مقام ہے، لیکن پہلی شرط جس پر دین کی بقا کا انحصار ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین، اس کا نائب، اس کی جگہ پر امت کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے والا جو کچھ بھی ہو اپنی جگہ پر، لیکن دین کے معاملہ میں وہ حد درجہ غیور ہو، وہ اپنے گھر والوں اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت وآبرو کے مقابلہ میں بھی اس دین کے ایک ایک نقطہ کے بارے میں زیادہ غیور، زیادہ باحمیت اور ذکی الحس واقع ہوا ہو، سارے مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ مذاہب سب سے زیادہ اس وجہ سے تحریف کا شکار ہوئے اور انھوں نے بہت جلد اپنی شکل بدل دی اور ایک دوسرے راستہ پر پڑ گئے کہ ان مذاہب کو اپنے لانے والوں کے

بعد (لاکھوں درود وسلام ہوں ہوں ان پر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا جانشین، محافظ وامین اور وفادار وغیور جانشین نہیں ملا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کس مرتبہ کے انسان تھے، ان کی صفات ان کی سیرت وسوانح کی کتابوں میں پڑھیے، وہ کن کمالات کے حامل تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں کیا فرمایا، ان کو کس درجہ کی فضیلت حاصل ہے، ان پر امت کو کتنا اتفاق ہے، یہ سب حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی اور غالب صفت جس کی پہلے مرحلہ میں سب سے بڑھ کر ضرورت تھی وہ ان کی دین کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی غیرت، ذکاوت حس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ اور منشائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غیر متزلزل عزم وفیصلہ تھا۔

ان کا خدا کے ساتھ جو تعلق تھا وہ اپنی جگہ پر، ان کی راتوں کی گریہ وزاری، ان کی دعائیں اور خلق خدا پر ان کی شفقت اور ان کا عدل وتقویٰ، ان کا زہد وایثار، وہ صفات وخصوصیات ہیں جو اپنی جگہ پر بڑی قدر وقیمت کی حامل ہیں، مگر حفاظت دین اور اس کے بارے میں شدید غیرت یہ ان کا وصف خاص اور ان کی سیرت کی کلیدی صفت ہے، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آج دین پر جو عمل ہو رہا ہے، فرائض اور شرعی احکام زندہ ہیں، دین تحریف اور امت کلی طور ضلالت سے جو محفوظ ہے یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اسی حفاظت دین کے جذبہ کا نتیجہ اور ظہور ہے، اللہ کے فضل سے آج بھی خدائے واحد کے ماننے والے موجود ہیں، بنیادی عقائد پر ایمان رکھنے والے اور فرائض کے پابند ہیں، جن کے بغیر کسی مسلمان کا مسلمان رہنا مشکل ہے، یہ سب رہین منت ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اولیٰ کا اور میں کیا چیز ہوں، میری کیا حیثیت ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے زیادہ حدیث کے راویوں میں کسی سے روایات منقول نہیں اور جن کی عدالت وصداقت پر امت کا اتفاق ہے، وہ فرماتے ہیں:

"والله الذی لا إله إلا هو، لو لا أن أبا بکر استخلف ما عبد الله."(۱)

(اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن نہ ہوتے تو دنیا میں خدائے واحد کی عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری نہ رہتا)۔

لوگوں نے کہا دیکھئے، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انھوں نے پھر وہی بات دوہرائی کہ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسند خلافت پر متمکن نہ ہوتے تو دنیا میں خدائے واحد کی عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری نہ رہتا۔

بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دین کے بارے میں ایسی غیرت رکھتے تھے جو غیرت عزت وآبرو کے بارے میں ہوتی ہے اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف تھا اور یہی ان کا اصل جوہر تھا جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کے اس وصف کو ان کا وہ جملہ بتاتا ہے جس کو تاریخ نے انھیں کے لفظوں میں نقل کیا ہے اور وہ جملہ خود بول رہا ہے کہ وہ کس دل سے نکلا ہے اور کس ایمان ویقین کے ساتھ نکلا ہے، وہ جملہ ہے "أینقص الدین و أنا حی" (کیا میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہوسکتی ہے) میری آنکھوں کے سامنے اللہ کے دین میں ایک حرف کیا ایک نقطہ کی بھی کمی ہوسکتی ہے؟

یہ ہے وہ چیز جس کی مذاہب وادیان کو سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے اور یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں بدرجہ کمال موجود تھی۔

اب میں آپ کے سامنے اس دینی غیرت وحمیت اور ذمہ داری کے بڑھے ہوئے احساس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں:

---

(۱) روایت ابوالاعرج البدایہ والنہایہ ۳۰۴/۶

۱- وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی جزیرۃ العرب میں فتنہ ارتداد اٹھا، اب کچھ ایسی نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فتنہ ارتداد میں باہر کے یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی ہاتھ تھا، ابھی تک یہ بات تاریخ کی روشنی میں نہیں آئی تھی (۱) انھوں نے یہ کوشش کی کہ وہیں جزیرۃ العرب میں ایک ایسی انتشار پسند و انتشار انگیز تحریک پیدا ہو جس سے اسلام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ایمانی وحدت، اعتقادی وحدت، ذہنی وحدت، قلبی وحدت اور اخلاقی وحدت ختم ہو جائے، یہ فتنہ شروع ہوا، جو لوگ اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے اور نماز ادا کرتے تھے، زکوٰۃ کے بارے میں ایک گروہ اس کی فرضیت کا بالکل منکر ہو گیا اور اس نے نماز و زکوٰۃ میں تفریق کی، دوسرے فریق نے کہا کہ ہم زکوٰۃ بیت المال کو ادا نہیں کریں گے بلکہ اپنے طور پر اس کی ادائیگی کا انتظام خود کر لیا کریں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے اولوالعزم صحابی کو بھی تامل ہوا اور یہ تامل ان کے احتیاط و تقویٰ پر مبنی تھا نہ کہ کسی کمزوری کی وجہ سے کہ جب یہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور اسلام کا انکار بھی نہیں کرتے تو ان سے جنگ کیسے کی جائے؟ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا:

"واللّٰہ لأقاتلن من فرّق بین الصلوۃ والزکوۃ، فإن الزکوۃ حق المال."

(بخدا میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں مختلف رویہ اختیار کرے گا کہ نماز پڑھے اور زکوٰۃ نہ دے گا

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہ ہے کہ قبائل عرب کا ارتداد اور مسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت اتفاقی اور خودرو پودے نہیں تھے جو خود سے اگ آئے ہوں، جیسے برسات کے موسم میں اگ آتے ہیں، اس فتنہ کو بھڑکانے میں ان کے نزدیک یہودی، عیسائی، مجوسی ذہن کام کر رہا تھا اور وہ ان لوگوں کے پشت پناہ تھے، ان کے نزدیک اس کے شواہد موجود ہیں اور اس کے ٹھوس ثبوت سامنے آچکے ہیں، اس کے لیے خاص طور پر وہ استاذ محمد جمیل مصری کی کتاب "أثر أهل الکتاب فی الفتن الداخلیة والحروب الأهلیة فی القرن الأول" کو پیش کرتے ہیں۔ (م)

اس لیے کہ زکوۃ مال کا حق ہے)۔

اور یہ بھی فرمایا کہ:

''ایک رسی بھی اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا اگر نہ دے گا تو میں اس سے بھی جنگ کروں گا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے اور اچھے اچھے لوگوں کو تامل تھا، یہ خالص الہامی بات تھی، اللہ کو دین کو چونکہ باقی رکھنا تھا، لہٰذا انھوں نے کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوسکتا، اگر اس میں کوئی تساہل برتا گیا اور زکوۃ کے بارے میں ڈھیل دی گئی تو کل حج کی باری ہے، اس کے بعد روزہ کی باری ہے، پھر نماز کی باری ہے اور پھر عقیدہ کی باری ہے اور یہ سلسلہ رکتا نہیں، انھوں نے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن یہ الہامی بات تھی جو خدا نے ان کے دل میں ڈالی تھی، کیونکہ اس دین کو اللہ تعالیٰ کو قیامت تک باقی رکھنا تھا، کیسی کیسی قوموں کو اس میں داخل کرنا تھا، کن کن بلندیوں تک اس کو پہنچانا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ اگر اس وقت ذرا تساہلی برتی گئی اور ذرا بھی رعایت کی گئی اور ذرا بھی رعایت کی گئی تو دین باقی نہ رہے گا اور وہ بالکل ادیان سابقہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح محرف ہو کر رہ جائے گا، چنانچہ وہ اپنے موقف پر اَڑ گئے اور انھوں نے جہاد کیا اور اس جہاد میں خود بھی جانے کا ارادہ کیا لیکن سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جا کر رکاب تھام لی کہ ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے اور یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلوص اور محبت کی کھلی ہوئی دلیل ہے، انھوں نے یہ خیال کیا کہ اگر خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش آگیا تو اسلام کے شیرازہ کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت نہیں، یہ خلوص کی اعلیٰ ترین مثال ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات مان لی اور حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور بہت سے صحابہ اور حفاظ قرآن رضی اللہ عنہم کو جنگ کے لیے روانہ کیا، اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کو بھیجا کہ ڈر ہوا کہ اگر یہ

حفاظ جنگ میں کام آگئے تو یہ قرآن کیسے باقی رہے گا، لیکن وہ اڑ گئے، خدا کی مدد ان کے ساتھ ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتنہ ارتداد ختم ہوا، دعویداران نبوت مارے گئے اور اب یہ واقعہ صرف تاریخ کی ایک امانت رہ گیا ہے، وہ بھی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے، بہت سے لوگ شاید ایسے ہوں گے جو پہلی مرتبہ اس واقعہ کا ذکر سن رہے ہوں گے۔

ہم اس واقعہ کی اہمیت اور اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکتے، وہ عرب جو اسلام سے قریب العہد تھے ابھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تھی اور دنیا سے آخرت کا سفر فرمایا ہے، ایک طرف رومن امپائر تھا جو تقریباً نصف متمدن دنیا پر قابض تھا، دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی، پھر عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت جیسے مذاہب تھے اور یہاں ہندوستان میں ہندو مذہب اور بودھ مذہب تھا، ان سب کی موجودگی میں اسلام اپنی اصل شکل میں کیسے باقی رہا، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے اور یہ کارنامہ خلافت نبوت کا مظہر اول ہے، انھوں نے کہا کہ خواہ کچھ ہو میں دین کے ایک نقطہ سے بھی دست ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ دین اسی شکل میں باقی ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ دوسرے مذاہب کا کیا حال ہوا، میں اس وقت صرف دنیا کے ایک وسیع ترین مذہب عیسائیت کا ذکر کروں گا۔

یہ عیسائیت جس کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور جو دنیا کے متمدن ترین اور ترقی یافتہ خطوں میں حکومت کر چکی ہے، بحیثیت مذہب کے بھی اور بحیثیت اپنے علمبرداروں کے بھی، اس عیسائیت کا یہ حال ہے کہ نصف صدی کی مدت کے اندر بھی، یہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکی، اب کتابیں نکل رہی ہیں، ابھی حال ہی میں Emest De Bensen کی کتاب جس کا نام Islam or true Christianity ہے شائع ہوئی ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے:

"موجودہ عیسائیت کسی بھی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ وہ عیسائیت نہیں ہے جس کی

دعوت اور اشاعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی، یہ
عیسائیت سینٹ پال کی بنائی ہوئی عیسائیت ہے۔''

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سینٹ پال اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان صرف ساٹھ پینسٹھ برس کا فصل ہے، ان چند برسوں میں عیسائیت کا یہ حال ہوا کہ اس نے رومی اثرات اور بودھ مذہب کے بہت سے تصورات قبول کر لیے اور اگر آپ مذاہب کی انسائیکلوپیڈیا اور عیسائیت پر لکھی گئی دوسری کتابیں دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ عیسائیت نے رومی دیومالا اور بودھ مذہب کی کتنی چیزیں مثلاً تمثل، اتحاد وحلول کو اور کتنے ان عقائد ونظریات واقدار کو جو ہندوستان کے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے قبول کیا اور بالکل محرف ہوکر رہ گئی اور برابر اسی راستہ پر چل رہی ہے۔

یہ قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لیے ''الضالین'' کا لفظ استعمال کیا ہے، ضالین کے معنی کیا ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، یہ ہے ضلال، آپ بجائے اس جلسہ گاہ میں آنے کے ریلوے اسٹیشن چلے جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے منزل مقصود سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے، عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جارہی ہے (ہوائی جہاز بھی اس کے پیروؤں کے دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں، اپنے مذہبی و دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزل مقصود سے دور نہیں ہوئی بلکہ اڑ کر دور ہوئی، آج کی موجودہ مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس سینٹ پال کا تحفہ اور اس کا دین کہنا چاہیے اور وجہ یہ ہے کہ (مجھے معاف کیا جائے اور خدا بھی مجھے معاف کرے) عیسوی مذہب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا پاسبان اور خلیفہ نہیں ملا، اب یہ اللہ کی حکمت تھی اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی ذات غنی ہے، اس نے حضرت مسیح علیہ السلام پر دوسرے بہت سے

انعامات فرمائے، حضرت مسیح حضرت مسیح ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے اور ان کی نبوت کا اقرار کیے بغیر ہم مسلمان نہیں ہو سکتے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے اس کو چونکہ عیسائیت کو قیامت تک باقی رکھنا مقصود نہ تھا "لیظھرہ علی الدین کلہ" اس کے لیے نہیں کہا گیا "الیوم أکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الإسلام دینا" کی بشارت اس کو نہیں دی گئی، ایک یہودی عالم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے امیر المومنین! ایک آیت قرآن مجید میں آپ آسانی سے پڑھ لیا کرتے ہیں، اگر کہیں وہ آیت ہم یہودیوں کے بارے میں نازل ہوتی تو ہم اس دن کو تہوار بنا لیتے، آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کون سی آیت؟ اس نے کہا کہ "الیوم أکملت لکم دینکم" فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کب نازل ہوئی، وہ عرفہ کا اور جمعہ کا دن تھا اور یہ تو پہلے ہی سے مبارک دن تھا۔

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کارنامہ تھا کہ وہ دین کے ایک نقطہ کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ کرامات چاہے ایسی ہوں کہ آدمی ہوا میں اڑے اور زبان ایسی ہو کہ جو بات نکلے پوری ہو جائے اور نظر ایسی ہو کہ جس پر پڑے مسلمان ہو جائے او ..لی کا درجہ پائے، سب چیزیں اپنی جگہ مسلم اور قابل تعریف ہیں، مگر جہاں تک دین کے باقی رہنے کا تعلق ہے تو سب سے اہم اور بنیادی چیز جو ہے وہ یہ کہ اس کے بارے میں غیرت اور اس کی حفاظت کا جذبہ سب پر غالب ہو، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان تھی اور اس میں وہ ساری امت میں ممتاز ہیں، کسی دوسرے مسئلہ میں کسی کا وصف ان سے نمایاں ہو، اس سے انکار نہیں کرتا، لیکن اس معاملہ میں ان کا کوئی مثیل نہیں۔

آپ کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جس وقت آپ مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری خواہشات اور تمناؤں میں یہ بات شامل تھی کہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو رومیوں سے جنگ کے لیے بھیجیں،

ادھر فتنہ ارتداد پھیلا ہوا تھا اور صرف دو تین مقامات ایسے بچے تھے جہاں نماز ہو رہی تھی، پورا جزیرۃ العرب خطرہ میں اور ارتداد کی زد میں تھا اور بات کا اندیشہ تھا کہ اگر یہ ارتداد کچھ اور پھیلا تو پورا جزیرۃ العرب اسلام کی دولت سے محروم ہو جائے گا اور مسلمانوں کی جو کچھ بھی فوجی طاقت تھی وہ جیش اسامہ میں تھی اور یہ وہ لشکر تھا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا تھا، لیکن اس کو بھیجنے کی نوبت نہیں آئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رحلت فرما گئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس نازک موقع پر فرمایا کہ میں یہ لشکر بھیجوں گا، کبار صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھایا کہ اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وقت اس لشکر کے بھیجنے کا نہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے پاس فوجی طاقت ہے وہ یہی لشکر ہے، اگر اس لشکر نے مدینہ سے باہر قدم رکھا تو یہ قبائل جو ہماری تاک میں ہیں، ہم پر حملہ آور ہو جائیں گے، لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اس لشکر کو روانہ کر کے رہوں گا، اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمنا اور وصیت تھی اور میں اس کو پورا کر کے رہوں گا، اس کے بعد ایسے الفاظ کہے جن کو میں آپ کے سامنے صاف طریقے سے بیان نہیں کر سکتا، یعنی یہاں تک کہہ دیا کہ چاہے ہمارے گھروں اور گھر والوں کی سلامتی اور حفاظت پر بھی اثر پڑ جائے اور وہ خطرہ میں پڑ جائیں، جب بھی میں اس وصیت پر عمل کر کے رہوں گا، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی ساری نصرت اور اس کی قدرت کاملہ کا ظہور اور اس نظام عالم کو بدل دینے کی اس کی عادت اور سنت ظاہر ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے منشاء کی تکمیل کی صورت میں، نہ کہ اس کو ملتوی رکھنے، یہ ان کا دین کا فہم تھا اور قرآن مجید کا مطالعہ تھا۔

چنانچہ یہ واقعہ تاریخ میں ہے کہ ادھر اس لشکر نے مدینہ طیبہ سے قدم نکالا اور ادھر سارے عرب قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ اب بھی مسلمانوں کے یہ دم خم ہیں کہ ان حالات میں بھی رومیوں سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار ہیں اور لشکر

جارہا ہے، ہم لوگ کیا ہیں، ہم غیر منظم قبائل ہیں، ہمارے پاس وہ ہتھیار بھی نہیں، وہ عسکری تنظیم بھی ہم نہیں جانتے، جب وہ رومیوں سے لڑ سکتے ہیں تو ہم کیا چیز ہیں، ان پر دھاک بیٹھ گئی اور بالکل الٹا اثر ہوا۔

یہ ہے اخلاص کا نتیجہ اور یہ ہے دین کے فہم اور حقیقی نیابت نبوت کا کارنامہ کہ سب ڈر رہے تھے، بڑے بڑے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گھبرا رہے تھے کہ یا اللہ خیر کرے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مانتے نہیں، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا لشکر باہر بھیج رہے ہیں، وہ باہر نکلا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب یہ لوگ بالکل لاوارث ہیں، کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں، اس سے بہتر موقع ہو نہیں سکتا اور وہ مدینہ پر چڑھائی کر دیں گے، لیکن اس کا بالکل الٹا اثر ہوا اور تمام مؤرخین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ پورے عرب پر دھاک بیٹھ گئی اور سب سہم گئے۔

یہ تھی پہلی بات اور یہی ہے تقدیر الٰہی اور "ذلك تقدير العزيز العليم" سے میں اسی طرف اشارہ کر رہا ہوں، آپ روز سورج کو مشرق سے نکلتے اور مغرب میں ڈوبتے دیکھتے ہیں، یہی تنہا اللہ تعالیٰ کے قہار ہونے اور حکیم و غالب ہونے کی دلیل نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ آفتاب رسالت کے اللہ تعالیٰ نے جو منازل مقرر کیے ہیں اور جن منازل سے اس کو گزارا اور جس طرح اس نے دین کو تکمیل تک پہنچایا اور جس طرح اس کے جانشین مہیا کیے اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خلفاء دیئے، یہ بھی "ذلك تقدير العزيز العليم" کا مظہر ہے۔

اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کام پورا ہوا اور فتنہ ارتداد ایسا ختم ہوا کہ آج صرف تاریخ میں اس کا نشان باقی ہے، یہ صرف اللہ کی قدرت تھی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عزیمت جو اللہ ہی کی دی ہوئی تھی اور اس کے نبی کی تربیت کی ہوئی تھی کہ وہ ارتداد کا فتنہ ختم ہو گیا، ورنہ پورے جزیرۃ العرب کا نام تاریخ میں اس حیثیت سے آتا کہ وہاں تھوڑے دن کے لیے اسلام ظاہر ہوا تھا اور وہاں ایک ایسی

ہستی پیدا ہوئی تھی جو اپنے آپ کو نبی کہتی تھی اور اس کے بعد کچھ دن وہ دین چلا اور اس کی صرف ایک تاریخ رہ جاتی۔

اب دوسرے نمبر پر ضرورت تھی کہ دین تو محفوظ رہ گیا کہ حاملین دین بھی محفوظ رہیں اور جو داعیان اول ہیں اور اس کے نمونہ اکمل ہیں اور جو اس کے عملی پیکر اور اس کا مظہر کامل ہیں ان کا مزاج بدلنے نہ پائے، بڑی شاندار تاریخ اور ماضی رکھنے والی اعلیٰ مقاصد کی حامل مستحکم سیرت و تربیت کی مالک قوموں اور باوسائل ذخائر رکھنے والے ممالک فتح کر لینے کے بعد برف کی طرح گھل اور موم کی طرح پگھل گئیں اور انھوں نے سارے اصول و معیار سے دست برداری حاصل کر لی۔

اس وقت کہ روم اور شام اور ایران فتح ہو رہے تھے، مصر و شام کی دولت امنڈ امنڈ کر آ رہی تھی اور بارش کی طرح برس رہی تھی، جن کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا، وہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں آ رہی ہیں، عربوں کا حال یہ تھا کہ جب انھوں نے پہلی مرتبہ کافور دیکھا تو نمک سمجھ کر کھانے میں ڈالنے لگے، یہ عرب تھے، اونٹوں کے چرانے والے، خیموں میں رہنے والے، اونٹ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے والے، ان کو سابقہ پڑا رومن امپائر سے، ساسانیوں کی سیکڑوں سال پرانی سلطنت سے، جہاں تمدن ارتقاء کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا، اب خطرہ یہ تھا کہ امت تمدن کے اس سیلاب میں بہہ نہ جائے، اللہ تعالیٰ اس موقع پر ایسی ہستی کو سامنے لایا جو اس وصف میں سب سے زیادہ ممتاز تھی، کہا نہیں بالکل نہیں، میرے سامنے عربوں کا، امت اسلامیہ کا مزاج نہیں بدل سکتا، یہ تمدن کا شکار نہیں ہو سکتے، یہ عیش و عشرت میں نہیں پڑ سکتے، انھوں نے عربوں کو بڑی تاکید سے سادگی، جفاکشی، شہسواری، زہد و قناعت اور اپنی قدیم نسلی سپاہیانہ و مشفقانہ خصوصیات کو قائم رکھنے کی ہدایت و تلقین کی۔

خود ان کا یہ حال تھا کہ جب آپ جابیہ کی طرف سفر کر رہے تھے تو اس شان کے ساتھ گئے کہ آپ ایک اونٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں، جس پر ایک معمولی کپڑا پڑا ہوا

ہے، اگر زمین پر لیٹنا ہو تو وہی ان کا بستر ہے اور اگر اوڑھنے کی ضرورت پڑے تو وہی ان کی چادر، جسم میں ایک موٹے سوتی کپڑے (کرباس) کا کرتہ تھا، جس پر جگہ جگہ سے نشان پڑ گئے تھے اور جا بجا پھٹا ہوا تھا۔

بیت المقدس کے سفر میں جہاں آپ کو اس کی چابیاں لینی اور مسلمانوں کی تولیت میں اس کو لینے کا عمل کرنا تھا، راستہ میں پانی پڑا تو کھل کھل کر اس کو پار کرلیا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا، عرض کیا کہ اے امیر المومنین آپ نے یہاں جو مظاہرہ فرمایا، نہ مناسب نہیں تھا، یہ رومی جو بڑے ترقی یافتہ اور تمدن سے آراستہ ہیں، کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کے خلیفہ اعظم ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ پانی میں اس طرح کھل کھلاتے چلے آرہے ہیں، آپ کسی معزز سواری پر تشریف لائے ہوتے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یہ بات برداشت نہ ہوسکی اور انھوں نے فرمایا:

"أو لو غيرك قالها يا أبا عبيدة، إنكم أذل الناس فأعزكم الله بالإسلام، فمهما تطلبوا العزة لغيره يذلكم الله."(۱)

(اے ابوعبیدہ! کاش تمہارے علاوہ کوئی اور یہ بات کہتا، تم لوگ سب سے زیادہ ذلیل تھے تو اللہ نے اسلام کی بدولت تم کو عزت بخشی اور جب بھی تم اسلام کے علاوہ کہیں اور عزت تلاش کروگے تو اللہ تم کو پھر ذلیل کردے گا)۔

مذاہب کی تاریخ اور وارثین انبیاء کی تاریخ میں ان الفاظ کی مثال نہیں ملتی، انھوں نے کہ کہ اے ابوعبید تم کہہ رہے ہو؟ اگر کوئی اور ہتا تو ہمیں افسوس نہ ہوتا، دل پر چوٹ نہ لگتی، تم جیسا آدمی یہ کہہ رہا ہے، اے امین الامت! خدا کی قسم تم (اہل عرب) سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلیل وحقیر وقلیل نہ تصور کیا جاتا تھا، ہم کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی، اب اسلام کے سوا تم جس راہ سے بھی عزت تلاش کروگے اللہ تم کو

---

(۱) البدایہ والنہایہ لابن کثیر ۷/۶۰

ذلیل کردے گا۔

پھر جب وہاں پہنچے تو کہنے لگے، ارے تم نے اتنی جلدی اپنا لباس تبدیل کردیا؟ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہو؟ تو حضرت ابوعبیدہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما نے کہا اے امیر المومنین! یہ ٹھنڈا ملک ہے، یہاں اس طرح کے کپڑوں کی ضرورت پڑی ہے اور دیکھئے ہمارے نیچے وہی کپڑے ہیں، انھوں نے کہا کہ اچھا خیر، اس کے بعد کسی پادری کو کرتہ دیا کہ پھٹ گیا ہے، ذرا اس کو سی دیں، پادری نے ایک دوسرا قیمتی کرتہ اس کے بدلے دے دیا، آپ نے فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ پادری نے کہا کہ یہ بڑے اچھے کپڑے (کتان) کا بنا ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ نہیں، ہمارا وہی کرتہ لاؤ، چنانچہ وہ کرتا لایا گیا اور آپ نے اسی کو پہنا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حاکم ومحکوم کے درمیان وہ فرق ہوتا تھا جو انسان اور جانور سے بھی زیادہ ہوتا ہے، آپ ہندوستان کو دیکھئے، یہاں جو طبقاتی تفاوت تھا اور اونچی اور نیچی ذاتوں کے درمیان جو فرق تھا وہ دیکھئے، منوشاستر پڑھئے تو آپ کو اس وقت کے حالات کا علم ہوگا۔

لیکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جو عدل الٰہی اور مساوات انسانی کے علمبردار تھے اور ان کو اس صفت کو قائم بھی رکھنا تھا اور اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعہ اس وصف کو اس وقت تک پہنچانا بھی تھا، ان کی عدل گستری اور مساوات انسانی کا صرف ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں:

ایک مرتبہ مصر میں گھوڑوں کی ریس ہو رہی تھی، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے فاتح اور اس کے گورنر ہیں، ان کے صاحبزادہ اس ریس میں شریک تھے، مقابلہ میں ایک قبطی کا گھوڑا ان کے گھوڑے سے جب آگے بڑھنے لگا تو انھوں نے ایک کوڑا گھوڑے پر لگایا، وہ رک گیا، تو انھوں نے اس قبطی پر بھی ایک کوڑا مارا اور کہا کہ میں ایک شریف زادہ ہوں اور تم مجھ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہو، قبطی

نے اس واقعہ کی شکایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گورنر صاحب اور ان کے صاحبزادہ کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، حالانکہ سب اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں، پھر آپ نے اس قبطی کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور حکم دیا کہ شریف زادہ گورنرزادہ کے سر پر ایسا ہی مارو جیسا کہ اس نے تمہارے سر پر مارا تھا۔(۱)

یہ تھی وہ چیزیں جس کی وجہ سے اسلام میں یہ نظام عدل اور مساوات انسانی اور انسانیت احترام اور اس کا شرف اور اس کی عزت باقی رہی۔

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ تیسرے نمبر پر کس چیز کی ضرورت تھی؟ فتنہ ارتداد ختم ہوچکا تھا، دین میں تحریف کا دروازہ بند ہوچکا تھا، انسانی مساوات اور عدل کا نظام قائم ہوچکا تھا، اب ضرورت تھی کہ یہ اسلامی مملکت قائم رہے، یہ قائم رہے گی تو خیر کا دروازہ کھلا رہے گا، کیسی کیسی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوں گی، کیسے کیسے باکمال افراد پیدا ہوں گے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ جیسے، کیسے کیسے محدث پیدا ہوں گے؟ امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ جیسے، کیسے کیسے قانون ساز پیدا ہوں گے؟ امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ جیسے، کیسے کیسے فاتح پیدا ہوں گے؟ عقبہ بن نافع اور طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم رحمہم اللہ جیسے۔

چنانچہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، کیونکہ انھیں کے خاندان کے لوگ زیادہ تر ملکوں کے فاتح اور حکم اور منتظم تھے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اہل کاران سلطنت کا خونی رشتہ بھی ہوتا ہے، نسبی و وطنی رشتہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنی چیز سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھے کہ ہم محض ملازم ہیں اور جواب دہ ہیں، تو وہ اس وقت اس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، اب یہاں پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ آئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسی فتوحات

---

(۱) ملاحظہ ہو کتب تاریخ وسیرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ (عربی) الفاروق (اردو)

ان کے زمانہ میں ہوئیں، آپ کے زمانہ میں قبرص، افریقہ کا ایک بڑا حصہ، آذربائیجان، اصطخر، سابور، شیراز، اصفہان، طبرستان، بجستان اور نیشاپور فتح ہوئے۔(۱)

خلافت عظمیٰ پر فائز اور وسیع مملکت کے حاکم اور ذاتی طور پر فراخ معیشت اور صاحب املاک ہونے کے باوجود دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ آپ جمعہ کے خطبہ دے رہے تھے اور آپ کے جسم پر ایک موٹی چادر ہے، جس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہیں۔

ایسا بارہا ہوا کہ باہر کے وفود آئے، ان کو لذیذ کھانے کھلائے اور خود گھر جا کر نہایت سادہ وغریبانہ کھانا کھایا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا جب محاصرہ ہوا تو آپ نے اگرچہ خلافت سے دست برداری منظور نہیں کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت تھی اور منشائے رسول اور مصالح اسلامی کے مطابق تھی اور اس طرح استقامت وعزیمت کی ایک شاندار نظیر چھوڑی لیکن اپنی سلامتی وحفاظت کے لیے مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہانے کی اجازت نہیں دی، شہادت سے ایک روز پہلے آپ کے مکان پر سات سو کے قریب مہاجر وانصار جمع ہوگئے، جن میں متعدد جلیل القدر صحابی بھی تھے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس پر بھی میرا کوئی حق ہے میں اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اپنے گھر چلا جائے اور اپنے غلاموں سے فرمایا جو تلوار نیام میں کر لے وہ آزاد ہے۔(۲)

اسلام کی طرف سے اب بالکل اطمینان ہو چکا تھا، سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اب کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا، اب ضرورت تھی کہ مسلمان اتنے دنوں تک حکومت کر چکے تھے اور ان پر تمدن کا اثر پڑنا لازمی تھا اور سیاسی طرز فکر کا آنا بھی ضروری تھا کہ

---

(۱) تاریخ اسلام از علامہ ذہبی (م ۷۴۸ھ) واضح ہو کہ علامہ ذہبی کی تاریخ اسلام کا حصہ خلافت راشدہ ''الخلفاء الراشدون'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔(م)

(۲) تاریخ ابن کثیر ۷/۱۸۱-۱۸۲

آدمی سیاسی اقتدار کے ذریعہ سوچے اور فیصلہ کرے کہ اس وقت یہ کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا نامناسب، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے اور دین کا مطالبہ یہ ہے۔

اب ضرورت تھی کہ خلیفہ رابع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لایا جائے جن کا اصل وصف اور اصل امتیاز یہ تھا کہ سیاسی اصولوں اور سیاسی منافع اور مفادات پر خالص دینی اصولوں کو ترجیح دی جائے اور اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی جائے کہ خلافت ہاتھ میں رہے گی یا نکل جائے گی، نہیں یہ چیز یہاں کے لیے مناسب نہیں، اس کو بدل دینا چاہیے، یہ کام یہاں نہیں ہونا چاہیے، یہاں تک کہ ان کی نظر اس پر بھی تھی کہ اپنے عمال سلطنت کا محاسبہ کرتے تھے، ایک صاحب ایک دعوت میں چلے گئے، ان کے نام خط ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایسی دعوت میں گئے ہو جہاں غریبوں کو ہٹایا جاتا ہے اور امیروں کو بلایا جاتا ہے، تم نے وہاں کی دعوت میں شرکت کی اور انواع واقسام کے کھانے کھائے۔

پھر ان کی آخری زندگی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ کوئی مہمان آیا اور اس کو خیال تھا کہ آج امیر المومنین کے یہاں آئے ہیں، آج تو خوان نعمت لگے گا، طرح طرح کے کھانے رکھے جائیں گے، لمبا چوڑا دسترخوان بچھے گا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک تھیلی منگوائی، اس پر مہر لگی ہوئی تھی، آپ نے مہر توڑی اور اس کو کھولا تو اس میں سے ستو نکلا، اس نے کہا اے امیر المومنین! یہاں تو اس وقت بصرہ اور کوفہ میں لذیذ اور عمدہ کھانوں کی فراوانی ہے اور آپ ستو کھاتے ہیں؟ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ ہاں یہ میرا خریدا ہوا ہے اور یہی میرا کھانا ہے، میں نے اس پر مہر لگا رکھی ہے تا کہ اس میں کوئی باہر کی چیز داخل نہ ہونے پائے۔

آپ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک زرہ کے معاملہ میں جب آپ کا عدالت جانا ہوا، آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ لگ گئی تھی جو کھو گئی تھی، اس کا مقدمہ قاضی کے پاس گیا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو ایک فریق کی حیثیت سے عدالت جانا پڑا، آپ

اپنے صاحبزادہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور اپنے غلام کو ساتھ لے کر گئے، قاضی صاحب نہ ان کے لیے کھڑے ہوئے اور نہ ان کو اس جگہ بٹھایا جہاں امیر المومنین کو بٹھانا چاہیے تھا اور جب آپ نے گواہ پیش کیے تو قاضی صاحب نے ان کی گواہی قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ان میں تو ایک آپ کا بیٹا ہے اور دوسرا آپ کا غلام، لہٰذا ان کی گواہی معتبر نہیں، آپ نے کچھ نہیں کہا، لیکن وہ یہودی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہوگیا اور کلمہ پڑھا کہ امیر المومنین اس طرح قانون پر چلتے ہیں اور اپنی طاقت اپنی شان اور حیثیت کا بے جا استعمال نہیں کرتے۔

آپ کے عہد خلافت کی یہ بھی ایک خصوصیت وافادیت تھی کہ آپ نے اس کا نمونہ پیش کیا کہ اندرونی فتنوں، ہم مذہبوں کی مخالفتوں اور انتشار کے دور میں کس طرح اصول پر قائم رہا جاتا ہے اور سیاست دین پر غالب نہیں ہونے پاتی، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا دور نہ ہوتا تو ہمیں خیر القرون کی کوئی مثال اور نمونہ نہ ملتا کہ فتنوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔(۱)

یہ تھا وہ جوہر جس کی چوتھے نمبر پر ضرورت تھی، اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا اور یہی حضرت حسن وحسین رضی اللہ عنہما کا معاملہ ہے۔

---

(۱) مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لصدر الائمہ ۲/ ۳۸

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اقدام میں امت کے لیے رہنمائی

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کا معاملہ بھی آیات الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو مخصوص معاملہ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو بہتر سے بہتر نعمتیں عطا فرمائی ہیں، ان میں سے آپ کے یہ دو پھول بھی ہیں، جن کو ''ریحانتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کا لقب عالی ملا ہے۔

میں اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں کہتا ہوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اقدام بالکل صحیح تھا جو انھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کیا تھا اور پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا کہ:

"إن ابنی هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين."(۱)

(میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصلح، رقم الحدیث/۲۷۰۴

مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے گا)۔

یہ بات حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لیے صرف ایک خبر نہیں تھی بلکہ یہ آپ کے لیے ایک وصیت تھی، منشاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اللہ کے رسول کا منشا بھی اور پیارے نانا جان کا منشاء بھی، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے لیے خالص حکم نبوی سمجھا اور اس کے مطابق جو اقدام کیا وہ بالکل صحیح تھا کہ معاملہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا، جو صحابی رسول تھے، کاتب وحی الٰہی تھے، قریبی عزیز اور رشتہ دار تھے اور کوئی بات موجب خروج اور تلوار اٹھانے کی نہ تھی، ان کے مخالفانہ فوجی اقدام کا نتیجہ خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوتا، ان کو جب بعض جوشیلے لوگوں نے طعنہ دیا کہ یہ ننگ وعار کی بات ہے تو فرمایا "العار خير من النار" (۱) (یہ عار نار جہنم سے بہتر ہے)۔

اسی طریقہ سے جب معاملہ یزید کا آیا تو میرے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام سو فیصد صحیح تھا اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہی کرنا چاہیے تھا، ورنہ قیامت تک کے لیے قرن اول کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہ ہوتا کہ جب کوئی غلط اقتدار قائم ہوجائے اور جب معاشرہ کی سیرت وکردار کے تبدیل ہوجانے کا خطرہ پیدا ہوجائے، جب حکومت بجائے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے اور بجائے تقویٰ اور طہارت پیدا کرنے اور بجائے خداترسی اور عبادت کا ذوق بنانے کے سیر وشکار اور تعیش ولذت اندوزی کا ذوق پیدا ہونے اور دولت واقتدار کا غلط استعمال ہونے لگے تو ہمارے سامنے کوئی نمونہ اس کا بھی ہونا چاہیے تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اٹھے اور اس کو چیلنج کرے اور اس کے مقابلہ میں آجائے، اگر یہ نہ ہوتا تو آپ اسلام کے بعد کی تاریخ میں دیکھئے کہ وہ ساری کی ساری اس شعر کی تعمیل ہوتی کہ ؎

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

---

(۱) فتح الباری ۱۳/۶۵

جو غلط اقتدار آجاتا، جو غلط حکومت قائم ہو جاتی، ہم بس اس کے تابع بن جاتے کہ یہی تقدیر الٰہی ہے، ہمارے پاس صدر اول کا کوئی نمونہ نہیں ہے، ہمارے پاس کوئی قابل قدر مثال نہیں ہے کہ ہم کچھ کرسکیں، پھر اس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس سے اسلامی وحدت پر اثر پڑے گا، مسلمانوں کی اجتماعیت خطرہ میں پڑ جائے گی، سب خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔

اس کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نمونہ قائم کیا گیا کہ نہیں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئیں اور کسی چیز کی پرواہ نہ کریں، چنانچہ بعد کے مجاہدین کی اگر آپ تاریخ پڑھیں اور ان کی نفسیات کا مطالعہ بھی کریں اور ان کے مکالمے بھی اگر دیکھیں اور ان کی باتیں بھی سنیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مختلف عہدوں اور ملکوں میں جو اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور جو انقلابی کوششیں پروان چڑھیں ان سب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ کام کررہا ہے، امیر عبدالقادر جزائری ہوں یا عبدالکریم ریفی، شیخ سنوسی ہوں یا شیخ شامل داغستانی یا سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ سب کے حوصلے کو بڑھانے والی، ان کے اندر جذبہ پیدا کرنے والی چیز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ ہے کہ یہ کوئی طفلانہ حرکت نہیں، کوئی اشتعال انگیز، کوئی انتشار پیدا کرنے والی حرکت نہیں بلکہ حسینی سنت ہے۔

یہ سلسلہ ہمارے اس دور تک قائم ہے، تحریک خلافت جس کا لکھنؤ ایک بڑا مرکز تھا، اس کے جو سب سے بڑے قائد تھے یعنی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ ان کے اندر بھی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی تقلید کا یہ جذبہ کام کررہا تھا، وہ کہتے ہیں ؎

پیغام ملا تھا جو حسین ابن علیؓ کو
خوش ہوں کہ وہ پیغام وفا میرے لیے ہے

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت زین العابدین کے صاحبزادہ زید بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ جب ہشام بن عبدالملک کے (جو یزید سے یقیناً کچھ بہتر ہی ہوگا) مقابلہ میں کھڑے ہوئے تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے دس ہزار درہم جو اس زمانہ کے لحاظ سے اور امام ابوحنیفہ کے اعتبار سے (جو ایک مجتہد اور فقیہ تھے، کوئی سرمایہ دار نہیں تھے) بہت بڑا عطیہ ہے، ان کو بھیجا اور کہا آپ اس سے کام لیجیے، اور پھر اس کے بعد جب محمد ذوالنفس الزکیہ (محمد ذوالنفس الزکیہ کون ہیں؟ محمد ذوالنفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن مثنٰی بن حسن مجتبٰی بن سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ) جب منصور کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے (منصور کون؟ ہارون رشید کا دادا اور بغداد میں خلافت عباسیہ کا بانی) تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے ان ساتھ دیا اور رقم بھی بھیجی اور حسن بن قحطبہ کو جو منصور کا جنرل تھا، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے روک دیا کہ تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم محمد ذوالنفس الزکیہ اور ان کے بھائی ابراہم سے جنگ کرو، یہ دو بھائی تھے، محمد بن عبداللہ جو مدینہ میں کھڑے ہوئے اور حدیث موجود ہے کہ میری اولاد میں ذوالنفس الزکیہ ہوگا جو مدینہ میں اور احجار زیت میں شہید ہوگا، یہ پیشین گوئی آپ پر صادق آئی، دوسرے بھائی ابراہیم تھے جو بغداد میں کھڑے ہوئے تھے، لیکن تاریخوں کے اختلاف کی وجہ سے ذرا سا فرق ہوگیا، چنانچہ دونوں مل کر مقابلہ نہیں کرسکے، امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے دونوں کا ساتھ دیا اور رقم بھیجی۔

اب اگر کوئی حضرت حسین رضی اللہ عنہ، زید بن علی رضی اللہ عنہ اور محمد ذوالنفس الزکیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس اقدام پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جمعیت اسلامی اور اقتدار اسلامی کے خلاف ایک غیر مستحسن اقدام اور ایک ناعاقبت اندیشانہ عمل تھا، تو وہ گویا یہ کہتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ فقیہ اور مجتہد ہے اور زیادہ خدا ترس اور اسلام دوست، اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ امام

ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نہ صرف فقیہ اور مجتہد تھے بلکہ ایسے فقیہ اور مجتہد تھے کہ میں شریعت اور فقہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ملتوں میں ان دونوں کی مثالیں نہیں ملتیں، انھوں نے نہیں سوچا کہ اسلام اقتدار اعلیٰ کے خلاف یہ لوگ قدم اٹھا رہے ہیں، ان کے پاس کیا فوجی طاقت ہے، اس کا نتیجہ سوائے انتشار کے کچھ نہیں، دونوں نے بالکل خم ٹھونک کر ان لوگوں کی تائید کی۔

اہل سنت والجماعت کا مسلک

یہ ہم اہل سنت کا امتیاز ہے کہ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت کرتے ہیں، ان کی فضیلت کے قائل ہیں اور اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے اس سرمایہ پر فخر کرتے ہیں، یہی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کا مسلک تھا، یہی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک تھا، میں نے صاف پڑھا ہے کہ جب ان کے والد (حضرت شیخ عبدالاحد سرہندیؒ) کا انتقال ہونے لگا، بالکل سکرات کا وقت تھا، حضرت مجدد صاحب نے کہا کہ ابا جان آپ بہت کہا کرتے تھے کہ اہل بیت کی محبت کا حسن خاتمہ میں بہت دخل ہوتا ہے تو فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں اور پھر اس جگہ یہ شعر لکھا ؎

الٰہی بحق بنی فاطمہؓ — کہ بر قول ایماں کنی خاتمہ

یہ ہمارا شعار ہے، ہم کسی قیمت پر بھی اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، ہم خلفائے راشدین کو "أحق الناس بالخلافة" اسی ترتیب کے ساتھ اور ان کی اولیت بھی اسی ترتیب کے ساتھ، پہلے خلیفۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، دوسرے نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تیسرے نمبر پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، چوتھے نمبر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، ہم اس ترتیب کے بھی قائل ہیں اور ان کی افضلیت کے بھی قائل ہیں اور ان کی خلافت کی حقانیت کے بھی قائل ہیں، اس کے ساتھ ہم اہل بیت سے بھی محبت رکھتے ہیں اور ہم حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

ہمارے تمام قابل اعتماد اور لائق استناد مجتہدین اور ائمہ سب متفق ہیں، یزید کے فعل کی شناعت اور یزید کے فسق پر، امام احمد بن محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق صاف آیا ہے کہ ان کے صاحبزادہ نے کہا کہ بیٹا جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو، کیا وہ یزید کو پسند کر سکتا ہے؟ صاحبزادہ نے عرض کیا کہ پھر آپ یزید پر لعنت کیوں نہیں بھیجتے، امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم نے اپنے باپ کو کب کسی پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے۔(۱)

یہی امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے، جب ان کا مکالمہ تا تاری قائد بولائی سے ہوا تو یزید کے بارے میں بڑے سخت الفاظ استعمال کیے اور اس سے اپنی براءت کا اظہار کیا اور اس کے فعل کی شناعت بیان کی۔(۲)

یہی مسلک تھا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کا اور ہمارے تمام پیشواؤں کا یہی مسلک تھا، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک تھا، میں ان کو جانتا ہوں کہ ان کو اہل بیت سے کتنا تعلق تھا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما سے کتنا تعلق تھا، یہاں تک کہ ان کے منتسبین تک سے ان کا جو معاملہ تھا وہ ہم سب جانتے ہیں، اس خصوصیت سے ہم کو بھی دست بردار نہیں ہونا چاہیے اور اس بارے میں کوئی سودا نہیں کرنا چاہیے، نہ عظمت صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں، خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی ترتیب کے بارے میں اور نہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کے فعل کی صحت کے بارے میں اور نہ ان کے اقدام کے صحیح اور مبارک ہونے کے بارے میں۔

خوارج ایک طرف چلے گئے، روافض ایک طرف چلے گئے، یہ بے توفیق تھے اور خدا کی نصرت، اس کی رہنمائی اور اس کی ہدایت سے محروم تھے، خوارج نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تکفیر کی اور روافض نے خلفائے ثلاثہ کی تکفیر کی اور ان کے ائمہ جو یہ بات کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہونے کے بعد صرف تین آدمی دین پر

(۱) فتاوی ابن تیمیہ ۴/۴۸۳ (۲) ایضا ۴/۵۵۱

قائم رہے اور بقیہ لوگوں نے ارتداد کا راستہ اختیار کیا، معاذ اللہ اس سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ناکامی کا اعلان اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیمیا اثر صحبت کی تاثیر کا انکار اور کیا ہوگا؟ یہ تو عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی نہیں کیا، چنانچہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے اور اس سے بہتر بات نہیں ہوسکتی اور میں اسی پر اپنی بات ختم کروں گا، وہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں امت یہودیہ میں سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ کون تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی۔ عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ تم اپنی امت میں سب سے افضل اور سب سے بہتر کسے سمجھتے ہو اور امت عیسوی میں نمونہ کامل کون لوگ تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری۔ روافض سے پوچھا گیا کہ امت اسلامیہ میں سب بدتر اور خراب تر لوگ کون ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی!

جن کا یہ سب فیض ہے اور یہ جو آج روشنی نظر آرہی ہے بقول شاعر۔

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انھیں کی لگائی ہوئی ہے

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عظمت وعقیدت، ان کی افضلیت کا عقیدہ اور ان کی خلافت کو برحق ماننا اور حضرات حسنین سیدنا حسن رضی اللہ عنہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ دونوں کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھنا اور ان کے لیے دعائے خیر کرنا اور ان سے محبت کرنا، یہ ہمارا آپ کا شعار ہے اور اس پر ہم کو فخر ہے اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم اس پر زندہ رہیں اور اسی پر دنیا سے جائیں۔(۱)

☆☆☆☆☆

---

(۱) ملاحظہ ہو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کا رسالہ "خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت الٰہی کی کارفرمائی اور حضرات حسنینؓ کے اقدام میں امت کے لیے رہنمائی" (از ص/۷ تا ص/۴۳) ط: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔